

GHĀLIB AND A STUDY OF GHĀLIB

Dr. EBADAT BRELVI *M.A., Ph. D. ; F.R.A.S. ;*

**Professor of Urdu, and Head of the Department of Urdu
UNIVERSITY OF THE PUNJAB, LAHORE.**

WRITER'S ACEDEMY

9 - Cooper Road, LAHORE.

فہرست

پیش لفظ

- حیات غالب پر چند خیالات ۱
 غالب کے حالات زندگی اور شخصیت ۱۷
 غالب کا ماحول ۶۸
 غالب کی تصانیف ۱۴۹
 غالب کی شاعرانہ عظمت ۱۹۹
 غالب کی شاعری کا آغاز پہلے ۲۱۵
 غالب کی شاعری کے نئے زاویے ۲۳۱
 غالب کی شاعری میں شوخی اور شگفتگی کے عناصر ۲۴۳
 غالب کی شاعری میں اجنبی شعور ۲۵۵
 غالب کی شاعری میں غم دوراں ۲۶۷
 غالب کی عشقیہ شاعری ۲۹۱
 غالب کی شاعری کا جہالتی جلو ۳۲۳
 غالب کی تصویر کاری ۳۱۵
 غالب کے فنی اضافے ۳۶۳
 غالب اور ان کے خطوط ۳۷۵
 غالب کے خطوط کی ادبی اہمیت ۳۹۷
 غالب کا ایک اہم خط — باب 'عاشق' ۴۰۷
 غالب کے اہم نقاد ۴۲۷
 مہاتمہ غالب کے سو سال ۴۵۱
 کتابیات غالب ۴۸۶
 اشاریہ

پیش لفظ

غالب ایک عظیم شاعر ہیں اور ان کی اس شاعرانہ عظمت کو اردو شعروں، تذکرہ نگاروں، ادبی مؤرخوں اور قدیم و جدید نقادوں، سب تسلیم کیا ہے۔ گزشتہ سو سال میں ان کی اس عظمت کے مختلف پہلوؤں پر شاعرانہ شہار کتابوں اور مقالوں میں ہوتی رہی ہے، جو وقتاً فوقتاً کر شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت اور کام کی ہر اچھا خاصہ تحقیقی اور تنقیدی مواد جمع ہو گیا ہے۔ لیکن ان کی شخصیت اور شاعری دونوں میں کچھ ایسی پہلو دار کیفیت ہے کہ ہر آدمی میں اس کے مختلف پہلوؤں پر کچھ نئی باتیں کہنے اور نئے خیالات کو کرنے کی گنجائش ہمیشہ باقی رہے گی۔

یہ کتاب 'غالب اور مطالعہ' غالب' بھی اسی صورت حال کی پیداوار ہے۔ اس کی تیاری میں غالب کے متعلق تقریباً تمام تحقیقی اور تنقیدی مواد پیش نظر رکھا گیا ہے اور اس سے حسب ضرورت استفادہ کر کے غالب شخصیت اور شاعری کے بعض نئے گوشوں کو لامل کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کا لکھنے والا گزشتہ تیس سال سے غالب کی شخصیت اور کام کے تحقیقی اور تنقیدی مطالعے میں مصروف رہا ہے۔ اس مطالعے کے نتائج نکلے ہیں، وہ سب اس کتاب میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ چونکہ مطالعے کا سلسلہ ابھی جاری ہے، اس لیے ان نتائج کو حرف آخر نہیں کہا جاسکتا۔ آئندہ جو نتائج سامنے آئیں گے، ان کو یا تو اس کتاب کے آئندہ ایڈیشنوں میں پیش کر دیا جائے گا یا ایک نئی کتاب مرتب کر کے کر دی جائے گی۔

یہ کتاب اردو شاعروں کے تحقیقی اور تنقیدی مطالعے کے ایک باقاعدہ اوّلے منصوبے کے سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ اس سلسلے کی کوشش اور کاوش 'سومن اور مطالعہ' کے نام سے ۱۹۶۱ء میں ہو چکی ہے۔ اس منصوبے کے مطابق غالب کے اس مطالعے کو 'ن اور مطالعہ' سومن' کی اشاعت کے دو تین سال بعد شائع ہو جانا ہے تھا۔ لیکن ۱۹۶۲ء میں راقم انگلستان چلا گیا اور پانچ سال تک

لندن یونیورسٹی میں تدریس کے ساتھ مطالعے اور ادبی تحقیق میں مصروف رہا ۔
اس لیے اس کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی ۔

لیکن حسن اتفاق ہے اس تاخیر کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ اب یہ
کتاب غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر شائع ہو رہی ہے ۔ شاید اس کی
اشاعت میں یہ تاخیر اسی وجہ سے ہوئی تھی کہ اس عظیم شاعر کے جشن
صد سالہ کے موقع پر یہ بھی اس خراج عقیدت میں شریک ہو ، جو اس سال
اُس کو دیا گئے تقریباً تمام ملکوں میں پیش کیا جا رہا ہے ۔

شفیق مکرم مصوٰر مشرق عبدالرحمن چغتائی صاحب نے اس کتاب کا
نہایت ہی حسین و دلآویز سرورق بنایا ہے ، عزیز گرامی ڈاکٹر ناظر حسن زیدی
صاحب نے بڑی مہنت سے اس کا اشاریہ تیار کیا ہے اور سید ظفر الحسن رضوی
صاحب نے اس کو بڑے ذوق و شوق سے چھاپا ہے ۔

ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے راقم کے پاس الفاظ نہیں ہیں ۔

اورینٹل کالج لاہور

۲۵ جنوری ۱۹۶۹ع

عبادت

حیات غالب
پر
چند خیالات

غالب کی زندگی بڑی ہی پہلدار تھی۔ وہ شروع سے آخر تک ہمہ نظر آتی ہے۔ اس میں بے شمار نشیب و فراز دکھائی دیتے ہیں۔ وہ تو ایک حسین اور دل آویز پہاڑی سلسلے کی طرح حسین اور دل آویز، پرشکوہ اور شان دار ہے۔ جلال و جلال دونوں اس میں گلے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ رومان و حقیقت کا اس میں ایک نہایت ہی دل کشی اور دل موہ لینے والا امتزاج ملتا ہے۔ وہ سیدھی، سادا اور سہاٹ نہیں ہے۔ اس میں تو ایک متد و جزر کی سی کیفیت ہے۔ وہ حادثات سے بھرپور ہے۔ وہ جہد مسلسل کی ایک داستان ہے۔ وہ ایک بے چین روح کی کہانی ہے۔ اس میں تو ایک ڈرامائی شان ہے، اور یہ ڈرامائی شان غالب کی زندگی کے ہر واقعے اور برصغیر میں اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ اس میں چونکاتے کا بڑا سامان ہے۔ اور اس میں شہ نہیں کہ وہ قدم قدم پر انسان کو اس طرح چونکاتی ہے کہ وہ ایک عالم تحریر میں پہنچ کر اپنے آپ کو اس میں گم کر دیتا ہے اور اس پر ایک خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

مرزا غالب کا خاندانی سلسلہ آل سلجوق تک پہنچا ہے۔ یہ لوگ ترک تھے اور انہوں نے صدیوں تک وسط ایشیا میں حکمرانی کی تھی۔ غالب نے اسی نسبت سے، اپنے آپ کو ”ترک سلجوق“ کہا ہے۔ آل سلجوق تقریباً تین سو سال تک حکمران رہے لیکن بالآخر غورازیوں نے ان کی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور وہ ایسے منتشر ہوئے کہ پھر کبھی بھی اپنی طاقت کو سمیٹ کر یک جا نہ کر سکے۔ ان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ جب حکومت ہاتھ سے نکل گئی تو زمانے نے انہیں

ادھر ادھر بھٹکتے پر مجبور کیا ۔ چنانچہ ان میں سے بعضوں نے تو راہزنی کو اپنا شعار بنایا اور بعضوں نے سپہ گری اختیار ، کی غالب نے اپنے آپ کو اجداد کی اس سپہ گری پر فخر کیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ شاعری ان کے لیے ذریعہ عزت نہیں ہے :

سو پشت سے ہے پیشہ آیا سپہ گری

کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں بھٹے

آل سلجوق کے اس بکھرے ہوئے قافلے میں ایک بزرگ ترسم خاں تھے۔ جو سلجوقیوں کے انتشار کے بعد سمرقند میں آباد ہوئے۔ یہ ترسم خاں غالب کے بردادا تھے۔ انہوں نے سپہ گری کا پیشہ اختیار کیا اور ان کی اولاد سمرقند ہی میں بھلی بھولی۔ لیکن بالآخر ان کے بیٹوں میں غالب کے دادا مرزا قوقان بیگ خاں نے اپنے والد ترسم خاں سے ناراض ہو کر ترک وطن کیا اور ہندوستان آ کر اقامت اختیار کی۔ پہلے کچھ عرصے ان کا قیام لاہور میں رہا۔ یہاں وہ نواب معین الملک میرٹھ کی سرکار میں ملازم ہوئے۔ لیکن جب ان کے انتقال کے بعد پنجاب میں بھی انتشار کا دور دورہ ہوا تو دلی چلے گئے۔ یہ شاہ عالم کا زمانہ تھا۔ شاہ عالم کے بادشاہ ہونے کے بعد جب ذوالفقار الدولہ نجف خاں نے حکومت میں اپنا اثر قائم کر لیا تو غالب کے دادا کو ان کے توسط سے معقول ملازمت مل گئی اور وہ دلی میں آباد ہو گئے۔ بھانسیو کا پرگنہ انہیں جاگیر میں ملا اور اس طرح وہ اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے۔

مرزا قوقان بیگ خاں کے ایک بیٹے مرزا عبداللہ بیگ خاں تھے۔ عبداللہ بیگ خاں دہلی میں پیدا ہوئے اور اسی سر زمین پر انہوں نے ہوش منبھالا۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد انہوں نے بھی سپہ گری کا پیشہ اختیار کیا۔ پہلے لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کی سرکار میں ملازمت کی۔ پھر حیدرآباد میں نظام علی خاں کی سرکار میں کئی سال ملازم رہے۔ جب بقول غالب ان کی نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھڑے میں جاتی رہی تو انہوں نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راجا جتناور سنگھ کے نوکر ہوئے لیکن وہاں کسی لڑائی میں مارے گئے۔ الور جانے سے قبل وہ آگرے میں آ گئے تھے اور وہاں ان کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی صاحبزادی عزت النساء بیگم سے ہو گئی تھی۔ غالب انہیں عبداللہ بیگ خاں اور

عزت النساء بیگم کے غرزلفہ ارجمند تھے ۔

غالب کی ولادت ۸ رجب المرجب یعنی ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرے میں ہوئی ۔ غالب تین بھائی بن تھے ۔ بن جھوٹی خانم غالب سے بڑی تھیں اور بھائی مرزا یوسف ان سے چھوٹے تھے ، غالب کی عمر ابھی پانچ برس ہی کی تھی کہ ان کے والد عبداللہ بیگ خاں کا انتقال ہو گیا ۔ والد کے انتقال کے بعد ان کی پرورش عبداللہ بیگ خاں کے چھوٹے بھائی یعنی غالب کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں نے اپنے دس لے لی ۔ یہ سریشوں کے ملازم تھے اور آکبر آباد کی صوبہ داری کا منصب ان کے سپرد تھا ۔ لیکن وہ بھی زیادہ عرصے نہ چلے ۔ غالب مشکل سے آٹھ سال چند ماہ کے ہوں گے کہ ان کا بھی انتقال ہو گیا ۔

اب ان کے سر پر کوئی ایسا بزرگ نہ رہا جو ان کی پرورش کرنا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں بچپن سے عطفوان شباب تک کا زمانہ اپنی تنہالی میں گزارنا پڑا ۔ یہاں ان کے سر پر کسی ایسے بزرگ کا سایہ نہ تھا جو ان کی دیکھ بھال کرنا اور جس کی نگرانی میں ان کی پرورش ہوتی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بے راہ روی کے راستے پر چل نکلے اور بالکل لا آہالی ہو گئے ۔ اس زمانے میں وہ ہتھک اڑانے ، شطرنج کھیلنے اور دوستوں کے ساتھ مل کر طرح طرح کے ہنکاسے برپا کرتے ۔ والد اور چچا کے انتقال کے بعد دس ہزار روپے کی رقم ان کے خاندان کی کفالت کے لیے مقرر ہو چکی تھی ۔ اس میں سے ثواب احمد بخش خاں نے صرف تین ہزار روپے سالانہ کی رقم مقرر کی ۔ اس رقم میں سے غالب کا حصہ صرف ساڑھے سات سو روپیہ تھا اس زمانے کے حساب سے یہ رقم ایک بچے کے اخراجات کے لیے خاصی تھی ۔ اس کے علاوہ ان کی تنہالی کے لوگ ابھی کھانے پینے تھے ۔ اس لیے مالی اعتبار سے غالب کو اس وقت اطمینان تھا ۔ اس صورت حال نے ان کی بے راہ روی اور لا آہالی پن کو کچھ اور بھی ہوا دی ۔

غالب کی تعلیم کے بارے میں تفصیل نہیں ملتی ۔ لیکن جن حالات میں ان کا بچپن گزرا ہے اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کی تعلیم میں وہ باقاعدگی نہیں ہوگی جو عام حالات میں ایک ایسے بچے کو نصیب ہوتی ہے جس کے سر پر والدین کا سایہ ہوتا ہے ۔ پھر بھی یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ان کی تنہالی کے لوگوں نے ان کی ابتدائی تعلیم کا

ضرورت کوئی انتظام کیا ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ شاعری، ادب، نجوم اور ہیئت وغیرہ کے ایسے علوم سے دلچسپی نہ لے سکتے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ انہوں نے نظیر اکبر آبادی کے مکتب میں بھی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ لیکن وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ واقعی نظیر کے مکتب میں پڑھنے کے لیے گئے۔ کیونکہ اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ اس بات پر سب متفق ہیں کہ انہوں نے ابتدائی زمانے میں فارسی زبان کی تعلیم مولوی محمد معظم سے حاصل کی۔ اس کے بعد ملا عبدالصمد کے سامنے ڈانٹے ادب تہہ کیا۔ ملا عبدالصمد پارسی تھے اور ان کا نام ہرمزد تھا۔ لیکن وہ مسلمان ہو گئے تھے اور ان کا اسلامی نام عبدالصمد رکھا گیا تھا۔ وہ سیر و سیاحت کی غرض سے ہندوستان آئے اور چند سال آگرے میں قیام کیا۔ غالب کی عمر اس وقت چودہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فارسی زبان سے انہیں اس وقت تک اتنی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی کہ اس کے قواعد کو سمجھنے کے لیے انہوں نے ملا عبدالصمد کی موجودگی کو نعمت غیر مترقبہ تصور کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ملا عبدالصمد غالب کے یہاں ٹھہرے۔ اور غالب نے ان سے استفادہ کیا۔ عبدالصمد سے استفادے کا یہ نتیجہ ہوا کہ فارسی زبان کے اسرار و رموز ان کے سامنے بے نقاب ہو گئے اور قدیم ایرانی تہذیب کے مزاج ذاتی بھی ان کے مزاج میں داخل ہو گئی۔

غالب کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ گیارہ سال کی عمر میں شاعری شروع کی۔ شروع شروع اردو میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ اس زمانے میں ان پر ہیدل، اسپر اور شوکت وغیرہ کا اثر تھا۔ اور وہ انہیں کے انداز کے شعر کہتے تھے۔ اس زمانے میں لہو و لعب ان کا شعار تھا۔ زندگی کے اس انداز نے شاعری سے ان کی دلچسپی کو بڑھایا اور شعر گوئی کی آتش شوق کو بھڑکایا۔ چنانچہ وقت کے ساتھ ساتھ شاعری کے ذوق و شوق میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی۔

ابھی غالب تیرہ سال کے تھے کہ ۱۲۲۵ء میں الٹنی جٹی خان معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے ان کی شادی ہو گئی۔ اس نسبت سے وہ آگرے سے دلی منتقل ہو گئے اور انہوں نے اس شہر میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی۔ دلی اس زمانے میں بقول حالی عہد اکبری اور

عہد شاہجہانی کی یاد تازہ کرتی تھی۔ علم و ادب کے بڑے بڑے ماہر اس سر زمین پر جمع تھے۔ اس ماحول کا اثر غالب پر بہت گہرا ہوا۔ دلی میں ان کی ملاقات مولانا فضل حق خیر آبادی سے ہوئی جو اس زمانے کے بہت بڑے عالم تھے اور شعر و شاعری کا بھی اچھا ذوق رکھتے تھے۔ ان کے اثر سے علمی معاملات میں بھی انہوں نے دلچسپی لی۔ دلی کے قیام نے ان کی زندگی کے اس انداز کو بڑی حد تک بدلا جس میں بے راہ روی اور لا اہالی پن کے پہلو نمایاں تھے۔ اب ان کے مزاج میں بڑی حد تک ٹھہراؤ پیدا ہوا اور زندگی کے عام انداز میں اعتدال کی کیفیت رونما ہوئی۔ اس صورت حال نے نہ صرف زندگی کو بسر کرنے میں صحت مندی پیدا کی بلکہ اس کے بنیادی معاملات و مسائل کو سمجھنے کا شعور بھی ان کے اندر پیدا کیا۔ اچھی صحبتوں کے اثر سے انہوں نے علم و ادب دونوں کی طرف باقاعدگی سے توجہ کی اور شاعری میں تو وہ رنگ روپ نکالا کہ تمام رنگ اس کے سامنے ماند پڑ گئے۔

دلی کے قیام کے زمانے میں غالب کو مالی مشکلات کا سامنا یقیناً کرنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی اعتبار سے اس وقت دلی کی حالت اچھی نہیں تھی۔ شاہی خاندان تک کا حال دگرگوں تھا۔ غالب بھی ان حالات سے متاثر ہوئے۔ آگے میں جو فراغت انہیں نصیب تھی وہ اب خواب و خیال ہو گئی۔ وہ ہشن جو انہیں ملتی تھی اس کو حاصل کرنے میں طرح طرح کی الجھنیں پیش آنے لگیں۔ اور ۱۸۳۱ء میں تو یہ ہشن بالکل ہی بند ہو گئی۔ ان حالات میں گزر بسر کے لیے انہیں قرض کا سہارا لینا پڑا۔ قرض خواہوں کے تقاضے بھی انہیں پریشان کرنے لگے۔ اسی زمانے میں ان کے چھوٹے بھائی ہوسف مرزا دیوانے ہو گئے۔ غالب کے لیے یہ بڑی پریشانی اور ابتلا کا زمانہ تھا۔ انہوں نے خود اس کا اظہار اس طرح کیا ہے :

ہے اب اس معمورے میں قحط غم الفت اسد

ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

اسی پریشانی کے عالم میں غالب نے حالات کی ناساز گاری سے تنگ

آکر ہشن کی بجالی کے لیے کلکتے کا سفر کیا۔ چنانچہ ۱۸۳۶ء میں دلی سے نکلے۔ کان پور ہوئے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ تقریباً ڈیڑھ سال ان کا قیام

کلکتے میں رہا۔ حکام اچھی طرح پیش آئے۔ شہر کے سبزہ زار ہائے مطرا اور نازنین بیتان خود آرا نے بھی ان کا دل لہایا۔ لیکن پٹشن کا قضیہ خاطر خواہ ملے نہ ہو سکا۔ مجبوراً وہ ۱۸۲۹ء میں دلی واپس پہنچے۔ ۱۸۳۵ء میں نواب شمس الدین احمد خاں کو ولیم فریئر کے قتل کے الزام میں پھانسی ہو گئی۔ ان کے مرنے کے بعد فرورز پور جھڑکھ کی ریاست میں سرکار ضبط کر لی گئی۔ اس لیے غالب کو ساڑھے سات سو روپے سالانہ کی پٹشن دہلی کے کلکٹر کی طرف سے ملنے لگی۔ لیکن انہوں اس سے زیادہ کا حق دار نہیں سمجھا گیا۔ انہوں نے اس فیصلے کے خلاف اپیل بھی کی لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ پھر بھی وہ چین سے نہیں بیٹھے۔ سولہ سال تک مقدمات کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ اور بات ہے کہ انہیں کامیابی نہ ہو سکی۔

۱۸۴۲ء میں غالب کو دہلی کالج میں فارسی کی مدرسہ پیش کی گئی مسٹر ٹامسن، جو ان دنوں حکومت ہند کے سکریٹری تھے، انہوں نے یہ دیکھ کر کہ فارسی پڑھانے کا خاطر خواہ انتظام کالج میں نہیں ہے، یہ حکم دیا کہ عربی کی طرح فارسی کا ایک مدرسہ بھی کالج میں ہونا چاہیے۔ مفتی صدرالدین آزرہ نے اس کام کے لیے غالب، مومن اور صہبائی کے نام قبول کر کے۔ ٹامسن نے مرزا غالب کو دعوت دی۔ غالب ان کے پاس پہنچے۔ لیکن چونکہ وہ ملازمت کی غرض سے آئے تھے۔ اس لیے ان کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی۔ غالب کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ اس وقت ان کی مالی حالت اچھی نہیں تھی، انہوں نے ملازمت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد یہ جگہ مومن کو پیش کی گئی۔ انہوں نے بھی اس کو اپنی شان کے خلاف سمجھا۔ چنانچہ صہبائی فارسی کے استاد مقرر کیے گئے۔

غالب کی زندگی کا سب سے الم ناکہ واقعہ غالباً ان کی امیری ہے۔ ۱۸۴۷ء میں وہ قمار بازی کے الزام میں گرفتار کیے گئے اور عدالت نے انہیں چھ ماہ قید باسفت کی سزا دے دی۔ حالی نے لکھا ہے ”کوئوال شہر سے غالب کی دشمنی تھی۔ اس لیے جھوٹا مقدمہ ان کے خلاف بنایا۔“

ہوسکتا ہے یہ بات صحیح ہو۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ غالب کو جوسر اور سطور کھیلنے کا شوق تھا۔ اور وہ کچھ بازی بدکر یہ کھیل کھیلے تھے۔ اس زمانے میں بہت سے لوگ ان کے مکان پر اس غرض سے آتے تھے اور اس بہانے سے جوا کھیلنے لگے۔ مرزا خاں کونوال کے بعد جب فیض الحسن کونوال ہوئے تو انھوں نے سختی کی اور قمار بازی کے اٹوں کو ختم کرنا چاہا، زند غالب پر بھی پڑی۔ ان کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ چھ مہینے کی سزا ہوئی۔ تین مہینے قید رہے۔ لیکن بالآخر ڈاکٹر راس۔ ول۔ مرجن کی سفارش پر ان کو رہا کر دیا گیا۔ اس واقعے سے غالب کے وقار کو بھی ٹھیس لگی اور ان کی طبیعت ہر بھی اس کا بہت برا اثر ہوا۔

اس واقعے کے بعد زیست اور بھی مشکل ہوگئی اور پچھن سال سے غالب جن مالی پریشانیوں کے شکار تھے، ان میں کچھ اور بھی اضافہ ہوگیا۔ ان حالات میں مجبور ہو کر انھوں نے قلعے سے تعلق پیدا کیا اور یہاں کالجی خاں صاحب اور حکم الحسن اللہ خاں کی سفارش پر ان کی رسانی بہادر شاہ تک ہوئی اور انھوں نے تیموری خاندان کی تاریخ لکھنے کا کام ان کے سپرد کیا۔ اس طرح وہ قلعے میں باقاعدہ ملازم ہو گئے اور حکیم الحسن اللہ خاں کی مدد سے انھوں نے 'سمر نیم روز' لکھنے کا کام شروع کر دیا۔ پچاس روپے تنخواہ مقرر ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب قلعے میں ذوق کا طوطی بولتا تھا اور وہ بادشاہ کے استاد تھے۔ ۸۵۴ ع تک وہ اس منصب پر مامور رہے۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد یہ منصب غالب کے سپرد ہوا اور وہ ۸۵۷ ع تک اس خدمت پر مامور رہے۔ اسی سال غدر ہوا۔ مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ انگریزوں کا اقتدار قائم ہوا۔ بہادر شاہ ونگوں بھیج دیے گئے۔ اور غالب کو داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی شمع کی طرح اجڑی ہوئی دلی میں رہنا پڑا۔

غدر اور اس کے بعد کا زمانہ غالب کے لیے بڑی پریشانی کا زمانہ تھا۔ غالب نے اپنی ذاتی پریشانیوں کے علاوہ اس زمانے میں ایک حکومت، ایک تہذیب، ایک معاشرت اور ایک نظام فکر کو اجڑے ہوئے دیکھا۔ 'دستنبو' کے علاوہ اپنے خطوط میں بھی انھوں نے ان حالات کا ماتم کیا ہے۔

اس ہنگامے نے زندگی کے سارے نظام کو درہم برہم کر دیا تھا۔ چنانچہ غالب کی آمدنی کے تمام ذرائع بند ہو گئے۔ امراؤ یکم کا کچھ وظیفہ

ضیاء الدین احمد خاں نے اپنی کوشش سے مقرر کروا دیا تھا۔ اسی سے گذر بسر ہوتی تھی۔ کچھ رام پور سے مل جاتا تھا۔ غنم کے بعد رام پور کا دربار غالب کا سب سے بڑا سہارا ثابت ہوا۔ ثواب یوسف علی خاں نے انہیں بار بار رام پور آنے کی دعوت دی۔ بالآخر وہ جنوری ۱۸۶۰ء میں رام پور گئے اور وہاں مارچ تک قیام بھی کیا۔ اسی سال ان کی پٹنہ، جو غدر کی وجہ سے بند ہو گئی تھی، بحال ہوئی اور ۱۸۶۳ء میں دربار و غلام بھی جاری ہو گیا۔

لیکن اب ان کی صحت جواب دے چکی تھی۔ عرصے سے بیمار تھے۔ بریشانیوں اور غموں نے اور بھی صحت کو خراب کر دیا۔ عمر بھی خاصی ہو چکی تھی۔ چنانچہ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو انتقال کیا۔

حیات غالب کے ان واقعات کی تفصیل، ان کے بارے میں لکھی ہوئی ہر کتاب میں مل جاتی ہے۔ حالی کی 'یادگار غالب' پہلی کتاب ہے جس میں نہ صرف ان کی زندگی کے واقعات کو سلونے سے ہٹ جا کیا گیا ہے بلکہ ان کی شخصیت کی بھی زندگی سے بڑی ہی بھر پور تصویر کھینچی گئی ہے۔ حالی کی 'یادگار غالب' کے بعد اگرچہ کچھ اور کتابیں بھی غالب کی حیات اور شخصیت پر لکھی گئی ہیں لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ 'یادگار غالب' ان سب میں منفرد نظر آتی ہے۔ بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ حالی کے بعد جن لکھنے والوں نے غالب کی شخصیت اور شاعری پر قلم اٹھایا ہے، انہوں نے ضرور حالی کی خوشہ چینی کی ہے اور اس چراغ سے اپنا چراغ جلایا ہے۔ یا پھر خود غالب کی تحریروں کو اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ جہاں تک حالی کی 'یادگار غالب' کے منفرد ہونے کا معاملہ ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ حالی نے غالب کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ وہ ان کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ وہ ان کے ہم مشرب نہ سہی لیکن ان کے پرستار ضرور تھے۔ وہ غالب کے ہم نوا نہ سہی لیکن ان کی باتوں سے انہیں دل چسپی ضرور تھی۔ غالب کے ساتھ ان کا زاویہٴ نظر ہمدردانہ تھا۔ اسی لیے حالی نے اس کتاب میں جو مواد جمع کیا ہے، اس تک دوسروں کی رسائی ناممکن تھی۔ اور جو تفصیلات انہوں نے غالب کی حیات، شخصیت اور شاعری کے بارے میں پیش کی ہیں، ان کو پیش کرنے کا کسی دوسرے

شخص کو خیال بھی نہیں آ سکتا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود حالی کی اس کتاب کو غالب کی شخصیت پر حرف آخر کی حیثیت نہیں دی جاسکتی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ غالب اور حالی کے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ایک رند شاہد باز و بادہ خوار کی باتیں ایک زاہد خشک کی سمجھ میں کس طرح آ سکتی ہیں؟ اور اگر سمجھ میں آ بھی جائیں تو وہ ان کو بیان کس طرح کر سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ حالی نے غالب کی جو تصویر پیش کی ہے وہ مکمل نہیں ہے، ادھوری اور نامکمل ہے۔ غالب کے اندر جو مولانا موجزن تھا حالی کو اس کی خبر نہیں تھی۔ بس یہی کمر 'یادگار غالب' میں کاٹنے کی طرح کٹکٹی ہے۔

حالی کے بعد غالب کی حیات پر تین اہم کتابیں شائع ہوئیں۔ ایک تو مولانا غلام رسول سہر کی 'غالب'، دوسری شیخ ہد اکرام کی 'غالب' جو اب 'آثار غالب' کے نام سے بھی شائع ہوئی ہے اور تیسری مالک رام کی 'ذکر غالب'۔ یہ تینوں کتابیں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ سہر صاحب نے بڑی محنت اور سلیقے سے غالب کے خطوط اور دوسری تحریروں کو سامنے رکھ کر ان کی زندگی کے واقعات کو مرتب کیا ہے۔ اکرام صاحب نے بڑی تحقیق اور تلاش و جستجو کے بعد ان کی زندگی کے واقعات کو بیان کیا ہے۔ لیکن ان میں سے کسی ایک کو بھی غالب کی باقاعدہ سوانح عمری نہیں کہا جاسکتا۔ 'یادگار غالب' بے شک کسی حد تک ان کی سوانح عمری معلوم ہوئی ہے لیکن سوانح عمری کی حیثیت سے اس میں بنیادی خامی ہیں ہے کہ حالی بے تکلفی کے ساتھ کبھی کبھار غالب کی حیات اور شخصیت کے بارے میں جو کچھ کہنا چاہتے تھے، نہیں کہہ سکے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ حالی کے مزاج کی ثقافت اس کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ دوسرے ان کے تعلقات غالب سے برابری کے نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بہت سی ایسی باتوں کو نظر انداز کر گئے ہیں جن کے بغیر غالب کی شخصیت کی تصویر مکمل نہیں ہو سکتی۔ پھر جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس میں اپنے آپ کو پابند کر لیا ہے اور حد درجہ عموماً رہنے کی کوشش کی ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ غالب کی حیات اور شخصیت کے بہت سے پہلو اس کتاب میں بھی دب کر رہ جاتے ہیں۔ غالب کی زندگی کے واقعات کو مختلف لکھنے والوں نے بیان کر دیا ہے۔

لیکن ابھی ان میں سے بیشتر واقعات پر مزید تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے ۔ تاکہ ان کی تفصیل سامنے آئے ۔ اب تک غالب پر جو کام ہوا ہے ، اس کا ساغذ یا تو غالب کے خطوط ہیں یا ان کے بعض معاصرین کے بیانات ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ غالب کے بارے میں ، جہاں جہاں ابھی جو ریکارڈ موجود ہے ، اس کو ایک منصوبے کے تحت کھنگالا جائے اور اس میں سے ضروری مواد نکال کر غالب کی زندگی کے حالات کو ایک مربوط صورت میں مرتب کیا جائے تاکہ ان کی صحیح تصویر سامنے آ سکے ۔ اس وقت تک غالب کی زندگی اور شخصیت پر جو کام ہوا ہے اس میں بیشتر باتیں ایک دوسرے سے لے کر دہرائی گئی ہیں ۔ جستہ جستہ کچھ لوگوں نے بعض نئی باتوں کا سراغ ضرور لکھا ہے لیکن یہ نئی باتیں کسی مربوط صورت میں یک جا نہیں ملتی ۔ یہ مواد تو مضامین و مقالات کی صورت میں جگہ جگہ بکھرا ہوا ہے اور موجودہ ناسازگار حالات میں بہت سے افراد کی دسترس سے باہر ہے ۔ اس نئے مواد کو ایک تو یک جا کرنے کی ضرورت ہے ، دوسرے یہ ابھی ضروری ہے کہ اس کو سامنے رکھ کر حیات غالب کے مختلف واقعات کو ایک لڑی میں پرویا جائے اور ان کی بنیاد پر ان کی زندگی کے بارے میں ایک ایسی مربوط کتاب مرتب کی جائے جس میں حیات غالب کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ہو ۔

حیات غالب کے جن معاملات و مسائل پر تحقیقی کی ضرورت ہے ان میں سب سے پہلے تو ان کے حسب نسب اور خاندان کا مسئلہ ہے ۔ اب تک اس موضوع پر جن لوگوں نے لکھا ہے ، انہوں نے اس سلسلے میں غالب کی کہی ہوئی باتوں کو تسلیم کر لیا ہے ۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ غالب ایک طرح کے احساس برتری میں مبتلا تھے ۔ یہ احساس برتری اس انحطاط و زوال کی پیداوار تھا ، جس میں سے ہو کر غالب کی زندگی کا قافلہ گزرا تھا ۔ وہ عیسیٰ اعتبار سے ایک زوال آبادہ معاشرے کی پیداوار تھے ۔ ایک ایسے معاشرے میں افراد کا اس احساس برتری کا شکار ہونا ضروری ہے ۔ خاص طور پر ایسے افراد کا جن کی نسلی وجاہت اور خاندانی شرافت ناسازگار معاشی حالات کے باعث آندھیوں کی زد پر ہو ۔ اسی صورت حال نے غالب کو فرگیت کا شکار کر دیا ۔ اس لیے انہوں نے جو کچھ اپنی نسل اور خاندان کے بارے میں کہا ہے

اس کو تسلیم کر لینا علمی اور تحقیقی اعتبار سے کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ وسط ایشیا میں ترکوں کی تاریخ اور ان کے مختلف خاندانوں کے بائبل کو سامنے رکھا جائے اور اس نسل کے جو لوگ ہندوستان آنے کی تفصیل کا سراغ لکھا جائے تو اس سلسلے میں بعض بڑی ہی دلچسپ اور قابل قدر معلومات کا سرمایہ فراہم ہو سکتا ہے اور غالب کی نسل اور خاندان کے بارے میں بعض اہم پہلو سامنے آ سکتے ہیں۔

غالب کے دادا قوتان بیگ خاں ہندوستان آئے لیکن اس معاملے میں اختلاف ہے کہ وہ شاہ عالم کے عہد میں اس سرزمین پر پہنچے یا پھر شاہ کے زمانے میں۔ پھر ان کی زندگی کے حالات کی تفصیل بھی کہیں نہیں ملتی۔ صرف اتنی معلومات فراہم ہوتی ہے کہ وہ پہلے پنجاب میں ٹھہرے۔ یہاں معقول ملازمت ملی۔ پھر دلی چلے گئے۔ لیکن دلی میں ان کے دن کیسے گزرے؟ انھوں نے شادی کہاں کی؟ ان کی ازدواجی زندگی کیسی تھی؟ ان باتوں کے متعلق پوری طرح علم نہیں ہوتا۔ ان کی ملازمتوں کے بارے میں تو تھوڑا بہت علم ہو چکا ہے لیکن ان کی خاندانی اور نجی زندگی کے بارے میں ابھی بہت کچھ پردہ خفا میں ہے۔ غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں کے حالات بھی صرف چند سطروں میں ملتے ہیں۔ ان کے بارے میں بھی تفصیلات کا علم نہیں ہوتا۔ یہی حال غالب کے نانا غلام حسین خاں کمیدان اور دوسرے عزیزوں کا ہے۔ ان کے متعلق ابھی بہاری معلومات بہت محدود ہے۔ غالب کی زندگی میں ان بزرگوں کی جو اہمیت ہے وہ اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کی جائے۔ کیونکہ غالب کی زندگی اور شخصیت پر ان سب کے اثرات بہت گہرے ہیں۔

غالب نے بچپن کا جو زمانہ اکبر آباد میں گزارا ہے وہ ان کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے لیکن اس زمانے کے بارے میں جو معلومات اب تک لکھنے والوں نے فراہم کی ہے وہ ناکافی ہے۔ اس زمانے میں وہ پشک اڑاتے، چوسر اور شطرنج کھیلتے اور نوجوان دوستوں کے ساتھ اچھا وقت گزارتے تھے۔ یہ لوگ کون تھے؟ غالب پر اس زمانے میں کن لوگوں کے اثرات گہرے ہوئے؟ ان کی تعلیم کہاں کہاں اور کس طرح ہوئی؟ وہ واقعی نظیر اکبر آبادی کے مکتب میں تعلیم حاصل کرنے

کے لیے گئے؟ مولوی معلم، جن کے سامنے انہوں نے زانوئے ادب نہ کیا، وہ کون بزرگ تھے؟ اور ان کی علمی استعداد کیا تھی؟ ہرمزد یا عبدالصمد کون تھا؟ کہاں گیا؟ اور اس کی زندگی کس طرح گزری؟ یہ سب باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں ہم ابھی زیادہ نہیں جانتے۔ جو حالات ہم تک پہنچے ہیں ظاہر ہے، کہ ہمیں ان کے مقابلے میں زیادہ تفصیل کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ جس زمانے میں غالب نے اکبر آباد کی سر زمین پر ہوش منبھالا اور ان کا ذہنی نشو و نما ہوا اس وقت وہاں کا علمی اور ادبی ماحول کیسا تھا۔ نظیر اکبر آبادی تو وہاں موجود تھے لیکن ان کے علاوہ اور کون کون سے شاعر تھے جن سے غالب نے اثر قبول کیا؟ وہ کس کے شاگرد ہوئے؟ اور اگر شاگرد نہیں ہوئے تو کیوں نہیں ہوئے؟ ان تمام پہلوؤں پر بھی ایسا تحقیقی کام ہونا چاہیے۔ پھر شاعری کے علاوہ اکبر آباد میں اس آسان اور سادہ نثر نگاری کی بھی ایک روایت موجود تھی۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۸۰۲ء میں اکبر آباد کے ایک لکھنے والے حکیم النہی بھٹی شرق اکبر آبادی نے ایک داستان "افسانہ" عشق کے نام سے لکھی اور اس میں لیل و من کے قصے کو آسان، سادہ اور پامحاورہ اردو میں بیان کیا۔ اس داستان کا قلمی نسخہ برٹلی میوزیم لندن کے کتب خانے میں موجود ہے۔

غالب کی زندگی کے حالات سے اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ مالی پریشانیوں میں گزرا ہے اور وہ ہمیشہ غم دوروں کا شکار رہے ہیں۔ ان حالات کے سائے میں انہوں نے کس طرح زندگی گزاری ہے اور اس کے کیا اثرات ان پر ہوئے ہیں؟ قرض انہوں نے کس کس طرح کن لوگوں سے لیا ہے؟ اور اس قرض کی ادائیگی کس طرح کی ہے؟ یہ بھی تحقیقی کا ایک اہم موضوع ہے۔ ابھی تک اس موضوع پر بھی کوئی خاص کام نہیں ہوا۔

اس کے علاوہ یٹن کا معاملہ بہ ذات خود بھی تحقیق کا ایک اہم مسئلہ ہے اور اس سلسلے میں انہوں نے کلکتہ کا جو سفر کیا ہے، اس کے بارے میں ابھی ابھی تک مکمل معلومات فراہم نہیں ہو سکی ہے۔ یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دلی سے کان پور ہوئے ہوئے لکھنؤ گئے تھے، وہاں

ان کی آویہکت ہوئی تھی لیکن آغا میر سے ان کی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لکھنؤ میں ناسخ اور آتش کا طوفانی یولٹا تھا۔ ناممکن ہے کہ غالب سے لکھنؤ میں ان کی ملاقات نہ ہوئی ہو۔ لیکن غالب کے متعلق ہر لکھنے والے نے اس موضوع پر کوئی ایسی بات نہیں کہی جس کی بنیاد تحقیق پر استوار ہو۔ پھر بنارس میں غالب کا وقت کس طرح گزرا ؟ کاتھہ میں انہوں نے کس طرح دن گزارے ؟ - ان کی مخالفت کبوں ہوئی ؟ اور نتائج کیا نکلے ؟ - یہ تمام باتیں بھی مزید تحقیق کا تقاضا کرتی ہیں ۔

یہ صحیح ہے کہ غالب کی دل کی زندگی کے بارے میں لکھنے والوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن اس زمانے کی سیاسی اور مذہبی ہنگامہ آرائیوں میں ان کا کیا حصہ تھا ؟ - مولانا سید احمد ریلوی کی امریکہ کی مخالفت اور مولانا فضل حق غیر آبادی کی حمایت میں انہوں نے کیا کیا کچھ کیا ؟ ذوق، مومن، شیفہ اور بہادر شاہ سے ان کے جو روابط تھے اس کے بارے میں بھی ابھی بہت کچھ کہنے کی گنجائش ہے ۔

پھر ان کے قید ہونے کا واقعہ ، ان کا مقدمہ ، قلعے میں ان کی باریابی غدر کے بعد ان کا زندگی اور اس کے معاملات و مسائل یہ تمام پہلو غالب کی زندگی میں خاصی طور پر اہمیت رکھتے ہیں ۔ لیکن ان کے بارے میں بھی اب تک جو معلومات فراہم کی گئی ہے ، اس کو دیکھ کر بھی خاصی تشنگی کا احساس ہوتا ہے ۔

غرض غالب کی زندگی کے بے شمار پہلو ابھی ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک تحقیق کا ایک اہم موضوع بن سکتا ہے ۔ جب تک ان موضوعات پر تحقیق کے بعد تفصیلی معلومات فراہم نہیں ہوئی ، غالب کی زندگی کا مطالعہ نامکمل رہے گا اور ان کی صحیح تصویر ہمارے سامنے نہیں آ سکتی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب پر اب تک جو کام ہوا ہے وہ اتنی جگہ اہم ہے اور غالب اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ ان پر اس وقت تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن اس میں تحقیقی وزن بہت کم ہے اور اس کا بیشتر حصہ غیر مربوط ، ششہ اور نامکمل ہے ۔

شاید یہی وجہ ہے کہ غالب پر ابھی تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی جس کو ان کی مکمل اور مستند سوانح حیات کہا جائے۔ بات یہ ہے کہ مکمل اور مستند سوانح حیات حالات و واقعات کی تحقیق کے

بغیر نہیں لکھی جا سکتی ۔ لیکن ظاہر ہے کہ صرف حالات اور واقعات کا جمع کر دینا ہی سوانح حیات نہیں ہے ۔ اس کے علاوہ ابھی بہت کچھ ہے ۔ غالب کا مطالعہ آج ایک ایسی ہی سوانح حیات کے لیے چشم برہ ہے جس میں ان کی زندگی کے حالات و واقعات کی تحقیق اور تفصیل کے علاوہ ابھی بہت کچھ ہو !

غالب کے
حالات زندگی
اور شخصیت

غالب ایک ترک تھے اور انہوں نے اپنے ایک ترک ہونے پر فخر کیا ہے۔ کلیات فارسی میں ان کے کئی قطعات ایسے ملتے ہیں، جن میں انہوں نے اپنے ترک ہونے کی وضاحت کی ہے اور اپنی نسل اور خاندان کے بیان میں جو نظریہ لہجہ اختیار کیا ہے اس سے ان کے مزاج اور اعتاد طبع پر روشنی پڑتی ہے۔

کہتے ہیں :

غالب از خاک پاک تورانم	لاجرم در نسب نرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہی	بسترگان قوم ہیوندیم
ایہکم از جامعہ الراق	در کماشی زماہ دہ چندیم
فن آباے ما کشاورزی ست	سرزبان زادہ سمرقندیم
ور زمنی سخن گزار دہ	خود چہ گولیم تا چہ و چندیم
ایض حق را کہبتہ خاک گردیم	عقل کل را جہنہ فرزدیم
ہم بہ تابشی برقی ہم نفسم	ہم بہ بخششی باہر مانندیم
ہم نلاشے کہ ہست نیروزم	ہم معاشے کہ نیست حرصندیم
ہم ہر خویشین ہی کریم	ہم ہر روزگار می خشندیم

ساق جو من ہشتگی و افراسیابم
دانی کہ اصل گوہرم از دودہ جم ست
میراث جم کہ می بود اینک بہ من مہار
زہں ہی وسد بہشت کہ میراث آدم ست

اس کے علاوہ غالب نے اپنے خود نوشت حالات جو ریٹیکن کے ”الذکر“ مظہر العجائب کے لیے لکھے تھے ، اس میں بھی اپنی نسل اور خاندان کی تفصیل اس طرح پیش کی ہے :

”اسد اللہ خان عرف مرزا نوشہ ، غالب تخلص ، قوم کا ترک سلجوق سلطان برکیارق سلجوق کے اولاد میں ہے ۔ اس کا دادا قوقان بیگ خان شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے دلی میں آیا۔ چاس گھوڑے اور نقارہ و نشان سے بادشاہ کا نوکر ہوا ۔ بھانسو کا برگہ چو اب سمرو کی یکم کو سرکار سے ملا آھا وہ اس کی جاداد میں مقرر تھا ۔ باپ اسد اللہ خان مذکور کا دلی کی رہاست چھوڑ کر اکبر آباد میں جا رہا ۔ اسد اللہ خان اکبر آباد میں پیدا ہوا ۔ عید اللہ بیگ خان الوری میں راڑ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا اور وہاں ایک لڑائی میں بڑی بہادری سے مارا گیا ۔ جس حال میں کہ اسد اللہ خان مذکور کو پانچ چھ برس کا تھا اس کا حقیقی چچا نصر اللہ بیگ خان مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد صوبہ دار تھا ۔ ۸۰۳ھ میں جب جرنیل لیک صاحب اکبر آباد میں آئے تو نصر اللہ بیگ خان نے شہر سپرد کر دیا اور اطاعت کی ۔ جرنیل صاحب نے چار سو سوار کا بریگیڈیئر کیا ، اور ایک ہزار سات سو کی تنخواہ مقرر کی ۔ پھر جب اس نے اپنے زور بازو سے سونک سونسا دو ہر گئے بہت دور کے قریب ہولکر کے سواروں سے چھین لیے تو جرنیل صاحب نے وہ دونوں ہر گئے بہادر موصوف کو بہ طریق استمرار عطا فرمائے ۔ مگر خان موصوف جاگیر مقرر ہونے کے دس مہینے کے بعد بہ مرگ ناکاہ پاتھی پر سے گر کے مر گیا ۔ جاگیر سرکاری بھی بازیاہت ہوئی اور اس کے عوض تقدی مقرر ہو گئی ۔ اور شرکا کو دے دلا کر ساڑھے سات سو روپیہ سال اس شخص کی ذات کو اسی زوسعی سے ملتے ہیں“۔

خواجہ قمر الدین راقم نے غالب کے نسب اور خاندان کی جو تفصیل

یہاں کی ہے ۔ وہ بھی ہر اعتبار سے نہایت دلچسپ ہے ۔ لکھتے ہیں :

”واضح ہو کہ ہماری اور غالب کی اصل نژاد سلاطین توران میں ہے۔ جس زمانے میں تورانی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا، بیخ بنیاد بھی نہ رہی تو ہمارے خاندان کے لوگ اس طوائف الملوک میں جا بجا منتشر ہو گئے اور جس نے جہاں امن پائی جا بسا۔ چنانچہ کوئی سو پچاس ہشت کے بعد اس خاندان میں دو برادران حقیقی جن کا نام راتم کو یاد نہیں ان کی اولاد میں دو فرزند تولد ہوئے۔ بڑے بیٹا کا بیٹا ترسم خاں اور چھوٹے بیٹا کا بیٹا رستم خاں۔ ہنوز یہ دونوں بیٹا عمر شباب کو نہ پہنچے تھے کہ ان کے والدین فوت ہو گئے۔ یہ دونوں کسی حالت میں اضلاع سمرقند میں آکر آباد ہوئے۔ پھر ایک مدت کے بعد بدخشاں میں آکر رہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ سر زمین ترکستان میں نور اسلام مثل ابرو خورشید منور ہو رہا ہے۔ یہ دونوں بیٹا بھی شرف اسلام سے فیض پاتے ہوئے اور ترسم خاں نے بدخشاں کے کسی شریف خاندان میں اپنا نکاح بیاہ کر لیا۔ ترسم خاں کی اولاد میں تین دختر اور دو فرزند پیدا ہوئے۔ یعنی ایک فرزند کا نام نصر اللہ بیگ خاں دوسرے کا عبداللہ بیگ خاں تھا۔ پھر ایک عرصے کے بعد ترسم خاں نے وفات پائی۔ ان کی اولاد مدت تک بدخشاں میں رہی۔ مگر رستم خاں بیٹا کے رنج میں بدخشاں میں نہ رہے۔ بخارا میں آ گئے۔ یہاں آکر تھوڑے عرصے کے بعد رستم خاں بھی ایک دولت مند گھر خواجگان جشت میں، جو خواجہ عیباللہ احراری کی نسل میں تھے، بیاہے گئے۔ ان کے ہاں قطب الدین خاں فرزند پیدا ہوئے۔ ہنوز قطب الدین خاں سن بلوغ کو نہ پہنچے تھے کہ ان کے والدین گزر گئے۔ اب قطب الدین خاں لفظ خواجگی سے ممتاز ہوئے۔ یہاں سلسلہ ذات ہمارا اور غالب کا جدا ہو گیا۔ رستم خاں کے بعد خواجہ قطب الدین کا اسی خاندان میں عقد ہوا۔ ان کے ہاں ایک فرزند خواجہ حاجی خاں تولد ہوئے۔ ان کی عمر قریب بلوغ کے پہنچی تھی کہ والدین کا انتقال ہو گیا۔ یہ خبر سن کر نصر اللہ بیگ خاں اور عبداللہ بیگ خاں مع اپنی بہنوں کے بھتیجے کے ہاں بخارا میں آئے۔ کچھ

دن پہنچے کے شریک حال رہے۔ پھر پہنچے سے راز دل بیان کیا اور مشورہ لیا کہ ہمارا قصد ہے کہ ہم ہندوستان چلیں اور سرکار شاہی میں ملازمت کریں۔ تم کیا صلاح دیتے ہو؟

خواجہ حاجی خاں جو کہ نوجوان شاہی پیشہ تھے، ہندوستان کے شوق میں چچا کی رائے کے شریک ہو گئے کہ اچھا میں آپ کے ہمراہ چلوں گا۔ غرض یہ کہ چچا پہنچے مع متعلقین، کسی قدر جمعیت ذاتی ہمراہ لے کر، بخارا سے روانہ ہوئے۔

اول سمرقند میں آئے۔ وہاں ایک امیر زادے شریف قوم مرزا جیون بیگ خاں چنتا سے ملاقات ہوئی۔ اثنائے گفتگو میں سفر کا ذکر آ گیا۔ مرزا جیون بیگ خاں بھی چلتے کو تیار ہو گئے اور مع اپنی زوجہ امیر النساء کے ہمراہ ہو گئے۔ غرض یہ ولایتی قافلہ زن و مرد ہندوستان میں آیا اور شہر شاہجہان آباد میں مقیم ہوا۔ یہ زمانہ شاہ عالم بادشاہ کا تھا اور ملک کی حالت ابتر تھی۔ ”ہنگالہ کا ملک انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ اور اودھ کا ملک صوبہ دار اودھ نے دیا لیا تھا۔ ادھر قوم مریشہ ہر طرف ملک کو تاراج کر رہی تھی۔ نواب نجف خاں ذوالفقار الدولہ وزیر سلطنت تھے۔ مگر بد نظمی رفع نہ ہوئی تھی۔ یہ تازہ وارد قافلہ وزیر اعظم سے ملا۔ وزیر ان سے مل کر بہت خوش ہوا۔ اور ان سب کو نوکر رکھ لیا۔ اور ان کی بسر اوقات کے لیے ایک ہر گنہ بھانسو، جو علی گڑھ کے ضلع میں ہے، جاگیر میں دیا۔ اور کسی قدر شاہی فوج بھی مقرر کر دی کہ مریشوں کی روک تھام بھی کرتے رہو۔ کئی برس یہ قافلہ شاہی ملازم رہا۔ ہتھوڑ کوئی کار نمایاں ان سے ظہور میں نہ آیا تھا کہ نواب نجف خاں کا وزیر اعظم سے کسی بات پر بکاڑ ہو گیا۔ یہ سب سفل زادے نوکری چھوڑ کر اکبر آباد چلے آئے، وہاں رہنے لگے۔ اتفاق سے بھاؤ راؤ سندھیا نے ان کا حال سن کر اپنے پاس بلا لیا اور نوکر رکھ لیا۔ نصر اللہ بیگ خاں کو پورے کمبوجا افسر مقرر کیا اور خواجہ حاجی خاں کو ایک رسالہ کا رسالدار کیا اور ایک پوری پلٹن کی کمانڈانی مرزا جیون بیگ خاں

غالب کے یہ دعاوی پر لحاظ سے درست ہوں یا نہ ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ اولیٰ درجے کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ان کے آبا و اجداد کا محبوب ترین مشغلہ تیغ زنی و سپہ گری تھا۔“

غالب نے اپنی نسل ، خاندان اور آبا و اجداد پر جو فخر کیا ہے ۔ اس کا سبب یہی ہے کہ ان کا تعلق ایک اولیٰ درجے کے خاندان سے تھا ، اور ان کے آبا و اجداد اہم شخصیتوں کے مالک تھے ۔ ان کے بردادا قوقان بیگ خان جب اس سر زمین پر آئے تو انہیں اس وقت حکمرانوں نے معقول ملازمت دی اور بلند منصب عطا کیا ۔ پھر ان کے والد عبداللہ بیگ خان بھی ہمیشہ اچھے عہدوں پر فائز رہے اور انہیں بھی مختلف حکمرانوں کی طرف سے اعلیٰ منصب ملا اور جاگیریں بھی دی گئیں ۔ اگرچہ حوادث زمانہ نے ان چراغوں کو جلد ہی بجھا دیا لیکن ان کی یاد ہمیشہ غالب کے دل میں روشنی اور گرمی پیدا کرتی رہی ۔ پھر ان کے دادا ، والد اور چچا کی شادیاں جن خاندانوں میں ہوئیں ، وہ بھی اولیٰ درجے کے تھے ۔ اس لیے غالب کے یہاں خاندانی عظمت اور ریاست و امارت کا احساس کچھ اور بھی شدید ہوا ۔ لیکن اس احساس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ غالب نے جس زمانے میں آنکھ کھولی ، وہ سیاسی ، معاشرتی اور تہذیبی اعتبار سے ایک انحطاط و زوال کا زمانہ تھا ۔ اس انحطاط و زوال کی وجہ سے خاندانی عظمتوں کے چراغ آندھیوں کی زد پر تھے اور ریاست اور امارت کی شمعیں بھی جھلملا رہی تھیں ۔

اس صورت حال نے افراد میں نسلی برتری اور خاندانی عظمت کے احساس کو بڑھایا اور ریاست و امارت کے خیال میں اضافہ کیا ۔ چنانچہ انہوں نے ان تمام باتوں پر فخر کرنے کو اپنا شعار بنا لیا ۔ انحطاط و زوال کے زمانے میں افراد کی انفرادی اور اجتماعی نفسیات یہی صورت اختیار کرتی ہے ۔

غالب کے یہاں نسلی برتری اور خاندانی عظمت کا احساس بھی اسی صورت حال کا مظہر ہے !

غالب ۸ رجب ۱۲۱۲ھ یعنی ۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو اکبر آباد (اگرہ) میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام، مرزا عبداللہ بیگ خان تھا، اور اُن کی والدہ کا نام عزت النساء بیگم تھا۔ غالب نے انھیں کے سائے میں پرورش پائی لیکن ابھی وہ پانچ سال ہی کے تھے کہ اُن کے والد کا انتقال ہو گیا۔ وہ ایک لڑائی میں مارے گئے۔ والد کی وفات کے بعد غالب کی پرورش اُن کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خان نے کی۔ وہ اس زمانے میں مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد میں صوبہ دار تھے۔ پھر اُن کے خسر نواب احمد بخش خان کی سفارش پر لارڈ لیک نے انگریزی فوج میں رسالدار کی عہدے پر اُن کا تقرر کرا دیا۔ لیکن وہ بھی ۱۸۰۶ء میں ایک لڑائی میں مارے گئے۔ غالب کی عمر اس وقت صرف نو سال تھی۔ اس طرح غالب نے اس جھوٹی سی عمر میں دو گہرے صدمے اٹھائے۔ ایک نو پانچ سال کی عمر میں اپنے والد عبداللہ بیگ خان کی وفات پر یثیمی کا صدمہ اور پھر اپنے چچا نصر اللہ بیگ خان کی وفات پر نو سال کی عمر میں ایک دوسرا صدمہ جو یثیمی کے صدمے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ کیونکہ چچا کی حیثیت بھی اس وقت اُن کے لیے باپ ہی کی تھی۔ غالب کی شخصیت پر ان واقعات کا زندگی بھر گہرا اثر رہا ہے۔ چنانچہ اپنی تحریروں میں جگہ جگہ ان واقعات کو حسرت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ باپ اور چچا کے انتقال کے بعد انھیں والی الوری کی طرف سے پنشن ملتی تھی۔ چنانچہ راجہ شیو دھیان سنگھ والی الوری کی مدد میں ایک قصیدہ لکھا ہے۔ اس میں یثیمی کے واقعے کا ذکر اس طرح کیا ہے :

ژان پس کہ گشت گویر من در جہان ہم
ژان پس کہ کشتہ شد پسر من بہ کارزار
در پنج سالگی شدہ ام چاکر حضور
رنگیں سخن طرازم و دہریں وظیفہ خواہ
دارم بہ گوشی حلقہ زہنجاہ و پشت سال
اکتوں کہ عمر شصت و صد سال است در شمار
باید شنید راز زاعیان ہارکہ
باید شفت قصہ زبیران آن دیار
کافی بود مشاہدہ، شاید ضرور نیست
در خاک راج گڑھ پدم را بود سزار

چند غلطوں میں بھی ان واقعات کا ذکر نہایت حسرت آمیز لہجے میں ملتا ہے۔ لکھتے ہیں :

”ہاپ میرا عبداللہ بیگ خان لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کا لوکر رہا۔ بعد چند روز حیدر آباد جا کر نواب نظام علی خان کا لوکر ہوا۔ تین سو سواروں کی جمعیت سے ملازم تھا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کی لڑائی میں مارا گیا۔

نصر اللہ بیگ خان میرا حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبے دار تھا۔ اس نے مجھے بالاً۔ ۱۸۰۶ء میں جرنیل لیک کا لعل ہوا صوبہ داری کمشنری ہو گئی اور صاحب کمشنر لیک انگریز مقرر ہوا۔ میرے چچا کو جرنیل لیک نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سوار کا برگڈیر مقرر ہوا۔ ایک ہزار روپیہ ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر حین حیات۔ علاوہ مرزائی کے تھی کہ بہ مرگ ناکہ مر گیا۔ رسالہ برطرف ہو گیا۔ ملک کے عوض نقدی ہو گئی وہ اب تک پاتا ہوں۔“

(خط بہ نام منشی حبیب اللہ ذکا)

”میں باج برس کا تھا کہ باپ مرا۔ نو برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اس کی جاگیر کے عوض میرے اور میرے شرکاہ حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خان مرحوم دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے۔ انھوں نے نہ دے مگر تین ہزار روپے سال۔ (خط بہ نام چودھری عبدالغفور خان سرور)

”پنج سال از عمر من گزشت کہ پدر از سرم سایہ بر گرفت۔ عم من نصر اللہ بیگ خان چون خواست کہ مرا بہ ناز پرورد، کہ مرگش فراز آمد۔ کہا بیش پنج سال بعد گزشتن برادر منجی ہے بردار برداشت و مرا دوں خرابہ تنہا گذاشت و این حادثہ کہ مرا نشان جان گدازی و گردوں و اکینہ بازی بود در سال ہزار و ہشت و شش عیسوی ۱۸۰۶ بہ ہنگام صد و شش لشکر آمدنی و کشور کشانی

صمصام الدولہ جرنیل لاؤڈ لیک صاحب بہادر بروئے کار آمد۔ چون عم مرحوم از دولتیان دولت اہل فرنگ بود و با انہوے چہار صد سوار بہ وکاب صمصام الدولہ (لاؤڈ لیک) و با سرکشان سرگرم جنگ و ہم از بخشش ہائے سرکار انگریزی دو ہرگہ سیر حاصل از مضافات اکبر آباد در جاگیر دانست۔ سرکار انکشیہ بہ خون ہائے آفتاب کلیہ تار گدایان را چراغ و مائے نوریان را بہ عوض جاگیر بہ مشاہرہ از غار غار جستجوئے وجد معاشی فراغ بخشید و ما امروز کہ شاربہ نفس شہاری زندگانی چہل و چار رسد بران را بہ غرضندیم و بران سایہ قانع۔“

(خط بہ نام مولوی سراج الدین احمد خان)
 ”نصر اللہ بیگ خان مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبے دار ہوا۔ ۱۸۰۳ء میں جب جرنیل لیک صاحب اکبر آباد پر آئے تو نصر اللہ بیگ خان نے شہر سپرد کر دیا اور اطاعت کی۔ جرنیل صاحب نے چار سو سوار کا ہریکڈیر کیا اور ایک ہزار سات سو تنخواہ مقرر کی۔ پھر جب اُس نے اپنے زور بازو سے سونک سونسا ہر گئے بہادر موصوف کو بہ طریق استمرار عطا فرمائے۔ مگر خان موصوف جاگیر مقرر ہونے کے دس مہینے بعد بہ مرگ ناگہ ہاتھی پر سے گر کر مر گیا۔ جاگیر سرکار میں بازیافت ہوئی اور اُس کے عوض نقدی مقرر ہو گئی۔“

غرض غالب نے اپنی ابتدائی زندگی کے خدمات کو جگہ جگہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ جیسا کہ ان بیانات سے ظاہر ہے یہ تفصیلات پوری طرح صحیح نہیں ہیں۔ ان میں تحقیق کی بہت گنجائش ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غالب نے ان واقعات کے گہرے اثرات قبول کیے ہیں۔ زندگی بھر وہ ان خدمات کو فراموش نہ کر سکے اور یہ خدمات مختلف صورتیں اختیار کر کے اُن کی شخصیت میں اپنے آپ کو نمایاں کرتے رہے۔ اُن کے بہت سے تجربات، جذبات و احساسات اور افکار و خیالات کے پچھے ابتدائی زندگی کے انہیں خدمات کا ہاتھ نظر آتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ والد اور چچا کے انتقال کے بعد غالب کو مالی اعتبار سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ کیونکہ نواب احمد بخش خاں نے لارڈ لیک سے سفارش کی اور انہوں نے غالب اور اُن کے بھائی بہنوں کے لیے پنشن کا انتظام کر دیا۔ مالک رام صاحب نے اس کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے :

”نواب احمد بخش خاں کو مرزا نصر اللہ بیگ خاں کی چواں مرگی کا سخت اندوس ہوا۔ انہیں ان چھوٹے چھوٹے بیوں پر خاص طور پر رحم آیا جو چچا کی وفات کے بعد بالکل بے کس ہو کر رہ گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے لارڈ لیک سے سفارش کی اور وہاں سے پنشن کا انتظام ہو گیا۔ نواب احمد بخش خاں کو اپنی گوناگوں خدمات کے لیے سرکار انگریزی کی طرف سے میوات میں فیروز پور جھڑکہ اور مضافات ہوائل (تحصیل فیروز پور جھڑکہ) میں نگینہ اور یونا پانا وغیرہ کی جاگیر بہ طور استعمرار عطا ہوئی تھی۔ اور چونکہ وہ ریاست الور کے وکیل تھے۔ اس لیے مہاراجہ بختاور سنگھ والی الور نے اپنی طرف سے انہیں لوہارو کا ہرگہ دے دیا تھا جو اس سے چلے الور میں کا ایک حصہ تھا۔ فیروز پور جھڑکہ کی استمراری جاگیر سے متعلق یہ طے پایا تھا کہ اس کے لیے نواب احمد بخش خاں سرکار انگریزی کو پچیس ہزار روپیہ سالانہ ادا کرتے رہیں گے۔

میرزا نصر اللہ بیگ خاں کی وفات پر ان کی حین حیات جاگیر سونکھ اور سولہ سرکار انگریزی نے واپس لے لی اور چار سو سواروں کا رسالہ بھی توڑ دیا۔ البتہ ان میں سے چاس سواروں کا ایک دستہ نواب احمد بخش خاں بہادر اور نواب نجات علی خاں بہادر والی چھڑکہ کو دے دیا گیا کہ وہ اسے برقرار رکھیں۔ سرکار کو جب ضرورت ہوگی وہ ان سے مدد طلب کرے گی۔ اب اس دستے کے اخراجات اور مرزا نصر اللہ بیگ خاں کے ہس ماندگان کی پنشن کے لیے ۸۰۶ روپے کو حکم جاری کیا گیا کہ نواب احمد بخش خاں اپنی جاگیر کے لیے جو پچیس ہزار روپے سالانہ دیتے تھے، وہ اس شرط پر معاف کیے جاتے ہیں کہ آئندہ پندرہ ہزار وہ اسی دستے کی غور و برداشت پر خرچ کریں اور باقی دس ہزار مرزا مرحوم کے خاندان کو

یہ طور پیش دیں۔۔۔۔۔ نہ معلوم کیسے مگر اس فیصلے کے ایک ہی مہینے بعد ۷ جون ۸۰۶ء کو نواب احمد بخش خاں نے ایک شدہ حاملہ کر لیا جس میں درج تھا کہ مرزا نصر اللہ بیگ خاں مرحوم کے متعلقین کو باج ہزار روپیہ سالانہ حسب ذیل تفصیل سے ادا کیا جائے :

۱۔ خواجہ حاجی۔۔۔۔۔ ہزار روپیہ سالانہ ۔
 ۲۔ مرزا نصر اللہ بیگ خاں کی والدہ اور تین بہنیں ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ ۔

۳۔ مرزا نوشہ اور مرزا یوسف برادر زادگان مرزا نصر اللہ بیگ خاں مرحوم ڈیڑھ ہزار سالانہ ۔

گویا چلے تو دس ہزار سالانہ کے ہوتے باج ہزار اور پھر اس تقسیم کی رو سے ان باج ہزار میں سے بھی صرف ساڑھے سات سو مرزا غالب کو ملے اور ساڑھے سات سو ان کے بھائی مرزا یوسف کو ملے ۔
 غرض اس طرح غالب اور ان کے خالداں کے لئے گزر بسر کا اچھا خاصا سامان ہو گیا ۔ اور وہ جہن میں اطمینان بلکہ آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنے لگے ۔

غالب نے اس زمانے میں اپنے نانا خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کے زیر سایہ آکرے میں زندگی بسر کی ، غالب کے نانا اس وقت کے مشہور رئیسوں میں تھے اور آگرے میں آرام و اطمینان سے زندگی بسر کرتے تھے۔ غالب کو بچپن اور عشوان شباب کے زمانے میں جب اساتذہ اور رہاست کا یہ ماحول ملا اور ان کے دن آرام و اطمینان سے گزرنے لگے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے لہو و لعب کو اپنا شعار بنا لیا ۔ باب اور چچا کا تو انتقال ہو ہی چکا تھا ۔ کوئی سر پر ہاتھ رکھنے والا نہ تھا ۔ اسی لئے ان کے مزاج میں ایک طرح کی بے راہ روی پیدا ہو گئی اور وہ نوجوان دوستوں کی صحبتوں میں رنگ و لیاں منانے لگے ۔ غالب نے منشی شیو نرائن کو ایک خط لکھا ہے جس میں اس زمانے کی تفصیل بیان کی ہے۔
 لکھتے ہیں :

”برخوردار نور چشم منشی شیو نرائن کو معلوم ہو کہ میں کیا

جانتا تھا کہ تم کون ہو۔ جب یہ جانا کہ تم ناظر ہنسی دھر کے
 ہوئے ہو تو معلوم ہوا کہ میرے فرزند دلہند ہو۔ اب تم کو
 مشق و مکرّم لکھوں تو گنہگار۔ تم کو ہمارے خاندان اور
 اپنے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم ہے۔ مجھ سے منو !
 تمہارے دادا کے والد عہد نجف خان ہمدانی میں میرے نانا صاحب
 مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق کار تھے۔ جب میرے
 نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو تمہارے پردادا
 نے بھی کمر کھولی اور بھر کہیں نوکری نہ کی۔ یہ باتیں
 میرے ہوش کے پہلے کی ہیں۔ مگر جب میں جوان ہوا
 تو میں نے یہ دیکھا کہ منشی ہنسی دھر، خاں صاحب کے
 ساتھ ہیں۔ اور انہوں نے کیتھم کلان اپنی جاگیر کا سرکار میں
 دعویٰ کیا تو منشی ہنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں۔ وکالت
 اور مختاری کرتے ہیں۔ میں اور وہ ہم عمر تھے۔ شاید منشی
 ہنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ انیس
 برس کی میری عمر اور اسی ہی عمر ان کی۔ باہم شطرنج اور
 اختلاط اور صحبت۔ آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی۔ چونکہ گھر
 ان کا بہت دور نہ تھا۔ اس واسطے جب چاہتے تھے چلے
 جاتے تھے۔ بس ان کے اور ہمارے مکان میں مجھیا رنڈی کا گھر
 اور ہمارے دو کٹرے درمیان تھے۔ ہماری حویلی وہ ہے جو اب
 ساتھ لکھی چند نے مول لی ہے۔ اس کے دروازے کے سنگین
 بارہ دری پر میری نشست تھی۔ اور پاس اس کے ایک کٹھیا
 والی حویلی اور سلیم شاہ کے لکھے کے پاس دوسری حویلی اور
 کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس کے آگے بڑھ کر
 ایک اور کٹرہ کہ وہ گلدریوں والا مشہور تھا اور ایک کٹرہ
 کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا۔ اس کٹرے سے ایک کوٹھے
 پر میں پتنگ اڑاتا تھا۔ اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا
 کرتے تھے۔ واصل خاں نامی ایک سپاہی تمہارے دادا کا
 پیش دست رہتا تھا۔ وہ کٹروں کا کراہہ آگاہ کر ان کے پاس
 جمع کراتا تھا۔ منو تو سہی ! تمہارا دادا بہت کچھ پیدا کر گیا ہے۔

علاقے سول لیے تھے اور زمیندارہ اپنا کر لیا تھا ۔ دس بارہ ہزار روپے کی سرکاری مال گزاری ادا کرنا تھا ۔ وہ سب کارخانے ہمارے ہاتھ آئے یا نہیں ؟ اس کا حال از روئے تفصیل جلد بچہ کو لکھو ۔“

اس خط سے اُن کے بچپن اور عنوان شباب کی زندگی کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے نانا غلام حسین خان کھیدان اپنے زمانے کے ایک اہم اور وضع دار رئیس تھے اور اس زمانے کے امرا و رؤسا سے اُن کے گہرے تعلقات تھے ۔ آگرے میں اُن کی خاصی جائداد بھی تھی ۔ آمدنی بھی اچھی خاصی تھی ۔ غالب کا ابتدائی زمانہ اُن کے ساتھ آرام اور اطمینان سے گذرا ۔ اس زمانے میں وہ احباب کی صحبتوں میں اچھا وقت گزارتے ۔ ان کے ساتھ مل کر رات رات بھر شطرنج اور چوسر کھیلتے ۔ بارہ دری میں احباب کے ساتھ اُن کی نشست رہتی ۔ کونہوں پر چڑھتے ، ہتک اڑاتے اور پہنچ لڑاتے ۔ ان مشاغل کے ساتھ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں ان کے ایسے مشاغل بھی رہتے ہوں گے جن کا ذکر کرنا ضروری نہیں ہوتا ۔

غالب نے کچھ نو ماحول کے اثر سے بچپن اور عنوان شباب کے زمانے میں زندگی کے اس انداز کو اختیار کیا ۔ کچھ اُس غم کو غلط کرنے کے لیے جو باپ اور چچا کی بے وقت موت سے انہیں اُٹھانا پڑا تھا ۔ غالب شطرنج کھیل کر اور ہتک اڑا کر در حقیقت اُس غم کو بھلانا چاہتے تھے جو اُس زمانے میں ان پر مسلط تھا ۔ اس لیے اُن کی بے راہ روی ، زندگی اور اس کے حقائق سے کسی حد تک ایک لڑائی کی حیثیت بھی رکھتی ہے ۔

اس صورت حال نے غالب کی شخصیت میں رومانیت کا رنگ بھرا اور یہ رومانیت زندگی بھر سائے کی طرح ان کے دم کے ساتھ رہی ۔ اس رومانیت نے غالب کی شخصیت میں عجب عجب گلی کھلائے !

اکرام صاحب نے صحیح لکھا ہے کہ :

”مرزا کا عنوان شباب رنگ وادیوں سے بھرا ہوا تھا ۔ اور ان کی

یاد بھی ایک لحاظ سے نشاط انگیز تھی۔ لیکن مرزا کو ان کا
 غمازہ بڑا سخت اٹھانا پڑا۔ اور جب وہ ٹھنڈے دل سے ان
 ایام کی بے حاصلگی اور اوقات عزیز کی نلکی پر غور کرتے تو دل
 میں رنج و کرب اور مایوسی کی لہر دوڑ جاتی۔ ہم مسہر نیم روز
 سے وہ القباس درج کر چکے ہیں جس میں انہوں نے اپنی
 بے راہ روی پر اور ان قیمتی لمحوں کی یاد میں جو بے نتیجہ
 بلکہ مفرد دلچسپیوں میں تلف ہوئے، آنسو بہائے ہیں۔ ان
 احساسات کا اظہار اشعار میں بھی کئی جگہ ہے۔ ایک فارسی مثنوی
 جو مرزا کی باطنی کشمکش کا آئینہ ہے اور جو کسی ایسے
 زمانے میں لکھی گئی جب وہ کوشش اور ہمت سے اپنے
 آپ کو انحطاط اور مایوسی کے گڑھے میں سے نکال رہے تھے اور
 اپنی پراگندہ قوتوں کو جمع کر کے اپنے آپ کو ایک بلند تر سطح نظر
 کے قابل بنا رہے تھے۔ وہ اسی زمانے کی نسبت لکھتے ہیں :

گر می خونت کہ ازین پیش بود
 صرف بر انداختن خویش بود

آتش ہنگامہ بہ جان داشتی
 داغ مغان شیوہ بتان داشتی

بود بہ بیج و خم سودائے کار
 کار تو چون زلف بتان قار و مار

بس کہ ہمیں تیرہ تر از شام بود
 روز تو داغ دل ایام بود

چشم پریشان نظرے داشتی
 جلوہ بہ پر وہ گذرے داشتی

بس کہ ہلا ہر اثر انداختی
 دیدہ بصد جا سپر انداختی

زان ہمہ اجزاء زمانی کہ رفت
 وان ہمہ خون ناہ فشانی کہ رفت

پر چہ کنوں می رسد در نظر
 شاہد و شراب و شکر

چرخ بسا روز بہ گشت این چنیں
آہ ز عمرے کہ گذشت این چنیں

۳

غالب نے اپنی زندگی کا ابتدائی زمانہ جس ماحول میں بسر کیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ اُن کی تعلیم و تربیت معقول طریقے پر، باقاعدگی کے ساتھ نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کی تعلیم کی طرف اس زمانے میں کسی نے توجہ کی ہی نہیں۔ کیونکہ تنہا ہی یقیناً اُن کی تعلیم کا خیال رکھا گیا ہو گا اور انہوں نے اس زمانے کے روایتی انداز میں تعلیم حاصل کرنی شروع کی ہو گی۔ یہ اور بات ہے کہ صحیح ماحول نہ ملنے کی وجہ سے تعلیم میں ان کا دل نہ لگا ہو۔ اور وہ لہو و لعب کی زندگی کی وجہ سے اُس کی طرف پوری طرح توجہ نہ کر سکتے ہوں۔

حالی نے اُن کی تعلیم کے بارے میں صرف اتنی معلومات فراہم کی ہے کہ :

”شادی کے بعد تک اُن کی مستقل سکونت آگرے ہی میں رہی اور شیخ معظم جو اُس زمانے میں آگرے کے ناس معلوموں میں سے تھے، اُن سے تعلیم پاتے رہے۔ اُس کے بعد ایک شخص ہارسی نژاد جس کا نام آتش پرستی کے زمانے میں پرہزد تھا اور بعد میں مسلمان ہونے کے بعد الصمد رکھا گیا غالباً آگرے میں سیاحانہ وارد ہوا جو کہ دو برس تک مرزا کے پاس اول آگرے میں اور پھر دلی میں مقیم رہا۔ مرزا نے اُس سے فارسی زبان میں کسی قدر بصیرت پیدا کی۔ اگرچہ کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے، اور عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے۔ چونکہ مجھ کو لوگ بے استادا کہتے تھے، اُن کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک

ارضی استاد گھڑ لیا ہے ۔ مگر اس میں شک نہیں کہ عبد الصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا ، اور مرزا نے اُس سے کم و بیش فارسی زبان سیکھی تھی۔ چنانچہ مرزا نے چاہیا اُس کے تلمذ پر اپنی تحریروں میں فخر کیا ہے اور اُس کو یہ لفظ تیسار جو پارسیوں کے ہاں نہایت تعظیم کا لفظ ہے ، یاد کیا ہے ۔ لیکن جیسا کہ مرزا نے اپنی بعض تحریروں میں تصریح کی ہے ، مرزا کی چودہ برس کی عمر تھی جب عبدالصمد اُن کے مکان پر وارد ہوا ہے اور کل دو برس اُس نے وہاں قیام کیا ۔ پس جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا کو کس عمر میں اُس کی صحبت میسر آئی اور کس قدر قلیل مدت اُس کی صحبت میں گزری تو عبدالصمد اور اُس کی تعلیم کا عدم وجود برابر ہو جاتا ہے ۔ اس لیے مرزا کا یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ مجھ کو میداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے۔“^۱

مولوی محمد معظم کے بارے میں کوئی خاص معلومات کسی لکھنے والے نے فراہم نہیں کی ۔ حالی نے چوکچہ لکھا ہے ، اُس کو مختلف لکھنے والوں نے دہرایا ہے ۔ مالک رام نے لکھا ہے :

”اس زمانے میں مولوی محمد معظم کی ذات اگرچہ میں مرجع خاص و عام تھی۔ مرزا غالب نے بھی ابتدائی فارسی تعلیم انہیں سے حاصل کی ۔ مولانا حالی نے ایک دلچسپ واقعہ اُس زمانے کا لکھا ہے کہ مرزا غالب نے ایک فارسی غزل میں ”چہ“ کے معنوں میں ”کہ چہ“ ردیف لکھی اور اپنے استاد کو دکھائی ۔ مولوی معظم نے ردیف کو سہل کہہ دیا ۔ مگر جب تھوڑے دن بعد مرزا نے ظہوری کے کلام سے اُس کی سند پیش کی تو اپنے ہونہار شاگرد کی خدا داد ذہانت اور چلت کے قائل ہو گئے۔“^۲

اگرچہ وثوق سے کوئی بات نہیں کہی جا سکتی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگرے میں اُس وقت کسی مکتب میں مولوی محمد معظم بچوں کو تعلیم دیتے ہوں گے ۔ غالب کو بھی اُن کی تنہال والوں نے اسی مکتب میں

۱۔ حالی : یادگار غالب : صفحہ ۱۳ - ۱۴

۲۔ مالک رام : ذکر غالب : صفحہ ۲۵

اجتہادی تعلیم کے لیے بھیج دیا ہوگا اور انہوں نے ابتدائی تعلیم ان سے حاصل کی ہوگی۔

ہرمزد یا عبدالصمد کے بارے میں یقیناً بعض لکھنے والوں نے اچھی خاصی معلومات فراہم کی ہے۔ مالک رام نے خود غالب کی تحریروں 'لطائف غیبی'، 'درفش کاویانی' اور 'تغییر' وغیرہ کو سامنے رکھ کر عبدالصمد کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ خاصی اہمیت رکھتا ہے وہ لکھتے ہیں:

”اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مرزا غالب کو فارسی زبان سے قدرتی لگاؤ تھا مگر اس ذوق کو چمکایا عبدالصمد ایرانی نے۔ جیسا کہ مرزا نے خود لکھا ہے۔ ملا عبدالصمد سامان پنجم کی نسل سے ایک امیر ذادۃ جلیل القدر تھے۔ وہ یزد کے رہنے والے اور نسلاً زردشتی تھے۔ اور اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر اسلام پر ایمان لے آئے تھے۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے ان کا نام ہرمزد تھا۔ وہ ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ء) میں سیر و سیاحت کرتے ہوئے ہندوستان آئے اور اکبر آباد وارد ہوئے۔“ مرزا غالب کی عمر اس وقت چودہ برس کی تھی۔ مرزا نے انہیں اپنے ہاں ٹھہرایا اور دو برس تک ان سے تعلیم حاصل کی۔ ملا عبدالصمد کی مادری زبان فارسی تھی۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے وہ زردشتی مذہب کے موید تھے اور زردشتیوں کا تمام مذہبی سرمایہ قدیم فارسی میں ہے۔ اس لیے ان کا فارسی زبان کا فاضل ہونا چنداں تعجب کا مقام نہیں۔ اس کے علاوہ وہ عربی کے بھی عالم تھے۔ اور انہوں نے سال ہا سال تک عباسی عرب و بغداد سے علوم عربیہ حاصل کیے تھے۔ پس گو یہ سچ ہے کہ مرزا کی فارسی دلی کا سنگ بنیاد مولوی محمد معظم کے ہاتھوں رکھا گیا تھا لیکن اس عبارت کی تکمیل ملا عبد الصمد کے جابک دست اور سہار ہاتھوں سے ایسے شاندار طریقے پر ہوئی کہ وہ آسمان سے ہاتھیں کرتے لگی۔ ملا عبدالصمد نے ہندوستان سے واپس چلے جانے کے بعد بھی مرزا غالب سے خط و کتابت جاری رکھی۔“

لیکن قاضی عبدالودود صاحب نے 'ہرمزد نامہ عبدالصمد' کے عنوان

ہے جو مقالہ لکھا ہے اس میں طویل بحث کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے :

”عبدالصمد غالب کا زائیدہ طبع ہے ۔ بہت سی باتوں میں اپنے آفریدگار سے مشابہ ہے ۔ غالب الفاسیابی ہیں تو عبدالصمد دارابی ، غالب دہلی کے رئیس زادے ہیں تو وہ ہزد کا امیر زادہ ۔ تصوف سے دونوں کو لگاؤ ہے اور توحید و جود کی کے دونوں قائل ہیں ۔ معلم کسی کا پیشہ نہیں ۔ لیکن جوہر قابل ملے تو اس کی تربیت کے لیے دونوں آمادہ ہیں ۔ منطقی و فلسفہ اور علوم عربیہ میں عبدالصمد کا تبحر اُسے غالب سے نمیزکرتا ہے ۔ یہ وہ علوم ہیں جن سے اپنی فاوانیت کا احساس غالب کو یہ شدت تھا ۔ یہ کمی عبدالصمد میں پوری ہوئی ۔ ایک بات میں غالب کو بھی عبدالصمد پر فوقیت ہے ۔ عبدالصمد راز داں تو ہے مگر راز گوئی کا شوق نہیں رکھتا ۔ غالب میں دونوں باتیں جمع ہیں ۔ اس لیے غالب نے ماسان ششم کا لقب اپنے لیے مخلوط رکھا“

مالک رام صاحب کا خیال زیادہ قرین، لباس ہے ۔ لیکن بہر حال اس موضوع پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے ۔

یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ غالب نے نظیر اکبر آبادی کے مکتب میں بھی تعلیم حاصل کی تھی ۔ لیکن اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا ۔ غالباً یہ غلط فہمی اس وجہ سے پیدا ہو گئی کہ قطب الدین باطن نے جو تذکرہ نواب مصطفیٰ خاں شیخہ کے جواب میں لکھا تھا ، اس میں غالب کو نظیر کا شاگرد لکھ دیا ۔ لیکن باطن نے جس انداز میں اس شاگردی کا ذکر کیا ہے ، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے اور انہوں نے صرف شیخہ پر وار کرنے کی غرض سے یہ سب کچھ لکھا اور یہ بات بعض حلقوں میں پھیل گئی ۔ مالک رام نے لکھا ہے :

”باطن کے آخری الفاظ ”اب خواہ شاگردی سے انکار کریں یا شاید اقرار کریں“ خاص طور پر قابل غور ہیں ۔ یہ باطن کے دل کا چور ہے جو چھپ نہ سکا ۔ صاف ظاہر ہے کہ انہیں خود

اپنے کہے کا یقین نہیں۔ اگر نظیر کی شاگردی مسلم تھی تو غالب انکار کیوں کرنے لگے تھے۔^{۲۹}

غالب کو بچپن میں جو استاد ملے انہوں نے اُن کے دل میں فارسی زبان سے دلچسپی کی شمع فروزاں کر دی اور انہوں نے اس کی روشنی میں زندگی بھر اس زبان کا مطالعہ کیا اور اس میں پوری طرح مہارت حاصل کی۔ اُن کی فارسی تحریریں اس بات کو صحیح ثابت کرتی ہیں بقول مولانا غلام رسول مہر :

”غالب کی مختلف تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں فارسی زبان کے قواعد اور تاریخ پر کامل عبور حاصل تھا۔ اساتذہ کے دواوین نظم و نثر نظر سے گذر چکے تھے۔ حافظہ غیر معمولی تھا۔ جو کتاب ایک مرتبہ دیکھ لیتے اُس کے تمام ضروری حصے یاد ہو جاتے۔ سرعت فہم کا یہ عالم تھا کہ مشکل سے مشکل مسائل کو صرف سروسری طور پر دیکھ کر حل کر لیتے۔“^{۳۰}

غالب نے اپنی تعلیم اور خاص طور پر فارسی زبان کی تعلیم اور اس سے دل چسپی کی وضاحت اپنے بعض خطوط میں کی ہے۔ لکھتے ہیں :

”میں نے ایٹام دبستان لشونی میں ”شرح مائت عامل“ تک پڑھا۔ بعد اس کے لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور و عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا۔ فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری و طبعی تھا۔ ناگہ ایک شخص ساسان پنجم کی نسل میں سے معبدًا منطقی و فلسفہ میں مولوی فضل حق مرحوم کا نظیر اور مومن موحد صوفی صافی تھا، میرے شہر (آگرہ) میں وارد ہوا۔ اور لطائف فارسی بحث (خالص فارسی بے آمیزش عربی در غوائض فارسی آمیختہ بہ عربی) اس سے میرے حالی ہوئے۔ سونا کسوٹی پر چڑھ گیا۔ ذہن معوج نہ تھا۔ زبان داری سے بے پیوند آؤلی اور استاد مبالغہ جاساسپ عہد بزرچمہر عصر تھا۔

۱۔ مالک رام : ذکر غالب : صفحہ ۲۹

۲۔ مولانا غلام رسول مہر : غالب : صفحہ ۲۹

حقیقت اس زبان کی دل نشین و خاطر نشان ہو گئی۔“

”بدھ پرور! سہربانی نامہ آیا۔ سر پر رکھا۔ آنکھوں سے لکایا۔

فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول مناسبت طبعیت کی ہے۔

پھر تتبع کلام اہل زبان لیکن نہ اشعار قتیل و واقف و شعرائے

ہندوستان کہ یہ اشعار سوائے اس کے کہ ان کو سوزونی طبع کا

نتیجہ کہے اور کسی تعریف کے شایان نہیں ہیں۔ نہ ترکیب

فارسی نہ معنی نازک ہاں الفاظ فرسودہ عامیانہ جو اطفال دیستان

جانتے ہیں۔ جب رودکی، عنصری و خاقانی و رشید و طواط اور

ان کے امثال و نظائر کا کلام بالاستعیاب دیکھا جائے اور ان کی

ترکیبوں سے آشنائی ہم پہنچے اور ذہن اعوجاج کی طرف نہ لے جائے

تب آدمی جانتا ہے کہ ہاں فارسی یہ ہے۔“

ان تحریروں سے صاف ظاہر ہے کہ ان کا لکھنے والا نہ صرف یہ کہ

فارسی زبان سے گہری دل چسپی رکھتا ہے بلکہ اس بات کی وضاحت بھی

ہوتی ہے کہ اُس کو اس زبان اور اُس کے ادب کے معاملات و مسائل پر

پوری قدرت حاصل ہے۔

اگرچہ اس بات کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا کہ غالب نے مختلف

علوم کسی طرح حاصل کیے لیکن ان کی تحریروں سے اس بات کی وضاحت

ہو جاتی ہے کہ انہیں نجوم اور طب وغیرہ سے دل چسپی تھی اور وہ ان

علوم کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو پیش کرنے پر قدرت رکھتے تھے۔

چودھری عبدالغفور کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

”چودھری صاحب شفیق مکرّم کی خدمت میں بعد ارسال سلام مسنون

عرض کرتا ہوں کہ آپ نے ذرہ پروری اور درویش نوازی کی ورنہ

میں سزاوار ستائش نہیں ہوں۔ ایک سپاہی زادۂ بیچ سدان اور بہر

دل الفسردہ و روح کاروان فرسودہ۔ ہاں ایک طبع سوزوں فارسی زبان

سے لگاؤ رکھتا ہوں۔ کیا آپ مجھ کو بے پتری اور بیچ میرزی

میں صاحب کمال نہیں جانتے۔ اور اس عبارت فارسی کو میرا مصداق

۱۔ انتخاب خطوط غالب : صفحہ ۳۹۔

۲۔ ایضاً : صفحہ ۳۸۔

حال نہیں مانتے۔ 'بیش ملا طیب و بیش طیب ملا'۔ بیش بیچ پر دو بیش پر دو بیچ۔۔۔۔۔ آرائش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف کچھ نجوم لگا رکھا ہے۔ اور سوائے سوزونی طبع کے بیان میں کیا رکھا ہے۔ بہر حال علم نجوم کے قاعدے کے موافق جب زمانے کے مزاج میں فساد کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں تب سطح پر یہ شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔ جس طرح برج میں یہ نظر آئے اس کا درجہ و دقیقہ دیکھتے ہیں۔ پھر ذوق کا کار اور طریقہ دیکھتے ہیں۔ ہزار طرح کی جال ڈالتے ہیں۔ تب ایک حکم نکالتے ہیں۔ شاہجہان آباد میں بعد غروب آفتاب اول میزان میں تھا تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ صورت عقرب میں ہے۔ درجہ و دقیقہ کی حقیقت نہ معلوم رہی۔ بہت دن شہر میں اس ستارے کی دھوم رہی۔ اب دس بارہ دن سے نظر نہیں آتا۔ وہاں شاید اب نظر آتا ہے جو آپ نے اس کا حال دیکھا ہے۔ اس میں جانتا ہوں کہ یہ صورتیں فہر آئینی کی ہیں۔ اور دلیلیں ملک کی تباہی کی۔۔۔

ایک خط میں نواب کلب علی خاں کو طب کے بعض معاملات کی

طرف اس طرح توجہ دلاتے ہیں :

"میں طیب نہیں مگر تجربہ کار ہوں۔ خدا جانے اور طیب کیا سمجھتے ہوں گے کہ کیا تھا۔ میرے نزدیک یہ اشتراک معدہ و قلب یہ مرض طاری ہوا تھا۔ اب آپ کو حفظ صحت کے واسطے گاہ گاہ نارجیل فریانی اور جنددار کا استعمال ضروری ہے اور معجون طلائع عنبری تقویت قلب میں مجوزہ حکیم ہر علی خاں مغفور سے ورق طلاع عنبر الشبب، عرق کیوڑہ، قند، کثرت اجزا اس ترکیب خاص میں نا پسند۔ کثر الاجزا اور معجون عنبری ہیں۔ مفرح ابو علی سینا، خمیرہ مروارید، خمیرہ گاؤ زبان، ماء اللحم غیر سنٹی جس میں طیور کے گوشت ادویہ مفرح و مقوی حرارت و پروت میں معتدل ڈالی جائیں۔ گاہ گاہ سکنجبین و گلاب پی لیا کیجئے۔ غذا اپنی گوشت طیور اکثر، پیضہ، نیم پرشت اکثر۔ لیکن

یہ خیال رہے کہ بیضہ مرغ و لحم طیور ایک جلسہ میں تناول نہ فرمائے۔ بکری کے گوشت کے ساتھ بیضہ مرغ جائز اور لذیذ اور مرغوب۔ ہودینے کا عرق، چھوٹی الائچی کا عرق ہمیشہ دوا خانے میں موجود رہے۔“

غرض اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ غالب کی تعلیم اگرچہ عجم میں باقاعدگی کے ساتھ نہ ہو سکی لیکن انہیں ایسے استاد ضرور ملے جن کی وجہ سے ان کے دل میں فارسی زبان سے دل چسپی کی شمع فروزاں ہوئی اور انہوں نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنے ذوق و شوق کے سہارے اس زبان کے قواعد کو سمجھنے اور اس کے ادبی معاملات و مسائل کو سلجھانے کا شعور پیدا کر لیا۔ اور نہ صرف یہ بلکہ اپنی ادبی تحریروں کو فکری اعتبار سے وسیع اور ہمہ گیر بنانے کے لیے نجوم اور طب وغیرہ کا علم بھی حاصل کیا۔ اور ساتھ ہی دینی علوم میں بھی خاطر خواہ دل چسپی لی۔ اور تصوف اور فلسفے کے معاملات و مسائل پر غور کرنے کا مذاق بھی پیدا کر لیا۔

یہ تمام باتیں غالب کی شخصیت میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں !

۴

غالب کی عمر ابھی تیرہ سال کی تھی کہ ۱۲۲۵ء میں ان کی شادی نواب الہی بخش خان معروف کی چھوٹی بیٹی امراؤ بیگم سے ہو گئی۔ امراؤ بیگم کی عمر اس وقت گیارہ سال تھی۔ نواب الہی بخش خان معروف نواب احمد بخش خان والی فیروز پور جیرکا رئیس ٹوبارو کے چھوٹے بھائی تھے۔ معروف اپنے زمانے کے معروف شاعر تھے اور شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ اس رشتے سے غالب کی زندگی میں بڑی حد تک اعتدال پیدا ہوا اور وہ جو کینٹ آگروے میں تھی وہ خاصی حد تک کم ہو گئی۔ کیونکہ شادی کے دو تین سال بعد انہوں نے مستقل طور پر دلی میں قیام کیا۔ چنانچہ اب ان کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

زندگی کی اس تبدیلی کے متعلق مرزا علاء الدین احمد خاں کو اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں :

”پرچند قاعدہ‘ عام یہ ہے کہ عالم آب و ہوا کے مجرم عالم ارواح میں سزا ہاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روہیلہ کے واسطے جہاں بھیجا گیا۔ ۱۳ برس حوالات میں رہا۔ ۲ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور شہر دلی کو زندان متروک کیا، اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔ کل نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد جیل خانے سے بھاگ نہ رہا۔ برس بلاد شرقیہ میں بھرنا رہا۔ پاپان کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی محبس میں بٹھا دیا۔ جب یہ دیکھا کہ یہ قیدی گریزا ہے دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے نکار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار، مسکت بلوری اور مشکل ہو گئی۔ طاقت یک قلم زائل ہو گئی۔ سال گزشتہ بیڑی کو زاوید‘ زندان میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگ میرٹھ، مراد آباد ہونا ہوا رام پور چنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑ آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بیاباگون کیا، بھاگنے کی طاقت بھی نہ رہی۔“

لیکن غالب کی اس قسم کی تحریریں، بقول مولانا مہر : ”ان کی طبعی نوعی، لطیف مزاج اور بذلہ سنجی کا نتیجہ ہیں۔ جو کچھ جی میں آتا تھا، بے تکلف کہہ دیتے تھے۔۔۔۔۔۔ واقعہ یہ ہے کہ غالب کو اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی۔ بیوی بھی شوہر کی راحت و آسائش پر اپنی جان قربان کرتی تھی۔ اگرچہ دونوں کے طرز زندگی میں نمایاں فرق تھا۔ غالب فطرتاً رند تھے۔ بیگم بے حد پرہیزگار اور عبادت گزار خاتون تھیں۔ خواجہ حالی نے لکھا ہے کہ بیگم نے از وہ کہاں اتنا اپنے کھانے پینے کے برتن الگ کر لیے تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ غالب کم از کم شرب و نوش کے باب میں متقی نہ تھے۔ اس کے باوجود طریقین میں کبھی محبت آخری دم تک قائم رہی۔“

۱۔ غالب : اردوئے معلیٰ ۱ : صفحہ ۳۰۱۔

۲۔ غلام رسول مہر : غالب : صفحہ ۵۹-۶۰۔

حمید احمد خان صاحب نے اپنے ایک مضمون میں غالب کی بیوی اور ان کی ازدواجی زندگی کے بعض پہلوؤں کی بڑی خوبصورت تصویر کھینچی ہے۔ لکھتے ہیں :

”یہ کہانی ۱۹۹۷ء سے شروع ہوتی ہے، جب دہلی کے ایک شریف ہا ایال گھرانے میں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام امرآؤ بیگم رکھا گیا۔ امرآؤ بیگم کے باپ مرزا الہی بخش خان کو شہزادوں کا سامعش و آرام میسر تھا۔ جوانی میں مرزا الہی بخش خان کی زندگی کا ڈھنگ ایسا تھا کہ ”وہ شہزادہ کل نام“ کے عرف سے مشہور تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی بیٹی کی پرورش کس ناز و نعمت کے عالم میں ہوئی ہوگی۔ جب امرآؤ بیگم گیارہ برس کی ہوئی تو اس زمانے کے دستور کے مطابق اس کا بیاہ ہو گیا۔ اس کا دولہا میرزا اسد اللہ بیگ خان جو عمر میں اس سے صرف دو برس بڑا تھا، آگرے کا ایک امیر زادہ تھا؛ سفید قام، خوش شکلی، خوش گفتار۔ خیال یہ تھا کہ اسد اللہ بیگ جوان ہو کر باپ دادا کی طرح سبہ گری کی زندگی اختیار کرے گا اور امرآؤ بیگم کو سیکھے گا امیرانہ ٹھانڈا سسرال میں بھی حاصل رہے گا۔ لیکن یہ امیدیں پوری نہ ہوئیں۔ اسد اللہ بیگ خان نے زر و مال کمانے کی کوئی سبیل نہ کی اور تمام عمر بیکاری میں، ہا بیکار قسم کے شعر لکھنے میں گزار دی۔ چوبیس پچیس برس کی عمر کو پہنچنے کے بعد امرآؤ بیگم نے پھر کبھی بے فکری کے دن نہ دیکھے۔ بلکہ حالات بد سے بد تر ہوتے گئے۔ شوہر کی طرف سے کوئی آرام اگر قسمت میں نہ تھا تو اولاد کی خوشی ہی نصیب ہوتی۔ لیکن بچپن کے اچھے دنوں کے بعد تقدیر نے امرآؤ بیگم سے نیک سلوک کرنے کی گویا قسم کھائی تھی۔ سات بجے پیدا ہونے مگر کسی کی عمر برس سوا برس سے زیادہ نہ ہوئی اور سبھی ایک ایک کر کے ماں کے دل کو دائمی جدائی کا داغ دے گئے۔ شوہر جیسا بھی تھا بیاہ تو کیے جا رہا تھا۔ لیکن یہاں بھی آخر عمر میں قسمت نے بے وفائی کی۔ شوہر کے ہاتھوں بیونہ خاک ہونا امرآؤ بیگم کو نصیب نہ ہوا۔ بڑھاپے میں اسے

بیوی کا صدمہ دیکھنا پڑا۔ اور اس کے ساتھ ہی شوہر کی مالی پریشانیوں خود اسے ورے میں مل گئیں۔ امرائیکم کا شوہر انتقال کے وقت آٹھ سو روپے کا مقروض تھا۔ اب بوڑھی بیوہ حیران تھی کہ یہ قرضہ کس طرح اور کہاں سے ادا کرے گا۔ سرکاروں، درباروں میں استعداد کے لیے غریبان بھجوائی گئیں۔ ان عرصوں کا مضمون بڑھنے والوں کو آج بھی درد ناک معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سرکاروں درباروں میں کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر ۱۸۷۰ء میں میرزا الہی بخش معروف کی ناز پروردہ بیٹی پریشان روزگار کے اولاد، بے شوہر دنیا سے رخصت ہوئی۔^۱

اس میں شبہ نہیں کہ ناسازگار معاشی حالات کی وجہ سے غالب کی ازدواجی زندگی ناخوش گوار ضرور رہی، پھر اولاد کے زندہ نہ رہنے نے اس کو کچھ اور بھی ناخوش گوار بنا دیا۔ جہاں وجہ ہے کہ وہ شروع سے آخر تک ایک اندوہ ناک داستان نظر آتی ہے۔

غالب کے سات بچے ہوئے لیکن ان میں سے ایک بھی پندرہ مہینے سے زیادہ زندہ نہ رہا۔ یہ ایسا غم تھا جس کی وجہ سے غالب کی شخصیت میں ساری زندگی ایک سنگینے والی کیفیت رہی۔ ایک خط میں میاں داد خان سیاح کو ان کے بچے کی وفات پر خط لکھتے ہیں تو اُس میں بھی اپنے صدمے کا ذکر کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں :

”تمہارے ہاں لڑکے کا پیدا ہونا اور اُس کا مر جانا معلوم ہو کر مجھ کو بہت غم ہوا۔ بھائی ! اس داغ کی حقیقت مجھ سے بوجھو کہ مجھے برس کی عمر میں ۷ بچے پیدا ہوئے۔ لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی۔ اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہ ہوئی۔ تم انہی جوان ہو۔ حق تعالیٰ تمہیں صبر اور نعم الہیٰل دے۔“^۲

اس تقریر کے ایک ایک لفظ سے وہ حسرت ٹپکتی ہے جو زندگی بھر غالب کے دم کے ساتھ رہی اور اس غم کا اندازہ ہونا ہے جو دوسرے

۱۔ پروفیسر حمید احمد خاں : امرائیکم : (اعمال غالب) : صفحہ

غموں کے ساتھ زندگی بھر سائے کی طرح ان کا پیچھا کرتا رہا ۔
 غالب نے اپنے اس غم کو غلط کرنے کے لیے اپنے بھانجے زین العابدین
 خان عارف کو گود لے لیا اور انہیں بالائے لیکن عارف جوانی ہی میں چل
 بسے اور غالب کو ایک ایسا غم دے گئے جس کو وہ ساری زندگی نہ
 بھلا سکے ۔

عارف کے انتقال کے بعد غالب نے ان کے دو بیٹوں حسین علی خان اور
 باقر علی خان کو اپنے ساتھ رکھا اور بڑی محبت اور لاف بہار سے انہیں پالا ۔
 یہاں تک کہ سفر تک میں انہیں ساتھ لے گئے ۔ اپنے غلطوں میں ان کا ذکر
 بڑی محبت سے کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

”سنو صاحب ! بد تم جانتے ہو کہ زین العابدین خان عارف مرحوم
 میرا فرزند تھا ۔ اب اس کے دونوں بچے کہ وہ میرے ہوئے
 ہیں ، میرے پاس آ رہے ہیں اور دم بہ دم مجھ کو ستاتے ہیں ۔ میں
 قہر کرتا ہوں ۔ خدا گواہ ہے کہ تم کو اپنا فرزند سمجھتا ہوں ۔
 اس بھارے نتائج میرے معنوی ہونے ہوئے ۔ جب اس عالم
 کے لونگوں سے کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے ۔ مجھ کو دوپہر
 کو سونے نہیں دیتے ۔ لنگے لنگے پاؤں ہلنگ پر رکھتے ہیں ۔
 کہیں پانی لڑھکاتے ہیں ۔ کہیں خاک اڑاتے ہیں ۔ میں لنگ نہیں
 آتا تو ان معنوی پواؤں سے کہ ان میں یہ باتیں نہیں ہیں ، کیوں
 کہہ رہا ہوں ؟“

(خط بہ نام منشی ہر گوبال چند)

”اندر باہر سب روزہ دار ہیں ۔ یہاں تک کہ بڑا لڑکا باقر علی خان
 بھی ۔ ایک میں اور میرا بیٹا حسین علی خان روزہ غور ہیں ۔ وہی
 حسین علی خان جس کا روزمرہ ہے کھانے کا دو ۔ میں بھی
 بھار جاؤں گا ۔“

(خط میر سیدی مجروح کے نام)

”لڑکے دونوں اچھی طرح ہیں ۔ کبھی میرا دل پھلاتے ہیں کبھی
 مجھ کو ستاتے ہیں ۔ بکریاں ، کبوتر ، بٹیریں ، نکل ، کنکوا ، ب
 سامان درست ہے ۔ فروری کے مہینے میں دو دو روپے دے ،
 دس دن میں اٹھا ڈالے ۔ پھر برسوں چھوٹے صاحب آئے کہ

دادا جان ! کچھ ہم کو فرض حسنه دو - ایک رویہ دونوں کو
فرض حسنه دیا گیا - آج ۳۱ ہے - دیکھتے کئے ہر فرض پس گئے۔“

”دونوں برغوردار گھوڑوں پر سوار چل دیے - میں چار گھڑی دن
رہے ہاؤز کی سرائے میں پہنچا - دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور
گھوڑوں کو ٹہلنے ہوئے پایا - گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا -
میں نے چٹانک بھر گھس داغ دیا - دو شامی کباب اس میں
ڈال دیے - رات ہو گئی تھی - شراب پی لی - کباب کھا لیے -
لڑکوں نے اوپر کی کھجڑی ہکوائی - خوب گھس ڈال کر آب بھی
کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی - ہارے آج تک دونوں
بھائیوں میں موافقت ہے - آس کی صلاح مشورے سے کام کرتے
ہیں - اتنی بات زائد ہے کہ حسین علی منول پر اثر کر پاپڑ اور
تھانی کے کھانے خرید لاتا ہے۔“

(خط بنام بھف خاں)

”آج صبح کو سات بجے باقر علی خاں اور حسین علی خاں مع چودہ
سرخ ، چھ بڑے ، آٹھ چھوٹے کے دلی کو روانہ ہوئے - دو آدمی
میرے ان کے ساتھ تھے۔“ (خط بہ نام علاء الدین احمد خاں)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب میں کتنی انسانیت تھی - وہ
اپنے متعلقین کا کتنا خیال رکھتے تھے اور ان سے کسی درجہ محبت کرتے
تھے - اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ اولاد کے زندہ نہ رہنے کی
وجہ سے ان کی زندگی میں ایک خلا تھا - وہ زندگی بھر اس خلا کو پر کرنے
کی کوشش کرتے رہے - اور انہوں نے اس تنہائی کے زہر کو اس طرح زائل
کرنے کی کوشش کی جو اولاد کے غم کی وجہ سے ان کی شخصیت میں
بڑی طرح سرایت کر گیا تھا -

شادی کے بعد دلی کا قیام غالب کی زندگی میں کتنی لحاظ سے اہمیت
رکھتا ہے - اس زمانے میں ان کی زندگی میں اعتدال اور تہہ راؤ پیدا ہوا -
جذباتی مسودگی نصیب ہوئی - رفاقت اور محبت کا سہارا ملا - تنہائی دور

ہوئی۔ خاندان کی زندگی کا تجربہ ہوا۔ اور اس طرح وہ بے راہ روی جو ان کے مزاج کا جزو بن گئی تھی، اس کے اثرات بڑی حد تک چھٹ گئے۔ اگرچہ اس زمانے میں انہیں مختلف طرح کے غموں نے گھیرے رکھا لیکن انہوں نے ان غموں کو چھینا اور ان کو زندگی کے لیے گوارا بنانا سیکھا۔ اور ایک بے چین روح ان کے اندر بیدار ہوئی۔ انہوں نے زندگی کو بسر کرنا، اس کو برتنا اور اس کو بسر کرنے اور برتنے کے لیے نا سازگار حالات سے لڑنا اور ایک نئی زندگی کی تعمیر و تشکیل کے لیے جد و جہد کرنا سیکھا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ دلی کے دوران قیام میں انہیں اس ماحول میں زندگی بسر کرنے کا موقع ملا جو بہ قول حالی عہد اکبری اور عہد شاہجہانی کی یاد دلاتا تھا۔ اس زمانے میں ایک ایسے طبقے سے ان کا تعلق رہا۔ جو صحیح معنوں میں اس وقت کی تہذیب و ثقافت دین و مذہب، ادب و شعر اور فکر و فلسفہ کا علم بردار تھا۔ جہاں انہوں نے اس ماحول میں وقت گزارا جس کو حکیم احسن اللہ خان، حکیم غلام غنی خان، حکیم محمود خان، نواب مصطفیٰ خان شیفہ، مولانا فضل حق خیر آبادی، سومن، شاہ نصیر، ذوق، فیروز خان، ظہیر، مجروح، عارف اور صہبائی وغیرہ کی شخصیتوں نے ہر اعتبار سے وسیع اور ہمہ گیر، رنگین اور برکار بنا دیا تھا۔

غالب کی زندگی اور شخصیت میں ذہنی انقلاب کی ایک لہر بھی اس ماحول نے پیدا کی اور وہ اسی کی بدولت اس نئے احساس و شعور کے سب سے بڑے علم بردار بن گئے، جس کا ایک طوفان اس زمانے کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں موج زن تھا۔

غالب کی شاعری کا آغاز اگرے ہی میں ہو چکا تھا۔ مالک رام صاحب نے "کلیات اثر غالب" اور "بادشاہ غالب" کے حوالے سے لکھا ہے کہ "ابھی وہ مولوی عہد معظم کے مکتب میں پڑھتے تھے، اور ان کی عمر دس گیارہ برس سے زیادہ نہیں تھی کہ انہوں نے شعر کہنا شروع کیا۔ اس زمانے کی ایک فارسی غزل کا بھی پتہ چلتا ہے مگر شروع میں ان کی توجہ زیادہ تر اردو کی طرف رہی اور وہ بھی بیدل، اصغر، شوکت کے رنگ میں۔ پچیس برس کی عمر تک تقریباً دو ہزار شعرا ایک دیوان تیار ہو گیا۔ اگر ہی روش رہتی تو ان کی ادبی موت میں

کبھی شبہ ہوسکتا تھا۔ لیکن غنیمت ہے کہ ان کی خدا داد صلاحیت نے ان کی رہنمائی کی۔ انہوں نے یہ راہ ترک کر دی اور اس دیوان کو بھی نظری کر دیا۔ اس طرح گویا انہوں نے میر تقی میر کی یہ پیش گوئی پوری کر دی کہ اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے رستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا۔ ورنہ محفل بکنے لگے گا۔ یہ کامل استاد ان کی طبع سلیم تھی یا بعض غلطی سخن شناس دوست، ورنہ شاعری میں وہ صحیح معنوں میں اللہ والرحمن تھے اور کسی کی شاگردی کا احسان ان کے سر پر نہیں۔“

یہ بات تحقیق طالب ہے کہ میر نے غالب کا کلام دیکھا یا نہیں۔ اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ بچپن میں غالب نے، ماحول کے اثر سے، شاعری کی طرف توجہ کی اور طرز ہدیل میں رختہ لکھنا شروع کیا۔ اگرچہ اس زمانے میں انہوں نے اردو کی طرف خاص طور پر توجہ کی اور فارسی میں شعر نہیں کہے لیکن ان کے اردو کلام میں اس وقت فارسی اثرات بہت گہرے تھے۔ حالی نے لکھا ہے :

”مرزا کے ابتدائی اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو طبیعت کی مناسبت سے اور زیادہ تر سلا عبدالصمد کی تعلیم کے سبب، فارسیت کا رنگ ابتدا ہی سے مرزا کی بول چال اور ان کی قوت متخیلہ پر چڑھ گیا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جیسی طرح اکثر ذکی الطبع لڑکے ابتدا میں سیدھے سادے اشعار کی نسبت مشکل اور پیچیدہ اشعار کو، جو بغیر غور و فکر کے آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے، زیادہ شوق سے دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔ مرزا نے لڑکپن میں ہدیل کا کلام زیادہ دیکھا تھا۔ چنانچہ جو روش مرزا ہدیل نے فارسی زبان میں اختیار کی تھی اسی روش پر مرزا نے اردو میں چلنا اختیار کیا۔“

یہ باتیں ابھی تحقیق طالب ہیں کہ غالب نے کسی کے اثر سے، کن

۱۔ مالک رام : ذکر غالب : صفحہ ۳۱۔

۲۔ حالی : یادگار غالب : صفحہ ۹۹۔

لوگوں کی صحبتوں میں شاعری شروع کی اور انہوں نے ابتدائی زمانے میں کس سے اصلاح لی ؟ - اور یہ کہ بیدل کے اثرات اس زمانے کے کلام میں اتنے گہرے کیوں ہوئے ؟ - قیاس یہ کہتا ہے کہ بچپن میں لہو و لعب کی زندگی ہی کے زیر اثر انہوں نے شاعری سے دلچسپی لی ہوئی اور خود شعر کہنا بھی شروع کیا ہوگا - پھر اُس زمانے میں آگرے کی سر زمین پر جو شعری اور ادبی ماحول تھا، اُس نے بھی انہیں متاثر کیا ہوگا۔ اس وقت آگرے میں شعر و شاعری کا اچھا خاصا ماحول موجود تھا - نظیر اکبر آبادی کو اگرچہ اونٹنی طہقے کے افراد درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے - لیکن پھر صورت آگرے میں ان کا ایک حلقہ موجود تھا، اور اس حلقے نے اپنے محدود دائرے ہی میں مجھی، شاعری کی ایک نضا پیدا ضرور کر دی تھی - اس کے اثرات براہ راست نہیں تو بالواسطہ طور پر غالب پر ضرور ہونے لگے - جب غالب آگرے کو چھوڑ کر دلی پہنچے تو وہاں کے شعری اور علمی ماحول نے شاعری کی اس آتش شوقی کو کچھ اور بھی بھڑکایا - دلی میں اُس وقت ذوق، شاہ نصیر، مومن اور شیفتہ وغیرہ نے شاعری کی ایک نضا قائم کر دی تھی - اور شاعروں کے علاوہ شعر و شاعری سے دلچسپی رکھنے والے عالم بھی خاصی تعداد میں اس سر زمین پر موجود تھے - ان میں حکیم احسن اللہ خان، حکیم محمود خان اور مولانا فضل حق غیر آبادی کے نام لیے جا سکتے ہیں - غالب نے، ظاہر ہے کہ ان سب سے اثر قبول کیا ہوگا - حقیقت یہ ہے کہ اسی ماحول کے اثر سے دلی میں اُن کی شاعری نے ایک نیا رنگ اختیار کیا اور اُس میں وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ رنگ رکھاؤ پیدا ہوتا گیا - یہاں تک کہ وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے اور اہم شاعر ہو گئے - اکرام صاحب نے لکھا ہے :

”قیام دہلی کا جو اثر ان کی شاعری پر ہوا وہ بہت واضح اور نمایاں

ہے - آگرے میں شعر اور شعر فہم حضرات کی وہ کثرت نہ تھی جو دہلی میں تھی - اور غالب کے عجیب و غریب اشعار پر جب لوگ معترض ہوتے تو وہ انہیں خاطر میں نہ لاتے — لیکن جب مرزا دہلی آئے اور مولانا فضل حق اور دوسرے مسلمہ استادوں نے انہیں ان اشعار کے حسن و قبح سے آگاہ کیا تو مرزا کو ان کے علم و فضل کے سامنے سر جھکانا پڑا — مرزا غالب کے منتظم

دیوان ریختہ کے بارے میں آزاد کا خیال ہے کہ یہ انتخاب مولانا فضل حق اور مرزا غانی کوٹوال دہلی نے کیا۔ مرزا کے بیانات اور معاصرانہ تذکروں سے خیال ہوتا ہے کہ انتخاب خود غالب نے کیا۔ غالباً یہ خیال درست ہے۔ لیکن مرزا کے ابتدائی اور بعد کے طرز شاعری میں اتنا فرق ہے کہ یہ بیان بعد از قیاس معلوم نہیں ہوتا کہ مرزا کی شاعری میں جو عظیم الشان تبدیلی ہوئی اس میں کسی خارجی رہنائی کو بھی دخل تھا اور بقول مرزا انہوں نے اپنا طرز خاص اس لیے ترک کیا کہ اُسے یاروں نے چلنے نہ دیا۔“ صحیح صورت حال جو کچھ بھی ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ، ماحول کے اثر سے، غالب نے اپنی شاعری میں تبدیلیاں کیں اور اس میں ایک ارتقائی عمل جاری رہا۔ اس نے زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنے دامن میں جگہ دی اور جاہلیاتی اعتبار سے بھی اپنے آپ کو دل نشیں بنایا۔ اور اس طرح وہ بہت ٹھوڑے عرصے میں ایک عظیم شاعر تصور کیے جانے لگے۔

لال قلعہ اس زمانے میں تہذیب و ثقافت اور شعر و ادب کا مرکز تھا۔ لیکن ایک زمانے تک غالب کو ایک شاعر کی حیثیت سے قلعے میں بارہابی حاصل نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس زمانے میں وہاں ذوق کا طوطی بولنا تھا، اور وہ چادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔ کبھی کبھی مشاعروں میں شرکت کے لیے تو غالب قلعے میں بلائے جاتے تھے لیکن اس سے زیادہ اُن کی رسائی نہیں تھی۔ ۸۵۰ھ تک وہ قلعے سے علیحدہ رہے۔ اُس کے بعد، اُن کی ناسازگار مالی حالت کو دیکھ کر، شیخ نصیر الدین کالے میاں اور حکیم احسن اللہ خاں نے اُن کی سفارش کی اور وہ تیموری خاندان کی تاریخ لکھنے پر مامور ہوئے۔ مولانا سہر لکھتے ہیں :

”شاہ دہلی نے شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں اور حکیم احسن اللہ خاں کی سفارش پر ۸۵۰ھ میں غالب کو تیموری خاندان کی تاریخ لکھنے کے لیے مقرر کیا تھا، اور نجم الدولہ، دیر الملک، نظام جنگ کے خطابات کے علاوہ خلعت اور مچاس روئے ماہالہ تنخواہ مقرر کی تھی۔ یہ تنخواہ آغاز جولائی ۸۵۰ھ سے لے کر آخر اپریل

۱۸۵۷ء تک ملتی رہی۔ حکیم احسن اللہ خان جمع و تخلیق حالات پر مامور تھے۔ جو کچھ لکھ کر دیتے، غالب اس کو بہار آفریں نثر کا جامہ پہنا دیتے۔ ۱۸۵۲ء تک تاریخ کا پہلا حصہ، جو ابتدائے آفرینش سے لے کر بہایوں بادشاہ کی وفات تک کے حالات پر مشتمل تھا، مکمل ہوا۔ اس کا نام 'سہر لیم روز' تھا۔ دوسرے حصے میں اکبر کی تخت نشینی سے لے کر بہادر شاہ ثانی تک کے حالات مدون کرنے کی تجویز تھی۔ اس کا نام غالب نے 'ماہ نیم ماہ' رکھا تھا۔ لیکن یہ حصہ شروع نہ ہوا اور غدر کی آگ بھڑک اٹھی جس نے تیموری خاندان کے رفت و وجود ہی کو راکھ بنا ڈالا۔^{۱۱} ذوق کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفر نے غالب سے باقاعدہ اصلاح بھی لی۔ مولانا حالی لکھتے ہیں:

”۱۲۷۱ھ میں جب کہ شیخ ابراہیم ذوق کا انتقال ہو گیا بادشاہ کے اشعار کی اصلاح بھی مرزا سے متعلق ہو گئی تھی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ مرزا اس کام کو بادل نا خواستہ سر انجام کرتے تھے۔ ناظر حسین مرزا مرحوم کہتے تھے کہ ایک روز میں اور مرزا صاحب دیوان عام میں بیٹھے تھے کہ چوب دار آیا اور کہا کہ حضور نے غزلیں مانگی ہیں۔ مرزا نے کہا ذرا ٹھہر جاؤ۔ اور اپنے آدمی سے کہا کہ 'ہالکی میں کچھ کاغذ رومال میں بندھ ہوئے رکھے ہیں، وہ لے آؤ' وہ فوراً لے آیا۔ مرزا نے جو اُسے کھولا تو اُس میں سے آٹھ نو ہرچے جن ہر ایک ایک دو دو مصرعے لکھے ہوئے تھے، نکالے۔ اور اسی وقت دوات قلم منگوا کر ان مصرعوں پر غزلیں لکھنی شروع کیں۔ اور وہیں بیٹھے بیٹھے آٹھ یا نو غزلیں تمام و کمال لکھ کر چوب دار کے حوالے کیا۔ ناظر جی مرحوم کہتے تھے کہ ان تمام غزلوں کے لکھنے میں اُن کو اس سے زیادہ دیر نہیں لگی کہ ایک مشتاق استاد چند غزلیں صرف کہیں کہیں اصلاح دے کر درست کر دے۔ جب چوب دار غزلیں لے کر چلا گیا تو مجھ سے کہا کہ 'حضور کی کبھی کبھی

کی فرمائشوں سے آج مدت کے بعد سبک، دوشی ہوئی ہے۔“^{۱۱}
 دلی کی ادبی زندگی میں غالب کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ یہ بات
 صحیح نہیں ہے کہ انہیں اپنے زمانے میں درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔
 اس وقت کے ادبی اور شعری ماحول کے علم بردار اُن کی عزت کرتے تھے
 اور وہ بھی اُن کو عزیز رکھتے تھے۔ ذوق اور مومن کی شاعری کو اس
 زمانے میں بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ اُن کے انتقال پر غالب نے جو کچھ
 لکھا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان کو کتنا عزیز رکھتے تھے
 اور خود اُن کے دلوں میں غالب کی کتنی عزت تھی۔

ذوق کے انتقال پر منشی نبی بخش حیدر کو لکھتے ہیں :
 ”جہاں کا حال تازہ یہ ہے کہ میان ذوق مر گئے۔ حضور والا نے
 ذوق شعر و سخن ترک کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ شخص اپنی وضع
 کا ابک اور اس عصر میں غنیمت تھا۔“^{۱۲}

مومن کے انتقال پر ان تاثرات کا اظہار کرتے ہیں :
 ”منا ہو گا تم نے کہ مومن خاں مر گئے۔ آج اُن کو مرے ہوئے
 دسواں دن ہے۔ دیکھو بھائی ! ہمارے بچے مرے جاتے ہیں۔ ہمارے
 ہم عمر مرے جاتے ہیں۔ قائلہ جلا جاتا ہے اور ہم ہا در رکاب
 بیٹھے ہیں۔ مومن خاں میرا ہم عصر تھا، اور یار بھی تھا۔
 بیالیس تینتالیس برس ہوئے، یعنی چودہ چودہ پندرہ پندرہ برس کی
 میری اور اس کی عمر تھی، کہ مجھ میں اور اس میں ربط پیدا ہوا۔
 اس عرصے میں کبھی کسی طرح کا رنج و ملال درمیان نہیں آیا۔
 حضرت ! چالیس برس کا دشمن بھی نہیں پیدا ہوتا۔ دوست تو
 کہاں ہاتھ آتا ہے ؟ یہ شخص بھی اپنی وضع کا اچھا کہنے والا
 تھا۔ طبیعت اُس کی معنی آفریں تھی۔“^{۱۳}

غالب کی ادبی زندگی کا سب سے اہم واقعہ ”برہان قاطع“ اور
 ”قاطع برہان“ کے ہنگامے کا ہے۔ حالی لکھتے ہیں :

- ۱۔ حالی : یادگار غالب : صفحہ ۳۲۔
- ۲۔ انتخاب خطوط غالب : صفحہ ۱۲۱۔
- ۳۔ ایضاً : صفحہ ۱۲۲۔

”چپ مرزا‘ دستبوس‘ کو ختم کر چکے ، اور اب بھی تفتانی اور ستائے کا وہی عالم رہا ، اس وقت سوا اس کے اور کیا چارہ تھا کہ دوات اور قلم کو مونس و رفیق سمجھیں ، اور کچھ لکھ بڑھ کر اپنا غم غلط کریں اور دل بہلائیں ۔ مرزا کے پاس اس وقت سوائے ’برہان‘ قاطع‘ اور ’دستبوس‘ کے کوئی کتاب موجود نہ تھی ۔ ’برہان‘ کو آٹھا کر سرسری نظر سے دیکھنا شروع کیا ۔ پہلی ہی نگاہ میں کچھ بے ربطیاں سی معلوم ہوئیں ۔ بھر زیادہ غور سے دیکھا تو اکثر لغات کی تعریف غلط پائی ۔ ایک ایک لفظ مختلف صورتوں سے لکھا دیکھا ۔ شعرا نے جو الفاظ بہ طور مجاز و کنایہ کے استعمال کیے ہیں ، ان کا ذکر بہ طور مستقل لغات کے دیکھا ۔ طریقہ بیان اکثر بھونڈا ، اور اصول لغات نگاری کے خلاف پایا ۔ بہت سے لغات کی ایسی تفسیر بھی دیکھی جس کے معنی بالکل سمجھ میں نہ آئے ۔ مرزا نے یاد داشت کے طور پر ، جو مقام قابل اعتراض نظر آئے ، ان کو ضبط کرنا شروع کیا ۔ شدہ شدہ وہ ایک کتاب بن گئی جس کا نام ’قاطع برہان‘ رکھا گیا ۔ اور ۱۲۷۶ھ میں چپ کر شائع ہوئی ۔ پھر مرزا نے ۱۲۷۷ھ میں یہ اضافہ دیگر مضامین و فوائد اس کو دوسری بار چھپوایا ، اور اس کا نام ’درفش کلوپانی‘ رکھا ۔“

یہ کتاب چھپی تو غالب کے خلاف ایک ہتکامہ برپا ہو گیا اور لوگوں نے ان کی مخالفت شروع کر دی ۔ چنانچہ ’عمرق قاطع‘ ، ’قاطع قاطع‘ ، ’سوید برہان‘ ، ’ساطع برہان‘ کے نام سے کئی رسالے لکھے گئے ۔ اس مخالفت کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ غالب نے ان غلطیوں کی طرف اشارہ کر کے اپنے نئے مزاج کو ظاہر کیا تھا اور جو لوگ برائی لکیر کے قہر تھے ، وہ اس کو برداشت نہیں کر سکتے تھے ۔ دوسرے ایک بات یہ بھی تھی کہ غالب نے کہیں کہیں ایسا لہجہ اختیار کیا تھا جس میں شوخی کے عناصر نمایاں تھے ۔ اس لہجے کو لوگ برداشت نہ کر سکتے ۔ غالب نے اس ہتکامے کا مقابلہ بڑی ہمت سے کیا ۔ جتنے لوگوں نے

ان کی مخالفت میں لکھا ، انہوں نے ان سب کے جواب دیے ، اور ان میں
 یہی اپنی شوخی اور ظرافت کے لمبے کے کو باقی رکھا ۔ اس سے ان کے
 ادبی مزاج ، ظرافت طبع اور احساس مزاج کا اندازہ ہوتا ہے ۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ غالب بنیادی طور پر
 ایک شاعرانہ اور ادبی مزاج رکھنے والے تھے ۔ انہوں نے زندگی ایک شاعر اور
 ادیب کی حیثیت سے بسر کی اور اپنی زندگی کا زیادہ زمانہ شعر و ادب کی
 تحقیق میں صرف کیا ۔ پھر اس کام کا سلسلہ شروع ہوا اور مرتے دم
 تک جاری رہا ۔ اس کام کو وہ سنائی کی محنت اور صلے کی پروا کے بغیر
 باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے ۔ انہوں نے اپنے زمانے کے
 ثقافتی ، تہذیبی ، اور شعری و ادبی معاملات و مسائل سے دل چسپی لی ۔
 اور ان کے بارے میں نہ صرف اظہار خیال کیا ، بلکہ وہ ان سب کو آگے
 بڑھانے اور پروان چڑھانے میں پیش پیش رہے ۔ اپنے زمانے کی ادبی شخصیتوں
 سے وہ سائر ہوئے اور انہوں نے خود ان شخصیتوں سے اثر قبول کیا ۔
 اس زمانے کے مفکروں ، عالموں ، ادیبوں اور شاعروں سے ان کے گہرے
 تعلقات رہے اور انہوں نے ان کے ساتھ مل کر ادب و شعر کا صحیح
 ماحول پیدا کیا ۔

اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنے زمانے میں ادبی ہنگامے بھی برپا کرتے
 رہے اور ان ہنگامہ آراہوں نے ان کے زمانے کی ادبی اور شعری زندگی کو
 جولانی سے ہم کنار کیا ۔

غالب کی شخصیت اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے اور جو کام
 انہوں نے اپنے زمانے کی ادبی اور شعری زندگی میں انجام دیا ہے ، اس میں
 ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا ۔
 اس اعتبار سے وہ ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں ۔

۶

غالب کی زندگی مسلسل جد و جہد کی ایک نہایت ہی الم ناک اور
 خوں چکن ، لیکن دلاویز اور دل نشیں داستان ہے ۔ الم ناک اور خوں چکن
 اس وجہ سے کہ غالب کے ایسے عظیم شاعر کو فکر دنیا میں سر کھپانا پڑا
 اور غم روزگار کے ایسے ایسے ٹھوڑے کھانے پڑے کہ زندگی کی کشتی

ڈولنے لگی اور دل آویز و دل نشیں اس وجہ سے کہ غالب کی قوت ارادی اور جہد مسلسل کے عزم مصمم نے اس کو، خون چکنی کے باوجود ایسا رنگین اور ہر وقار بنا دیا کہ وہ آج بھی دیکھنے والوں کے لیے زندگی اور جولاں سے قریب ہونے کا سامان فراہم کرتی ہے۔

آگرمے کا قیام غالب کے لیے مالی اعتبار سے غالباً اُن کی زندگی کا سب سے اچھا زمانہ ہے۔ قیام دلی کا ابتدائی زمانہ بھی اس لحاظ سے برا نہیں ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں انہیں سائے سات سو روپیہ نواب احمد بخش خاں کی طرف سے پنشن کے ملتے تھے۔ الور سے بھی کچھ نہ کچھ مل جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اُن کی والدہ بھی اُن کو کچھ نہ کچھ دیتی رہتی تھیں۔ لیکن یہ صورت حال زیادہ عرصے تک باقی نہ رہی۔

ہوا یہ کہ ۱۸۲۲ء میں نواب احمد بخش نے اپنی جائداد کا انتظام اس طرح کیا کہ فیروز پور جہر کہ کا علاقہ اُن کے بڑے بیٹے نواب شمس الدین احمد خاں کو سلا اور لویارو کی جاگیر اُن کے دو چھوٹے بیٹوں امین الدین خاں اور ضیاء الدین خاں کے حصے میں آئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غالب کی پنشن نواب شمس الدین خاں کے پاس چلی گئی۔ غالب کے تعلقات چونکہ امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں سے تھے۔ اس لیے اس کا اثر اُن کی پنشن پر پڑا۔ کچھ عرصے تک تو اس کی ادائیگی میں دشواریاں پیدا کی گئیں اور بالآخر ۱۸۳۱ء میں یہ پنشن بند کر دی گئی۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ غالب کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

پھر سمند ناز یہ ایک اور قازیانہ یہ ہوا کہ ۱۸۲۹ء میں خواجہ حاجی کا انتقال ہو گیا۔ غالب کا خیال یہ تھا کہ خواجہ حاجی کے انتقال کے بعد اُن کے حصے کے دو ہزار سالانہ کی رقم اُن کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ جب اُن کے انتقال کے بعد یہ رقم اُن کے بیٹوں شمس الدین خاں عرف خواجہ جان اور بدرالدین عرف خواجہ امان کی طرف منتقل ہوئی تو غالب کو یہ ہلت ناگوار ہوئی اور انھوں نے اس فیصلے کو تبدیل کرانے کے لیے گورنر جنرل کے سامنے عرضداشت پیش کرنے کا ارادہ کیا۔ اور اسی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کلکتے کے سفر کا منصوبہ بنایا۔

مالک رام صاحب کے خیال میں غالب ۱۸۲۹ء میں اور مولانا مہر کے خیال کے مطابق اپریل ۱۸۲۷ء میں دہلی سے کلکتے روانہ ہوئے۔ راستے میں

لکھنؤ میں بھی ان کا قیام رہا۔ حالی نے لکھا ہے کہ :

”چونکہ لکھنؤ کے ذی اقتدار لوگ مدت سے چاہتے تھے کہ مرزا ایک بار لکھنؤ آئیں، اس لیے کان پور پہنچ کر انہیں یہ خیال آیا کہ لکھنؤ بھی دیکھنے چلے۔“

پھر حال ۱۸۴۲ء میں لکھنؤ پہنچے۔ وہاں ان کا شان دار استقبال کیا گیا اور بڑی آؤ بیگت ہوئی۔ آغا میر اس زمانے میں نائب السلطنت تھے۔ ان سے ملاقات کی صورت پیدا ہوئی۔ لیکن جلدی میں قصیدہ نہ لکھ سکے۔ صنعت تعطیل میں نثر لکھ لی لیکن ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔ کیونکہ غالب نے دو شرطیں پیش کر دیں۔ ایک تو یہ کہ آغا میر ان کی تعظیم کریں اور دوسری یہ کہ انہیں نذر پیش کرنے کے لیے مجبور نہ کیا جائے۔ ان شرائط کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ اس لیے وہ آغا میر سے نہ مل سکے۔ فاسخ اور آتش اس زمانے میں لکھنؤ کی سر زمین پر موجود تھے لیکن یہ بات تحقیق طلب ہے کہ غالب کی ملاقات ان سے ہوئی یا نہیں۔ صرف اتنا علم ہوتا ہے کہ لکھنؤ والوں نے ان کے اعزاز میں ایک مشاعرہ کیا اور اس میں غالب نے غزل بھی پڑھی۔ اور کوئی گیارہ مہینے کے قریب لکھنؤ میں ان کا قیام رہا۔ اس زمانے میں جو غزل انہوں نے کہیں اس کے چند اشعار میں قیام لکھنؤ کے متعلق چند تاثرات کا اظہار اس طرح کیا ہے :“

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کہتا یعنی

ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

مقطع سلسلہ شوق نہیں ہے یہ شہر

عزم سیر خف و طوف حرم ہے ہم کو

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب

جادو رہ کشش کاف گرم ہے ہم کو

غالب لکھنؤ سے کان پور ہوتے ہوئے باندھ گئے۔ باندھ سے الہ آباد اور الہ آباد سے بتارس پہنچے اور وہاں قیام کیا۔ اس شہر سے وہ بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے اس کی تعریف میں ایک مثنوی ’پیراغ دیر‘ لکھی۔

اس میں بنارس کی تعریف اس طرح کی ہے :
 تعائے اللہ بنارس چشم بد دور
 پشت خرم و فردوس معمور
 بنارس را کہے گنتہ کہ چہی است
 بنور از گنگ چینی بر جبین است

ہا اے خائف ! از کیفیت ناز
 نگاہے بر ہوی زادانش الداز
 ہمہ جانہائے بے تن کن تماشا
 ندارد آب و خاک این جلوہ حاشا
 نہاد شاں چو ہوئے گل گراں ترست
 ہمہ جہانند جسمے درمیاں نیست

بنافش را پیولا نعلہ طور
 سراپا نور ایزد چشم بد دور
 میانہ نازک و دلہا توانا
 ز نادانی ہمہ کار خویش دانا
 تبسم ہی کہ در لبہا طبعی است
 دہن ہا رشک گل ہائے ربعی است

ہمہ لطف از موج گوہر نرم رو سر
 ہمہ ناز از خون عاشق گرم دو سر
 ہمہ سامان دو عالم گلستان رنگ
 ز قباب رخ چراغان لب گنگ
 قیامت قامتان مزگان درازان
 زمزگان در صف دل نیزہ ہازان

بنارس سے ہشتہ ہوئے ہوئے فروزی ۱۸۴۸ ع میں کلکتے پہنچے ۔ وہاں
 ایک مکان کواہہ پر لیا اور اس میں قیام کیا ۔ کلکتے سے بہت متاثر ہوئے
 اور اس شہر کے قیام کی یاد ہمیشہ اُن کے دل میں گڑھ رہی ۔ جیسا کہ ان
 اشعار سے ظاہر ہے :

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں !
 اک تیر مہرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

وہ سبز زار ہائے مطرا کہ اُن غضب

وہ نازیں بتان خود آرا کہ ہائے ہائے

صبر آزما وہ اُن کی نکاحی کہ اُن غضب

طاقت رہا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے

وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ وا

وہ بادہ ہائے تاب گوارا کہ ہائے ہائے

کلکتے میں غالب کے دوست سراج الدین احمد موجود تھے۔ اُن کی وجہ سے بھی اس شہر میں اُن کا دل نکا۔

کلکتہ کے دوران قیام میں وہ ادبی ہنگامہ بھی ہوا جس کے بارے میں انہوں نے اپنی مشہور فارسی مثنوی 'باد مخالف' لکھی۔ یہ ہنگامہ بقول مولانا غلام رسول سہر غالب کی علمی اور ادبی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ :
 "وہ شروع ہی سے قتیل ، واقف اور اس فاش کے دوسرے شعراء کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ لیکن کلکتہ میں اس رائے کے اظہار پر جو معرکہ 'تمریضات گرم ہوا' ، اُس نے غالب کے جذبہ مخالفت میں بہت تندہی ، تیزی اور تلخی پیدا کر دی۔ یہی جذبہ مخالفت انجام کار 'قاطع برہان' کی شکل میں ظاہر ہوا جو غالب کی طرف سے فارسی دانان ہند کے درجہ اسناد و اعتاد کے خلاف ایک بڑا جہاد تھا۔ اُن کے کلام نظم و نثر میں جا بجا قتیل ، واقف ، عبدالواسع ، غیاث الدین رام پوری اور اس قبیل کے دوسرے فرومایگان ذوق ادب کے خلاف جو تحقیر آمیز کلمات ملتے ہیں ، اُن صب کی تیزی اور تندہی کا سر چشمہ ہیں کلکتہ والا ہنگامہ تھا۔"

کلکتے میں انہوں نے ہشن کا مقدمہ گورنر جنرل کی کونسل میں پیش کیا لیکن جواب یہ ملا کہ چونکہ یہ مقدمہ دلی میں ریڈیڈنٹ کے سامنے پیش ہو چکا ہے ، اس لیے اس کی رپورٹ پر مناسب کارروائی کی جائے گی۔ اس طرح غالب نے ماہوسی کے عالم میں واپسی کا ارادہ کیا اور فروری ۱۸۳۹ء میں دلی واپس پہنچے۔

غالب کے دلی واپس پہنچنے کے چند سال بعد ۱۸۳۵ء میں دلی کے ریڈیڈنٹ ولیم فریزر کے قتل کا واقعہ پیش آیا۔ اور نقشہ یہ یہ ثابت ہوا کہ اس

قتل میں نواب شمس الدین احمد خان کا ہاتھ ہے۔ چنانچہ، تحقیقات کے بعد فریرو کے قاتلِ کرمِ خاں اور اس کے ساتھ ہی شمس الدین احمد خاں کو بھانسی دے دی گئی اور ان کی رہاست کو بہ حق سرکار ضبط کر لیا گیا۔

اس واقعے کے بعد غالب کو ساڑھے سات سو روپیہ سالانہ کی پنشن دہلی کے کلکٹر کی طرف سے ملنے لگی، لیکن یہ فیصلہ ہوا کہ وہ اس سے زیادہ کے حق دار نہیں ہیں۔ غالب اس مقدمہ کو گورنر جنرل ٹک لے گئے لیکن انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر ۱۸۴۳ء میں ایک عرضداشت ملکہ وکٹوریہ کو بھی بھیجی لیکن اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

یہ زمانہ غالب پر مالی اعتبار سے بہت سخت تھا اور وہ بڑی پریشانیوں کے شکار تھے۔ لیکن اس عالم میں بھی ان کا یہ حال تھا کہ جب ۱۸۴۲ء میں انہیں دہلی کالج کی مدرسے پیش کی گئی تو انہوں نے صرف اسی بنا پر اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ مسٹر ٹامسن نے ان کا خاطر خواہ استقبال نہیں کیا تھا۔ اس سے غالب کے احساس برتری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۸۴۷ء میں غالب کو اپنی زندگی کے سب سے زیادہ افسوسناک واقعے سے دو چار ہونا پڑا یعنی وہ تار بازی کے الزام میں گرفتار کیے گئے، ان پر مقدمہ چلایا گیا اور انہیں چھ ماہ قید یا مشقت کی سزا دی گئی۔ لیکن صرف تین مہینے قید میں رہنے کے بعد ڈاکٹر واس کی سفارش پر انہیں رہا کر دیا گیا۔ اس واقعے سے ان کی عزت کو ٹھیس لگی اور اس نے زندگی کو ان کے لیے ایک عذاب بنا دیا۔ حالی نے ”یادگار غالب“ میں غالب کے ایک فارسی خط کا ترجمہ درج کیا ہے جس سے اس ذہنی کیفیت کی وضاحت ہوتی ہے جو اس واقعے کے بعد غالب پر طاری ہوئی تھی۔ لکھتے ہیں :

”کوئوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف، لہذا گہات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودیکہ مجسٹریٹ کوئوال کا حاکم ہے، میرے باب میں وہ کوئوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔ شش جج باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتنا اور اکثر صحبتوں میں ملے ٹکلفانہ ملتا تھا، اس نے بھی اغاز اور تفاؤل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا گیا مگر کسی نے نہ سنا اور وہی حکم بحال رہا

بہر معلوم نہیں کیا باعث ہوا کہ جب آدھی سعاد گذر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی آ گیا۔ اور حکم صدر میں میری رہائی کی رپورٹ پہنچنے پر اس کی بہت تعریف کی۔ اور میری خاکساری اور آزاد روی سے اس کو مطلع کیا۔ یہاں تک کہ اس نے خود بخود میری رہائی کی رپورٹ بھیج دی۔ اگرچہ میں اس وجہ سے کہ ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا۔ جو کچھ گذرا اس کے نفع سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے اس پر راضی ہوں۔ مگر آرزو کرتا آئین عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ اب دلیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں۔ روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے۔ یہ بھی جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جانے پناہ اور آستانہ رحمتہ للعالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھئے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جان فرسا ہے نجات پاؤں، اور بغیر اس کے کوئی منزل مقصود قرار دوں، سر بھرا نکل جاؤں، یہ ہے جو کچھ کہ مجھ پر گذرا اور یہ ہے جس کا میں آرزو مند ہوں۔^{۱۲۲}

غرض یہ کہ غالب کی زندگی کے یہ پچیس تیس سال ان کے لیے بہت سخت تھے۔ اس زمانے میں ان کی زندگی ایک بے سروسامانی کے عالم میں گزری سالی مشکلات نے ان کا زندہ رہنا مشکل کر دیا۔ پھر ان کے پاؤں میں چکر رہا۔ وہ لکھنؤ، بنارس، الہ آباد اور کلکتے میں مارے مارے پورے۔ لیکن جس مقصد سے انہوں نے یہ سب کچھ کیا تھا، اس کا نتیجہ کچھ نہ نکلا اور ناکام دلی واپس آئے۔ پھر وہی سہی کسر اسیری کے واقعے نے پوری کر دی اور ان کی عزت و آبرو کو خاک میں ملا دیا۔

غالب کی شخصیت کی بڑائی اس میں ہے کہ انہوں نے ان تمام ناسازگار حالات کا مقابلہ نہایت خندہ پیشانی اور جرأت سے کیا اور کبھی بہت نہ ہاری۔ جہد مسلسل ان کا شعار رہا اور جیتے، زندہ رہنے اور زہست کرے کی

آرزو ان کا نصب العین !

اور یہ ان کی شخصیت کا شاید سب سے اہم پہلو ہے !



غالب پر زندگی میں جو مصیبتیں پڑیں اور حالات نے ان کے دل پر جو کاری زخم لگائے ، ان کی تلافی اگرچہ کسی حد تک اس سے ہو گئی تھی کہ ۸۵۰ع میں وہ نصیر الدین عرف ، ہاں کالے صاحب اور حکیم احسن اللہ خان کی سفارش پر قلمی کے ساتھ منسلک ہو گئے تھے ۔ بہادر شاہ ظفر نے نجم الدولہ ، دوبر الملک ، نظام جنگ ، کہہ کر انہیں مخاطب کیا تھا اور شاہان تیموری کی تاریخ مسہر فیم روز لکھنے کی خدمت ان کے سپرد کی تھی ۔ پچاس روپے ماہانہ مشاہرہ مقرر کیا تھا ۔ اس کے علاوہ ولی عہد سلطنت میرزا فطرو بھی ان کے شاگرد ہو گئے تھے اور چار سو روپے سالانہ تنخواہ ان کی طرف سے بھی انہیں مل جاتی تھی۔ پھر نومبر ۸۵۳ع میں جب ذوق کا انتقال ہوا تھا تو غالب ، شاہ ظفر کے باقاعدہ استاد ہو گئے تھے ۔ واجد علی شاہ کی طرف سے بھی انہیں پانچ سو روپے سالانہ کی رقم مل جاتی تھی ۔ لیکن یہ سکون و اطمینان بالکل وقتی اور عارضی تھا ۔ کیونکہ ۸۵۶ع میں میرزا فطرو کا انتقال ہو گیا ، اسی سال واجد علی شاہ معزول کر دیے گئے اور انہیں مشیا برج بھیج دیا گیا ۔ پھر قیامت یہ ہوئی کہ ۸۵۷ع میں ہنگامہ ہو گیا جس کو ہندوستان کی تاریخ میں غدر کا نام دیا جاتا ہے لیکن جو درحقیقت سیاسی طاقت کو ایک دفعہ پھر حاصل کرنے کے لیے ، مسلمانوں کی ایک اضطرابی اور غیر منظم کوشش تھی ۔ وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے ، انہیں شکست ہوئی اور اس شکست کے نتیجے میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کا سارا نظام درہم برہم ہو گیا ۔ بہادر شاہ ظفر معزول کر کے رنگون میں جلا وطن کر دیے گئے ۔ سینکڑوں کو پھانسی دے دی گئی ۔ ہزاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ۔ یہ سب کچھ اس وقت کی زندگی کے لیے آشوب قیامت سے کسی طرح کم نہ تھا ۔

یہ تمام مناظر غالب نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور یہ موج خوں ان کے سر سے بھی گزری ۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے اُلے نہیں۔ یہ زمانہ غالب پر کچھ اور بھی سخت گزرا ۔ آمدن کے ذرائع مسدود ہو گئے تھے ۔ برکھیاں تفتہ ، شیوجی رام اور ہال مکند نے اس زمانے میں ان کی مدد کی

لیکن دلی کے اجڑنے ، مسلمانوں کے تباہ ہونے ، احباب کے پھوٹنے ، ایک معاشرے کے بکھرنے اور ایک تہذیب کے منتشر ہو جانے کا جو صدمہ انہیں ہوا ، اس کی وجہ سے ان کی حیثیت داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی ایک شمع کی سی ہو گئی ۔

غالب نے اس مستحضر لے جا کے حالات اور اپنے تاثرات ’دستبوس‘ کے نام سے ایک رسالے میں قلم بند کئے ہیں ۔ اس میں مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر جولائی ۱۸۵۸ء تک کے واقعات ، حالات اور تاثرات کی تفصیل ہے ۔ اس رسالے سے غالب کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے ۔ اس لیے اس کے چند اقتباسات کا اردو ترجمہ یہاں دے دینا نا مناسب نہ ہوگا ۔ لکھتے ہیں :

”اس سال جس کا مادہ تاریخی یہ رعایت تخریجہ ’مستحضر لے جا‘ ہے ۔ اور اگر صاف صاف پوچھو تو ۱۶ رمضان ۱۲۷۳ء کو پیر کے دن دوپہر کے وقت مطابق ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء اچانک دہلی کے قلعے اور فصیل کی دیواریں لرز اٹھیں ، جس کا اثر چاروں طرف پھیل گیا ۔ میں ڈنڈے کی بات نہیں کر رہا ہوں ۔ اس دن ، جو بہت متعوس تھا ، میراث کی فوج کے بد نصیب اور شوریدہ سر سپاہی شہر میں آئے ۔ نہایت ظالم و مفسد ، انگریزوں کے خون کے پیاسے ، شہر کے مختلف دروازوں کے محافظ جو ان فسادوں کے ہم پیشہ اور بھائی بند تھے ، بلکہ تعجب نہیں کہ پہلے ہی ان محافظوں اور فسادوں میں سازش ہو گئی ہو ۔ شہر کی حفاظت کی ذمہ داری اور حق تک ہر چیز کو بھول گئے ۔ ان یں ہلانے یا مدعو کردہ سپاہیوں کو غرض آمدید کہا ۔ ان مدہوش سواروں اور اکھڑ پیادوں نے جب دیکھا کہ شہر کے دروازے کھلے ہیں اور محافظ سہانے آواز ہی دیوانوں کی طرح ادھر ادھر دوڑ پڑے ۔ جدھر کسی افسر کو پایا اور جہاں ان قابل احترام انگریزوں کے مکانات دیکھے ، جب تک السروں کو مار نہیں ڈالا اور ان مکانات کو بالکل تباہ نہیں کر دیا ادھر سے رخ نہیں پھیرا ۔ ہر شخص غم گین و ماتم زدہ اپنے گھر میں بیٹھ رہا ۔ انہیں غم زدہ لوگوں میں سے ایک میں اہی ہوں ۔ میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ شور و غول مٹا ۔ چاہتا تھا کہ معلوم کروں کہ اتنے

میں شور مچ گیا کہ اندرون قلعہ صاحب ایجنٹ بہادر اور قلعہ دار قتل کر دیے گئے۔ ہر طرف سے پیادوں اور سواروں کے دوڑنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ زمین پر طرف گل انداسوں (یعنی انگریزوں) کے خون سے رنگین ہو گئی۔ باغ کا ہر گوشہ ویرانی اور بربادی کے سبب سے بہادروں کا مدفن بن گیا۔^{۱۱۰}

جب ہنگامہ ختم ہوا اور انگریزوں کی فتح ہوئی تو بے شمار لوگ بھانسی پر چڑھا دیے گئے۔ غالب نے اس کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے :

”اس قید میں قید خانہ شہر سے باہر ہے اور حوالات الدرون شہر۔ ان دونوں میں بے شمار لوگوں کو بھر دیا گیا ہے۔ ان دونوں قید خانوں کے جن قیدیوں کو مختلف دنوں میں بھانسی دے دی گئی ہے، ان کی تعداد فرشتہ موت ہی جانتا ہے۔ شہر میں ایک ہزار سے زیادہ مسلمان نہیں باؤ گئے۔ میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔ جو لوگ شہر سے نکل کر چلے گئے ہیں، ان میں سے کچھ لوگ اس قدر دور نکل گئے ہیں گویا وہ اس سر زمین (دہلی) کے باشندے تھے ہی نہیں۔ بہت سے عالی مرتبہ لوگ شہر کے ارد گرد دو دو چار چار کوس پر ٹیلوں، گڑھوں، چھپروں اور کچے مکانوں میں اپنے نصیب کی طرح آنکھیں بند کیے ہوئے پڑے ہیں۔“^{۱۱۱}

غالب نے ”دستبُو“ میں اپنی یہی حالات بھی لکھے ہیں اور اس ”بر آشوب زمانے میں جو کچھ پریشانیوں انہیں اٹھانی پڑی ہیں ان کا ذکر بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

”جس دن سے گورے مجھے پکڑ کر لے گئے تھے، اس دن کے علاوہ چوکھٹ پر قدم رکھنا، گھر سے باہر نکلنا، گلی یا بازار میں چلنا یا دور سے چوک کو دیکھ لینا نصیب نہیں ہوا ہے۔“^{۱۱۲}

اسی زمانے میں ۲۹ صفر ۱۲۷۷ھ کی شب کو غالب کے چھوٹے بھائی یوسف مرزا کا انتقال ہوا۔ مرنے سے قبل وہ کوئی تیس سال تک دیوانگی کی

۱- غالب : دستبُو (ترجمہ) اردو معلول دہلی : صفحہ ۱۸۴

۲- ایضاً : صفحہ ۲۱۹

۳- ایضاً : صفحہ ۲۰۹

زندگی بسر کر چکے تھے۔ غالب نے اُن کے مرنے کا حال اس طرح لکھا ہے :

”۱۹ اکتوبر کو پیر کے دن نے (جس کا نام ہفتے کے رجسٹر ہے کاٹ دینا چاہیے) آتش فشاں اُڑنے کی طرح دنیا کو لگال لیا۔ اس دن صبح کے وقت وہ کم بخت دربان بھائی کے مرنے کی خبر لایا۔ کہتا تھا کہ وہ گرم رفتار راہ لٹا (یوسف مرزا) پانچ دن تیز بخار میں مبتلا رہا اور آدھی رات کے قریب اس دلہا سے رخصت ہو گیا۔ پانی، رومال، غسل، کوروکن، اینٹ چوئے، گارے وغیرہ کا ذکر چھوڑو۔ یہ بتاؤ میں کیسے جاؤں اور میت کو کہاں لے جاؤں۔ کس قبرستان میں سپرد خاک کروں۔ بازار میں اُچھا برا کسی قسم کا کپڑا انہیں ملتا۔ زمین کھودنے والے مزدور گویا کبھی شہر میں تھے ہی نہیں۔ ہندو اپنے مردوں کو دریا کنارے لے جا کر جلا سکتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی کیا مجال ہے کہ دو تین شخص ساتھ ساتھ راتیں بے گزریں۔ چہ جائے کہ میت کو شہر سے باہر لے جائیں۔ بڑوسیوں نے میری تنہائی پر رحم کیا اور اس کام کو انجام دینے کے لیے تیار ہوئے، پٹالے کے ایک سپاہی کو آگے کیا، میرے دو نوکروں کو ساتھ لیا اور چل دے۔ میت کو غسل دیا، دو تین سفید چادریں جاں سے گھر لے گئے تھے۔ ان میں لیٹا اور مسجد میں جو مکان کے برابر تھی، زمین کھودی میت کو اس میں رکھ دیا اور اس گڑھے کو پاٹ کر لوٹ آئے۔“

”دستبُو“ میں غالب نے اس قسم کے بہت سے واقعات کو جمع کر دیا ہے اور اس طرح یہ مختصر سی کتاب ان کی زندگی کے حالات اور اس زمانے کے واقعات کی ایک اچھی دستاویز بن گئی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس میں غالب نے انگریزوں کا ذکر ہمدردی کے ساتھ کیا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اس برعظیم کے حاکم بن چکے تھے۔ لیکن اس سر زمین کے لوگوں پر جو تباہی آئی، اس کا یہاں بھی غالب نے بڑی شدت کے ساتھ کیا ہے۔

جب غدر کا ہنگامہ ہوا ہے، اس وقت غالب کی عمر پانچو سال تھی۔ اس سے قبل بھی وہ اپنی زندگی کا بیشتر زمانہ پریشانیوں میں گزار چکے

تھے۔ اب غدر کی وجہ سے جو انتشار پیدا ہوا، اس نے تو ان کی دایا بالکل ہی اجاڑ دی۔ انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایک حکومت کو دم توڑتے ہوئے اور ایک تہذیب کو انتشار کا شکار ہونے ہوئے دیکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی بقیہ زندگی بڑی ہی ذہنی پریشانی اور کوفت کی حالت میں گزری۔ زمانے کے غم نے انہیں کہیں کا نہ رکھا۔

اس ہنگامے کے بعد غالب کا دربار رام پور سے تعلق گھبرا ہو گیا۔ ۱۸۵۹ء میں انہیں رام پور سے سو روپے مہینہ تنخواہ ملنا شروع ہوئی اور یہ سلسلہ انتقال کے وقت تک جاری رہا۔ ۱۸۶۰ء میں وہ نواب یوسف علی خان کی دعوت پر رام پور گئے اور وہاں قیام کیا۔ کچھ عرصے بعد دلی واپس آئے۔ ۱۸۶۵ء میں نواب کاب علی خان کی دعوت پر وہ پھر رام پور گئے اور کچھ عرصہ وہاں قیام کیا۔

۱۸۷۰ء میں غالب کی ہشن بھی انگریزوں نے جاری کر دی اور دربار و خلعت کا بھی اجرا ہوا۔ اس لیے مالی اعتبار سے یہ زمانہ غالب کے لیے کسی حد تک سازگار ثابت ہوا۔

لیکن اب ان کے قویٰ نے جواب دے دیا تھا۔ عمر بھی خاصی ہو چکی تھی۔ زندگی میں صلے بھی بہت اٹھائے تھے۔ پریشانیاں بھی بے شمار دیکھی تھیں۔ ذکاوت بھی بہت جھیلے تھے۔ جہد مسلسل نے بھی ٹھکا دیا تھا۔ زمانے کے غم بھی بہت سے تھے۔ بیمار ہونے سے بھی آگھبرا تھا۔ زندگی کے اس دور کی صحیح تصویر ان کے آخری دور کے خطوں میں ملتی ہے۔ میرزا تقی کو لکھتے ہیں :

”اؤ میرزا تقی ! میرے کلمے لک جاؤ۔ بیٹھو اور میری حلیت سنو ! سامعہ مر گیا تھا۔ اب باصرہ بھی ضعیف ہو گیا۔ جتنی قوتیں انسان میں ہوتی ہیں سب مضمحل ہیں۔ حواس سراسر غفل ہیں۔ حافظہ گویا کبھی نہ تھا۔ شعر کے فن سے گویا کبھی مناسبت نہ تھی۔“^{۱۰۱}

”بیانی ! وہ خط پہلا تم کو بھیج چکا ہوں کہ بیمار ہو گیا۔ توقع زیست کی نہ رہی۔ قولنج اور پھر کیسا شدید کہ پانچ پھر مرغ لیم ہسمل کی طرح ٹڑپا گیا۔ آخر عصارہ ریوند اور ارنڈی کا تیل پیا۔ اس

وقت تو بچ گیا۔ قصہ قطع نہ ہوا۔ مختصر کہتا ہوں میری غذا تم جانتے ہو کہ تندرستی میں کیا ہے۔ دس دن دو بار آدھی آدھی غذا کھاتی۔ گویا دس دن میں ایک بار غذا تناول فرماتی۔ کل بے خوف مرگ گیا ہے اور صورت زیست کی نظر آتی ہے۔“

یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :

”یوسف مرزا! میرا خیال سوائے میرے اور میرے خداوند کے کوئی اور نہیں جانتا۔ آدمی کثرت غم سے سوداقی ہو جاتے ہیں۔ عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجوم غم میں میری قوت متذکرہ میں فرق آ گیا تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ بوجھو کہ غم کیا ہے۔ غم مرگ، غم فراق، غم رزق، غم عزت، غم مرگ۔۔۔۔۔“

علامہ الدین احمد خان کو لکھتے ہیں :

”۔۔۔۔۔ میری حقیقت سنو! مجھ پر بھرے زیادہ کا عرصہ ہوا پائیں پاؤں میں ورم کف یا بے پشت یا کو گھبراتا ہوا پنڈلی تک آئیں۔ کھڑا ہوتا ہوں تو پنڈلی کی رگیں بھٹنے لگتی ہیں۔ پیر نہ آٹھا۔ رول کھانے محل مرا نہ گیا۔ کھانا پیس منگا لیا۔ اور حوائج کو کیا کروں۔ یہ سب موقع خیال میں لا کر سوچ لو کہ کیا گزرتی ہوگی۔۔۔۔۔“

میری و حد عیب جنیں گفتہ اند

اپنا یہ مصرع بار بار جبکہ جبکہ بڑھتا ہوں ع

اے مرگ ناگہان مجھے کیا انتظار ہے

مرگ اب ناگہانی کہاں رہی۔ اسباب و آثار سب فراہم ہیں۔ ہائے

الہی بخش خان معروف کا کیا مصرع ہے :

اے جی جاؤں لکل جائے اگر جان کہیں

زائدہ بے فائدہ۔ مرگ کا طالب غالب جمعہ ۳ جولائی ۱۸۶۳ ع۔

منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں :

”قبلہ! میری و حد عیب ساتویں دہائے مہینے گن رہا ہوں۔ قولنج

آگے دوری تھا۔ اب دائمی ہو گیا ہے۔ غذا کم معنوم نہ کہو تو یہ منزلہ مفقود کہو۔ بھر گریں نے مار ڈالا۔ ایک حرارت غریبہ جگر میں پاتا ہوں جس کی شدت سے ابھنا جاتا ہوں۔“ (۱۸۶۶ء)
حکیم سید احمد حسن مودودی کو لکھتے ہیں :

”پیر و مرشد ! آپ کو میرے حال کی بھی خبر ہے۔ ضعف نہایت کو پہنچ گیا۔ ریشہ پیدا ہو گیا۔ یٹانی میں بڑا لتور پڑا۔ حواس مختل ہو گئے۔“ (۱۸۶۶ء)

میر غلام بابا خان کو لکھتے ہیں :

”اگر میری اوقات شب روزی اور میرے حالات آپ دیکھیں تو تعجب کریں گے کہ یہ شعور جیتا کیوں کر ہے۔ صبح سے شام تک ہلنگ پر پڑا رہتا ہے۔ اور بھر دم بدم پیشاب کو اٹھنا ان مجموع مصائب میں سے ادنیٰ مصیبت نہ ہے کہ ۱۶۸۲ء شروع ہوئے۔ ۱۶۸۳ء کی ولادت ہے۔ اب کے رجب کے مہینے سے سترواں سال شروع ہوکا۔ سترا پتہرا بوڑھا اباج آدمی ہوں۔“ (۱۸۶۷ء)

امراض جسمانی کا بیان اور اخلاص ہم دگر کی شرح کے بعد ہجوم غم ہائے بانی کا ذکر کیا کروں جیسا کہ ایر سیاہ چھا جاتا ہے یا ٹھنی دل آتا ہے۔ ہس اللہ ہی اللہ ہے۔“ (۶ اپریل ۱۸۶۸ء)
ان بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لاموافق حالات نے غالب کو آخر عمر میں داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی ایک شمع بنا دیا تھا۔ ناسازگار حالات میں آخر یہ کب تک فروزاں رہ سکتی تھی۔ بالآخر یہ شمع، اسی عالم میں ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔

۱۔ انتخاب خطوط غالب : صفحہ ۱۸۷

۲۔ ایضاً : صفحہ ۱۸۹

۳۔ ایضاً : صفحہ ۱۹۱

غالب
کا
ماحول

غالب اپنے ماحول کی پیداوار تھے اور اس ماحول کا مخصوص رنگ اُن کی شخصیت میں رچا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے سیاسی، معاشرتی، معاشی، اقتصادی، مذہبی اور مذہبی خیالات سے متاثر تھے اور اُن کی ذہنی نشو و نما انہیں حالات کے سایے میں ہوئی ہے۔ انہیں اپنے زمانے کی سیاست اور سیاسی حالات سے بظاہر کوئی خاص تعلق نہیں تھا۔ اُنہوں نے اپنے زمانے کے معاشی، معاشرتی حالات سے بھی براہ راست کوئی خاص دلچسپی نہیں لی، وہ مذہبی آدمی بھی نہیں تھے اور انہیں اپنے زمانے کی مذہبی زندگی سے بھی کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ لیکن چونکہ اُنہوں نے ان حالات کی آغوش میں آنکھ کھولی اور انہیں کے سایے میں ان کی نشو و نما ہوئی، اس لیے وہ براہ راست نہیں تو بالواسطہ طور پر ان سے ضرور متاثر ہوئے ہیں۔ اور ان کی شخصیت میں ان حالات کے اثرات بہت گہرے نظر آتے ہیں۔ اُن کی حرکات و سکنات، عادات و اطوار، انکار و خیالات، نظریات و تصورات سب میں ان حالات کے مختلف اثرات کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ان حالات نے جو مخصوص ماحول پیدا کیا ہے اور اُن کے ہاتھوں اُس زمانے کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جو مخصوص فضا قائم ہوئی ہے، اُس کا نمایاں اثر غالب کی شخصیت میں نظر آتا ہے۔ اس مخصوص ماحول میں جو معیار قائم ہوئے ہیں اور اس مخصوص فضا میں جن قدروں کی ترویج ہوئی ہے۔ غالب کی شخصیت اُن کی صحیح آئینہ دار ہے۔ یہ ظاہر وہ اپنے زمانے کی زندگی سے الگ تھلک رہے ہیں۔ اُنہوں نے اپنی محدود سی دنیا علیحدہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا عام انداز ان کے بیشتر ہم عصروں سے مختلف

معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اس زمانے کی زندگی کا عام انداز ان کی شخصیت میں اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ اور جس ماحول نے اس انداز کو پیدا کیا ہے، وہ اس کے صحیح ترجیاں اور عکس نظر آتے ہیں۔

یہ زمانہ سیاسی اعتبار سے ایک انتشار اور افراتفری کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں مرکزیت ختم ہوئی ہے۔ اقتدار کا خاتمہ ہوا ہے۔ طاقت نے دم توڑا ہے۔ حکومت وقت کی بنیادیں منزلزل ہوئی ہیں۔ نظام مملکت کی جان کے لالچے بڑ گئے ہیں۔ نظام و نسق پر جان کنی کا عالم طاری ہوا ہے۔ زندگی کی جڑیں کھوکھلی ہو گئی ہیں۔ اس کے نتیجے میں، ہنگامے کھڑے ہوئے ہیں۔ کسی چیز کا کچھ ٹھیک نہیں رہا ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہے۔ زندگی میں کوئی نظام و ضبط باقی نہیں رہا ہے۔ بد نظمی زندگی کا قانون بن گئی ہے۔ شورشوں نے سر اٹھایا ہے۔ فتنے بیدار ہوئے ہیں۔ بغاوتوں نے جڑ پکڑی ہے۔ سازشوں کا بازار گرم ہوا ہے۔ شاہان وقت صرف نام کے بادشاہ رہ گئے ہیں۔ قریبی طاقتوں نے انہیں شاہ شطرنج سے زیادہ حیثیت نہیں دی ہے۔ جس کو بھی ذرا سا موقع ملا ہے اس نے من مانی کی ہے اور جس کی لالچی اس کی بھینس کے خیال پر عمل ہوتا رہا ہے۔ انہوں نے ساتھ بیگانے بھی میدان میں آ گئے ہیں۔ سات سمندر پار سے آئے ہوئے لوگوں نے ملکی سیاست میں باقاعدگی سے حصہ لینا شروع کر دیا ہے، اور طاقت کی ہوس نے انہیں جو خواب دکھائے انہیں عملی شکل دینے کی کوشش بھی انہوں نے باقاعدگی سے شروع کر دی ہے۔ وہ صحیح معنوں میں حکمران بن بیٹھے ہیں اور بادشاہوں کو اٹھانے بٹھانے کا کاروبار انہوں نے شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ ان کا اقتدار بڑھنے لگا ہے۔ اس بڑھنے ہوئے اقتدار کو دیکھ کر بہت سے لوگ ان کے ساتھ ہو گئے ہیں۔ اور انہوں نے ان کے اقتدار کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھ لیا ہے۔ چنانچہ عجیب عجیب تمانے ہوتے رہے ہیں۔ اس زمانے کی زندگی ان تماشوں کو نہ صرف دیکھتی رہی ہے، بلکہ ان تماشوں میں اُسے خود بھی شریک ہونا پڑا ہے۔ اور اس طرح وہ خود ایک تماشا بن گئی ہے۔

ان حالات نے اس زمانے کی زندگی کے ہر شعبے کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ معاشرتی زندگی مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔ جو معاشرتی روایات سینہ بہ سینہ منتقل ہو کر اُس وقت کے الراد تک پہنچی ہیں، انہیں ان لوگوں نے

عزیز تو رکھا ہے لیکن وہ انہیں پوری طرح برقرار نہیں رکھ سکے ہیں۔ معیار ڈانوا ڈول ہو گئے ہیں۔ قدریں متزلزل ہو گئی ہیں۔ صرف ان کا خیال باقی رہ گیا ہے۔ اس لیے ان کی عملی شکل اس زمانے میں ذرا کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ افراد کا اخلاقی بکڑا ہے۔ لذت اور تعیش کے خیالات اخلاقی معیاروں کو بھا لے گئے ہیں۔ اس سیلاب کے سامنے بڑے بڑوں کا قدم جانا مشکل ہو گیا ہے اور وہ اس دھارے کے ساتھ بہہ نکلے ہیں۔ مذہبی اور ذہنی، ذہنی اور فکری تحریکیں بھی انہیں سہارا نہیں دے سکی ہیں۔ زندگی میں لوگوں نے پناہ ڈھونڈی ہے۔ ذہنی تعیش کو افراد نے اپنا مزاج بنا لیا ہے۔ فرار پسندی ان کی طبیعتوں میں داخل ہو گئی ہے۔ محض اس زمانے میں زندگی نے عجب عجب طولانوں کو اٹھایا ہے۔ معاشی اور اقتصادی نظام میں رخنے پڑ گئے ہیں اور وہ درہم برہم ہو گیا ہے۔ جب سیاسی زندگی میں سکون و اطمینان اور معاشرتی زندگی میں اعتدال و توازن نہ ہو تو اقتصادی اور معاشی نظام کی بنیادوں کا متزلزل ہو جانا یقینی ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں معاشی اور اقتصادی نظام اقتدار کے فشار نے زندگی میں کچھ عجب انتشار پیدا کر دیا ہے۔ افلاس اور ناداری عام ہوئی ہے۔ بڑے بڑوں کو اس انتشار کی وجہ سے مصیبتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ زرگری کی ہوس جاری رہی ہے اور اس ہوس نے اعلیٰ معیاروں کو پس منظر میں ڈال دیا ہے۔ لوگ اپنی اپنی فکر میں پریشان اور سرگرداں رہنے لگے ہیں۔ محض اس زمانے کی زندگی مجموعی طور پر ان حالات کی وجہ سے بڑے ہی انتشار اور افراتفری سے دو چار ہوئی ہے۔

غالب نے اس آشوب قیامت کی آغوش میں آنکھ کھولی اور اسی سیاسی انتشار، معاشی معاشرتی افراتفری اور ذہنی فشار کے سایے میں زندگی کے دن گزارے۔ یہ سارا ہمانا انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ناسازگار حالات کے تمام مناظر ان کی آنکھوں کے سامنے سے گزرے۔ انہوں نے ان کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی۔ ان کے شہب و فراز کا انہیں علم ہوا۔ چنانچہ اس زمانے کی زندگی کا شد و جزر ان کی شخصیت میں بھی اپنا اثر دکھانا ہے۔ وہ اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنے زمانے کی زندگی کا جزو معلوم ہوئے ہیں۔ بلکہ یہ گہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ اس زندگی کی صحیح نمائندگی کرتے ہیں۔ اور اس زمانے میں جو واقعات ظہور پذیر

ہوئے ہیں ، مجموعی طور پر اُن کا اثر اُن کی شخصیت میں کسی نہ کسی زاویے سے اپنی جھلک ضرور دکھاتا ہے ۔ اس لیے ان حالات و واقعات کی تفصیل و جزئیات کی تلاش و جستجو غالب کے مطالعے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے کہیں کہ اسی آئینے میں اُن کی زندگی اور شخصیت کے خط و خال صحیح طور پر نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں ۔

۲

وہ زمانہ جس کی آغوش میں غالب نے آنکھ کھولی اور جس ماحول میں انہوں نے زندگی کے دن گزارے ، ہندوستانی مسلمانوں کے انحطاط و زوال کا زمانہ ہے ۔ مغلوں کی سلطنت اس زمانے میں زندگی اور موت کی کشمکش سے دو چار ہوئی ہے اور اُس پر عرصے تک نزع کا عالم طاری رہا ہے ۔ انحطاط و زوال کی وہ کیفیت جو اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد رونما ہوئی ، اُس زمانے میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی ۔ عالمگیر کا انتقال ۷۰۷ھ میں ہوا ۔ اُس کی آنکھ بند ہوتے ہی سلطنت سیاسی ہنگاموں سے دو چار ہوئی ۔ مرتے وقت اُس نے اپنے بیٹوں کو ، مل جول کے ساتھ رہنے کی چار وصیت کی تھیں ، اُس کا کوئی اثر نہ ہوا ۔ ادھر اُس کی آنکھ بند ہوئی ادھر آپس میں جھگڑے شروع ہو گئے ۔ تخت و تاج کے لیے لڑائیوں کا ایک سلسلہ جاری ہوا ۔ کبھی ایک بادشاہ تخت پر بیٹھا ، کبھی دوسرا ۔ اس ماحول نے سازشوں کو ہوا دی ۔ چنانچہ مغلوں کی حکومت میں دور دور تک سازشوں کے جال پھیلا دیے گئے ۔ ان سازش کرنے والوں نے کئی پتلیوں کی طرح بادشاہوں کو اپنی گرفت میں رکھا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں کی ماری ساکھ ختم ہو گئی ۔ طاقت نے جواب دے دیا ۔ ہر چیز منتشر ہو گئی ۔ افراتفری کا دور دورہ ہوا ۔ اس صورت حال سے بعض باغیانہ قوتوں نے فائدہ اُٹھایا اور یہ لوگ ہندوستان پر حکومت کرنے کے خواب دیکھنے لگے ۔ چنانچہ لڑائیوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو کم و بیش انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک جاری رہا ۔ ان طاقتوں میں مرہٹے ، سکھ اور انگریز خاص طور پر پیش پیش رہے ۔ ہندوستان کی تاریخ میں تقریباً تین چوتھائی صدی کا زمانہ انہیں ہنگاموں کی تاریخ ہے ۔

یہ ہنگامے کبھی بھی نہ ہوئے یا کم از کم یہ صورت اختیار نہ کرنے ۔ اگر مغلوں کی سلطنت میں داخلی طور پر مرکزیت اور استواری باقی رہتی لیکن مغلوں کی ہوس نے بھائی کو بھائی کے خون کا پیاسا بنا دیا ۔ وہ بات بات پر ایک دوسرے سے لڑنے لگے ۔ سلطنت کو حاصل کرنے کے لیے انہوں نے ایک دوسرے کے خون کو ہانی کی طرح چھایا ، جیسے وہ ان کے نزدیک بہت ہی معمولی سی بات تھی ۔ ان حالات نے جماعت بندیوں اور سازشوں کے لیے زمین ہموار کی ۔ چنانچہ مغلوں کے دور آخر میں یہ سازشیں اور جماعت بندیوں زندگی کا جزو بن گئیں ؛ اور اس زمانے کی سیاسی تاریخ انہیں سازشوں اور جماعت بندیوں کی ایک داستان معلوم ہوتی ہے ۔ یہ سازشیں درباروں ہی تک محدود رہتیں تو صبر تھا ۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ انہوں نے اپنے حدود سے باہر نکل کر بیرونی طاقتوں سے ساز باز بھی شروع کر دی ۔ اور اس طرح ان کے علم بردار ان طاقتوں کے اشاروں پر رقص کرنے لگے ۔ اس زمانے میں مغلوں کا دربار دو جماعتوں کی سازشوں کا شکار رہا ۔ ان میں ایک او ایرانی جماعت تھی اور دوسری تورانی ۔ ہندوستان کی سیاست میں اس وقت انہیں کا عمل دخل تھا ۔ یہ لوگ آپس میں لڑتے رہتے تھے ، اور اس کا اثر اس زمانے کے سیاسی حالات پر پڑتا تھا ۔ سر جادو ناتھ سرکار نے 'تاریخ احمد شاہی' کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس زمانے کا تمام فتنہ و فساد ایرانی اور تورانی اُمراء کے آپس کے جھگڑوں کا نتیجہ تھا ۔ وہ شاہزادوں کو آپس میں لڑاتے تھے تاکہ ان کی اپنی اہمیت محسوس کی جائے اور انہیں من مانی کرنے کے مواقع ملتے رہیں ۔ ان سازشوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے ملک میں ابتری پھیل گئی ۔ صوبے دار اپنے اپنے علاقوں میں خود مختار بن بیٹھے اور اس طرح مغلوں کی مرکزیت کا خاتمہ ہو گیا ۔ بنگال میں علی وردی خاں نے اپنی حکومت بنا لی ۔ اودھ میں سعادت علی خاں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا ۔ نظام الملک نے دکن میں ایک نئی حکومت کی بنیاد ڈال دی ۔ اس طرح ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ۔ اس کے نتیجے میں بعض نئی طاقتوں نے بھی سر اٹھایا ۔ سکھ پنجاب میں حاکم بن بیٹھے اور مسلمانوں کے خلاف ہنگامے کرنے لگے ۔ مرہٹوں نے دکن میں

وہ اودھم مچایا کہ زیست مشکل ہو گئی۔ دلی اور اُس کے اُس پاس کے علاقوں میں جانوں اور روپوں نے اپنے ہتھکڑوں سے قیامت برپا کر دی۔ اور پھر ان حالات کو دیکھ کر انگریز بھی ہندوستان کی سیاست میں بھانہ بٹھے۔ ساحلی علاقوں میں تو اُن کا اثر بہت پہلے سے موجود تھا۔ اب جو انہوں نے یہاں کی سیاسی زندگی کے عام انتشار کو دیکھا تو ان کے دل میں طاقت حاصل کرنے کی خواہش بیدار ہو گئی اور وہ بھی ان ہتھکڑوں میں شریک ہو گئے۔ غرض مغلوں کے انحطاط کے باعث ہندوستان میں سیاسی اعتبار سے بڑی ہی غیر پائنی کیفیت پیدا ہوئی۔ اور ساری زندگی میں انتشار اور ہتھکڑوں کا کچھ اس طرح دور دورہ ہوا کہ ہر چیز کی بنیادیں ہل گئیں، اور زندگی کا ہر شعبہ اپنی جگہ کچھ اکھڑا اکھڑا سا نظر آنے لگا۔

غالب نے جب آنکھ کھولی تو اپنے زمانے کی زندگی کو اسی صورت حال سے دو چار دیکھا۔ یہ شاہ عالم کا زمانہ تھا، جس کی حکومت کچھ عرصے تک مرہٹوں کے رحم و کرم پر رہی لیکن بالآخر ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے مرہٹوں کو دلی سے نکال باہر کیا اور اس طرح شاہ عالم بادشاہ ایک صباد کے چنگل سے نکل کر دوسرے صباد کے چنگل میں بھنس گیا۔ یہ وہی بد قسمت اور تیرہ روزگار شاہ عالم تھا جس نے اس سے قبل زمانے کے ہاتھوں عجب عجب ستم اٹھائے تھے۔ پورے پینتالیس برس تک اُس نے حکومت کی اور ان پینتالیس برسوں میں اس نے وہ کچھ دیکھا کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ خاصے عرصے تک انگریزوں نے اُسے اپنا آئندہ کار بنائے رکھا۔ دو برس تک بادشاہ کو شجاع الدولہ ساتھ ساتھ لیے پھرا۔ کبھی بتارس لیے گیا، کبھی الہ آباد، کبھی لکھنؤ۔ ظاہر میں بادشاہ معلوم ہوتا تھا مگر در حقیقت وہ قیدی اعزاز کے ساتھ تھا۔ پھر انگریزوں نے اس کی ہنسن مقرر کر دی اور وہ الہ آباد میں رہنے لگا۔ ادھر دلی میں احمد شاہ ابدالی نے جوان بخت کو نائب بادشاہ مقرر کیا تھا اور اس طرح دلی کی سلطنت چل رہی تھی۔ مرہٹوں اور جانوں کے ہتھکڑے جاری تھے۔ شاہ عالم کو الہ آباد میں رہتے ہوئے خاصا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس لیے ۱۷۷۱ء میں اُس نے دلی جانے کا ارادہ کیا۔ اور بغیر کچھ سوچے سمجھے

چل دیا۔ میجر جنرل سر روبرٹ ہا کر صاحب کچھ فوج لے کر کٹوا نک
بادشاہ کے ساتھ گیا۔ یہاں ان جنرل صاحب نے بادشاہ سے عرض کیا کہ
آپ دلی نہ جائیے، مگر بادشاہ نے نہ مانا جن اضلاع میں بادشاہ ہو کر
چلا گیا پھر اس کی حکومت کا کوئی نشان ان میں نمودار نہ ہوا۔ اب اس
بادشاہ کی سلطنت میں دو مخالف گروہ تھے۔ ایک مسلمان، جو یہ چاہتے تھے
کہ احمد شاہ ابدالی جس قدر ملک ہمارے لیے چھوڑ گیا ہے، اُس کو اپنے
قبضے میں رکھیں۔ دوسرے مرہٹے تھے، جو یہ چاہتے تھے کہ باقی ہند کی
اڑائی میں جو نقصان ہمارا ہوا ہے اُسے پورا کریں۔ اُس کے موا شجاع الدولہ
ہوا جو اس کی ناک میں رہتا تھا کہ جو گروہ ضعیف ہو اُس سے کچھ
لے مرے۔ انگریز بھی اپنی دانش مندی سے اعتدال کے ساتھ اس منصوبے
کے درمیان تھے۔ اب بادشاہ فتح گڑھ میں پہنچا۔ یہاں احمد بخش بنگش انہیں
دلوں میں مرا تھا۔ اُس کے بیٹے مظفر الدولہ نے باج لاکھ روپیہ فخرانہ
بیش کیا۔ بادشاہ نے یہاں برسات کے سبب سے قیام کیا۔ اس وقت تین ہزار
مرہٹوں کی سپاہ دلی میں موجود تھی۔ مادھو جی سیندھیا چلے فرخ آباد میں
بادشاہ کے پاس آیا اور اپنے عہد و بیان بادشاہ سے ٹھہرا گیا۔ اور
۲۵ دسمبر ۱۷۷۱ء کو بادشاہ قلعہ میں داخل ہوا۔ عبدالاحد خان کشمیری
بادشاہ کا مقرب ہوا۔ مجدد الدولہ کا اُس کو خطاب ملا۔ وہ مدار المہام
بادشاہ کے گھر کا ہوا۔ یہ ایک آدمی بڑا سکڑا اور فریبی تھا۔ اُس کے کاسوں
کا آگے حال معلوم ہوگا۔ مرزا نجف خان نے سپاہیوں اور بہادروں کو تلاش
کرنے اپنے انہیں لائق سپہ سالار بنایا۔ اب یہاں بادشاہ کو اُس کے دوستوں
یعنی مرہٹوں نے چین نہیں لینے دیا۔ دلی اور اُس کے پاس چھوٹی چھوٹی
اڑائیاں ہوتی رہیں۔ کبھی جانوں نے ہتھکڑیاں کیا، کبھی مرہٹے شورش برپا
کرتے رہے، کبھی سکھوں کی یورشیں جاری رہیں۔ بالآخر مادھو جی سیندھیا
دلی پر قابض ہو گیا۔ بیشتر سردار اُس کے مطیع ہو گئے۔ شاہ عالم بادشاہ
اُس وقت لال قلعے میں ایک معزز قیدی تھا۔

۱۔ ذکا اللہ : تاریخ ہندوستان : جلد نہم ، صفحہ ۳۳۹

۲۔ W. Francklin : The History of the the Reign of Shah

Ahmed : P. 179.

اسی زمانے میں غلام قادر روہیلہ کو عروج حاصل ہوا اور اُس نے اپنے باپ کے کھوئے ہوئے جاہ و منصب کو حاصل کرنے کے خیال سے دلی پر حملہ کرنے کے منصوبے بنائے۔ کچھ لڑائیوں کے بعد دلی میں اُس کا تسلط ہو گیا۔ اسی زمانے میں وہ شاہ عالم بادشاہ سے ناراض ہو گیا۔ کیونکہ اُس نے سیندھیا سے ساز باز کر رکھی تھی۔ ”بادشاہ نے ایک خط سیندھیا کو لکھا تھا کہ امداد کے واسطے آؤ اور وہ غلام قادر کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس نے یہ خط بادشاہ کے آگے ڈالا۔ اور اُس کو اور اُس کے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ہتھیار ڈال دو۔ انہوں نے حکم کی اطاعت کی۔ اس کم بخت موذی نے بادشاہ کو قید میں ڈال دیا اور سلیم گڑھ میں سے کسی موزنی مرزا کو بلا کر بادشاہ کے تخت پر بٹھا دیا اور بیدار بخت اُس کا لقب رکھا۔ اور سب سپروں سے اُس کو بادشاہ متوایا۔ تین روز بادشاہ پر بے آب و دانہ گزرے۔ اب غلام قادر نے انتظام کے ساتھ قلعے کے لولٹے کا ارادہ کیا۔ برادر کا دعوے دار اُس کا مرزا اسماعیل بیگ تھا۔ اسے یہ کہہ کر ڈال دیا کہ اپنے لشکر میں چلے جاؤ۔ وہ چلا تو گیا مگر بہت جلد اُس کو اپنی حماقت یہ معلوم ہوئی کہ بغیر لیے دے چلا آیا۔ ایک آدمی غلام قادر کے پاس بھیجا کہ یاروں کا حصہ یاد رہے۔ سارے شہر کے دولت مند اور معزز اہل کاروں کو بلا کر کہہ دیا کہ ہوشیار رہو اور اپنی حفاظت کا بندوبست کرو۔ اور اپنے سپاہیوں اور نائبوں کو حکم دے دیا کہ اگر روہیلے لوٹیں تو تم بھی لوٹو۔ غلام قادر نے اول اپنے نئے بادشاہ سے کہا کہ تمام بیگمات سے جوابرات لے لو۔ جب اُس سے بھی پیٹ نہ بھرا تو شاہ عالم پر دولت بنانے کے لیے غضب توڑنا شروع کیا۔ اُسے یقین تھا کہ اس بوڑھے کو سارے خزانے دکن سے معلوم ہوں گے۔ اب کوئی ظلم و ستم باقی نہ رہا جو اس ظالم نے اس ضعیف پرانہ سال بادشاہ اور اُس کی اولاد پر نہیں کیا۔ اس کو بیدار بخت کے ہاتھوں بٹوایا اور طرح طرح کی جسمانی تکلیفیں دیں۔ ۳ جولائی کو بیگمات کے بدن پر سارے کے نیل ڈال دے اُن کے گلابی گال سارے ٹوٹھڑوں کے لال کو دے اُن کے درد ناک آہ و نالے سے سارا محل ٹھراتا تھا مگر اس کم بخت کے دل میں ذرا رحم نہ آتا تھا۔ اسماعیل بیگ سے ذرا کٹی دہتی تھی۔ اس کے پاس ۳۱ جولائی کو پانچ لاکھ روپیہ بھیج دیا اور پھر کئی روز بعد سات لاکھ روپیہ بھیجا۔ سپاہیوں سے بھی

انسانیت کے ساتھ رویہ لیا۔ پہلی اگست کو پھر بادشاہ کو خزانہ ہٹانے کے لیے آڑے ہاتھوں لیا۔ اس پر بوڑھا بادشاہ چٹلایا کہ 'اڑے کم بخت! خزانہ کہاں دھرا ہے۔ میرے پیٹ میں رکھا ہے۔ اے چبر کرنگال لیے۔' اب بوڑھی بوڑھی بہیموں کی کم بختی آتی۔ اب تک ان کی تعظیم و تکریم ہو رہی تھی کہ ان سے ساری دولت کا ہتھ لگ جائے گا۔ جب ان سے کام نہ چلا تو ان پر غضب ڈھایا۔ ان سب بوڑھیوں میں ممتاز محل سب سے زیادہ ممتاز تھیں۔ انہیں کی سب سے زیادہ فضیلت تھی۔ سب سال و اسباب چھین، بے چاری کو قلعے سے نکال دیا۔ جس کو بادشاہ نے بنایا تھا اس کی تعظیم و تکریم کو بھی اس نے سلام کیا۔ قلعے کے دم اس کے سامنے اڑائے۔ دیوان خاص میں بادشاہ کے برابر جا بیٹھا۔ تاریخ کو تخت کو بھی آگ لگا کر سارا چاندی سونا اس میں سے نکال لیا تین روز کے اندر سارا فرش اکھاڑ ڈالا کہ کہیں اس کے نیچے دھینہ ہاتھ لگے۔ اب ۱۰ اگست ۱۷۷۸ء آئی۔ یہ وہ تاریخ ہے کہ جس کو ہمیشہ خاندان تھپورہ کی تاریخ میں یاد رکھنا چاہیے۔ غلام قادر نے یعقوب علی اور لین چار پٹھانوں کو ساتھ لیا اور شاہ عالم کو دیوان خاص میں بلایا اور پھر خزانہ کو ہوجھا۔ اس نے کہا اگر خزانہ مجھے معلوم ہوتا تو میں کیوں کر اپنے ظروف فقر و غلامی کو بیچ کر اپنے نوکروں کی لالچواہ تقسیم کرنا۔ اگر کوئی دھینہ گڑا دیا ہوا ہوگا تو مجھے کیا اس کا علم ہے۔ اس پر غلام قادر نے کہا کہ اب تو کسی کام کا نہیں، تیرا دلہا میں رہنا بیکار ہے۔ آنکھیں ٹیری نکال لینی چاہئیں، اس پر آہ سرد پھر کر بادشاہ نے کہا کہ 'یہ وہ آنکھیں ہیں جو ساتھ برس تک کلام اللہ پڑھتی رہی ہیں۔ ان پر رحم کر' یہ سن کر بادشاہ کے بیٹے ہوتوں کو جو اس عالم میں اس کے ہمراہ تھے بے تحاشا مارنا دھاڑنا شروع کیا۔ اس پر بادشاہ نے کہا کہ 'ان آنکھوں کے رکھنے کے لیے میں نے اس عذاب اور مصیبت کو دیکھنے کے واسطے نہیں کہا۔ تو ابھی انہیں نکال لیے۔' غرض وہ سفاک تخت پر سے کودا اور بادشاہ کو نیچے لٹا، چھاتی پر چڑھ، ایک آنکھ اپنے خنجر سے نکال لی۔ دوسری آنکھ نکالنے کو یعقوب علی سے کہا۔ اس نے انکار کیا تو فوراً اس کا تلوار سے سر اڑا دیا۔ اس خوف سے اور پٹھانوں نے دوسری آنکھ نکال لی اور پھر بادشاہ کو سلیم گڑھ میں لیے چلے۔ اس وقت جو قلعے کی کثرت ابھی قلع سے بیان نہیں ہو سکتی۔

کوئی شاہ زادہ ہے بس بے کس، غم کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ کوئی شاہ زادی
 سکتے کے عالم میں ہے پوش تھی۔ کوئی ہائے شاہ عالم، ہائے شاہ عالم
 کہہ کر سر ہیٹ رہی تھی۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو آنسو سے پر نہ تھی۔
 کوئی دل نہ تھا جو اس غم سے خالی تھا۔ جب شہر میں یہ خبریں پھیلیں
 تو خوف و ہراس کی وجہ سے لوگ شہر چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔
 لیکن اسی عالم میں مرتے آگئے۔ لڑائی ہوئی۔ غلام قادر زخمی ہو کر
 گرفتار ہوا۔ منہرا میں اُسے سیندھیا کے سامنے پیش کیا گیا۔ سیندھیا نے
 اس کی بڑی فضیلت کی۔ ایک گدھے پر اٹا سوار کیا۔ اور ایک چہرا ساتھ
 کیا اور ہر ایک دکان سے ایک ایک کوڑی نواب باون محال کے نام سے
 مشکوئی۔ پھر اُس کی زبان کلٹ لی، پھر اُس کی آنکھیں پھوڑ ڈالیں پھر
 ناک کان، ہاتھ پیر کلٹ لیے۔ اس طرح لوٹھڑا بنا کر بادشاہ کی خدمت میں
 دلی بھیجا۔ مگر راہ میں موت نے بڑی رفاقت کی۔ کچھتے ہیں ۳ مارچ ۱۷۸۹ء ع
 کو ایک درخت میں اُس کو لٹکا کر پھانسی دے دی۔ یہ لاش قیہ قیہ
 اندھے بادشاہ کے رو برو دیوان خاص میں پیش کش ہوئی۔ لوگ شاہ عالم
 کے استقلال و صبر و تحمل کی بڑی تعریف کرتے ہیں کہ جس وقت آنکھیں
 اُس کی نکالی گئیں اُس نے آف نہ کی۔ اور خدا کو یاد کرتا رہا اور اس
 صدمے کے بعد بھی اتنے دنوں تک زندہ رہا۔ ”شاہ عالم کی وفات ۶۔۸۔۱۷۸۹ء ع
 میں ہوئی۔ زندگی میں زمانے نے اُس پر ایسے ستم ڈھائے کہ جن کے خیال
 سے کاجا منہ کو آتا ہے۔ انگریزوں کی چال بازیوں، مریشوں کی فریب کاریاں
 سکھوں کی ہتک، آرائیاں، روپیوں کی ستم شعاریاں، اُس نے نہ صرف اپنی
 آنکھوں سے دیکھیں، بلکہ اُسے براہ راست اُن سب کا شکار ہونا پڑا۔ اُس
 زمانے میں اس شاہ وقت سے زیادہ مظلوم اور پریشان حال کوئی اور شخص
 نظر نہیں آتا۔

یہ ہتکے غالب نے اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھے لیکن کانوں سے
 سنے ضرور۔ البتہ اُن کی وجہ سے انتشار اور اتراتقزی کی جو فضا اُس زمانے
 میں پیدا ہوئی، وہ اُنہوں نے نہ صرف دیکھی، بلکہ اُن پر اس فضا کا اثر
 بھی ہوا۔ وہ رجب ۱۲۳۱ھ ۲ دسمبر ۱۷۸۹ء ع میں پیدا ہوئے۔ یہ شاہ عالم

ہی کا زمانہ تھا لیکن انہوں نے جب آنکھ کھول کر دیکھا تو انگریز آگرہ اور دلی پر حکمران ہو چکے تھے۔ لارڈ لیک کی فوجیں ۱۸۰۳ء میں دلی میں داخل ہوئیں۔ ان فوجوں نے مرہٹوں کا قلع قمع کر دیا۔ اور انہیں مار کر دلی سے باہر نکال دیا۔ بادشاہ اب تک مرہٹوں کے رحم و کرم پر تھا۔ لیکن اب انگریزوں نے اسے پناہ دی۔ اس کی بادشاہت کو برقرار رکھا۔ اور ایک لاکھ روپیہ سالانہ اس کی پنشن مقرر کی۔ ۱۸۰۶ء میں جب شاہ عالم کا انتقال ہوا تو اس کا ولی عہد اکبر شاہ ثانی تخت پر بیٹھا اور ۱۸۳۷ء تک بادشاہ رہا۔ اس کے زمانے میں ہنگامے کو ختم ہو گئے۔ کیونکہ انگریزوں کی گرفت دلی پر خاصی مضبوط ہو چکی تھی۔ البتہ دربار میں سازشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ انگریز ان سازشوں کو نشوونما کی نظر سے دیکھتے رہے لیکن انہوں نے بادشاہت کو نہیں چھیڑا۔ مغلوں کی نام نہاد حکومت برقرار رہی۔ مکہ انگریزوں کا جلتا رہا۔ اکبر شاہ ثانی کے بعد محمد سراج الدین ظفر بہادر شاہ تخت پر بیٹھے اور ۱۸۵۷ء تک حکمران رہے۔ ان کے زمانے میں غدر بڑا اور انہوں نے بھی عجیب عجیب مہم سہی۔ جوان بیٹوں اور بیوتوں کو ان کی آنکھوں کے سامنے قتل کیا گیا خود جلا وطن کیے گئے۔ ان کے ساتھ ہی مغلوں کی حکومت ہندوستان سے ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

مغلوں کے دور آخر کے یہ سیاسی حالات اس ماحول کو پوری طرح پیش کر دیتے ہیں جو غالب کے زمانے میں موجود تھا اور جس کے سامنے میں انہوں نے زندگی بسر کی تھی۔ ان حالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغلوں کی سلطنت کو گھٹن لگ گیا تھا۔ اور انگریزوں کے بااقتدار تسلط کے وقت تک وہ اسی عالم میں رہی۔ اس زمانے میں سازشوں کا بازار گرم رہا۔ مغل صرف نام کے بادشاہ رہ گئے۔ اس حالت کو دیکھ کر بعض طاقتوں نے ہندوستان کی سیاسی زندگی میں حصہ لینا شروع کیا۔ اور وہ طاقت حاصل کرنے کے خیال سے ہنگامے برپا کرتے رہے۔ ان میں مرہٹے، سکھ، جاٹ، روہیلے اور انگریز سب ہی شامل تھے۔ اس زمانے کی سیاسی تاریخ انہیں طاقتوں کی ہنگامہ آرائیوں کی تاریخ ہے۔ ان طاقتوں کے پیش نظر کوئی بڑا نصب العین نہیں تھا۔ یہ سب کے سب ہندوستان میں کسی طرح اپنا اثر قائم رکھنا چاہتے تھے تاکہ انہیں دولت ملتی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغلوں کو مٹا دینا ان کے

پہل نظر نہیں لیا۔ وہ تو اُن کو اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتے تھے۔ اور اُن کی خواہش یہ تھی کہ مغل ان کے دست نگر رہیں۔ اس صورت حال نے اس انتشار میں کچھ اور بھی اضافہ کیا جو مغلوں کے سیاسی اضطراب کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔

مرہٹے اس انتشار کو پیدا کرنے میں پیش پیش رہے۔ اورنگ زیب عالمگیر ہی کے زمانے سے انھوں نے مسلمانوں کے خلاف ہتھکڑے شروع کر دیے تھے۔ اورنگ زیب نے انہیں کچلنے کی کوشش کی۔ ایک حد تک اُسے کامیابی بھی ہوئی لیکن اس کے مرتے ہی انھوں نے پھر سر اٹھایا اور مغلوں کے خلاف اچھا خاصا محاذ قائم کر لیا۔ اس زمانے میں ان کی طاقت بڑھنے لگی۔ اس کی ایک وجہ شہزادوں اور صوبہ داروں کی آپس کی دشمنی بھی تھی۔ مرہٹوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ اٹھارویں صدی میں وہ شمالی ہندوستان کی طرف بڑھنے لگے۔ اس وقت مغلوں کی حالت خراب تھی، اور روز بروز بد سے بدتر ہوتی جاتی تھی۔ اس لیے اُن کے مقابلے میں صف آوا ہونے کے بجائے مغلوں نے اُن کے ساتھ مصالحت کرنے اور انہیں مراعات دینے کی حکمت عملی کو اختیار کیا۔ اس حکمت عملی نے اُن کی بہت اور بڑھادی۔ بعض مغل بادشاہوں اور سید برادران کی کشمکش نے مرہٹوں کو اور بھی حاوی کر دیا۔ چنانچہ وہ دلی پر حملہ آور ہونے کی بہت کرنے لگے۔ سید حسین علی نے جب مرہٹوں کو دکن میں چوتھ وغیرہ وصول کرنے کا حق دیا تو بادشاہ کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور اُس نے مرہٹوں کے اس حق کو تسلیم نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حسین علی نے مرہٹوں کی مدد سے دلی پر چڑھائی کی۔ اس کے بعد اُن کے حوصلے بہت بڑھ گئے اور انھوں نے زیادہ طاقت حاصل کرنے کی باقاعدہ کوششیں شروع کر دیں۔ چنانچہ وہ دلی اور دوسرے علاقوں پر حملے کرتے رہے۔ لیکن اس وقت تک اُن کا مقصد صرف لوٹ مار تھا۔ اس لوٹ مار اور غارتگری نے سارے ملک میں دہشت پھیلادی۔ بادشاہ تک اس خوف و دہشت کا شکار ہوئے۔ مرہٹوں کے مظالم کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ لوگوں کو مار ڈالنا اور آبادیوں کو تباہ کر دینا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل

تھا۔ وہ صرف لوٹ مار اور قتل و غارت ہی میں پیش پیش نہیں تھے، لوگوں کو تکلیف دے کر خوش بھی ہوتے تھے۔ لوگوں کے ہاتھ پر اور ناک کان کاٹ دینا، عورتوں کو اٹھا لے جانا اور ان کے ساتھ زنا کرنا ان کے معمولات میں داخل تھا۔ آئندہ رام خلص نے چند اشعار میں اس آشوب قیامت کی تصویر کھینچی ہے جو مرہٹوں نے اٹھارویں صدی میں یورپا کر رکھا تھا۔

بر دل ما تیرہ روزاں زان صف مژگان گزشت

آہم از فوج دکن بر ملک ہندوستان گزشت

در چمن بر سرک گلریا لگزدرد صبح از نسیم

بر گریباں انجم از دستم شب بچراں گزشت

مرہٹوں کے ان ہنگاموں نے غلی خدا کو پریشان کر دیا۔ اسی پریشانی کو دیکھ کر شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آ کر جہاد کرنے کی دعوت دی۔ اس نے یہ دعوت قبول کی اور پانی پت کی تیسری لڑائی ہوئی جس میں مرہٹوں کی طاقت کا شہرازہ بکھر گیا۔ اس کے بعد بھی وہ برابر اپنی قوتوں کو جمع کرنے کی کوشش کرتے رہے اور ان کی سازشیں شاہی ہندوستان میں بھی جاری رہیں۔ شاہ عالم کے زمانے میں ان کے رہنا سیندیا نے اچھا خاصا اقتدار حاصل کر لیا۔ انگریزوں کے سامنے اس کی کچھ پیش نہ گئی۔ غرض سازشوں اور جھگڑوں کا سلسلہ برابر جاری رہا اور مرہٹے ایک زمانے تک اس وقت کی زندگی کے لیے مصیبت بنے رہے۔ ان کی وجہ سے سکون ناپید ہو گیا۔ زندگی متزلزل ہو کر رہ گئی۔ نظام اقتدار کی بنیادیں ہل گئیں۔ اور اگرچہ انیسویں صدی کے شروع میں انگریزوں نے ان کا قلع قمع کر دیا لیکن ان کی سیاسی دھماچوکڑی نے جو اثرات جھوڑے تھے، وہ عرصے تک باقی رہے۔ غالب نے آنکھ کھول کر دیکھا تو اپنے ماحول کو انہیں حالات سے دو چار پایا۔

اس سیاسی انتشار کو پیدا کرنے میں مرہٹوں کے ساتھ ساتھ سکھ بھی پیش پیش رہے۔ مغلوں سے سکھوں کی دشمنی بہت پرانی تھی۔ اس کا آغاز اس وقت سے ہوا، جب سکھوں نے اپنے آپ کو مذہبی تحریک کے چیلے

ایک فوجی طاقت میں تبدیل کرنا چاہا۔ اور وہ ہندوستان کی سیاست میں طاقت حاصل کرنے کے خواب دیکھنے لگے۔ گرو نانک نے جو روحانی تحریک شروع کی تھی، اُس کو گرو گووند سنگھ نے خالص مادی اور دنیاوی بنا دیا۔ چنانچہ مغلوں سے سکھوں کے جھگڑے شروع ہو گئے اور وہ غولش کوار تملقات جو باہر اور اکبر کے زمانے میں تھے، ان کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کی بنیاد تمام نر سیاسی تھی۔ سکھوں کے گرو ارجن سنگھ نے تو ایک ہورا سیاسی نظام تیار کر لیا تھا اور وہ اس کو عملی جامہ پہنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ وقت کے ساتھ ساتھ سکھوں میں ملک گیری اور حصول دولت کی ہوس بڑھتی گئی اور اسی صورت حال نے بقول ڈاکٹر تارا چند ایک مذہبی تحریک کو ایسی جماعت میں تبدیل کر دیا جس کو حکمرانی کی ہوس نے دیوانہ بنا دیا۔ سکھوں کے ساتھ مسلمانوں کے جھگڑے جہانگیر ہی کے وقت سے شروع ہو گئے تھے، جب باغی شہزادے خسرو کو گرو ارجن نے پناہ دی تھی۔ اس پر بادشاہ نے گرو ارجن کو دربار میں طلب کیا اور انہیں سزا دی۔ سکھوں نے اپنی تنظیم کا کام جاری رکھا۔ اورنگ زیب عالم گیر کے زمانے میں سکھوں کے گرو تیغ بہادر نے کشمیر میں بغاوت کے شعلے بھڑکائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اورنگ زیب عالم گیر نے انہیں قتل کی سزا دی۔ غرض اس طرح مغلوں اور سکھوں کے درمیان اختلافات بڑھتے گئے اور دشمنی میں اضافہ ہوتا گیا۔ اورنگ زیب عالم گیر جب تک زندہ رہا وہ کچھ نہ کر سکے۔ اُس کے مرنے ہی جب اُس کے جانشینوں میں جھگڑے شروع ہوئے تو سکھوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور وہ مسلمانوں کے خلاف ہتکامیے کرنے پر تل گئے۔ سکھوں کی نفرت صرف حکومت اور شاہان وقت ہی کے خلاف نہیں تھی، عام مسلمانوں کے بھی وہ جانی دشمن تھے۔ چنانچہ جب بھی انہوں نے کوئی حملہ کیا تو اُس میں عام مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگتے اور انہیں تباہ و برباد کیا۔ ان کے ظلم و ستم کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ بچوں اور عورتوں تک کو یہ لوگ مار ڈالتے تھے۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر دیتے تھے۔ مسلمانوں کے دلوں میں اُن کے اس ظلم و ستم کی وجہ سے دہشت بیٹھ گئی تھی۔ مرد اُن کے ڈر کی وجہ سے ہندوؤں کے

گھروں میں چھپ جاتے تھے، اپنے نام بدل لیتے تھے اور عورتیں اپنی عزت اور ناموس کو بچانے کی غرض سے کتوؤں میں ڈوب کر جان دے دیتی تھیں۔^۱ ہندوستان میں اس وقت جو سیاسی انتشار تھا، اس نے سکھوں کو من مانی کرنے کا موقع دیا اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی طاقت بڑھتی گئی۔“ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کا حملہ ہوا، اس کے بعد سکھوں کی طاقت اور بہت میں اضافہ ہو گیا۔ ۱۷۳۹ء سے ۱۷۶۵ء تک متعدد بیرونی حملوں کی وجہ سے حالات خراب ہو گئے اور سکھوں کو ہنگامہ آرائی کا موقع ملا۔ انہوں نے ۱۷۶۵ء میں لاہور پر قبضہ کر لیا اور جہلم سے جمنائیک اپنا تسلط قائم کر لیا۔ ۱۷۶۵ء اور ۱۸۰۰ء کے درمیان ان کا اقتدار اور بڑھا۔ انک سے کرنال تک اور ملتان سے جمنائیک ان کے قبضے میں آ گیا۔ اور انہوں نے دوآبے اور روہیل کھنڈ پر بھی حملے کرنے شروع کر دیے۔ انیسویں صدی کے شروع میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پنجاب میں اپنا اقتدار قائم کیا، اور سکھوں کی طاقت اڑنے پورے عروج پر پہنچ گئی۔“ یہ اس زمانے میں ان ہنگامہ آرائیوں کا سلسلہ کسی حد تک ختم ہوا جو اس سے قبل سکھوں نے برپا رکھے تھے۔ رنجیت سنگھ نے ۱۸۰۹ء میں انگریزوں کے ساتھ صلح کر لی جس کی رو سے اس کی حکومت دریائے ستلج تک محدود کر دی گئی۔ انگریزوں کے ساتھ اس صلح نامے نے دلی اور اطراف دلی میں تو سکھوں کے ہنگاموں کو ختم کر دیا لیکن پنجاب اور سرحد کے علاقوں میں ان کی مسلمان دشمنی جاری رہی، انہوں نے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ اور اسی کے نتیجے میں مولانا سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد عمل میں آئی۔

سکھوں کے ساتھ ساتھ اس زمانے میں جاٹوں کا بھی عروج ہوا اور مغلوں کے دور آخر میں انہوں نے بھی بڑے ہنگامے برپا کیے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد ان لوگوں نے بھی دلی اور اطراف دلی میں لوٹ مار شروع کر دی۔ یہ لوگ بھی مسلمانوں کے جانی دشمن تھے اور ان کے

۱۔ غلام حسین خاں : سیرالماخرین : صفحہ ۴۰۲

۲۔ خلیق احمد نظامی : تاریخ مشائخ چشت : صفحہ ۳۱۸

۳۔ Lyall : Rise and Explanation of British Power in India

پیش نظر بھی مسلمانوں کی بنیادوں کو متزلزل کرنا تھا۔ دلی اور آگرے کے درمیان انھوں نے اپنے چھوٹے چھوٹے قلعے بنا لیے تھے اور موقع پا کر مسلمانوں پر حملے کرنے رہتے تھے۔ ان کا مقصد مسلمانوں کو پریشان کرنا اور لوٹ مار کر کے اپنی ہوس کو پورا کرنا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے اپنے مکتوب میں ان جاٹوں کے بارے میں لکھا ہے :

”غیر مسلموں میں ایک قوم جاٹ ہے جس کی بود و باش دلی اور آگرہ کے درمیان ہے۔ یہ دونوں شہر بادشاہوں کے لیے دو حوٹلیوں کی مانند رہے ہیں۔ محل بادشاہ کبھی آگرہ میں رہتے تھے تاکہ ان کا دیدار اور رعب راجپوتانہ تک پڑے اور کبھی دہلی میں فروکش ہوتے تھے تاکہ ان کی شوکت اور ہیبت سہرند اور نواحی سہرند تک اثر ڈالے۔ دہلی اور آگرہ کے درمیان کے مواضع میں قوم جاٹ کاشت کاری کرتے تھے۔ زمانہ شاہ جہاں میں اس قوم کو حکم تھا کہ گھوڑوں پر سوار نہ ہوں، بدوق اپنے ہاس نہ رکھیں اور اپنے گڑھی نہ بنائیں۔ بعد کے بادشاہوں نے رفتہ رفتہ ان کے حالات سے غفلت اختیار کر لی اور اس قوم نے فرصت کو غنیمت جان کر بہت سے قلعے تعمیر کر لیے اور اپنے ہاس بدوق رکھ کر بٹ ماری کا طریقہ شروع کر دیا۔ اورنگ زیب اس وقت دکن میں قلعہ بیجاپور و حیدر آباد کو فتح کرنے میں مشغول تھا۔ دکن ہی سے ایک فوج جالوں کی تادیب کے لیے اس نے روانہ کی اور اپنے بولے کو فوج کا سردار مقرر کیا۔ رئیسان راجپوتانہ نے اس شہزادے سے مخالفت کر لی۔ لشکر میں اختلاف واقع ہوا۔ جاٹوں کی لہوڑی سے عاجزی پر اکتفا کر کے فوج بادشاہی واپس ہو گئی۔ عہد فرخ سیر کے زمانے میں اس جماعت کی شورش پھر جوش میں آئی۔ قطب الملک وزیر نے زبردست فوجیں ان کی طرف بھیجیں۔ چوراسی جو اس قوم کا سردار تھا، بعد جنگ صلح پر راضی ہو گیا۔ اس کو بادشاہ کے سامنے لانے اور تقصیرات کی معافی دلوائی۔ یہ کام بھی خلاف مصلحت عمل میں آیا۔ پھر عہد محمد شاہ میں اس قوم کی سرکشی حد سے تجاوز کر گئی اور چوراسی کا چچازاد بھائی سورج مل اس جماعت کا سردار ہو گیا اور فساد کا راستہ اختیار کیا۔ چنانچہ شہر ریاتہ جو اسلام کا قدیم شہر تھا اور جہاں علماء و مشائخ سات سو سال سے اقامت پزیر تھے، اس شہر میں قہراً اور جبراً قبضہ کر کے مسلمانوں کو ذلت و خواری

کے ساتھ وہاں سے نکال دیا۔ اُس کے بعد سرکشی برابر بڑھتی گئی۔ بادشاہوں اور امیروں کے اختلافت اور غفلت کی بنا پر کوئی بھی اس جانب متوجہ نہ ہوا۔ اگر بالفرض ایک امیر اُس کی تنبیہ کا قصد کرے تو سورج مل کے کارکن دوسرے امراء کی جانب رجوع کرتے ہیں اور اس طرح بادشاہ کے مشورے کو ہلک دیتے ہیں۔ پسر چھ شاہ کے عہد میں صفدر جنگ ابراہی نے خروچ کیا اور سورج مل سے سازش کر کے ابراہی دہلی پر حملہ کر دیا اور تمام باشندگان شہر کہنہ کو لوٹ لیا۔ پسر چھ شاہ نے شہر کے دروازوں کو بند کر کے جنگ توپ خانہ شروع کی۔ بعض خدا کے فضل سے صفدر جنگ اور سورج مل دو تین ماہ کے بعد فاکامیاب واپس ہوئے اور صلح و موافقت کی داغ بیل ڈالی۔ چونکہ بادشاہ کے آدمی جنگ سے تھک چکے تھے، اس لیے انہوں نے صلح کو غنیمت شمار کیا۔ اُس کے بعد سے سورج مل کی شہرت ترقی پا گئی۔ دہلی سے دو کوس کے فاصلے سے لے کر آگرہ کے آخر تک طول میں اور مہوات کے حدود سے فیروز آباد و شکوہ آباد تک عرض میں سورج مل قابض ہو گیا۔ کسی کی طاقت نہیں کہ وہاں اذان و نماز جاری کر سکے۔“

غرض جانوں نے مغلوں کے دور آخر میں ایسے ہنگامے برپا کیے کہ خلیفہ خدا اُن کے ظلم و ستم سے تنگ آ گئی۔ مسلمانوں پر تو عرصہ حیات تنگ ہو گیا۔ دلی اور اس کے اطراف کے باشندے اُس زمانے میں اُن کی وجہ سے خوف زدہ تھے۔ گھبراہٹ اور پریشانی اُن پر طاری تھی۔ خلیفہ احمد نظامی نے ’چهار کشتن شجاعی‘ کے مصنف کا ایک بیان نقل کیا ہے جس میں اُس نے جانوں کے ہنگاموں کی وجہ سے پیدا ہونے والی پریشانیوں کی وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ”ایک مرتبہ جب جانوں نے لوٹ مار شروع کی تو دہلی کے باشندے گھبراہٹ اور پریشانی میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ وہ در بدر کُلی بہ کُلی مارے مارے پھرتے تھے بلکہ اسی طرح جیسے کوئی ٹوٹا ہوا جہاز ظالم موجوں کے رحم و کرم پر ہو۔ ہانکوں کی طرح ہر شخص پریشان حال اور گھبرایا ہوا نظر آتا تھا“ شاہ ولی اللہ

۱۔ خلیفہ احمد نظامی : شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات :

صفحہ ۱۰۱ - ۱۰۳

۲۔ ایضاً : صفحہ ۳۴۴

نے بھی حافظ جار اتھ کے نام ایک خط میں جاٹوں کے مظالم کا ذکر کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں ۔ ”دلی میں ایک حادثہ ”عظیم واقع ہوا ۔ قوم جاٹ نے دلی کے شہر کہنہ کو لوٹا اور حکومت اس فساد و شرارت کو دفع کرنے سے عاجز رہی ۔ اُنہوں نے مال لوٹے عزت و فاموس کو برباد کیا اور مکانات کو آگ لگائی ۔ اور یہ لوٹ مار کا حادثہ اوائلی ۱۶۹۱ء میں ہوا اور آخر شعبان تک جاری رہا ۔“ جاٹ ایک جاہل قوم تھی ۔ وہ پڑھنا لکھنا تک نہیں جانتے تھے ۔ انہیں کسی چیز کا علم نہیں تھا ۔ اس لیے وہ جنگلیوں اور وحشیوں کی طرح ہنگامے برپا کرتے تھے ۔ ان جاٹوں نے مغلوں کے دور آخر میں زیست مشکل کر دی تھی ۔ اُن کے ہنگاموں کا یہ سلسلہ انگریزوں کے تسلط کے وقت تک جاری رہا ۔ جب انگریز دلی پر حکمران ہو گئے تو سکھوں اور مرہٹوں کی شورشوں کے ساتھ ساتھ جاٹوں کی شورش بھی ختم ہو گئی ۔

غالب نے اپنی آنکھوں سے جاٹوں کے یہ ہنگامے تو نہیں دیکھے کیونکہ انہوں نے جب ہوش سنبھالا تو انگریز دلی میں داخل ہو چکے تھے ۔ لیکن جو اثرات ان جاٹوں نے دلی کی زندگی پر اپنی شورش سے چھوڑے تھے ، اس کو انہوں نے ضرور دیکھا اور وہ اُن سے متاثر بھی ہوئے ۔ ان ہنگاموں نے دلی کی سیاسی ، معاشرتی اور معاشی زندگی کی بنیادیں ہلا دی تھیں ۔ انیسویں صدی کے شروع کی دلی میں بھی اس کا اثر باقی تھا ۔ اس لیے غالب ان اثرات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے ۔

اس میں شبہ نہیں کہ انیسویں صدی کے شروع میں انگریزوں نے فاتح کی حیثیت سے داخل ہو کر ان تمام ہنگاموں کو ختم کیا جو مرہٹوں ، سکھوں اور جاٹوں نے اس سے قبل برپا کر رکھے تھے اور اس طرح اس سیاسی انتشار کا یقیناً خاتمہ ہوا جس کا سلسلہ تقریباً ایک صدی سے دلی اور اطراف دلی میں جاری تھا ۔ اب زندگی کی بحیرہ یعنی کیفیت بڑی حد تک ختم ہو گئی اور لوگ وقتی طور پر کسی حد تک مطمئن بھی ہو گئے ۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ انگریز بہ ذات خود ایک ایسے سیاسی انتشار کا باعث بنے جس کا تصور

بھی اس سے قبل کسی نے نہیں کیا تھا۔ جب ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی فوجیں دلی میں داخل ہوئیں تو گویا صحیح معنوں میں مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور اس ملک کے باشندے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیے گئے۔ سیاسی طاقت تو انھوں نے اس سے قبل بھی حاصل کر لی تھی۔ وہ بادشاہوں کو لڑاتے اور ان کے ساتھ خود بھی لڑتے تھے۔ ہندوستان کے بعض علاقوں میں تو باقاعدہ ان کی حکومت تھی اور اس حکومت کو انھوں نے اپنی حکمت عملی اور شمشیر کے زور سے حاصل کیا تھا۔ وہ اس وقت تک اتنے طاقتور ہو چکے تھے کہ مغل بادشاہوں کی ان کے سامنے کوئی حیثیت نہیں تھی، وہ انھیں اپنا 'آلہ' کار بناتے تھے۔ انھیں تخت سے اتارتا اور تخت پر بٹھانا ان کے لیے معمولی بات تھی۔ وہ بادشاہ سے دیوانی لے سکتے تھے اور ان کی طرف سے اسے ہشون مل سکتی تھی۔ غرض انھوں نے ہندوستان کی سیاست میں بڑا عمل دخل پیدا کر لیا تھا، ان کی طاقت اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ ہندوستان کے حکمرانوں کو خاطر میں نہیں لانے لگے اور پھر انھوں نے اس وقت تک جو کچھ حاصل کر لیا تھا، وہ اسی پر قانع نہیں تھے۔ ان کی سیاسی ریشہ دوالیاں جاری تھیں، اور وہ دلی میں بیٹھ کر سارے ہندوستان پر حکومت کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔

۱۸۰۳ء کی لڑائی میں انھوں نے دلی کو فتح کر لیا تھا۔ وہ چاہتے تو اس وقت مغلوں کی بادشاہت کو ختم کر سکتے تھے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ کیوں کہ ان کے خیال میں مغل بادشاہ کو اپنا 'آلہ' کار بنا کر باقی رکھنا سیاسی اعتبار سے زیادہ مناسب تھا۔ چنانچہ انھوں نے بوڑھے بادشاہ شاہ عالم کی بادشاہت کو قائم رکھا۔ شاہ عالم کے ایما ہی پر انھوں نے دلی کی لڑائی لڑی اور وہ فاتح کی حیثیت سے اس شہر میں داخل ہوئے۔ بادشاہ سریشوں، جاٹوں اور روہیلوں کی شورشوں سے اتنا پریشان ہو چکا تھا کہ اس نے انگریزوں کو اپنا نہایت دہندہ تصور کیا اور ۱۶ ستمبر ۱۸۰۳ء کو لارڈ لیک سے دربار میں ملاقات کی۔ حالانکہ اس سے قبل اس نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ وہ انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کے لیے تیار ہے، کیونکہ اس کے خیال میں یہ لوگ جس ملک میں جاتے ہیں وہاں نہایت خاموشی سے طاقت حاصل کرنے کی کوشش

کرتے ہیں۔ لیکن انگریزوں کی فتح نے اب اس کے خیال کو بدل دیا اور اس نے انگریزوں کی آمد کو ایک نعمت غیر مترقبہ تصور کیا۔ لارڈ لیک کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ اُسے بادشاہ کی طرف سے خطاب دیا گیا۔ وہی خطاب جو اس سے قبل ہندو کو دیا جا چکا تھا۔ اور جس کا مطلب یہ تھا کہ بادشاہ کی طرف سے نظم و نسق کی تمام ذمہ داری اسے سونپ دی گئی ہے۔ چلے یہ کام ہندو کے سپرد ہوا تھا۔ اب یہ دستار لارڈ لیک کے سر پر باندھی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز صحیح معنوں میں حکمران ہو گئے اور دلی میں ان کے نام کا سکہ چلنے لگا۔ چنانچہ ویلزلی نے بادشاہ کو یہ خط لکھا کہ انگریزوں کے زمانے میں اُسے کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ اور وہ اس و اطعیتان کے ساتھ بسر کر سکے گا۔ ظاہر ہے اس خط کا مطلب یہی تھا کہ انگریزوں کی سیاسی طاقت نے مختلف شورشوں کو ختم کر دیا ہے اور اب وہ بادشاہ کی حفاظت کریں گے اور اُسے زندہ رہنے کا موقع دیا جائے گا۔ انہوں نے دتتا ہوڑھے بادشاہ شاہ عالم کو زندہ رہنے کا موقع دیا اور اس طرح مطمئن ہو کر اپنی سیاسی طاقت کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے کام میں مصروف ہو گئے۔

اس وقت صرف لال قلعے میں بادشاہ کی حکومت تھی۔ اس کی چہار دیواری کے باہر انگریزوں کا سکہ چلتا تھا۔ انگریز لال قلعے کے اندر بادشاہ کی حکومت کو تسلیم کرتے تھے۔ جو لوگ قلعے میں آباد تھے ان کا شمار بادشاہ کی رعایا میں ہوتا تھا اور شاہی خاندان کے افراد کی شہزادوں کی طرح عزت کی جاتی تھی۔ شاہی دربار کے آداب کا خیال رکھا جاتا تھا۔ دربار باقاعدگی سے منعقد ہوتے تھے۔ خطابات کا سلسلہ قائم تھا۔ دربار کی مخصوص زبان بھی باقی تھی۔ انگریز دوسرے درباروں کی طرح دربار میں حاضر ہوتے تھے۔ انگریز ریڈیٹ دیوان خاص میں باقاعدگی کے ساتھ حاضر ہوتا تھا۔ دوسرے درباروں کی طرح وہ نثار خانے کے سامنے اپنی سواری سے اُترتا تھا اور پیدل چل کر لال پردے کے پیچھے سے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور عام درباروں اور امراء کی طرح سامنے کھڑا رہتا تھا۔

اگرچہ سارے ہندوستان میں اب مغل بادشاہ کی کوئی حیثیت نہیں رہی تھی۔ وہ انگریزوں کا ہنشن یافتہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن لال قلعے کے اندر اس کی حکومت تھی اور اُسے پورا اقتدار اور شان و شکوہ حاصل تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس اقتدار اور شان و شکوہ کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ کیونکہ مغلوں کی حکومت کا تو خاتمہ ہو چکا تھا۔ انگریز صحیح معنوں میں حکمران ہو چکے تھے اور بادشاہ کی حیثیت محض شاہ شطرنج کی رہ گئی تھی۔

شاہ عالم بادشاہ اسی عالم میں ۸۰۶ ع تک زندہ رہا۔ وہ مغل بادشاہ جس نے پہن میں نادر شاہ کا حملہ دیکھا، مرہٹوں اور روہیلوں، سکھوں اور جاٹوں کی شورشیں جس کی آنکھوں کے سامنے اُٹھی تھیں، ہانی پت کی تیسری لڑائی جس کے سامنے ہوئی تھی اور جو انگریزوں کے مقابلے میں بکسر کے مقام پر صف آرا ہوا تھا۔ جس نے کلابو کے زمانے میں انگریزوں سے آہ آباد کے مقام پر صلح کی تھی جو ہسٹنگز کی پروا کیے بغیر انگریزوں کو چھوڑ کر دلی چلا آیا تھا۔ تقریباً تین جوتھائی صدی کے ان سیاسی ہنگاموں سے دو چار رہ کر ۸۰۶ ع میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔ اس کے بعد کئی بادشاہ تخت پر بیٹھے لیکن انگریزوں کے سیاسی اقتدار پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ جس طرح چاہتے تھے، ان بادشاہوں کے ساتھ برتاؤ کرتے تھے۔ ان کے سیاسی اقتدار اور عسکری طاقت نے ان بادشاہوں کو ان کا دست نگر بنا دیا تھا۔ مغلوں کے آخری تاج دار بہادر شاہ ظفر تک یہ صورت حال باقی رہی۔ بالآخر ۸۵۷ ع میں مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی۔ یہ انگریزوں کی سیاسی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی آخری کوشش تھی، جس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں کی سلطنت ختم ہو گئی۔ انگریز حکمران ہو گئے اور اس سر زمین پر سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے۔

یہ سیاسی ماحول تھا جس کے سائے میں غالب نے آنکھ کھولی۔ ان میں سے بعض واقعات تو ان کی آنکھوں کے سامنے ہوئے۔ بعض واقعات ان سے قبل ہو چکے تھے۔ لیکن ان واقعات نے ان کے ماحول پر جو اثر کیا تھا، اس کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے ضرور دیکھا۔ مرہٹوں کی یورشیں،

جاٹوں اور سکھوں کے ہنگامے اور انگریزوں کی ہوس ملک گیری کے سارے تماشے انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اور ان سب کے نتیجے میں ان کا ماحول جس انتشار اور افرائی سے دو چار ہوا تھا، اُس کو انہوں نے شدت سے محسوس کیا۔ وہ جب پیدا ہوئے تو یقیناً بہت سے ہنگامے غم ہو چکے تھے۔ انگریزوں نے مرہٹوں کی طاقت کو غم کر دیا تھا۔ لیکن وہ غود صحیح معنوں میں حکمران بن بیٹھے تھے اور ملاؤں کی حکومت صرف لال قلعے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس صورت حال نے بہت سے فتنوں کو جنکایا۔ ماحول میں سازشیں ہی سازشیں تھیں۔ انگریزوں نے ان سازشوں کو ہوا دی تاکہ ان کا اقتدار باقی رہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس سر زمین پر ان کی بنیادیں زیادہ سے زیادہ مضبوط ہوتی جائیں۔

غرض غالب کے سیاسی ماحول میں بڑا انتشار تھا، زندگی کی بنیادیں متزلزل ہو گئی تھیں اور ہر چیز اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی۔

۳

اس سیاسی صورت حال نے اس زمانے کے مسلمانوں پر عرصہٴ حیات تک کر دیا تھا۔ الہاویں اور انیسویں صدی کے ہندوستان کی تاریخ مسلمانوں کے درد و الم کی ایک طویل داستان ہے۔ ۱۷۳۲ء میں قادر شاہ کا حملہ ہوا اور مسلمانوں کی پریشانیوں کا ایک ایسا باب کھل گیا جو ۱۸۵۷ء کے بعد تک جاری رہا۔ ہر صبح ان کے لیے ایک نئے فتنے کا بیغام لاتی تھی۔ —مرہٹے، جاٹ، سکھ، تینوں کی ہنگامہ آرائی نے زندگی کو ایک مصیبت بنا دیا تھا۔ بھر افتنانوں کے حملوں نے تو جان ہی نکال دی۔ —سکھوں، مرہٹوں اور جاٹوں کے حملوں سے بھارت ملی تو غیر ملکی حکومت کا تسلط سر پر پایا۔ مسلمان پانچ سو سال سے زیادہ تک حکمرانی کر چکے تھے اور ان ہی سے سیاسی اقتدار بھی چھینا گیا تھا۔ اس بنا پر انگریزی حکومت نے ان پر سختی کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں مسلمانوں کے جان، مال اور آبرو سب پر مصیبت آئی اور پوری قوم پر نکبت اور افسردگی کا عالم طاری ہو گیا۔ ان حالات میں معاشی بد حالی اور

معاشرتی اضطراب نے پرورش پائی - جیسے کے لالے بڑ گئے - زندگی دوبارہ ہو گئی - زندہ رہنے کے لیے افراد نے عیش کوشی اور تمیش پسندی کا سہارا لیا ، جس نے ماری معاشرتی زندگی کی صورت مسخ کر دی - اخلاقی معیار بدل گئے اور زندگی کے حقائق سے فرار اور اس کی اعلیٰ قدروں سے انحراف اُن کا مزاج بن گیا - انیسویں صدی کی دلی میں یہ معاشی بد حالی اور اُس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی معاشرتی انفراتفری زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتی ہے ، اور تقریباً ہر طبقے کے افراد اُس کے شکار دکھائی دیتے ہیں - جس سر زمین پر کم و بیش ایک صدی تک سیاسی اقتدار کو حاصل کرنے کے لیے یہ ہتکے ہوئے رہیں ، جہاں مرکز کم زور ہو گیا ہو ، جہاں بادشاہ صرف نام کے بادشاہ رہ گئے ہوں ، جہاں داخلی شورشوں نے سارے نظام کو درہم برہم کر دیا ہو ، جہاں بیرونی طاقتوں نے سیاست میں اپنا اثر قائم کر لیا ہو اور جہاں داخلی انتشار سے تنگ آکر لوگ بیرونی حملہ آوروں کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھنے کے لیے تیار ہو جائیں ، وہاں اس صورت حال کا پیدا ہو جانا ایسا کچھ عجیب نہیں ہے -

اور تک زہب عالم گیر کی وفات کے بعد مغلوں کی حکومت روز بروز سیاسی اعتبار سے کم زور ہوتی گئی تو اس کا اثر معاشی ، اقتصادی اور معاشرتی زندگی پر بھی ہوا - دور آخر کے مغل بادشاہ اس صورت حال سے بالکل بے خبر رہے - سیاسی انتشار نے انہیں اپنی دنیا الگ بنانے کے لیے مجبور کر دیا تھا - اس محدود دنیا میں رہ کر وہ اپنی زندگی کے دن گزارنا چاہتے تھے - انہیں اس کا علم نہیں تھا کہ ان کے اُس پاس کی زندگی میں اندر ہی اندر کس طرح کے طوفان اُٹھ رہے ہیں اور اُن پر ان طوفانوں کا نتیجہ کیا ہونے والا ہے - دولت کو بڑھانے اور اُس کے نظام کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے جس سکون کی ضرورت ہوتی ہے ، وہ انہیں نصیب ہی نہیں تھا - یہی وجہ ہے کہ وہ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا خیال تک دل میں نہیں لاتے تھے - زندگی میں اُن کی دلچسپیاں ایسی چیزوں سے بڑھ گئی تھیں جن کے لیے دولت درکار ہوتی ہے اور جن کو حاصل کرنے کے لیے قانون کے خزانے بھی ہوں تو خالی ہو جاتے ہیں - سیاسی انتشار نے دولت کی پیداوار کو گھم کر دیا تھا - مرکز کی کم زوری نے دولت کی فراہمی کے ذرائع اور وسائل محدود کر دیے تھے لیکن دولت کو صرف کرنے

کی ہوس بڑھ گئی تھی۔ اخراجات میں اضافہ ہو گیا تھا اور اس کی وجہ ہوا و ہوس اور ذہنی تعیش اور عیش کوشی کے وہ میلانات تھے جن کو ان بادشاہوں نے اپنے مزاجوں میں داخل کر لیا تھا۔ اورنگ زیب کے بعد جتنے بھی بادشاہ ہوئے کم و بیش سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ دولت کو ہانی کی طرح پہانا ان کے معمولات میں داخل تھا۔ اورنگ زیب کے جانشین بہادر شاہ کی فیاضی مشہور ہے۔ اس نے اپنی دولت کو اس طرح لٹایا کہ مالی اعتبار سے اس کی حکومت تباہی کے قریب پہنچ گئی۔ اس کے بعد جہاں دار شاہ کے زمانے میں اس کا حال کچھ اور بھی خراب ہو گیا۔ اس کی عیاشی نے خزانے خالی کر دیے۔ اس نے بھی دولت بری طرح لٹائی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی محبوبہ لال کنور پر دو کروڑ روپیہ سالانہ خرچ ہوتا تھا۔ دربار میں عیش و عشرت کی فضا تھی۔ اس پر بری طرح روپیہ خرچ ہوتا تھا۔ نرخ سیر کو گھوڑے ہالنے کا شوق تھا۔ اس نے بے شمار گھوڑے ہال رکھے تھے اور ان گھوڑوں پر ہزاروں روپیہ خرچ ہوتا تھا۔ شاہ عالم کے اخراجات زیادہ نہیں تھے۔ آخر وقت میں تو جو رقم اُسے انگریزوں سے ملتی تھی، اس میں سے وہ خاصا بچا لیتا تھا۔ کیونکہ بڑھاپے میں اس کے اخراجات محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ لیکن اس کے جانشین اکبر شاہ ثانی نے تخت نشین ہونے کے بعد انگریزوں سے زیادہ رقم طلب کرنے کی خواہش ظاہر کی کیونکہ اس کے اخراجات بڑھ گئے تھے۔ اس وقت دلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور وہ سیاہ و سفید کے مالک بن چکے تھے۔ اس لیے مغلوں کی دولت ان کے ہاتھ میں تھی۔ ملک کی معاشی اور اقتصادی زندگی کو انہوں نے اپنے قبضے میں گر لیا تھا۔ غرض انگریزوں سے قبل سفل بادشاہوں کی زندگی کے عام انداز نے ملک کی معاشی اور اقتصادی زندگی کی بنیادیں ہلا دیں۔ ان کے بعد جو رسی سبھی کھسک تھی وہ انگریزوں نے پوری کر دی۔

یہ انگریز دولت کے بیہوش تھے۔ ہندوستان کی دولت نے ان کی آنکھوں کو غیرہ کر دیا تھا۔ وہ اسی دولت کو حاصل کرنے اور اس کے ذرائع

اور وسائل پر قبضہ جانے ہی کے لیے اس ملک کی سیاست میں داخل ہوئے تھے۔ شروع شروع میں حکومت کرنا ان کا مقصد نہیں تھا۔ وہ سلطنت بنانے کے خواب کم دیکھتے تھے۔ صرف دولت حاصل کرنا ان کے پیش نظر تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس ملک کی دولت کو خوب خوب لوٹا۔ اٹھارویں صدی میں دولت کو لوٹنے کا یہ سلسلہ براہ راست جاری رہا۔ بے شمار دولت وہ انگلستان لے گئے۔ خزانے کے خزانے انہوں نے خالی کر دیے۔ یہ کمپنی کے زمانے کی بات ہے۔ کمپنی کی بنیاد تجارت ضرور تھی، لیکن حالات نے تجارت سے زیادہ لوٹ مار کو اس کا نصب العین بنا دیا تھا۔ وہ بادشاہوں سے دولت حاصل کرتے تھے۔ عوام کو لوٹتے تھے۔ اس ملک کی معاشی اور اقتصادی زندگی کو متاثر کرنا ان کے پیش نظر نہیں تھا۔ انہیں صرف اپنے آپ سے اور اپنی ہوس سے مطمئن نہ تھے۔ اسی لیے حکمران ہونے کے بعد بھی وہ یہاں کی معاشی اور اقتصادی حالت کو متاثر کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ لوٹ مار کا سلسلہ اب بھی اسی طرح جاری رہا۔ انہوں نے اس ملک میں اپنا زرعی نظام قائم کیا جس نے ٹی جاگیرداروں پیدا کیں۔ اس کا مقصد بھی اپنے شکم کو بھرنا تھا۔ اس زمانے میں رشوتیں لینے اور تحفے قبول کرنے میں بھی وہ پیش پیش رہے۔ یہاں کے سیاسی انتشار نے ان کی طاقت میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس طاقت سے انہوں نے غلط فائدہ اٹھایا، انفرادی اور اجتماعی طور پر انہوں نے یہاں کی دولت سے خوب خوب اپنی جھولیاں بھریں اور ساری دولت کو سمیٹ کر سات سمندر پار لے گئے۔ اس صورت حال نے یہاں کی معاشی اور اقتصادی زندگی کو جو نقصان پہنچایا، اس کی مثال تاریخ میں کہیں اور نہیں مل سکتی۔ داخلی لڑائیوں، بیرونی حملوں اور سیاسی سازشوں نے بھی اس زمانے کی معاشی اور اقتصادی زندگی کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا کہ انگریزوں کی اس ہوا و ہوس نے پہنچایا۔ مختصر یہ کہ کمپنی نے اپنی تجارت اور حکومت کے مخلوط عہد میں حکومت کے پردے میں خوب زرکشی کی اور اس طرح ہندوستان کی صنعت و حرفت اور تجارت کو بہرہاد کیا۔ انہیں بڑے عہدوں سے غارج کیا۔ عدالتوں کو ذریعہ آمدنی قرار دینے کے ساتھ ہندوستانیوں سے تحقیر کا برتاؤ کیا۔ ان

شکایت اور دیگر وجوہ کی بنا پر پارلیمنٹ نے ۱۸۳۲ء میں کمپنی سے تجارت کرنے کا حق چھین لیا۔ لیکن اس کے بعد تو مختلف طریقوں سے اور بھی لوٹ مار شروع ہوئی۔ پہلے دن سے ہندوستان کی تجارت، ملک گیری اور ملک داری میں جو رویہ ہندوستان سے کہا کیا کر لکھا تھا، اس کا منافع تو ہمیشہ کمپنی کے حصہ داروں میں تقسیم ہوتا رہتا تھا اور جو خسارہ ہوتا وہ ہندوستان پر قرضہ قرار دیا جاتا۔ اب کمپنی سے حق تجارت سلب کرنے وقت سلطنت برطانیہ نے طے کر دیا کہ اس نام نہاد قرضے کی رقم پر، جو کروڑوں کی تعداد میں تھا، ہندوستان کے خزانے سے ساڑھے دس فی صدی سالانہ سود کمپنی کو دیا جایا کرے اور چالیس سال آئندہ تک قرضہ کی اصل رقم کمپنی کو ادا نہ کی جائے، بلکہ صرف اس کا سالانہ سود ادا ہوتا رہے اور باوجود سال بہ سال ادا ہونے کے چالیس سال کی میعاد گزر جانے پر کمپنی کو سو فی صدی کی ایک مزید رقم دی جائے تب اس کے قرضے سے سبک دوشی ہو سکے گی۔ غرض اس طرح مختلف طریقوں سے دولت کی نوج کھسوٹ اور لوٹ مار کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جس وقت تک انگریز اس سر زمین پر حکمران رہے۔

ہندوستان کا معاشی اور اقتصادی نظام ان حالات کی وجہ سے تقریباً ڈیڑھ سو سال تک ایک کرب مسلسل کے عالم میں رہا اور انیسویں صدی میں تو اس پر نزع کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ افلاس جہاں کے لوگوں کا مندر بن گیا۔ نہ صرف عوام بلکہ بادشاہ اور امراء تک اس کے شکار ہوئے۔ خلیق احمد نظامی نے 'تاریخ مسالخ چشت' میں مختلف لکھنے والوں کے حوالے سے آٹھارویں صدی کی معاشی اور اقتصادی حالت کی جو تصویر کھینچی ہے، تھوڑے سے فرق کے ساتھ کم و بیش یہی کیفیت انیسویں صدی کی بھی تھی۔ وہ لکھتے ہیں: "احمد شاہ کے زمانے میں شاہی خزانے کی یہ حالت تھی کہ دو دو ڈھائی ڈھائی سال تک عملات کے ملازمین کو تنخواہیں نہیں ملتی تھیں۔ بادشاہ کی ساکھ اس قدر گر گئی تھی کہ مہاجن اور ماہوکار بھی قرض

۱۔ مولانا طفیل احمد سنگھوری: مسلمانوں کا روشن مستقبل : صفحہ ۷۸

۲۔ ایضاً : صفحہ ۹

دینے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے۔ اس زمانے میں شہزادوں کو تین تین دن کے فاقے کونے پڑتے تھے۔۔۔“ سرسید احمد خان لکھتے ہیں : ”اکبر شاہ اگرچہ تخت لشیہ ہونے مگر اخراجات کی تنگی کا وہی عالم تھا جو شاہ عالم کے وقت میں تھا۔ شاہ عالم ہی کے وقت میں اخراجات کی نہایت تنگی تھی۔ تمام کارخانے بند ہو گئے تھے۔ شاہزادوں کو جو قلعے کے فوجیوں میں رہتے تھے ماہواری روپیہ نہیں ملتا تھا اور وہ چھتوں پر چڑھ کر چلاتے تھے کہ بھوکوں مرے ہیں، بھوکوں مرے ہیں۔“ اسپر (Spear) نے اپنی عاتانہ تصنیف *Twilight of the Mughals* میں مغلیہ شہزادوں کے درد ناک مصائب کا نقشہ کھینچا ہے اور بتایا ہے کہ ”ان شہزادوں کو بھوک سے مر جانے دیا جاتا تھا، لیکن مزدوری یا ملازمت کرنے کی اجازت بھی اس وجہ سے نہ ملتی تھی کہ وہ ان کے دون مراقبت تھا۔ ان کی حالت جانوروں سے بدتر تھی۔“ غرض اس طرح اس زمانے کی معاشی و اقتصادی بد حالی نے ہر طبقے کے افراد کو زبوں حال کر دیا تھا اور ان میں سے ہر ایک کی حالت ایسی تھی کہ اس کو دیکھ کر کایجا منہ کو آتا تھا۔ لیکن حالات اس درجہ خراب ہو چکے تھے کہ ان کو درست کرنا کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں تھی۔ لوگوں کو اس زبوں حالی کا احساس ضرور تھا۔ لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے جاں زندگی سے ذہنی طور پر ایک بیزاری پیدا ہو گئی جس نے انہیں بے عمل بنا کر ایک فراری ذہنیت کا شکار کر دیا۔ زندگی کی حقیقتوں سے منہ موڑ لینے کے خیالات ان کے جاں پیدا ہونے لگے اور ایک غیر متوازن زندگی بسر کرنا ان کا مزاج بن گیا۔ اس کی جھلک زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اس زمانے کی معاشرتی زندگی کو اس صورت حال نے بہت متاثر کیا ہے۔

مغل عظیم معاشرتی روایات کے علم بردار تھے اور دور آخر تک آنے آئے تو ان کی ان معاشرتی روایات نے ایک ترشے ہوئے پیرے کی صورت

۱۔ سرسید احمد خان : سیرت فریدیہ : صفحہ ۲۲ - ۲۳

۲۔ خلیق احمد نظامی : تاریخ مشائخ چشت : صفحہ ۲۲۵

اختیار کر لی تھی۔ ان کی حکومت کا خاکہ ہو گیا۔ دولت و ثروت خاک میں مل گئی۔ شان و شکوہ پر ادبار کے بادل چھا گئے۔ معاشی اعتبار سے اتلاس کی تاریکیوں نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ ہمسے ہمسے کو محتاج ہو گئے لیکن معاشرتی ان بان کو انہوں نے حتی المقدور باقی رکھا۔ بلکہ اس زمانے میں تو معاشرتی روایات کو برقرار رکھنے اور ان کو فروغ دینے کا خیال تو ان کے یہاں کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا۔ چنانچہ اس معاشی بد حالی کے باوجود، جو اس زمانے میں سیاسی انتشار اور زوال کی وجہ سے ان کا مقدر بن گئی تھی، انہوں نے اپنی زندگی کے معاشرتی تقاضوں کو پورا کیا اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنی روایات کو عظیم سمجھا اور اپنی محدود دنیا میں رہ کر ان روایات کو برتنے اور ان کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان روایات کو برتنے کے خیال ہی نے ان کے لیے اس میں زیست کا کچھ سامان پیدا کر دیا۔ ورنہ تو سیاسی انتشار اور معاشی انحطاط و زوال نے ان کے لیے زندگی دوبارہ کر دی تھی اور ماحول کو جہنم بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں انہوں نے رین سہن میں زیادہ فضا پیدا کی۔ زندگی کے لطیف پہلوؤں سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا۔ عیش و عشرت کی طرف وہ زیادہ راغب ہوئے۔ لہو و لعب اور تفریح کو انہوں نے اپنی زندگی میں زیادہ اہمیت دی۔ انہوں نے لذت پسندی اور تعیش پرستی کا ماحول پیدا کیا۔ محفلیں منعقد کیں۔ مجلسوں کو آراستہ کیا۔ اپنے آس پاس اور گرد و پیش، رقص و سرود، موسیقی و مصوری، شعر و شاعری اور دوسرے فنون لطیفہ سے دلچسپی لینے کی ایک فضا قائم کی جس کے نتیجے میں عوام اور خواص سب ہی ان سے لطف لینے لگے۔ غرض اس طرح لطیف چیزوں سے دلچسپی لے کر زندگی کو زیادہ سے زیادہ لطیف بنانے کی طرف خاص طور پر توجہ کی گئی۔ چنانچہ اس زمانے میں یہ رجحان عام ملتا ہے اور ہر شخص کی زندگی اس رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے نتیجے میں لذت پرستی کے خیالات ضرور بھیلے ہیں۔ تعیش پسندی کا ماحول ضرور پیدا ہوا ہے۔ لہو و لعب میں زندگی بسر کرنے کی ایک فضا ضرور قائم ہوئی ہے۔ لیکن ان سب کی نہم میں زندگی کو ایک فن بنانے کا احساس ضرور کار فرما ملتا ہے۔ یہ معاشرت اور معاشرتی روایات مقلوں کے دور آخر میں لال قلعے کے

اندر محدود ہو کر رہ گئی ہے اور اس کے باہر لوگوں نے قلعے کو اس معاشرت اور معاشرتی رواہات کی علامت سمجھا ہے۔ چنانچہ لال قلعے کے اندر زندگی کو بسر کرنے کے جو معیار قائم ہوئے ہیں اور وہاں سلاطین و امراء نے اپنے آپ کو جس رنگ میں رنگا اور اپنی زندگی کو جس حالت میں ڈھالا ہے، اس کو قلعے سے باہر لوگوں نے معیار بنایا ہے اور وہ خود بھی اس رنگ میں رنگ گئے ہیں۔ چنانچہ ساری دلی اس زمانے میں معاشرتی اعتبار سے اسی حالت میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے جس کی تشکیل و تعمیر لال قلعے کے اندر ہوئی تھی۔ قلعے کے باہر بھی اس زمانے میں لوگ اپنے آپ کو امیر سمجھتے اور اس امارت و ریاست کو برقرار رکھنے کے لیے زمین و آسمان کے فلاحی ملاتے ہیں۔ زندگی کے لطیف پہلوؤں سے لگاؤ اور نفیس چیزوں سے دل چسپی ان کے مزاجوں میں داخل ہو گئی ہے اور اسی کو انہوں نے زندگی کا معیار سمجھا ہے۔ لہو و لعب اور عیش و عشرت کے خیالات ان کے جہاں بھی بیدار ہوئے ہیں اور انہوں نے ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی میں رنگینوں کا دور دورہ نظر آتا ہے اور ہر شخص اپنے اپنے فکر اور معیار کے مطابق زندگی کو ان رنگینوں سے روشناس کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ گھر گھر محلیں متعلد ہوتی ہیں اور محفلوں کو آرامہ کیا جاتا ہے۔ رقص و سرود کے بازار گرم ہوتے ہیں اور زندگی کو ایک دلوں کی طرح سجانے کی کوشش کی جاتی ہے اور شمشیر و سناں کی بجائے طاؤس و رہاب کی اولیت کے خیالات دلوں میں گھر کر لیتے ہیں۔

اس کا سلسلہ اور تک زیب عالم گیر کی وفات کے بعد ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ محمد شاہ اور فرخ سیر کے زمانے سے لے کر شاہ عالم، اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر تک نہ صرف یہ سلسلہ جاری رہا بلکہ اس میں وقت کے ساتھ ساتھ کچھ شدت بھی پیدا ہوتی گئی۔ محمد شاہ کے زمانے میں تو اس میں ہوس ہرستی اور نعیش پسندی کو زیادہ دخل رہا تھا لیکن آخری بادشاہوں کے جہاں یہ رجحان نسبتاً کم نمایاں نظر آتا ہے، برخلاف اس کے وہ معاشرت اور معاشرتی رواہات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور انہیں باقی رکھنے کا خیال انہیں زندگی کے ان پہلوؤں کی طرف زیادہ متوجہ کرتا ہے جن میں عیش و عشرت اور تمیش پسندی کے رجحانات بھی نمایاں ہو جاتے ہیں۔ دوسرے

لفظوں میں ہوں کہا جا سکتا ہے کہ باوجود سیاسی اضطراب و زوال کے اس زمانے کے بادشاہوں کے پاس ایک معاشرتی شعور تھا اور وہ ہر اس چیز سے دلچسپی لینے اور اسے برقرار رکھنے کی کوشش کرتے تھے جس کا تعلق ان کی معاشرت اور معاشرتی روایات سے تھا۔ وہ صرف ہوس کے بندے ہی نہیں تھے۔ ان کی زندگی کا مقصد صرف تمیش ہی نہیں تھا۔ ان کے پیش نظر معاشرت اور معاشرتی زندگی بھی تھی۔ ان دونوں کو انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کر دیا تھا کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

لال قلعہ، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اس زمانے میں معاشرتی زندگی کا مرکز تھا اور دلی شہر کے تمام رہنے والے اسے اپنی معاشرت کی ایک علامت سمجھتے تھے۔ بادشاہوں کو بھی اس بات کا احساس تھا۔ اس لیے انہوں نے ان تمام ہنگاموں کے باوجود، جن سے وہ دوچار ہوتے رہے لال قلعے کی مرکزیت اور اس کی معاشرتی اہمیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ حالات بھی ایسا کرنے کے لیے کچھ سازگار رہے۔ اگرچہ اس زمانے میں بہت سی جنگیں ہوتی رہیں۔ مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں اور روہیلوں کی یورشوں کا سلسلہ جاری رہا لیکن لال قلعہ اس کے باوجود تباہ نہ ہوا۔ اس پر کبھی زبردست گولہ باری نہیں ہوئی۔ کبھی کہیں سنگ سرخ اور سنگ مرمر کی دیواروں کو نقصان ضرور پہنچا لیکن یہ نقصان بہت معمولی تھا۔ البتہ محل بالکل تباہ ہو گیا۔ نادر شاہ تخت طاؤس اور جواہرات کے خزانے اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کے بعد اہراہوں اور سورج مل جاٹ نے رنگ محل کی چاندی کی چھتیں اتار لیں اور قیمتی جواہرات وغیرہ لوٹ کر لے گئے، پھر غلام قادر روہیلے نے قلعے میں ہنگامہ برپا کیا لیکن وہ بھی اسے تباہ نہ کر سکا، صرف جواہرات وغیرہ نکالنے کی غرض سے فرش کھود ڈالے، اور شاہی کتب خانے کو بہت سی قیمتی چیزوں سے محروم کر دیا۔ ان میں سے کچھ تو لکھنؤ چلے گئے جنہیں نواب وزیر اودھ نے خرید لیا۔ مرہٹوں کے زمانے میں قلعے کو اصل حالت میں برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی لیکن رقم نہ ہونے کی وجہ سے مرمت وغیرہ نہ ہو سکی۔ شاہ عالم کا قابض ہونا ان کے لیے مفید ثابت ہوا۔ کیونکہ ایک طرف تو اس کا دل پیہہ گیا تھا۔ اس کے اخراجات محدود ہو گئے تھے۔ اسے زیادہ روپے کی

ضرورت نہیں تھی۔ دوسرے آئے قلعے کی تباہی کا احساس ہی نہیں تھا، کیونکہ نالینا ہونے کی وجہ سے تباہی اور بربادی کے وہ مناظر اس کے سامنے نہیں تھے، جن سے قلعہٴ معلولہ دوچار ہو چکا تھا۔ اس لیے قلعے کی مرمت کی طرف شاہ عالم نے کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس کام سے کہیں زیادہ اہم اس کے نزدیک اپنے بڑے خاندان کی پرورش اور دیکھ بھال تھی۔ اس کے جانشین اکبر شاہ نے بے شک تخت نشین ہونے کے بعد قلعے کی مرمت کی طرف توجہ کی۔ لیڈی نوچنٹ (Lady Nugent) نے ۱۸۱۲ء میں یہ لکھا ہے کہ قلعے کے دیوان خاص کی چھت درست ہو چکی ہے اور خاصی مرمت ہے۔ قیمتی جواہرات کی جگہ اب نقلی جواہرات لگا دیے ہیں اور تقریباً تمام جواہرات نقلی ہیں لیکن ان کا اثر دیکھنے والے پر اچھا ہوتا ہے۔ لیکن یہ سلسلہ غالباً جاری نہ رہ سکا۔ کیونکہ ۱۸۲۵ء میں بشپ ہیبر (Bishop Heber) نے لکھا ہے کہ محل کا حال خراب ہے اور اس میں ہر طرف ویرانی پرتی ہے۔ شاہ برج میں گندگی ہے اور وہ ویران ہے۔ غسل خانے اور فوارے سوکھے پڑے ہیں، اندر کوڑے کے ڈھیر لگے رہتے ہیں اور پرندے گندگی پھیلانے رہتے ہیں۔ لیکن یہ صورت ہمیشہ باقی نہیں رہی۔ بہادر شاہ ظفر کے تخت نشین ہونے کے بعد پور قلعے کی طرف توجہ کی گئی اور ۱۸۳۸ء میں رزیڈنٹ نے یہ لکھا ہے کہ قلعے کی حالت بہت بہتر ہے اور اس کی طرف خاص توجہ کی جا رہی ہے لیکن یہ سلسلہ بھی جلد ہی ختم ہو گیا کیونکہ بہادر شاہ اس وقت تک خاصے ضعیف ہو گئے اور انہوں نے قلعے کے ظاہری پہلوؤں کی طرف توجہ نہیں دی۔ اس کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ بہادر شاہ ظاہری پہلوؤں سے زیادہ داخلی اور باطنی پہلوؤں کی طرف توجہ دیتے تھے اور ان کے نزدیک ذہنی اور روحانی معاملات کی اہمیت زیادہ تھی۔ بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ مغلوں کے دور آخر میں قلعے کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کی کوشش کی گئی۔ بعض بادشاہ اس کام کی طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہوئے لیکن انہوں نے قلعے کو مغلوں کی معاشرتی زندگی کی ایک علامت ضرور سمجھا اور اس کو زیادہ نکھارنے اور سنوارنے کی کوشش کی انہوں

نے اس شان و شوکت اپنی حدود آبدی میں بھی حتی الاسکان برقرار رکھا جو انہیں اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملی تھی۔

لیکن اپنی روایات کو برقرار رکھنے کی یہ کوشش اور کاوش کوئی مستقل صورت اختیار نہ کر سکی۔ کیونکہ سیاسی اضطراب و زوال کے باعث پیدا ہونے والی معاشی بد حالی نے قلعہ "معلو" میں بھی اپنے قدم جما لیے تھے۔ بادشاہ لکھ اس زمانے میں پہلے مرہٹوں اور پھر انگریزوں کے رحم و کرم پر رہا، یہ لوگ سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ اس لیے ان کی مقرر کی ہوئی ہشن پر بادشاہ اور اس کے خاندان کی زندگی کا دار و مدار تھا۔ یہ لوگ تعداد میں بھی بہت تھے۔ شاہی خاندان کے سیکڑوں آدمی قلعے میں رہتے تھے لیکن ان میں بیشتر کی معاشی حالت اتنی خراب تھی کہ وہ معاشرتی زندگی کی بلند سطح کو قائم نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس زمانے میں میجر جارج کنگھم (Major George Cunningham) نے لکھا ہے کہ جو لوگ سلاطین کہلاتے ہیں وہ اولیٰ اولیٰ دیواروں کے بیچھے رہتے ہیں۔ ان دیواروں کے اندر بے شمار چٹائیوں کے بنے ہوئے جھونپڑے ہیں جن میں یہ پامال اور پریشان حال غلوط آباد ہے۔ انہیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس نہ تو کھانے کے لیے کچھ ہے اور نہ پہننے کے لیے—ان میں سے بعض بادشاہ کے قریبی عزیز ہیں۔ ان کی زندگی کا دار و مدار بادشاہ کی سخاوت اور وہڈہڈٹ سٹن کے رحم دلی پر ہے۔ ان میں بعض رشتے میں بادشاہ کے بھائی اور چچا ہوتے ہیں۔ ان کی کوئی معاشرتی حیثیت نہیں ہے۔ انہیں دیوار تک میں حاضر ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ انگریزوں نے ۱۸۰۳ء میں ان کی حالت زار پر ٹرس کھا کر کچھ مراعات ضرور دیں، لیکن ظاہر ہے کہ ان سے ان کی قسمیں نہیں بدل سکتی تھیں۔ وہ جہاں تھے وہیں رہے اور ان کی معاشرتی حیثیت بلند نہ ہو سکی۔

ان کے مقابلے میں بادشاہ کے بیٹوں کا معاشرتی مرتبہ کسی قدر بلند تھا۔ انہیں نسبتاً زیادہ آزادی حاصل تھی۔ انہیں روپہ بھی کچھ زیادہ ملتا تھا۔ دربار میں بھی انہیں جگہ دی جاتی تھی لیکن انہوں نے اپنے آپ کو تباہ کر لیا تھا۔ اکبر شاہ کے بیٹے مرزا چہانگیر کا حال بعض

لوگوں نے تفصیل سے لکھا ہے۔ اس سے اس زمانے کے شہزادوں اور ان کی معاشرتی زندگی پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ کرنل سلیم (Col. Sleeman) نے ۱۸۱۶ء میں اس سے ایک ملاقات کا حال بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ”وہ برانڈی کی بڑی تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ انگریزوں نے اس سے بہتر شراب نہیں پائی۔ لیکن اس میں صرف ایک ہی خرابی ہے کہ اس سے بہت جلد نشہ ہو جاتا ہے۔ وہ اس شراب سے لطف حاصل کرنے کے لیے ہر گھنٹے کے بعد ایک بڑا گلاس پیتا رہتا تھا، جہاں تک کہ اس پر بد مستی کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ناچنے اور گانے والیاں مستقل اس کے سامنے ناچتی اور گاتی رہتی تھیں۔ وہ بہت چھوٹی عمر میں مر گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی زندگی بسر کرنے والا آدمی زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔“ ”سیرزا جہانگیر کے بھائی سیرزا بابر کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ اس نے تو قلعے میں انگریزی طرز کی عمارت تعمیر کرائی تھی۔ اسی میں رہتا تھا، انگریزی لباس پہنتا تھا اور شہر میں مستقل طور سے گھومنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔“ یہ لوگ ایک زوال آتار معاشرتی ماحول کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ زوال و انحطاط اس زمانے کی معاشرت میں موجود تھا اور تھوڑے سے فرق کے ساتھ تقریباً تمام لوگ اس میں باہر و تہیر تھے۔

پھر بھی اس زمانے میں ان معاشرتی روایات کی جھلکیاں بعض لوگوں میں ضرور نظر آتی ہیں جو مغلوں کے ساتھ مخصوص تھیں۔ بعض لوگوں نے اکبر شاہ کی بڑی تعریف کی ہے۔ جہاد شاہ بھی اس اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے زمانے میں ان معاشرتی روایات کو زندہ رکھنے کی کوشش کی جو انہیں ورثے میں ملی تھیں اور جنہیں وہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ ان دونوں بادشاہوں کے زمانے میں درباروں کی شان و شوکت قائم رہی اور انگریزوں کے حکمران ہونے کے باوجود شاہان مغلیہ کے جہاد و جلال میں فرق نہیں آیا تھا۔ وہ روایتی شان و شکوہ کے ساتھ درباروں میں بیٹھتے تھے اور سائل ان کے سامنے پیش کیے جاتے تھے۔

بشپ ہمبر (Bishop Hebbber) نے اکبر شاہ کے دربار کی حقیقت سے بڑی ہی بھر پور تصویر کھینچی ہے۔ اُس نے لکھا ہے کہ کس طرح وہ فلمے کے مختلف حصوں کو طے کر کے بادشاہ کے دربار میں پہنچا۔ کتنی بار اسے نذر پیش کرنی پڑی، کس طرح اسے خلعت پہنایا گیا۔ کس انداز میں اس کی آؤ بھگت ہوئی!۔ بہادر شاہ ظفر کو بھی بعض لوگوں نے بہت سراہا ہے۔ وہ فطرتاً نیک، شریف اور سادہ مزاج بادشاہ تھے۔ دن بھر لکھنا پڑھنا، قرآن مجید کا مطالعہ کرنا اور فکر سخن میں محو رہنا اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ انہیں ادب اور جمالیات سے دلچسپی تھی۔ روزانہ وہ جتنا کی سیر کرتے تھے۔ برسات میں مہروں جاکر رہنا اور برسات کی دل چسپیوں میں حصہ لینا اُن کے معمولات میں داخل تھا۔ انہیں مختلف نہواروں سے دلچسپی تھی اور وہ اُن میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ عرسوں میں شریک ہونا بھی اُن کے معمولات میں داخل تھا، اور اُن کے زمانے میں عرس بڑے اہتمام سے منائے جاتے تھے۔ غرض ان دونوں بادشاہوں کا انداز اگرچہ ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ ایک میں درباری شان و شکوہ تھا اور دوسرے میں سادگی اور درویشی تھی لیکن دونوں کا زمانہ معاشرتی اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے عہد میں مغلوں کی معاشرتی روایات کو نہ صرف برقرار رکھا گیا بلکہ معاشرتی زندگی میں بعض نئی دلچسپیاں پیدا کی گئیں، جنہوں نے وقت کے ساتھ ساتھ نئی معاشرتی روایات کا رعب اختیار کر لیا۔ منشی فیاض الدین نے اپنی کتاب 'ہزم آخر' میں اس زمانے کی معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اُنہوں نے دہلی کے آخری دو بادشاہوں اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ کے طریق معاشرت کی تصویر پیش کی ہے۔ اس پوری تصویر میں صرف آسائش اور عیش کا رنگ بھرا ہوا ہے۔ رات اور دن جتن میں گزرتے تھے۔ کبھی توڑے ہندی ہے، کبھی رت چکا کبھی نو روز، کبھی آخری چہار شنبہ، کبھی خواجہ صاحب کی چھڑیاں، کبھی سلونو، کبھی بھول والوں کی سیر—غرض ہزم ہی ہزم ہے، رزم کا کہیں نام نہیں۔ قلعہ معلیٰ کے باہر جو طوفان برپا ہے، اس سے بے خبر فکر فردا سے بے نیاز—ایسا معلوم ہوتا ہے رقص پری پیکراں اور

’غوغائے رامنہ گراں‘ میں ساری دنیا سمٹ کر آ گئی ہے۔“ اس بیان میں کسی قدربالغہ آرائی ضرور ہے لیکن ویسے یہ حقیقت ہے کہ اس زمانے میں معاشرتی زندگی انہیں دل چسپیوں میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اور چونکہ بادشاہ انہیں بہت اہمیت دیتے تھے اس لیے اُن کی دیکھا دیکھی عوام نے بھی انہیں اپنے معمولات میں داخل کر لیا تھا۔ اسراء اور عوام بھی ان میں دلچسپی لیتے تھے اور اُس زمانے کے مخصوص حالات نے ان باتوں کو اُن کی زندگیوں کا جزو بنا دیا تھا۔ وہ بھی عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کے خواب دیکھتے رہتے تھے۔ خوش وقتی اُن کے نزدیک بھی معیار بن گئی تھی۔ بقول غالب ہزاروں خواہشیں ایسی تھیں کہ ہر خواہش پر اُن کا دم لگتا تھا۔ اُن کا دل غم کھانے میں بودا تھا اور مے کھانے کے کم ہونے کا رنج بھی اُن کے لیے بہت تھا۔

ان حالات نے ایک ایسی معاشرت کو پیدا کیا جس میں زندگی کی حلیصوں کی طرف توجہ کم تھی۔ اُن سے چشم پوشی کرنے اور انہیں بھلا دینے کا خیال زیادہ تھا۔ تعیش ہسندی اور لذت پرستی اس معاشرتی زندگی کی بنیاد تھی اور زندگی کے اس انداز کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مذہب اور دین داری کے ساتھ ساتھ بھی لذت اور تعیش کے یہ سلسلے قائم رہ سکتے تھے۔ چنانچہ اُس زمانے میں یہی ہوا ہے۔ لوگ اسی اکتساب لذت اور حصول تعیش کے پیچھے بھاگتے رہے ہیں۔ بعض جگہ تو اس صورت حال نے لطافت اور رنگینی کی صورت اختیار کی ہے لیکن بعض جگہ اس میں انہما ہسندی نے ابتذال کا رنگ پیدا کر دیا ہے۔ درگاہ قلی خان نے اپنی دل چسپ کتاب ’سرفہ دہلی‘ اگرچہ چھ شاہی عہد میں لکھی ہے لیکن اُس سے شاہ عالم، اکبر شاہ اور بہادر شاہ کے عہد کی معاشرتی زندگی پر بھی خاصی روشنی پڑتی ہے کیونکہ اس وقت بھی ٹھوڑے سے فرق کے ساتھ زندگی کا عام انداز وہی تھا۔ چھ شاہ کے زمانے کی سی شدت تو اس زمانے میں باقی نہیں رہی تھی لیکن اس زندگی کے لیل و نهار کم و بیش وہی تھے۔ اس زمانے کے بازاروں، محفلوں، مجلسوں اور دوسری دلچسپیوں کا جو حال آلوہوں نے لکھا ہے، وہ بڑھتے سے تعلق رکھتا ہے۔ قلمی کے باہر

جو چوک سعد اللہ خان کے نام سے مشہور ہے ، اس کی کیفیت انہوں نے اس طرح بیان کی ہے :

”ہنگامہ اش عاذی دروازۃ قلعہ است و جمعش در اضافے پیش گاہ جلوہ خانہ ۔ سبحان اللہ کثرتے می شود کہ نظر از ملاحظہ محسوسات رنگا رنگ دست و پا گم می کند و لگاہ بہ مشاہدہ تجدد و امثال در تماشا و تعداد تمثال ، مواد تمتا در آئینہ خانہ حیرت می نشیند ، ہر طرف راض انبارد خوش رو قیامت آباد و ہر سو شور اسفانہ سنجال محشر بنیاد“ ۔

”یہ چوک قلعہ شاہی کے دروازے سے شروع ہوتا ہے ۔ یہ دہلی کا بہت ہی خوبصورت بازار ہے ۔ یہاں صبح و شام اس قدر ہجوم رہتا ہے اور اس قدر رنگا رنگ جلوے نظر آتے ہیں کہ چلی دلفہ دیکھنے والا دیکھ کر حیرت زدہ سا ہو جاتا ہے اور ایک اجنبی شخص کے لئے یہ بازار نگار خانہ“ چہن معلوم ہوتا ہے ۔ کیونکہ یہاں حیرت اور دلچسپی اور تعجب کی بہت سی چیزیں ہیں ۔ لیا شخص کس کس کو دیکھے ۔ بازار کے ایک طرف خوبصورت اور اور طرحدار مردوں کا ناچ ہوتا ہے ۔ یہ ناچ اس قدر دلچسپ ہوتا ہے کہ آدمی بس کھڑا دیکھا ہی کرے ۔ ناچ دیکھنے والوں کی ایک بوڑھی لکی رہتی ہے ، جو صدائے تحسین و مرجبا سے آہان سر پر اٹھا لیتی ہے ، جس کو سن کر ہر گزرنے والے کا دل زبردستی ناچ کی طرف کھنچ جاتا ہے“ ۔

اور دہلی کے بعض امراء کی دلچسپیوں اور مزاج کی رنگینیوں کا ذکر اس طرح کیا ہے :

”اعلم خان ہسر ندوی خان برادر زادہ خان جہاں بہادر عالمگیری از امراء عظیم الشان بمقتضائے رنگینی“ مزاج و سہارت راگ مدوح مطربان ہندوستان طبعش ابارد پسند است و مزاجش بہ محبت

۱۔ درگاہ قلی خان : مرقع دہلی : صفحہ ۱۴

۲۔ حسن نظامی: ہوائی دہلی کے حالات (ترجمہ مرقع دہلی) : صفحہ ۲۳

سادہ رویان در ہند مداخل جاگیر نش صرف اخراجات این فرمہ است و حاصل روزگارش خرج ہا انداز مقدم - طبقہ پر جا از سروے رنگین صیر می باید بروایت دل خواہ در کھند رفاقت خود می اندازد از ہر طرف از سادہ روئے پیمائی می رسد بہ دام احساس می کشد جمعے ازین گروہ بہمن معیش بمنصب مناسب امتیاز یافتہ انیس بساط اقد و برخیہ ہمرامات خانگیں اکثفا کردہ رنگ افروز ہفل نشاط در سواری نشان تمام و تجمل مالا کلام ہر امہاں باد ہا سواری شوہد شرض ہر جا سیزہ رنگے نظر می آید منسوب بہ اعظم خان است و ہرکجا نو خطے جلوہ کند از وابستہائے آن عظیم الشان بہ ہر تو خال این کل رخاں صبح پیری را غضاب می کند و ہواہمہ کم فرصتی ہائے زمان فرصت حیات در استجلاب و مخلوط نفسانی در شباب"

"خان جہاں بہادر عالم گیری کا بیانی اور ندوی خان کا لڑکا ہے - دہلی کے بڑے امیروں میں ہے - رنگین مزاج اور بڑا سنج ہے - فن موسیقی کا ماہر ہے ، ہندوستان کے مطرب اور موسیقی دان اعظم خان کی بہت عزت کرتے ہیں - حسن پرست ہے خوب صورت لڑکوں ، نو خط مردوں اور ماہ رو حسینوں کی محبت میں گرفتار رہتا ہے - اس کی جاگیر کی آمدن کا اکثر حصہ حسن پرستی کی نذر ہو جاتا ہے - جہاں کہیں کسی خوب صورت لڑکے کی خبر سنا ہے ، فوراً اُس کو حاصل کرنے ہا اُس سے ملنے کی کوشش شروع کر دیتا ہے - یہاں تک کہ اُس کو اپنا بنا لیتا ہے - ایسے ہی اگر کسی خوش جمال عورت کا حال سنا ہے تو اُس کو بھی قبضے میں لانے کی کوشش کرتا ہے اور کسی نہ کسی طرح اس کو حاصل کر لیتا ہے - عشق بازی اور حسن پرستی کے سلسلے میں ہنر اور بے خوفی ہے - اس سلسلے میں بے شمار رویہ خرج کر ڈالتا ہے - عباسی اُس کی زندگی ، امرد پرستی اُس کا شعار اور زن پرستی

اس کی عادت ہے ۔ اس کی محفل نشاط میں منتخب حسینانِ چہان کا جھکوٹا رہتا ہے ۔“

”میرزا منو کہ از امیر زادہائے زمانہ است و درین فن سحرکاریا بیکانہ ۔ اکثر از امرا زادہ ہائے احکام ضروری این علم ازو باد میں گیرند و بشاگردیش فخر میں کنند شیرازہ این محفل است و باعث انتظام این بزم غلّانِ مشاگل ۔ خانہ اش بہشت شہاد است و کاشاندیش آشیان مجمع ہری زاد ہر نو خط رنگیں کہ با این محفل ربط نہ دارد فرد باطل است و ہر ملوح کہ باین مجمع مربوط نیست از حلیہ اعتبار عامل مجلس دارالعبار شاہدان است و ہزمنی محک امتحان گل رخاں نند قرائض حسن تائبہ دارالضرب ہزمنی رجوع نہ کنند کامل عیار نیست چہ شد کہ مثل طلائے دست افشار است وسیع جہاں تا در کوزہ جمعیش گداز نیابد چالیدی نیست چہ شد کہ اگر قرہ خائض است“ ۔“

”یہ حضرت بھی مشہور امیر زادے ہیں اور حسن ہرستی اور امرد نوازی کے فن میں بیکانہ روزگار سمجھے جاتے ہیں ۔ بڑے بڑے نواب زادے دولت مند ہیں اور میرزا منو کے اس فن خاص کو سیکھتے ہیں اور میرزا کی شاگردی پر فخر کرتے ہیں ۔ میرزا منو کی محفلِ زندانہ تک اچھے اچھوں کی رسائی نہیں ہوتی اور وہ میرزا کی صحبت کے لیے ترمٹے ہیں ۔ میرزا کی محفلِ بہشتِ شہاد کا نمونہ ہے ۔ جہاں ہری زاد غلّان ، جادو نگاہ لڑکے اور خوب صورت مطربوں اور معشوقوں کا مجمع رہتا ہے ، مشہور ہے کہ میرزا کی بزمِ جہاں حسن و خوب صورتی کی امتحان گاہ ہے کیونکہ میرزا عشق بازی اور حسن ہرستی کے فن میں اتنا کامل ہے کہ کسی حسین کا اس کے چنگل سے نکل جانا یا میرزا کا کسی حسین سے

۱۔ حسن نظامی : ہرانی دہلی کے حالات : (ترجمہ مرقع دہلی) :

صفحہ ۳۸ ، ۳۹

۲۔ درگاہِ قلی خان : مرقع دہلی : صفحہ ۲۷ - ۲۸

بہت نہ کرنا اس حسین کے نفس کی علامت ہے ۔ دہلی کی ہر حسین لڑکی اور ہر حسین لڑکے کا میرزا کے تعلق میں ہونا لازمی ہے ۔ یہ مثل مشہور ہے کہ جو امرد میرزا منو کی محفل کی زینت نہیں وہ عیار کامل نہیں ہے اور اُس کو معشوقیت کی تمیز نہیں ہے ۔“

ان بیانات سے مغلوں کے دور آخر کی دلی ، اُس کی معاشرت اور اس معاشرت کے علم برداروں پر خاصی روشنی پڑتی ہے ۔ کم و بیش یہی حال امراء ورفساء کا بہادر شاہ ظفر کے وقت تک رہا ۔ ان میلانات کے اثرات اس زمانے کی معاشرتی زندگی پر اتنے گہرے ہوئے کہ عوام تک نے اپنے آپ کو اسی رنگ میں رنگ لیا اور اس طرح ہر طرف ایک عیش و عشرت ، لذت پسندی اور ہوا و بوس کی فضا قائم ہو گئی ۔ اس زمانے کا ہر فرد اسی فضا میں سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے افکار و خیالات ، عقائد و توہیات اور عادات و اطوار سب میں اس کی چھلکیاں دکھائی دیتی ہیں ۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان لوگوں نے زندگی کے اسی انداز کو اپنا نصب العین بنا لیا ہے اور اُس کو عملی جامہ پہنانے کے خیال میں وہ سب کے سب سرگرداں نظر آتے ہیں ۔ اس زمانے کے مخصوص حالات نے ان میں سے ہر ایک کو انتہا پسند بنا دیا ہے اور اُن کی انتہا پسندی نے مجموعی طور پر معاشرتی زندگی میں عجیب عجیب گل کھلائے ہیں ۔

بظاہر یہ زندگی بڑی رنگین اور ہرکار نظر آتی ہے ۔ اس کے ہر شعبے پر رنگین پردے پڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔ اس میں بڑی دلکشی ہے ۔ یہ رعنائی سے بھرپور ہے ۔ اس میں دلچسپی کا بڑا سامان ہے ۔ یہ آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس رنگینی اور ہرکاری کے نیچے بنیاد اور بے اساس ہونے کا احساس ہوتا ہے ۔ یہ ایک خواب و خیال کی دنیا معلوم ہوتی ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو انضباط و زوال کے غیر شعوری احساس نے پیدا کیا تھا ۔ اب آگے بڑھنے کے راستے بند ہو گئے تھے ۔ شعائر و ستار کی جگہ طاؤس و رہاب نے لے لی تھی ۔ رزم کی جگہ

بزم کا دور دورہ تھا۔ اس لیے لوگ زندگی کے حقائق کو بھلا دینا چاہتے تھے۔ اس کے سنگین معاملات سے چشم پھٹی کرنا ان کے مزاجوں میں داخل ہو گیا تھا۔ اس لیے ان کی زندگی متوازن نہیں رہی تھی۔ اس زمانے کے لوگ عظیم معاشرتی روایات کے علم بردار تھے لیکن اب سیاسی انتشار اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی معاشی بد حالی نے ان روایات کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ اس لیے وہ ان روایات کو سینے سے لکڑے رکھنا چاہتے تھے لیکن روایات کو اصل صورت میں باقی رکھنے کے لیے سیاسی انتشار اور معاشی انضباط کی ضرورت تھی اور یہ دونوں چیزیں غٹا ہو چکی تھیں۔ اس لیے ان معاشرتی روایات کو برقرار رکھنے کے خیالات افراد سے عجیب عجیب حرکتیں سرزد کراتے تھے۔ معاشرتی زندگی میں لذت پسندی کا خیال انہیں ورثے میں ملا لیکن اب اس خیال نے عجیب و غریب صورتیں اختیار کر لی تھیں۔ اس میں فراری ذہنیت نمایاں تھی۔ اس لیے انتشار کا رنگ رونا ہونے لگا تھا۔ تاج محل اور لال قلعے کی تعمیر کے لیے اس زمانے میں وسائل موجود نہیں تھے۔ اس لیے تخلیقی صلاحیتیں ان بزم آرائیوں کی نذر ہو گئی تھیں جن کا مقصد صرف ذہنی تعمیل تھا۔ اس زمانے کی زندگی کے مختلف شعبوں میں افراد کی حرکات و سکنات اسی صورت حال کی آئینہ داری کرتی ہیں۔

۴

یہ صورت اس ذہنی ہستی کا نتیجہ تھی جس کو سیاسی انتشار اور معاشی پراگندگی کے ہاتھوں وجود میں آنے والے انحطاط و زوال نے پیدا کیا تھا۔ مغلوں کے دور آخر کا تقریباً ڈیڑھ سو سال کا زمانہ اسی ذہنی ہستی اور انحطاط و زوال کی نشان دہی کرتا ہے۔ اورنگ زیب عالم گیر کی وفات سے لے کر بہادر شاہ ظفر کے معزول ہونے تک ہندوستان کی زندگی اسی صورت حال سے دو چار رہی۔ مسلمانوں پر اس کا نسبتاً زیادہ اثر ہوا۔ کیونکہ وہ براہ راست ان حالات سے دو چار ہوئے۔ اس آشوب قیامت نے ان پر عرصہٴ حیات تنگ کر دیا جو اس زمانے میں سیاسی اقتدار کی کمی اور مرکز کی کم زوری کی وجہ سے سکھوں اور چالوں کی شورشوں نے برپا کیا تھا۔ معاشی بد حالی نے ان کے لیے زیست دشوار کر دی اور وہ جو کچھ کر سکتے تھے

وہ نہ کر سکے بے بسی ان کی ربابوں میں حالی رہی۔ چنانچہ انہیں میدان چھوڑنا پڑا اور وہ عملی زندگی سے منہ موڑ لینے پر مجبور ہو گئے۔ انہوں نے خیال کی دنیا میں بھلیں سچائیں اور ان کا وہی حال ہوا جو عام طور پر ان حالات میں رومانی مزاج لوگوں کا ہوتا ہے۔ وہ معاشرتی روایات کو برقرار تو رکھتے ہیں۔ ان کی زندگی میں نفاست اور لطافت بھی نظر آتی ہے۔ ان کی مجلسوں میں رونقوں کا احساس بھی ہوتا ہے لیکن اس ذہنی پستی اور اخلاقی انحطاط کے اثرات بھی ان کے یہاں نمایاں ہیں جن کو عام طور پر وہ بے اعتدالی پیدا کرتے ہیں جو رومانیت کی بنیاد ہے۔ وہ بے اعتدالی اس زمانے کی زندگی میں بہت عام ہے اور اس نے معاشرتی زندگی کے شیرازے کو منتشر کر کے رکھ دیا ہے۔ چنانچہ ہر چیز اس زمانے میں نمود و نمائش کا ذریعہ بن گئی ہے۔ ہر شعبے میں ہوا و ہوس کے خیالات نے گہر کر لیا ہے اور اس کی تکمیل ہی کو لوگ زندگی کا مقصد سمجھنے لگے ہیں۔

ان حالات میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی ذہنی اور فکری تحریک چلتی ہے جس کا مقصد زندگی کو راہ راست پر لانا ہوتا ہے۔ اس زمانے میں بھی بعض اہم ذہنی اور فکری تحریکیں ملتی ہیں جن کا شباب مغلوں کے انحطاط و زوال کا یہی زمانہ ہے۔ اس تحریک کی ابتدا شاہ ولی اللہ دہلوی سے ہوئی ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کے سیاسی انحطاط، معاشی انتشار اور معاشرتی پراگندگی کو محسوس کیا اور انہیں اس سے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ یہ کام آسان نہیں تھا کیونکہ اس زمانے میں ایک عام افراتفری کا دور دورہ تھا۔ سکھوں کے ہنگاموں، جاٹوں کی ہورشوں اور مرہٹوں کے حملوں نے نہ صرف سلطنتِ مغلیہ کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا تھا، بلکہ عام مسلمانوں کے لیے بھی زندگی دشوار کر دی تھی۔ بادشاہ اور امراء ان حالات کی تاب نہ لا کر عیش و عشرت میں گم ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنے آس پاس اور گرد و پیش کو بھلا دیا تھا اور زندگی کے حقائق سے اس طرح اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں جیسے الہیں ان حالات سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اس صورت حال نے سازشوں کا ماحول پیدا کیا۔ ہوس ملک گیری بڑھ گئی۔ لوگ دولت کے پیچھے بھاگنے لگے۔ کسی کے سامنے کوئی بڑا نصب العین نہ رہا۔ فوجی طاقت کم زور ہو گئی۔ بغاوتوں نے سر اٹھایا۔ سازشوں کے فتنے بیدار ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں کی حکومت

ختم ہو گئی۔ معاشی اور اقتصادی حالات بد سے بدتر ہونے لگے۔ معاشرتی زندگی میں فراوی ذہنیت کا عکس نظر آنے لگا۔ غرض ایک عام براگندگی پھیل گئی۔

شاہ ولی اللہ نے ان حالات کو بغور دیکھا، ان کے نشیب و فراز پر نظر ڈالی۔ سیاسی معاشی، معاشرتی اور تعلیمی معاملات کا غور سے مطالعہ کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کے انحطاط و زوال، ان کے قومی انتشار اور ملی براگندگی کا سبب دین اور مذہب سے علیحدگی اور اسلام کے صحیح اصولوں سے یگانگی ہے۔ اسی نے ان کے ہاں ڈھیلا ڈھالا بن پیدا کیا ہے اور وہ صحیح زندگی کے راستے سے ہٹ گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ زندگی کا سارا نظام بگڑ گیا ہے۔ معاشی نظام اقدار میں لا پسواری پیدا ہو گئی ہے۔ معاشرتی مذہبات عام ہو گئے ہیں۔ لہو و لعب زندگی کا جزو بن گیا ہے۔ تفریح پرستی مزاجوں میں داخل ہو گئی ہے۔ لذت پسندی کے خیالات عام ہو گئے ہیں۔ اپنی کتاب 'تقصیبات' میں انہوں نے ان تمام پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے اور مسلمانوں کے تمام طبقوں کو ان حالات سے باہر نکلنے کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اس زمانے کے مسلمان امراء کو غماظ کر کے کہتے ہیں :

”اے امیرو! یہ دیکھو! کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے؟ دلیا کی فانی لذتوں میں تم ڈوبے جا رہے ہو اور جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہوئی ہے ان کو تم نے چھوڑ دیا ہے تاکہ ان میں بعض بعض کو کھانے اور نکلنے رہیں، چاہیے کہ تم اپنی شہوانی خواہشوں کو نکاح کے ذریعے پورا کرو۔ خواہ تمہیں ایک سے زیادہ ہیں نکاح کیوں نہ کرنا پڑیں۔ لیکن تمہاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذت کھانوں کی قسمیں پکوائے رہو اور نرم و گداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے رہو۔ اچھے کپڑوں اور اچھے مکانات کے سوا تمہاری توجہ کسی طرف منعطف نہیں ہوتی۔“

۱۔ شاہ ولی اللہ : تصنیفات (بہ حوالہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی

مکتوبات) : مرتبہ خلیق احمد نظامی : صفحہ ۶، ۷، ۸

اور عوام کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں :

”اپنا مصارف وضع قطع میں تکلف سے کام نہ لیا کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تمہارے نفوس بالآخر فسق کے حدود تک پہنچ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتا ہے کہ اس کے بندے اُس کی آمانیوں سے فائدہ اٹھائیں۔۔۔ اتنا کھانے کی کوشش کرو جس سے تمہاری ضرورتیں پوری ہو جائیں۔ دوسرے کے سونے کے بوجھ بننے کی کوشش نہ کرو کہ اُن سے مانگ مانگ کر کھایا کرو یا تم اُن سے مانگو اور وہ نہ دیں۔ اس طرح بے چارے بادشاہ اور حکام کے لیے بوجھ نہ بن جاؤ۔ تمہارے لیے یہی پسندیدہ ہے کہ تم خود کھا کر کھایا کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں معاشر کی بھی رائے سچھائے گا جو تمہارے لیے کافی ہو گی۔ اے آدم کے بھو! جسے خدا نے ایک جائے سکونت دے رکھی ہو۔ جس میں وہ آرام کرے۔ اتنا پانی جس سے سیراب ہو۔ اتنا کھانا جس سے بسر ہو جائے۔ اتنا کپڑا جس سے تن ڈھک جائے۔ ایسی بیوی جو اُس کی رہن سہن کی جد و جہد میں مدد دے سکتی ہو تو یاد رکھو کہ دنیا کابل طور سے اُس شخص کو مل چکی ہے۔ چاہیے کہ اس پر خدا کا شکر ادا کرے۔“

اس طرح جو لوگ بری رسموں کو معاشرتی زندگی کا اہم حصہ سمجھنے لگے تھے۔ اُن کے بارے میں لکھا ہے :

”تم نے ایسی فاسد رسمیں اختیار کر لی ہیں جن سے دین متغیر ہو گیا ہے۔ مثلاً یوم عاشورہ کو تم باطل حرکات کرتے ہو۔ ایک جماعت نے اُس دن کو ماتم کا دن بنا رکھا ہے۔ کچھ لوگوں نے اس دن کو کھیل تماشوں کا دن بنا لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اُسے مذہبی مناسک کا دن بنا رکھا ہے۔ پھر تم شب بارات میں جاہل قوموں کی طرح کھیل تماشے کرتے ہو اور

۱۔ شاہ ولی اللہ : تفسیلات (۲۰ حوالہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات) :

تم میں سے ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ اس روز مردوں کو کثرت سے کھانا بھیجنا چاہیے۔“
 اور جو لوگ معاشرتی زندگی میں بعض رسموں کو پورا کرنے کے لیے فضول خرچی کرتے ہیں انہیں مخاطب کر کے کہا ہے :
 ”پھر تم نے ایسی رسمیں بنا رکھی ہیں جن سے تمہاری زندگی تنگ ہو رہی ہے مثلاً شادیوں میں فضول خرچی ، شلاق کا ممنوع بنا لینا ، بیوہ عورت کو بٹھا رکھنا ۔ تم نے موت اور غمی کو عید بنا رکھا ہے۔“

غرض شاہ ولی اللہ نے اس وقت کی ساری زندگی کو بدلنے کی کوشش کی ہے ۔ اس کو نئی راہوں پر گامزن کرنا چاہا ہے ۔ اس کے مختلف شعبوں میں نیا خون دوڑانے کے سلسلے میں وہ پیش پیش رہے ہیں ۔ ان کی تحریک اس وقت کی اہم تحریک تھی ۔ اس تحریک کی نوعیت یہ یک وقت دینی بھی تھی ، سیاسی بھی ، معاشی بھی تھی معاشرتی بھی ۔ انہوں نے زندگی کے ان تمام شعبوں میں ایک نئی روح بھونکی ہے اور انہیں صحت مندی سے ہم کنار کرنے کا اہم کام انجام دیا ہے۔ رسول شیخ محمد اکرام ”شاہ ولی اللہ قومی زندگی کے ایک بڑے تازک دور میں پیدا ہوئے۔ ان کا ظہور اس زمانے میں ہوا جب اسلامی حکومت کی بنیادیں اکھڑ رہی تھیں اور اس ملک میں صدیوں جاہ و جلال سے حکومت کرنے کے بعد اس قدر آرام طلب اور کم زور ہو گئے تھے کہ وہ سریشوں اور مکہوں کے مقابلے میں تساہل اختیار کرتے تھے ۔ شاہ صاحب کو اس صورت حال کا احساس ہوتا ہوا تھا۔ لیکن جو شخص عملی کام کرنا چاہے اسے اپنا دائرۂ عمل محدود اور معین کرنا پڑتا ہے ۔ شاہ صاحب اپنے آپ کو اس کام کے لیے سوزوں نہیں سمجھتے تھے کہ وہ عملی زندگی میں دخل انداز ہو کر واقعات کی رو کو روکیں ۔ لیکن جس کام کے لیے وہ سوزوں تھے اور جو کچھ کم ضروری نہ تھا (یعنی رسول اکرم کی خلافت ہانیہ) اس کے لیے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی ۔ وہ ان عیوب اور کوتاہیوں سے پوری طرح واقف تھے جو مسلمانوں کی انفرادی اور

۱۔ یہ حوالہ تاریخ مشائخ چشت : صفحہ ۳۶۲

۲۔ ایضاً : صفحہ ۳۷۳

اجتماعی زندگی میں گھر کر گئی تھیں اور جن کی وجہ سے انہیں یہ روز بد دیکھنا نصیب ہو رہا تھا ۔ شاہ صاحب نے انہیں بوری طرح بے نقاب کرنے کی کوشش کی تاکہ ان کا ازالہ ہو جائے۔ ” یہ بہت ہی اہم کام تھا کیونکہ اس وقت کی زندگی حد نظر تک پہنچی ہوئی اندھیاریوں میں بھٹک رہی تھی۔ اُسے راستہ نظر نہیں آتا تھا ۔ منزل کی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ شاہ ولی اللہ کے افکار و خیالات نے اُس کے لیے شمع راہ کا کام کیا جس کی روشنی میں اُس زمانے کے مختلف شعبوں نے ارتقائی سفر جاری رکھا ۔ یہ تحریک بنیادی طور پر ذہنی اور فکری تحریک تھی ۔ اس میں عمل کا پہلو نمایاں نہیں تھا ۔ اس وقت حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اسی تحریک نے آگے بڑھ کر عملی صورت بھی اختیار کی۔ شاہ اسماعیل شہید اور مولانا سید احمد بریلوی اسی تحریک کے چشم و چراغ ہیں ۔ لیکن اُن کے چاں عمل کا جذبہ تحریک حباد کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اور یہ مردان حق آگاہ باطل کے مقابلے میں حق کی قوتوں کو صف آرا کرتے ہیں اور راہ حق میں لڑتے ہوئے شہید ہو جاتے ہیں ۔ ان بزرگوں نے شاہ ولی اللہ اور اُن کے صاحب زادوں سے فیض حاصل کیا ۔ شاہ ولی اللہ کے صاحب زادوں میں شاہ عبد العزیز ، شاہ رفیع الدین ، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی تھے ۔ انہوں نے اپنے والد کی وفات کے بعد اُن کی ذہنی اور فکری تحریک کو جاری رکھا اور مسلمانوں کی دینی زندگی کو سدھارنے ، معاشرتی معاملات کو سنوارنے اور تہذیبی حالات کو نکھارنے میں پیش پیش رہے ۔

شاہ عبدالعزیز ۱۵۹ھ ۱۷۷۶ع میں پیدا ہوئے ۔ اپنے والد شاہ ولی اللہ سے علم حاصل کیا اور پندرہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے ۔ جب شاہ ولی اللہ صاحب کا انتقال ہوا تو اُن کی عمر سترہ سال تھی ۔ وفات کے بعد یہ شاہ صاحب کے خلیفہ مقرر ہوئے اور ساٹھ سال تک اپنے والد کے کام کو جاری رکھا ۔ علم حدیث کے درس کی طرف انہوں نے خاص طور پر توجہ دی ۔ چنانچہ ہندوستان کے اکثر محدثین کا سلسلہ آپ سے ملتا ہے ۔ اپنے والد کی طرح وہ تصنیف و تالیف کی طرف توجہ نہ

کر سکے۔ کیونکہ اُن کا زیادہ وقت درس و تدریس میں صرف ہوتا تھا اور وہ ارشاد و ہدایت کے کام میں مصروف رہتے تھے۔ اُس زمانے کے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے جو اہم کام شروع کر رکھا تھا، اُس کو اُس زمانے کے لوگ کتنی اہمیت دیتے تھے اور اُن کے دلوں میں شاہ صاحب کی کتنی عزت تھی۔ جن نامور ہستیوں نے اُن سے فیض حاصل کیا اُن میں شاہ رفیع الدین، شاہ محمد اسحاق، شاہ غلام علی، مفتی صدر الدین آزاد، مولوی مخصوص اللہ، مولوی عبدالغنی، مولانا میر محبوب علی، مولانا فضل حق غیر آبادی، مفتی الہی بخش کالدھلوی اور مولانا سید احمد بریلوی وغیرہ کے نام خاص طور پر مشہور ہیں۔ شاہ عبدالعزیزؒ نہ صرف اسلامی علوم کے ماہر تھے بلکہ دوسرے علوم و فنون پر بھی اُن کی نظر بہت گہری تھی۔ زبان و ادب کے بھی وہ بہت ماہر تھے۔ چنانچہ اُس زمانے کے بعض شاعروں نے بھی اُن سے فیض حاصل کیا ہے۔ مومن بچن ہی میں اُن کے مدرسے سے منسلک ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے ابتدائی تعلیم بھی وہاں حاصل کی اور اُن کے وعظ بھی سنے۔ ذوق نے بھی اُن کی شاکردی اختیار کی اور اپنی محزلیں اُنہیں دکھائیں۔ ناصر نذیر نراق نے ’لال قلعے کی ایک جھلک‘ میں اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”کون نہیں جانتا کہ حضرت شاہ نعیم صاحب دہلوی اکبر شاہ ثانی اور ابو ظفر بہادر شاہ اور شیخ ابراہیم ذوق کے استاد تھے۔ جب شاہ صاحب کا ذوق سے دل کھٹا ہو گیا اور اصلاح موقوف ہوئی تو ذوق پر جمعہ کو مولانا عبدالعزیز صاحب کے وعظ میں جانے لگے اور وعظ بہت غور سے سننے لگے۔ کسی دوست نے اس کا سبب پوچھا تو ذوق نے کہا ”استاد مجھ گنہ گار سے ناخوش ہو گئے۔ شعر و سخن میں اصلاح ملتی نہیں۔ اس کا بدل میں نے یہ نکالا ہے کیونکہ شاہ عبدالعزیز صاحب اردو زبان دانی میں شاہ نعیم صاحب سے کسی طرح کم نہیں۔ اُن کے بیان اور گفتگو کو سنتا ہوں اور اردو کے غاور سے روز سرہ یاد کرتا ہوں۔“

۱۔ شیخ محمد اکرام : رود کوثر : ص ۹۰۔

۲۔ آزاد : آبِ حیات :

اس لیے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب اپنے والد ماجد کے حکم کے بموجب اردو زبان سیکھنے کے لیے خواجہ میر درد صاحب کی خدمت میں جھٹپن سے حاضر ہوئے تھے اور چپ چاپ بیٹھے ہوئے آپ کی تفریر سنا کرتے تھے اور محاورات کو دل ہی دل میں چنا کرتے تھے۔ مولانا ولی اللہ صاحب اپنے بیٹوں سے کہا کرتے تھے جس طرح اصول حدیث اور اصول فقہ فن ہے اسی طرح حصول زبان بھی فن ہے اور اردو زبان کے موجد و مجتہد خواجہ میر درد صاحب ہیں۔ آپ کی صحبت کو اس فن کے واسطے غنیمت سمجھو، خواجہ صاحب ہکے بان ہیں۔ چنانچہ شاہ عبد القادر صاحب خاص طور پر میر درد صاحب کے شاگرد تھے۔“

غرض شاہ عبدالعزیز سے نہ صرف علماء نے بلکہ شعراء نے بھی استفادہ کیا کیونکہ وہ جامع کمالات تھے۔ ہر علم اور فن میں انہیں ملکہ حاصل تھا۔ بقول سر سید: 'ذات فیض بہت ان حضرت با برکت کی فنون کسبی و وبسی اور مجموعہ' فیض ظاہری و باطنی تھی۔ اگرچہ جمیع علوم مثل منطق و حکمت و ہنفسہ و ہیئت کو خادام علوم دینی کا کرکر تمام ہمت و سراسر سعی کو تحقیق غوامض حدیث نبوی و تفسیر کلام الہی اور اعلائے اعلام شریعت ملکہ حضرت رسالت بناہی میں مصروف فرماتے تھے اور سوا اس کے جو کہ چلائے آئینہ باطن صیقل عرفان و ایتان سے کمال کو پہنچی تھی، طالبان صافی نہاد کی ارشاد و تلقین کی طرف توجہ عام تھی۔ اس پر بھی علوم عقلیہ میں سے کون سا علم تھا کہ اس میں ہکتائی اور ایک فنی نہ تھی۔“

غرض وہ بہت بڑے عالم تھے، اور علمی حیثیت سے ان کے بلند مرتبے کو ہر ایک نے تسلیم کیا ہے۔ اس علم سے انہوں نے اس زمانے کے مسلمانوں میں ایک نئی روح بھونکی۔ انہیں زندگی بسر کرنے کا گر بتایا اور جینے کے صحیح آداب سکھائے۔ اور اس طرح ان میں زندگی اور جولانی کی ایک لہر دوڑائی۔ انہوں نے اپنے زمانے کے حالات کا جائزہ لیا اور اس زمانے میں مختلف قوتوں کے زیر اثر زندگی جن نئے رجحانات سے آشنا ہو رہی تھی،

۱۔ ناصر نذیر فراق : لال قلمی کی ایک جھلک : صفحہ ۶۳

۲۔ سرسید احمد خان : تذکرہ اہل دہل : صفحہ ۵۲

ان کا غیر مقدم کیا اور ان کے قبول کرنے کی طرف لوگوں کو بھی توجہ دلائی۔ شاہ عبدالعزیز کا انتقال ۷ شوال ۱۲۲۸ھ یعنی ۱۷ جولائی ۱۸۲۳ع کو ہوا۔ مومن نے جو اپنے اصلی نام حبیب اللہ سے نہیں بلکہ شاہ صاحب کے دیے ہوئے نام مومن خان سے زیادہ مشہور ہوئے، تاریخ کہی دست پیداد اجل سے بے سرو پا ہو گئے

فقر و دہی، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ فقر و دہی، فضل و ہنر، لطف و کرم اور علم و عمل کا مجسمہ تھے۔ انہوں نے اپنے زمانے میں انہیں عام کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں ان کے ذوق و شوق اور انہماک نے انہیں بہ ذات خود ایک ادارہ اور ایک تحریک بنا دیا۔

شاہ عبدالعزیز کے سالہ ساتھ ان کے بھائی شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی بھی اس کام میں پیش پیش رہے جس کا آغاز ان کے والد شاہ ولی اللہ نے کیا تھا۔ انہوں نے بھی اپنے علم و فضل اور درس و تدریس سے اس وقت کے مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ شاہ رفیع الدین ۱۱۶۳ھ مطابق ۱۷۷۹ع میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد شاہ ولی اللہ سے علوم حاصل کیے۔ جب شاہ عبدالعزیز آخر عمر میں درس و تدریس کا کام نہ کر سکے تو یہ کام شاہ رفیع الدین نے سنبھالا۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ قرآن مجید کا تحت اللفظ ترجمہ ہے۔ ساری زندگی انہوں نے دین اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کی۔ ۱۲۳۲ھ ۱۸۱۹ع میں انتقال کیا۔ شاہ عبدالقادر بھی شاہ ولی اللہ کے نامور فرزند تھے۔ انہوں نے بھی ساری زندگی درس و تدریس میں گزاری۔ علم سے فارغ ہو کر اکبر آبادی مسجد میں گوشہ نشین رہے۔ قرآن کا با محاورہ ترجمہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اس ترجمہ نے مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پیدا کی کیونکہ انہیں دین کو براہ راست سمجھنے کا موقع ملا۔ علم قدس، حدیث اور تفسیر کے بھی وہ زبردست عالم تھے اور انہوں نے مسلمانوں میں ان علوم کے ذریعہ سے بھی دین اور دنیا دونوں کو سمجھنے کا شعور پیدا کیا۔ آپ کے علم و فضل کا بیان کرنا ایسا ہے کہ کوئی آفتاب کی تعریف اور فلک کی

مدح بلندی کے ساتھ کرے۔ زبان کو کیا طاعت کہ ایک حرف حضرت کی صفات سے لکھ سکے اور قام کی کیا مجال کہ آپ کی مدائح سے ایک ذرہ لکھ سکے۔ کسب فیض باطن سوائے والد ماجد کے اور بزرگوں کی خدمت سے ہوا اتفاق ہوا ہے۔ بارہا ثقات کی زبان سے سنا گیا کہ جس اُس میں کچھ فرمایا ویسا ہی ہے کم و کثرت ظہور میں آیا، باوجود اس کے کہ بسبب کثرت اخلاق کے کسی کے حق میں کچھ ارشاد نہ کرتے اور کسی کو نہ فرماتے کہ ادھر بیٹھ یا ادھر لیکن من جانب اللہ لوگوں کے دل میں آپ کا ایسا رعب چھایا ہوا تھا کہ روسائے شہر جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے، بسبب ادب کے دور دور خاموش بیٹھتے اور بدون آپ کی تحریک کے مجال سخن نہ پاتے اور ایک دو بات سوا پارا نہ دیکھتے کہ کچھ اور کلام کریں۔“ غرض شاہ عبدالقادر بڑے ہائے کے بزرگ اور بڑے ہی متبحر عالم تھے۔ اُن کا فیض اُس زمانے میں عام تھا۔ باقاعدگی سے درس دیتے تھے۔ وعظ کا سلسلہ بھی جاری کر رکھا تھا۔ ان میں اچھے اچھے لوگ شرکت کرتے تھے۔ مومن نے بھی اُن سے استفادہ کیا۔ بچوں کی معمولی تعلیم کے بعد جب ذرا ہوش سنبھالا تو والد نے شاہ عبدالقادر صاحب کی خدمت میں پہنچایا، اُن سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھنے رہے۔ حافظے کا یہ حال تھا کہ جو کچھ شاہ صاحب سے سنتے تھے فوراً یاد کر لیتے تھے۔“ غرض شاہ عبدالقادر کا فیض عام تھا۔ انہوں نے اُس زمانے میں دین کے اصولوں کو عام کرنے اور اُن کی روشنی میں صحیح زندگی بسر کرنے کی فضا قائم کی۔ ۱۰۳۳ھ میں اُن کا انتقال ہوا۔ شاہ عبدالقادر کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالغنی تھے۔ اگرچہ وہ اپنے بڑے بھائیوں کی طرح مشہور و معروف نہیں لیکن جس دینی اور اصلاحی تحریک کی داغ بیل شاہ ولی اللہ نے ڈالی تھی اور جس کو اُن کے بڑے بھائیوں نے زندہ رکھا تھا، اُس میں اُن کا بھی خاصا حصہ ہے۔ شاہ اسماعیل شہید انہیں کے بیٹے تھے جنہوں نے اسلامی علوم کو عوام میں پھیلایا، اور پھر مولانا سید احمد بریلوی کے ساتھ جام شہادت پی کر اپنے آپ کو ایک بہت بڑا عالم باعمل ثابت کر دکھایا۔

۱۔ سرسید احمد خان : تذکرہ اہل دہلی : صفحہ ۷۵

۲۔ آزاد : آبِ حیات : صفحہ ۳۳

یہ تحریک اپنے شباب پر اُس وقت پہنچی ، جب اُس زمانے کے سب سے بڑے عالم با عمل مولانا سید احمد بریلوی جہاد کے خیال سے میدان میں آئے اور جنہوں نے مسلمانوں کو منظم کرنے اور کفار کے مقابلے میں صف آرا ہونے کی تحریک شروع کی کہ اُن کے خیال میں اسی طرح اسلام کا بول بالا ہو سکتا تھا اور مسلمان اس قدر مذلت سے باہر نکلی سکتے تھے جس میں وہ تقریباً ایک صدی سے بڑے ہوئے تھے ۔ مولانا سید احمد بریلوی نے شاہ عبدالعزیز کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا تھا اور شاہ عبدالقادر سے بھی انہیں نسبت خاص رہی تھی ۔ یہی سبب ہے کہ شاہ ولی اللہ کی تحریک کا اُن پر گہرا اثر نظر آتا ہے ۔ ہرچند کہ اُنہوں نے مصلح یا مجدد ہونے کا کوئی بلند باتگ دعویٰ نہ کیا تھا لیکن تجدید اصلاح کا ہوا سامان مہیا کر دیا تھا ۔ قوم کی اخلاقی اور روحانی قیادتوں کو اُنہوں نے اپنی تصانیف میں بے نقاب کیا ۔ ملک میں قرآن فہمی اور درس حدیث کے چشمے لگا دیے جن کی وجہ سے غیر اسلامی عناصر آسانی سے نمایاں ہونے لگے۔ اس سے بڑھ کر وہ ایک ایسی جماعت کی بنیاد ڈال گئے تھے جو اُن کی اصلاحی تجاویز کو ہایہ تکمیل تک پہنچا سکتی تھی ۔ حضرت امام الہند کے جانشین شاہ عبدالعزیز نے اس کام کو جاری رکھا ۔ لیکن اُن کی اصلاحی کوششوں میں اُن کی طبعی مہاندہ روی نمایاں تھی ۔ اور مرض اس قدر عام اور پرانا ہو گیا تھا کہ اُس کے ازالے کے لیے معمولی عرق سوتل اور نمک سلانی کافی نہ تھے بلکہ کسی بہت تیز اور کڑوی دوا کی ضرورت تھی ۔ یہ معاملہ شاہ صاحب کے خلیفہ مولانا سید احمد بریلوی اور اُن کے رفقاء کا کرنے تجویز کیا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مولانا سید احمد بریلوی نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور مسلمانوں کی اس ذہنی اور اصلاحی تحریک کو معراج کمال تک پہنچانے میں اُن کا بہت بڑا حصہ ہے ۔

مولانا سید احمد بریلوی یکم محرم ۱۲۰۱ھ یعنی ۲۸ اکتوبر ۱۸۸۶ء کو خلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں انہیں علم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مکتب میں داخل ہوئے لیکن بڑھتے لکھنے میں جی نہ لگا۔ جب سن شعور کو پہنچے تو لکھنؤ گئے۔ وہاں کسی

اوپر کی ملازمت کر لی۔ اس زمانے میں شاہ عبدالعزیز کے درس و تدریس کا شہرہ تھا۔ مولانا سید احمد بریلوی کے دل میں اُن سے ملنے اور فیض حاصل کرنے کی خواہش بیدار ہوئی۔ چنانچہ وہ اسی مقصد سے دلی روانہ ہوئے۔ دلی پہنچے۔ شاہ عبدالعزیز نے انہیں اپنے بھائی شاہ عبدالقادر کے پاس بھیجا جو ان دنوں اکبر آبادی مسجد میں مقیم تھے۔ شاہ صاحب سے انہوں نے مختلف علوم پڑھے۔ قرآن کا مطالعہ بھی کیا۔ ہائیس سال کی عمر میں وہ شاہ عبدالعزیز کے مرید ہوئے اور نقشبندیہ سلسلے میں اُن سے بیعت کی لیکن زیادہ عرصے تک دلی میں نہ ٹھہر سکے۔ انہیں بعض مجبوروں کی بنا پر رائے بریلی واپس جانا پڑا۔ وہاں کچھ عرصے قیام کرنے کے بعد وہ نواب امیر خاں فرماںروائے ٹونک کے پاس چلے گئے اور فوج میں ملازمت کر لی۔ چھ ست سال وہاں رہے اور انہیں سپہ گری کے فن کو سیکھنے کا موقع ملا۔ جہاد کا شوق انہیں ہمیشہ سے تھا۔ یہاں اس شوق کو عملی جامہ پہنانے کے مواقع زیادہ فراہم ہوئے چنانچہ سات سال تک وہ یہاں جہاد کی ترغیب دیتے رہے۔ لیکن فوج میں ان کی حیثیت محض ایک سپاہی ہی کی نہیں تھی وہ متعدد لڑائیوں میں ایک دسٹے کے امیر اور نواب کے مشیر خاص کی حیثیت سے بھی شریک رہے۔ لیکن جب وہاں کی فضا سازگار نہ رہی تو انہوں نے دلی کا رخ کیا۔ اُن کا خیال تھا کہ نواب کی مدد سے ہندوستان میں حقیقی جہاد کے لیے زمین ہموار ہو سکے گی۔ لیکن جب نواب نے انگریزوں سے صلح کر لی تو یہ توقع ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی چنانچہ دلی واپس آ کر انہوں نے علیحدہ جہاد کی اس جد و جہد کو جاری رکھا۔ اس زمانے میں شاہ عبدالعزیز کے داماد مولانا عبدالحنی اور ان کے بھتیجے شاہ اسماعیل شہید نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس سے مولانا سید احمد کو بڑا سہارا ملا۔ انہیں ساتھ لے کر وہ دورے پر نکلے اور شمالی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کی۔ ان کے مواعظ سے بہت اصلاح و انقلاب ہوا۔ اس ایک سفر نے وہ کام کیا جو بڑے بڑے مشائخ کا تزکیہ باطن اور بڑے بڑے علماء و مصلحین

۱۔ مسعود عالم ندوی : ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک : صفحہ

کی برسوں کی تربیت ظاہر کرتی ہے۔ ہر ہر جگہ سیکڑوں آدمی مٹی، شورع عابد، متبع سنت اور ربانی بن گئے۔ ہزاروں فاسق و فاجر صالح اور اولیا اللہ ہو گئے۔ بیسیوں آدمی قتل کے ارادے سے آئے اور جان نثار بن گئے اور گھر بار چھوڑ کر آپ کے ساتھ ہو گئے یہاں تک کہ میدان جنگ میں شہید ہوئے۔ جس نے ایک دلہہ زیارت کر لی وہ آپ کے رنگ میں رنگ کیا۔“ اسی زمانے میں شاہ اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحنی نے ان کے اقوال و خیالات کو ’صراطِ مستقیم‘ کے نام سے یکجا کیا ہے۔ اس میں مختلف دینی معاملات پر خیالات کا اظہار ہے اور ان سے مولانا سید احمد بریلوی کی طبیعت کے اصلاحی بلکہ انقلابی میلان پر روشنی پڑتی ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب پنجاب میں سکھوں نے قیامت برپا کر رکھی تھی اور مسلمانوں پر عرصہٴ حیات تنگ کر دیا تھا۔ اس کی خبریں دلی تک پہنچی تھیں۔ مولانا سید احمد بریلوی کو بھی اس کا علم ہوا۔ واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ جب مولانا وعظ کے لیے رام پور گئے تو وہاں بعض افغانوں نے اپنی روداد سنائی کہ جس طرح وہ پنجاب کے ایک علاقے میں ایک کنوئیں پر پانی پینے گئے۔ وہاں کچھ عورتیں پانی پھر رہی تھیں۔ انہیں پنجابی زبان نہیں آتی تھی۔ اس لیے انہوں نے اشارے سے پانی ہلانے کو کہا۔ تب ان عورتوں نے ادھر ادھر دیکھ کر پشتو زبان میں کہا کہ وہ مسلمان افغانوں کی بیٹیاں ہیں۔ سکھ انہیں یہاں زبردستی پکڑ کر لائے ہیں اور سکھ بنا کر جبراً یہاں رہنے پر مجبور کیا ہے۔ یہ سن کر مولانا کو بہت بڑا صدمہ ہوا اور انہوں نے یہ عہد کیا کہ وہ عنقریب سکھوں سے جہاد کریں گے۔“ اگرچہ فوراً یہ خیال عملی جامہ نہ پہن سکا۔ کیونکہ اس واقعے کے بعد وہ مکہٴ معظمہ چلے گئے۔ واپسی پر انہوں نے جہاد کی تحریک باقاعدہ طور پر شروع کی۔ سارے ہندوستان میں یہ تحریک اس طرح پھیلی جیسے جنگل میں آگ لگ جاتی ہے۔ اس کا مقصد مسلمانوں کو سکھوں کے کے پنجوں سے نجات دلانا تھا۔ وہ ۱۸۴۷ء میں جہاد کے لیے روانہ ہوئے۔ چلے کابل گئے اور پھر کابل سے پشاور آئے۔ نوشہرہ اور اکوڑہ کے مقام پر

۱۔ سید ابوالحسن ندوی : سیرت سید احمد شہید : صفحہ ۸۵

۲۔ مولوی محمد جعفر : سوانح احمدی : صفحہ ۲۰

کئی لڑائیاں ہوئیں جن میں مسلمانوں کو کٹہری ہوئی۔ لیکن اس کے بعد میدان کے مقام پر جو لڑائی ہوئی اس میں مسلمان ناکام رہے۔ اس کا سبب موسم کی غرابی، سکھوں کی منظم فوجی طاقت اور بعض مسلمان سرداروں کی غداری تھی۔ اس کے بعد بھی کئی لڑائیاں ہوئیں۔ بالا کوٹ کی لڑائی آخری تھی۔ اس میں ان کا لشکر ایک ماٹھی کی غداری سے محصور ہو گیا۔ اس معرکے میں پہلے شاہ اسماعیل شہید ہوئے اور بالآخر ۲ ذی قعدہ ۱۰۳۶ھ یعنی ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو مولانا کو بھی جام شہادت پینا پڑا۔ اس کی اصل وجہ افغان سرداروں کی غداری تھی جو بڑوں مودودی: ”بندۂ زور اور نہایت طامع ہیں۔ سکھوں کے اعوا سے آپ سے منحرف ہو گئے اور عین معرکہ جنگ میں آپ سے دغا کی از بسکہ مثبت الہی میں دولت شہادت آپ کے نصیب میں تھی“۔

ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں مولانا سید احمد بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید کے نام ہمیشہ سترے حروف میں لکھے جاتے رہے۔ یہ دونوں عالم با عمل تھے اور انہوں نے انیسویں صدی کے مسلمانوں میں اپنے افکار و خیالات سے زندگی اور جولانی کی لہر دوڑائی۔ انہیں خواب غفلت سے بیدار کیا، دین کے اسرار و رموز ان پر روشن کیے حق و صداقت کی اہمیت واضح کی۔ اخوت اور آزادی کا تصور عام کیا اور اس کے لیے جان کی بازی لگا دینے کی اسنگ اور آرزو دلوں میں بیدار کی۔ حوصلوں کے چراغ جلانے اور ولولوں کی شمعیں فروزان کیں اور اس طرح اس زمانے کے مسلمانوں کی زندگی میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ مولانا سید احمد بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید دونوں اس کام میں پیش پیش رہے اور شاہ ولی اللہ کی تحریک کو عمل سے ہم کنار کرنے کا سہرا انہیں دونوں کے سر ہے۔ یہ دونوں شاہ صاحب کی تحریک کے سلسلے کی بنیادی کڑی ہیں۔ ان کے افکار و خیالات میں شاہ ولی اللہ کی آواز صاف سنائی دیتی ہے [بقول مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی: شاہ صاحب (شاہ ولی اللہ صاحب) کی وفات پر پوری نصف صدی بھی نہ گزری تھی جو شاہ صاحب نگاہوں کے سامنے روشن کر کے رکھ گئے تھے] سید صاحب (مولانا سید احمد بریلوی) کے خطوط اور ملفوظات اور شاہ شہید کی ’منصب امامت‘، ’طبقات‘، ’تقویت الایمان‘

اور دوسری تحریریں دیکھیے ۔ دونوں جگہ وہی شاہ صاحب کی زبان بولی ہوئی نظر آئے گی ۔ شاہ صاحب نے عملاً جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ حدیث اور قرآن کی تعلیم اور اپنی شخصیت کی تاثیر سے صحیح خیال اور صالح لوگوں کی ایک کثرت تعداد پیدا کر دی اور پھر ان کے بعد چاروں صاحب زادوں نے ، خصوصاً شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس حلقے کو جت زیادہ وسیع کر دیا جہاں تک کہ ہزارہا ایسے آدمی ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئے جن کے اندر شاہ صاحب کے خیالات نفوذ کئے ہوئے تھے جن کے دماغوں میں اسلام کی صحیح تصویر اتر چکی تھی ۔ اور اپنے علم و فضل اور اپنی عمدہ سیرت کی وجہ سے عام لوگوں میں شاہ صاحب اور ان کے حلقے کا اثر قائم ہونے کا ذریعہ بن گئے تھے ۔ اس چیز نے اس تحریک کے لیے گویا زمین ہموار کر دی جو بالآخر شاہ صاحب ہی کے حلقے ، بلکہ یوں کہیے کہ ان کے گھر سے اٹھنے والی تھی ۔ سید صاحب بریلوی اور شاہ صاحب شہید دونوں روحاً و معاً ایک وجود رکھتے تھے اور اس وجود متحد کو مستقل بالذات مجدد نہیں سمجھنا ، بلکہ شاہ ولی اللہ صاحب کی تجدید کا تسمہ سمجھنا ہوں ۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ مولانا سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید کی اسی تحریک کا سلسلہ تھی جس کی داغ بیل شاہ ولی اللہ نے ڈالی تھی اور جسے شاہ عبدالعزیز ، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے پروان چڑھایا تھا ۔

یہ بہ یک وقت ایک ذہنی اور عملی تحریک تھی ، جس نے مذہب ، دین ، سیاست ، معاشرت اور ثقافت سب ہی کو متاثر کیا ۔ وہ مسلمان جو اورنگ زیب عالمگیر کے وقت سے انحطاط و زوال کی اندھیاریوں میں بھٹک رہے تھے ، انہیں اس تحریک نے روشنی عطا کی ۔ دین اور مذہب کا صحیح احساس ان کے جہاں پیدا ہوا اور انہوں نے اسے ایک نظام عمل کی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش کی ۔ مذہب کے جو غلط تصورات عام ہو گئے تھے ان کا خاتمہ ہوا ، بدعتوں کی نیچ کٹی ہوئی اور راہ حق میں جان دے دینے کے خیالات عام ہوئے ۔ سیاسی زندگی میں آزادی حاصل کرنے اور جبر و استبداد کے مقابلے میں صرف آرا ہونے کا خیال اس نے پھیلایا ۔ معاشرتی

زندگی میں صحیح معیار اس نے قائم کیے۔ معاشرتی زندگی کے نظام افکار کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کی طرف توجہ دلائی اور ثقافت کو ارتقاء کی راہ پر گامزن کرنے کی ایک فضا قائم کی۔ غرض یہ تحریک ایک وسیع اور ہمہ گیر تحریک تھی، جس میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے مسلمانوں کو ایک نئی زندگی سے آشنا کر کے ان کی کلیا ہلا دی۔ یہی سبب ہے کہ اس کا اثر اس زمانے کے ہر شعبے میں اپنی جہلک دکھاتا ہے۔

۵

اس تحریک کے اثرات سب سے زیادہ اُس زمانے کی تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی زندگی پر نظر آتے ہیں۔ یہ محفل اس سے قبل ایک زمانے سے سوئی ہوئی تھی۔ اس تحریک کے اثر سے اُس میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑی اور صدیوں کے بعد اب یہ محفل اُس طرح جم گئی۔ پرچند کہ اُس محفل میں وہ عہد اکبری اور عہد شاہجہانی جیسی بات تو نہیں رہی تھی لیکن جہاں تک تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا تعلق ہے، اُس میں اُس زمانے کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی ایک جہلک ضرور نظر آتی ہے۔ بقول حالی 'تیرہویں صدی ہجری میں جب کہ مسلمانوں کا تنزل درجہ' غایت کو پہنچ چکا تھا اور اُن کی دولت، عزت اور حکومت کے ساتھ علم و فضل اور کمالات بھی رخصت ہو چکے تھے، حسن اتفاق سے دارالخلافت دہلی میں چند اہل کمال ایسے جمع ہو گئے جن کی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری و شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کی یاد دلاتی تھیں'۔' القضاۃ و زوال کے باوجود ان محفلوں کا جینا اس بات کا ثبوت ہے کہ اب اُس زمانے کی تہذیبی زندگی نئی ذہنی تحریکوں کے زیر اثر ایک نئی زندگی سے آشنا ہو رہی تھی اور اس سے قبل انتشار اور پراگندگی کے جو بادل تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے افق پر چھائے ہوئے تھے، وہ اب جھٹکا شروع ہو گئے تھے اور تہذیب کا آفتاب ایک دفعہ پھر زندگی کے افق پر طلوع ہونے لگا تھا۔

مغلوں کی سیاسی طاقت تو بڑھتا ہی رہا مگر اس زمانے میں ختم ہو چکی تھی لیکن بعض طاقتوں کی داخل در اندازی کے باعث، ایک زمانے کے انتشار اور

برائگی کے بعد اب زندگی کسی حد تک سکون اور اطمینان سے آگیا ضرور ہو گئی تھی۔ انگریزوں کے دلی میں داخل ہونے سے قبل تو مرہٹوں اور جالوں نے وہ ہنگامے برپا کیے تھے کہ لوگوں کا زندہ رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے ان حالات میں تہذیبی معاملات کی طرف توجہ ممکن نہیں تھی۔ اگرچہ دلی میں انگریزوں کے داخل ہونے اور برسر اقتدار آ جانے کو لوگوں نے اچھا نہیں سمجھا تھا، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس کے بعد حالات کسی حد تک معمول پر ضرور آ گئے اور لوگوں کو ایک جگہ جم کر بیٹھنے، غور کرنے، سوچنے، اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے، کچھ لکھنے پڑھنے اور علمی کام کرنے کے مواقع ضرور ملے۔ اس ماحول میں وہ ذہنی اور فکری تحریکیں جن کی نوعیت نیم سیاسی اور نیم مذہبی تھی فروغ پاتی رہیں۔ اس تحریک کے علم برداروں نے اس زمانے کی مذہبی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی پر گہرے نقوش چھوڑے۔ ان میں سے بیشتر نہ صرف مذہبی علوم کے عالم تھے بلکہ سیاست اور تاریخ، معاشرت اور عمرانیات سے بھی انہیں واقفیت تھی۔ انہیں اس زمانے کی زندگی کے نشیب و فراز کا پوری طرح علم تھا اور انہوں نے اس کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال بھی کیا ہے۔ ان میں سے بیشتر صاحب تصنیف بھی گزرے ہیں اور مختلف موضوعات پر ان کی باقاعدہ کتابیں موجود ہیں۔ انہوں نے زبان و ادب کے لیے بھی بڑا کام کیا ہے۔ ان کے اثر سے اس زمانے کی شاعری میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑی ہے اور اس نے اس وقت کی سیاسی، تہذیبی، ذہنی اور جذباتی زندگی کے ان گنت پہلوؤں کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ پھر اس زمانے میں انگریزوں کے اثر سے ایک نئی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا آغاز بھی ہوا ہے جس میں مشرق و مغرب کی تہذیبی روایات نے آپس میں مل کر قوس قزح کی صورت اختیار کی ہے۔

اس زمانے کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کو دیکھا جائے تو سب سے پہلے ان علماء پر نظر پڑتی ہے جنہوں نے دین اور مذہب کے مختلف پہلوؤں کو مفکرانہ انداز میں پیش کیا اور اپنی تحریر و تقریر دونوں میں ایک اجتہادی شان پیدا کی۔ شاہ ولی اللہ سے لے کر مولانا سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید تک اس کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ ان علماء دین کے کارناموں پر سرمد نے تذکرہ اہل دہلی میں روشنی ڈالی ہے۔ اس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ

اس زمانے میں کیسے بڑے بڑے عالم دلی کی سرزمین پر موجود تھے اور انہوں نے دینی معاملات و مسائل کو سمجھنے سمجھانے میں کبسا اجتہاد پیدا کیا تھا۔ اس تذکرے میں مولوی رشید الدین خان، مولانا محمد اسحق، مولوی محمد یعقوب، مولانا قطب الدین خان، مولوی عبدالخالق، مولوی فائز حسین، مولوی محبوب علی، مولوی نصیر الدین، مولوی کریم اللہ، مولانا فضل امام، مولانا فضل حق، مولوی نور الحسن، مولوی کرامت علی، مولوی مخلوک العلی، مفتی سید رحمت علی، اخون شیر محمد، مولوی امام علی، مولوی امان علی، مولوی محمد چان، مولوی نواز علی، مولوی رستم علی، مولوی حاجی محمد اور ملا سرفراز کے حالات بیان کیے ہیں اور ان کے علمی اور دینی کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔ ان علمائے دین میں نظریاتی اختلافات بھی تھے۔ انہوں نے اپنے اپنے خیالات و افکار کو اپنے مخصوص حدود میں وہ کر بٹھ کر دیا ہے لیکن ان میں سے ہر ایک کی انفرادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ ان سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کے کارناموں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ مجموعی طور پر یہ سب کے سب اس زمانے کو علم و عمل کی ایک فضا سے آشنا کرنے میں بیش بیش نظر آتے ہیں۔ انہوں نے دینی معاملات و مسائل پر غور و فکر کیا ہے اور مفکرانہ انداز میں اپنے خیالات عوام تک پہنچائے ہیں جن کی بدولت صحیح دینی فضا قائم ہوئی ہے۔

شاہ ولی اللہ کے بعد ان کی دینی خدمت کو اس زمانے میں ان کے صاحب زادے شاہ عبدالعزیز نے جاری رکھا۔ وہ چودہ پندرہ برس کی عمر میں اپنے والد ماجد اشرف الاماجد عبد اللہ علمائے حقیقت آگاہ شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی خدمت میں تحصیل علوم غلی و غلی اور تکمیل کمالات باطنی سے فارغ ہوئے۔ اس کے چند مدت بعد حضرت شاہ موصوف نے وفات پائی اور آپ کی ذات فائض البرکات سے مسند خلافت نے زینت و جہا اور ومادہ ارشاد و ہدایت نے روشنی لے منتہا حاصل کی۔ تمام علوم و فیوض کو انہیں حضرت کی خدمت میں کسب کیا۔ علم حدیث و تفسیر بعد آپ کے تمام ہندوستان سے مفقود ہو گیا۔ علمائے ہندوستان کے خواجہ جیس اسی سرگروہ علماء کے خرم کمال کے ہیں اور جمیع کمالہ اس دیار کے چاشنی گرفتہ اسی زبدۂ اویاب حقیقت کے مائدۂ فضل و افضال کے۔ “ ان کے ساتھ

شاہ رفیع الدین بھی اس کام میں پیش پیش نظر آتے ہیں اور اس زمانے میں دینی معاملات پر انہوں نے بھی غور و فکر سے کام لیا اور اپنے خیالات و نظریات درس و تدریس کے ذریعے سے عام کیے۔ "چونکہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب مرحوم بسبب کبرسنی اور ضعف مزاج و کثرت امراض کے دماغ تعلیم و تدریس طلباء نہ رکھتے تھے۔ سلسلہ تدریس کا حضرت کی ذات یا برکات سے جاری تھا۔ فضلاء نامی ہر دیار کے ارباب کمال سے منشور یکتائی حاصل کرچکے تھے۔ جب آپ کی خدمت میں پہنچتے اپنے تئیں طلل ابجد خواں اور مبتدی محض سمجھ کر ابتدا سے انتہا تک پھر تحصیل پر کمر باندھتے۔ اسی واسطے دیار ہندوستان کے جمیع فضلاء نامی انہیں حضرت فیض موبیت کے مستفیضوں میں سے ہیں۔ ہر فن کے ساتھ ایسی مناسبت تھی کہ ایک وقت میں قانون متبادرہ اور علوم مختلفہ درس فرماتے تھے۔ جب ایک کی تعلیم سے دوسرے کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوتے، حضار خدمت کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسی فن میں چاہے" یکتائی ان کے قامت استعداد پر قطع ہوا ہے۔" کم و بیش یہی حال شاہ رفیع الدین کے بھائی شاہ عبدالقادر کا تھا۔ وہ اپنے زمانے کے محقق مسائل دین، موسس معنی شرح متین، ہادی، شریعت اور بہر طریقت سمجھے جاتے تھے، آپ کے علم و فضل کا بیان کرنا ایسا ہے کہ کوئی کتاب کی تعریف فروغ اور فلک کی مدح بلندی کے ساتھ کرے۔ صاحب کشف تھے اور ایسا مکشف صحیح کم کسی اہل سے اتفاق ہوا ہے۔" گوشہ نشینی ان کے مزاج میں داخل تھی۔ اکبر آبادی مسجد میں سناری زندگی گزاری۔ درس و تدریس اور وعظ کے ذریعے سے دین کے نکات کو عوام تک پہنچانا ان کی زندگی کا بنیادی مقصد تھا۔ اس زمانے کے بڑے بڑے لوگوں نے ان کے سامنے فخر کے ساتھ زانوئے ادب تہ کیا۔ علماء میں مولانا سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید اور شعراء میں سومن خاں نے ان سے فیض حاصل کیا۔ مولانا سید احمد بریلوی تو اس زمانے کے ایسے زبردست عالم یا عمل تھے کہ علم و عمل میں ان کی مثال نہیں مل سکتی۔ اوائل حال میں شوق طالب علمی وطن سے وارد

۱۔ سر سید احمد خاں : تذکرہ اہل دہلی : صفحہ ۷۲

۲۔ ایضاً : صفحہ ۷۵

شاہجہاں آباد ہو کر حضرت با برکت مولانا عبدالقادر علیہ الرحمۃ کی خدمت سراسر افتاد میں حاضر ہو کر مسجد اکبر آبادی میں فروکش ہوئے اور صرف و نحو میں فی الجملہ سواد حاصل کیا۔ از بسکہ ذوق درویشی اور مسکینی طینت میں بڑی ہوتی تھی۔ اکثر خدمت اور اس مقام کے واردوں، خصوصاً درویشان پاک طینت جو دور دراز سے تحصیل علم باطنی کے شوق میں جناب عبدالقادر صاحب موصوف کی خدمت میں حاضر رہتے۔ خاطر داری اور سر انجام مہام میں ایسے بہ دل سرگرم ہوتے، گویا اس امر کو اہم مہام سمجھتے ہوئے تھے اور اس زمانے میں یہی اپنی اوقات کو طاعات و عبادات میں ایسا مصروف کیا تھا کہ جو لوگ صرف اسی امر کے واسطے کنج نشین اور گوشہ نشین تھے، ان سے بھی اس طرح مجموع اور حضور قلب سے ظہور میں نہ آتے تھے۔ اکثر مولانائے مغفور رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اس بزرگ کے احوال سے آثار کمال ظاہر ہوتے ہیں اور مادہ اس سعادت منشی کا فرق مدارج علیا کے قابل نظر آتا ہے۔“ ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ وہ تحریک جہاد ہے جس نے ہندوستانی مسلمانوں کے جسد مردہ میں جان ڈال دی۔ ہر طرف اسلام کے نام پر جان دے دینے کے خیالات عام ہونے لگے۔ ”تیرہویں صدی میں جب ایک طرف مسلمانوں کی سیاسی طاقت فنا ہو رہی تھی اور دوسری طرف ان میں شرکانہ رسوم اور بدعات کا زور تھا مولانا اسماعیل شہید اور حضرت سید احمد بریلوی کی مجاہدانہ کوششوں نے تجدید دین کی نئی تحریک شروع کی۔ وہ وقت تھا جب سارے پنجاب پر سکھوں کا اور باقی ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ ان دونوں بزرگوں نے اپنی بلند ہستی سے اسلام کا علم اٹھایا اور مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی جس کی آواز ہالیہ کی چوٹیوں اور نیالی کی ٹرائیوں سے لے کر خلیج بنگال کے کناروں تک یکساں پھیل گئی اور لوگ جوق جوق اس علم کے لیجے جمع ہونے لگے۔ سید صاحب کے خلفاء پر صوبہ اور ولایت میں پہنچ چکے تھے اور اپنے دائرہ میں تجدید، اصلاح اور تنظیم کا کام اہتمام دے رہے تھے۔ شرکانہ رسوم مٹائے جا رہے تھے، بدعتیں چھوڑی جا رہی تھیں۔ نام کے مسلمان کام کے مسلمان بن رہے تھے، جو مسلمان نہ تھے وہ

بھی اسلام کا کلمہ بڑھ رہے تھے ۔ شراب کی بوتلیں توڑی جا رہی تھیں ۔
 تاڑی اور سبدمی کے خم لٹھائے جا رہے تھے ۔ بازاری فواحش کے بازار سرد
 ہو رہے تھے اور حق و صداقت کی بلندی کے لیے علماء حجروں سے ، امراء
 ایوانوں سے نکل نکل کر میدان میں آ رہے تھے اور ہر قسم کی ناچاری ، مفلس
 اور غربت کے باوجود تمام ملک میں اس تحریک کے سپاہی پھیلے تھے اور مجاہد
 تبلیغ اور دعوت میں لگے تھے "۔ مولانا اسماعیل شہید کا بھی اس تحریک
 میں بڑا ہاتھ تھا اور وہ بھی اس تحریک کے بہت بڑے علم بردار تھے۔ انھیں
 مولانا سید احمد کے دست راست ہونے کا شرف حاصل تھا ۔ اگرچہ وہ ان
 کے مرید تھے ۔ لیکن دینی علوم میں ان کا ہاتھ بہت بلند تھا ۔ وہ وعظ
 کہنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے اور دینی معاملات ایسی قابلیت سے
 ذہن نشیں کراتے تھے کہ ہر بات آگے کی طرح روشن ہو جاتی تھی ۔ مقالات
 اور مقالات دونوں میں ان کا ہاتھ بہت بلند تھا ۔ دہلی میں ان کے وعظ کا
 اثر یہ ہوا کہ جامع شاہجہانی سے لے کر قسق و معصیت کے مرکزوں تک
 خدا کا پیغام پہنچایا ۔ شریعت کے احکام سنائے ۔ اپنی مخصوص اور شہرۂ آفاق
 جرأت و شجاعت سے شرک و بدعت کا رد کیا ، توحید و سنت کی منادی کی ۔
 چند ہی دنوں میں لال قلعے سے لے کر جھوٹڑوں تک زبانوں پر آپ کا نام
 تھا ۔ گھر گھر آپ کے مواعظ اور نئے عقائد کا چرچا تھا "۔ سرسید نے
 الہی شاہ کشور شریعت گسٹری ، ملک الملوک دہار دیں پروری ، قاص بنان
 شرک و طغیان حاد موجبات علم و اہقان ، موسس اساس کمال ، مہذب
 اوضاع حال و قال ، سالک مسائل ہدایت و ارشاد ، مجلی آئینہ صافی اعتقاد ،
 دائرۃ علوم ، منطقہ آسمان فہوم ، مرتبی مدارج درجات عالی ، پیشوائے
 ادانی و اعلیٰ ، مرجع و مآب فضائل ، کام روئے طبائع ناضل ، رموز فہم
 سوار تقسیم قرآنی ، ذکیف یاب معالم القدیرات ربانی کہا ہے ، جامع کالات
 صوری و معنوی ، نکتہ سنج کلام الہی و حدیث نبوی ، قدوة اہالی پیش کہ
 قبول ، جلال غوامض معقول و منقول ، بانی مہانی فضل و انضال ، محمد
 قواعد تکمیل و اکمال ، جاہد حق و یقین ، مثبت دلائل دین کہا ہے اور

۱۔ سید ابوالحسن علی ندوی : سیرت سید احمد شہید : صفحہ ۱۳ ، ۱۵

۲۔ ایضاً : صفحہ ۳۸۳

اس میں شبہ نہیں کہ ان کی شخصیت ان تمام خصوصیات کی حامل تھی۔ کم و بیش یہی حال مولانا عبدالحی، مولانا محمد اسحق، مولانا محمد یعقوب وغیرہ کا تھا۔ یہ سب کے سب اپنے زمانے کے بڑے علمائے دین میں شمار ہوتے تھے اور علمی اعتبار سے ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔

ان کے علاوہ اس زمانے میں بعض ایسے عالم بھی تھے جو پوری طرح ان علماء کے ساتھ نہیں تھے اور جنہوں نے ان کی نگاہوں مخالفت بھی کی ہے لیکن علمی اعتبار سے ان کا پایہ بھی بہت بلند ہے۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں نام مولانا فضل حق خیر آبادی کا ہے۔ اس زمانے کی دلی میں وہ بھی موجود تھے اور اُس وقت کے علمی مباحث میں بڑی گرم جوشی سے حصہ لیتے تھے۔ غالب کو ان سے بڑی عنایت تھی۔ چنانچہ انہوں کی تحریک پر غالب نے اپنے اردو کلام میں سے دو نث کے قریب نکال ڈالا۔ سرسید نے ان کو مستجمع کلمات صوری و معنوی، جامع فضائل ظاہری و باطنی کہا ہے اور لکھا ہے کہ ”جمع علوم و فنون میں بکتائے روزگار ہیں اور منطق و حکمت کی تو گویا انہیں کی فکر عالی نے بنا ڈالی ہے۔ علمائے عصر بل فضلائے دہر کو کیا طاقت ہے کہ اس سرگروہ اہل کمال کے حضور میں بساط مناظرہ آراستہ کر سکیں۔ بارہا دیکھا کہ جو لوگ آپ کو یگانہ فن سمجھتے تھے، جب ان کی زبان سے ایک حرف سنا دھوی“ کمال کو فراموش کر کے نسبت شاگردی کو اپنا فخر سمجھے۔ ہاں بعد کلمات علم و ادب میں ایسا علم سرفرازی بلند کیا ہے کہ نصاحت کے واسطے ان کی عبارت شستہ محضر عروج معارج ہے اور بلاغت کے واسطے ان کی طبع رسا دست آویز بلندی مدارج ہے۔“ غرض میں ان پر مقدمہ چلایا گیا اور کالیے ہانی کی سزا ہوئی، وہیں انہوں نے ۱۸۹۱ء میں انتقال کیا۔ مولانا فضل حق کے مشہور شاگرد مولانا نور الحسن تھے۔ ان کا شمار بھی اس زمانے کے عالموں میں ہوتا تھا۔ ان کے مزاج میں خلق ایسا تھا کہ ہندوکان الہی کی دل شکنی آپ کے اعتقاد میں خانہ خدا کی بنیاد گرانے سے کم جرم نہیں اور علم ایسا کہ اس کو ایک چمک فراہم لا کر فرق نہم پر رکھ دیں تو یہ سب گرائی بار کے

۱۔ حالی : یادگار غالب : صفحہ ۱۰۲۔

۲۔ سرسید احمد خان : تذکرۃ اہل دہلی : صفحہ ۸۷۔

طبقات کرات کو اس طرح توڑنا ہوا ہستی کو مائل ہو اور محیط کے دوسری طرف سے گزر جائے کہ اوج سے حسیض تک نگاہ کو ایک جادۂ مستقیم محسوس ہو اور وقار اس درجہ میں کہ فلک دیوار کی ہزار گردشیں ان کی ممکن کی ایکہ نشست میں سر مو تفاوت پیدا نہیں کر سکتیں۔“ اسی طرح مولانا فضل امام غیر آبادی کی بھی سرسید نے بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ علوم عقلیہ میں ان کی طبع دقاق سے اعتبار تھا اور علوم ادبیہ میں ان کی زبان دافی سے اقتدار۔“ غرض ایسے بڑے شہار بلند پایہ عالم اس زمانے میں موجود تھے ، جنہوں نے اپنے علم و فضل اور حسن اخلاق سے اس ماحول میں بڑی عالمانہ شان پیدا کر دی تھی ۔

یہ علما نے دین جو اس زمانے کی دلی میں موجود تھے ، بہت بلند مراتب کے مالک ہیں ۔ ان کی کوششوں سے نہ صرف دین داری کی قضا قائم ہوئی بلکہ ذہنی مسائل کو عالمانہ اور مفکرانہ زاویہ نظر سے دیکھنے کا ایک رجحان عام ہوا ۔ ان کے انکار و خیالات نے افراد میں ایک ذہنی تہذیب پیدا کی اور ان قدروں کا احساس و شعور ان کے چاں عام ہوا ، جو تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی بنیاد ہوا کرتا ہے ۔ انہوں نے ایک علمی فضا بھی قائم کی جس میں شعور و فکر کا صحیح سامان پیدا ہوا ۔ اور ان کی تدریس اور مواعظ کی بدولت افراد تزکیہ نفس کی طرف راغب ہوئے ، اور انہوں نے اپنے آپ کو ذہنی ، روحانی اور اخلاقی اعتبار سے زیادہ سہذب بنایا ۔ ان میں بیشتر صاحب تصنیف و تالیف بھی گزرے ہیں ۔ شاہ ولی اللہ نے اس سے قبل تصنیف و تالیف کی ایک عظیم روایت قائم کی تھی ۔ اور ان کی تصانیف ”حجۃ اللہ الباقیہ“ ”تہذیب اللہیہ“ ، ”الفرز الکبیر“ ، ”السمات“ ، ”الطائف القدس“ ، ”غیر کثیر“ ، ”انصاف فی بیان سبب الاختلاف“ ”الفاہم العارفین“ وغیرہ بہت بلند مقام رکھتی ہیں ۔ اس کے بعد اگرچہ اس طرح تو تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری نہیں رہا ۔ کیونکہ ان کے جانشین درس و تدریس اور مواعظ کی طرف زیادہ متوجہ رہے پھر بھی ان کے صاحب زادوں میں سے بعض نے اہم تصنیفی کارنامے انجام دیے ۔ یہ تصانیف ، عربی ، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں موجود ہیں ۔

۱۔ سرسید احمد خان : تذکرۃ اہل دہلی : صفحہ ۷۷

۲۔ ایضاً : صفحہ ۸۶

شاہ عبدالعزیز کے زمانے میں شیعہ منی اختلافات زوروں پر تھے۔ آپ نے ان مسائل پر عربی زبان میں کتابیں لکھیں۔ ان میں سے ’تفہد‘ اثناء عشریہ‘ ایک مناظرہ کی کتاب ہے لیکن مخالفین بھی اس کی مناعت تہذیب اور شائستگی کے مداح ہیں۔ اس کے علاوہ ’تفسیر عزیزی‘ میں آپ نے قرآن مجید کے پہلے سوا بارے اور آخری دو پاروں کی تفسیر فارسی میں کی ہے۔ اصول حدیث میں ’مجاہد نالندہ‘ اور تاریخ حدیث میں ’ایستان المحدثین‘ اور چند حواشی اور شرح کی کتابیں آپ سے یادگار ہیں۔ آپ کے فنون کا مجموعہ بھی چھپ چکا ہے ’شاہ عبدالعزیز کے چھوٹے بھائی کا زیادہ وقت درس و تدریس میں صرف ہوا لیکن آپ سے چند نظمیں اور کچھ نثر بھی یادگار ہے۔ آپ کا سب سے اہم کام کلام مجید کا تحت اللفظ اردو ترجمہ ہے جو آج تک مقبول انام ہے۔“ شاہ عبدالقادر صاحب کے مزاج میں ترک زیادہ تھا، اور وہ گوشہ نشین آدمی تھے۔ انہوں نے ساری زندگی اکبر آبادی مسجد میں گزار دی۔ درس و تدریس اور وعظ ان کے محبوب مشاغل تھے۔“۔ اس سبب سے تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ نہ کی لیکن قرآن شریف کا با محاورہ ترجمہ یا ’موضح القرآن‘ (۵۰۹۰ ع) آپ سے یادگار ہے جس پر بلا مبالغہ ہزاروں کتابیں نثار ہیں۔“۔ شاہ عبدالقادر کے شاگرد خاص مولانا سید احمد بریلوی بنیادی طور پر ایک مجاہد تھے۔ ان کی زندگی جہاد کے منصوبے بنانے اور کافروں سے لڑنے میں گزر گئی۔ اس لیے تصنیف و تالیف کی طرف کوئی خاص توجہ نہ کر سکے۔ البتہ ان کے دست راست مولانا عبدالحی اور شاہ اسماعیل شہید باوجود جہاد کے کاموں سے دلچسپی لینے کے تصنیف و تالیف کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ ان دونوں نے مل کر مولانا سید احمد کے اقوال و ارشادات کو جمع کیا ہے اور یہ کتاب ’صراط مستقیم‘ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب ایک مقدمہ اور چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا اور چوتھا باب مولانا اسماعیل نے ترتیب دیا ہے اور اس میں طریقی ولایت اور طریقی نبوت کے اختلاف کا ذکر ہے اور چوتھے باب میں طریقی سلوک راہ نبوت یعنی طریقتہ‘ مجاہدہ کا

۱۔ شیخ محمد اکرام : رود کوثر : صفحہ ۳۹۳۔

۲۔ ایضاً : صفحہ ۳۹۶۔

۳۔ ایضاً : صفحہ ۳۹۶۔

بیان ہے دوسرا اور تیسرا باب مولانا عبدالجلی کا لکھا ہوا ہے جس میں ہندوستان کے مشہور سلسلہ ہائے تصوف کے اشغال و وظائف کو عام فہم زبان میں جمع کیا ہے اور بتایا ہے کہ چشتیہ قادریہ ، نقشبندیہ اور دوسرے طریقوں کے بزرگ اپنے مریدوں کو کس طرح تعلیم دیتے تھے اور صفاتی قلب اور ترقی درجات کے لیے انہیں کون سے مراقبے اور عمل سکھاتے تھے اس کے علاوہ شاہ اسماعیل شہید نے ایک مستقل کتاب 'تقویت الایمان' کے نام سے اردو زبان میں لکھی ہے ۔ اس کتاب میں ایمان کے جزو یعنی خدا اور رسول پر بحث ہے ۔ اُن کی بعض اوز کتابیں بھی اہم ہیں ان میں 'یک روزی' جسے آپ نے مسئلہ امتناع نفیر غاتم النبیین پر مولانا فضل حق غیر آبادی کے جواب میں ایک دن میں لکھا ۔ 'رسالہ اصول فقہ' ، 'منصب امامت' ، 'طبقات' ، 'ایضاح الحق الصریح الاحکام الہیت و التفریع' ، 'مثنوی سلک نور' اور 'تتویر العینین فی اثبات رفیع الدین' بھی اُن کی مشہور تصانیف ہیں ۔ مولانا سید محمد بریلوی کے ساتھیوں میں مولوی کرامت علی جون پوری کی شخصیت بھی خاصی اہم ہے ۔ یہ بھی صاحب تصنیف تھے اور ان کی تصانیف 'الرد البدعت' ، 'دائع الوسواس' ، 'ترجمہ شائل ترمذی' ، 'ترجمہ مشکوٰۃ جلد اول' ، 'مفتاح الجنۃ' وغیرہ مشہور ہیں ۔ ان علمائے دین کے علاوہ اس زمانے میں بعض دوسرے عالموں نے بھی تصنیف و تالیف کا کام کیا ہے ۔ نواب صدر الدین خان آرزوہ سے بہت سی نظم و نثر یادگار ہے ۔ مولانا نواب قطب الدین خان نے اپنی منصبی مصروفیتوں کے باوجود "اکثر رسائل زبان ریختہ میں واسطی فوائد عوام کے تحریر کیے اور اس میں مسائل ضروریہ ہر طرح کے مندرج فرمائے اور حق یہ ہے کہ ان رسالوں سے خالق کو بہت فائدہ ہوا کہ ضروریات دین سے ہر شخص مطلع اور آگاہ ہو گیا ۔ کتب حدیث سے 'مشکوٰۃ' کا ترجمہ زبان اردو میں بہت صاف و سستہ و فائدہ مند کیا ہے اور اکثر فوائد کتب متداولہ و غیر متداولہ سے اُس پر بڑھایا ۔" مولانا فضل حق غیر آبادی بھی نظم و نثر پر پوری قدرت رکھتے تھے اور ان

۱۔ شیخ محمد اکرام : موج کوثر : صفحہ ۱۲ ۔

۲۔ ایضاً : صفحہ ۳۷۰ ۔

۳۔ ایضاً : صفحہ ۳۰ ۔

۴۔ ایضاً : صفحہ ۸۴ ۔

سے یوں بہت سی تحریریں یادگار ہیں۔ غرض اس زمانے میں ان علما نے دین نے
 خاصاً علمی ماحول پیدا کر دیا تھا اور اس طرح تصنیف و تالیف کی اچھی خاصی
 فضا قائم ہو گئی تھی۔ اس زمانے کی ثقافتی زندگی میں اس علمی ماحول اور
 تصنیفی فضا نے ذہنی اور روحانی اعتبار سے بڑے اہم کارنامے انجام دیے ہیں۔
 ان علما نے دین کے ساتھ ساتھ اس زمانے کی زندگی میں بڑے بڑے
 اولیاء اللہ بھی موجود تھے اور انہوں نے بھی اس وقت کی ثقافتی زندگی پر
 گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔ ان بزرگوں نے صرف ریاضت اور عبادت ہی میں
 کمال حاصل نہیں کیا ہے۔ اخوت اور انسانی محبت کے خیالات بھی عام کیے
 ہیں اور اپنے ان خیالات کو درس و تدریس، کشف و کرامات اور تصنیف و
 تالیف کے ذریعے سے عوام تک پہنچایا ہے۔ یہی سبب ہے کہ خلق خدا
 ان سے متاثر ہوئی ہے اور افراد نے ان کے اثر سے اپنے آپ کو مہذب بنایا
 ہے اور اس طرح ان کے فکر و عمل نے اس زمانے کی ثقافتی زندگی کو بہت
 متاثر کیا ہے۔ ان مشائخین اور اولیاء اللہ میں حضرت شیخ الشیوخ مولانا شاہ
 غلام علی، حضرت مولانا ابو سعید، حضرت مولانا شاہ عبدالغنی،
 شاہ محمد آفاق، حاجی علاؤ الدین احمد، مولانا فخر الدین، مولانا قطب الدین،
 حاجی غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب، خواجہ محمد نصیر رح، مولوی
 یوسف علی، حضرت شاہ غیاث الدین، شاہ سائر بخش، جناب میر ہدی صاحب
 میران شاہ مانو، شاہ جلال اور مولانا محمد حیات کے نام خاص طور پر مشہور
 ہیں۔ ان میں سے اکثر صاحب کشف و کرامات تھے۔ اکثر نے اپنے فیض
 کو عام کر رکھا تھا۔ اکثر معرفت و حقیقت کے اسرار و رموز کی درس و
 تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ ان میں بعض صاحب تصنیف و تالیف بھی
 گزرے ہیں اور بعضوں نے شعر و شاعری سے بھی دلچسپی لی ہے۔

حضرت شاہ غلام علی اس زمانے کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ "اعلم اور
 عمل اور فضل و کمال اور تجرید و تجرد اور حلم و کرم اور سخاوت اتم اور
 ایثار و انکسار آپ کی ذات پر ختم تھے۔ دن رات اللہ اور اللہ کے رسول کے
 ذکر میں بسر کی اور دنیا و مافیہا کی خبر نہ رکھی۔ آپ کی ذات فیض آفات
 سے تمام جہان میں فیض پھیلا اور ملکوں ملکوں کے لوگوں نے ان
 کی بیعت اختیار کی۔ میں نے حضرت کی خانقاہ میں روم اور شام اور بغداد
 اور مصر اور چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا کہ حاضر ہو کر بیعت کی

اور خدمات خائفہ کو سعادت الہی سمجھا اور قریب قریب کے شہروں کا مثل ہندوستان، پنجاب اور افغانستان کا تو کچھ ذکر نہیں کہ تہذیبی دل کی طرح امتحان تھے۔^۱ ”شاہ غلام علی خلیفہ شاہ ابو سعید تھے۔ ان میں صفات ذاتی اور کمالات ظاہری اور باطنی ایسے تھے کہ جن کا کچھ حد و حساب نہیں۔ حافظ کلام اللہ اور عاشق رسول اللہ اور علوم دینی آپ کو بہت مستحضر تھے اور دن رات انہیں کے درس میں گزرتے تھے۔ علم قرأت میں پکتائے روزگار تھے۔ کلام اللہ ایسی خوش آواز اور قرأت سے پڑھتے تھے کہ لوگ دور دور سے سنتے آتے تھے۔“^۲ ان کے بڑے بیٹے مولانا شاہ سعید احمد تھے۔ انہیں علم حدیث و فقہ و تفسیر میں کمال حاصل تھا۔ دن رات مشغولہ درس و تدریس جاری رہتا تھا۔ مسائل دینی آپ کے فیض سے حل ہوتے اور فتویٰ شریعہ شریف آپ کی سہر سے مسجل کیے جاتے۔ قدم بہ قدم اپنے بزرگوں کے طریقے پر چلتے اور اپنے پیروں کا طریقہ برتتے تھے۔ نسب باطنی بہت مستحکم تھا۔^۳ کم و بیش یہی حال حضرت مولانا عبدالغنی، شاہ محمد آفاق اور حاجی علاء الدین احمد کا تھا۔ مولانا محمد نغیر الدین بھی اس دور کے ایک اہم بزرگ تھے۔ مقبول خدائے لایزال تھے۔ خلق اللہ میں بھی ایسا قبول خاطر ہم پہنچایا کہ گروہا گروہ حصول نجات اور تحصیل ہدایت کے واسطے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور آپ کے ارشاد کو مانند حکم وحی کے راست اور درست جانتے تھے۔ چنے امرائے ذوی الایمان اور سلطان عہد تھے، آپ کی بیعت سے مشرف ہو کر آپ ہی کی خاک در کو وسیلہ، آبرو اور آپ ہی کے غبار آستان کو تاج عزت و اعتبار سمجھتے تھے۔ کتاب ”نظام العوائد“ اور ”رسالہ سرحدیہ“ اور ”المختصر الحسن“ حضرت ہی کی تالیفات میں سے ہیں۔^۴ ”خواجہ محمد نصیر رنج بھی اس عہد کے بزرگوں میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ خواجہ میر درد کے نواسے تھے۔ آپ کو خصوصاً ریاضیات میں بہت دخل تھا۔ علم موسیقی بہت خوب جانتے تھے اور قال اور لے سے ایسے

۱۔ سرسید احمد خاں : تذکرہ اہل دہلی : صفحہ ۱۲ - ۱۳

۲۔ ایضاً : صفحہ ۱۸

۳۔ ایضاً : صفحہ ۱۹ - ۲۰

۴۔ ایضاً : صفحہ ۲۳ - ۲۵

واقف تھے کہ بڑے بڑے استاد اُن کے سامنے کان پکڑتے تھے اور خاک چاٹ کر نام لیتے تھے۔ علم حساب کو اُس سے زائد جانتے تھے اور مسائل حساب میں وہ مہارت ہم پہنچائی کہ مسائل لاینحل بہ آسانی حل فرماتے تھے۔ چنانچہ، نال اور حساب میں اُن کی تصنیفات موجود ہیں۔ یہ تو صفات ظاہری تھیں اور کہالات باطنی میں ان سب سے رتبہ بڑا تھا اور وہ مقام ہی اور تھا۔ یمن سے دلچسپی تھی اور ہر مہینے کی دوسری اور چوبیسویں کو مجلس بین نوازی کی آب کے روبرو ہوا کرتی تھی۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے، رنجِ فغان تھا۔ ”میر غدی بھی اُس زمانے کے بزرگ تھے۔ مقبولانِ بارگاہِ کبریائے الٰہی سے تھے۔ قبول خاطر خاص و عام میں بھی یہاں تک حاصل تھا کہ امراء و سلاطین آپ کے دیدار فیض انوار کو نعمت کہیں اور آپ کی خدمت میں حاضر رہنے کو ایک مہینہ سمجھتے تھے، از بس کہ جنب باطن کی تاثیر سے ساکنینِ شہر کے، عموماً صادقینِ قلندر مبارک کے، علِ الخصوص شہزادگانِ جلیل القدر آپ سے بہت رجوع کرتے تھے۔ غرض یہ بزرگ نے شہرِ غصوبیات کے مالک تھے اور انہوں نے اس زمانے کی ثقافتی زندگی میں بڑے کار ہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ انہوں نے عوام سے رشتہ استوار کیا اور اُن کی ذہنی اور روحانی تہذیب کی، امراء و رؤسا بھی اُن کے زیر اثر آئے اور اُن کی تہذیب میں بھی انہوں نے نمایاں حصہ لیا۔ انہوں نے زندگی کے اعلیٰ معیار قائم کیے۔ علم کے دریا بہائے، درس و تدریس میں مصروف رہے، تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ مختلف فنون، خاص طور پر موسیقی اور شاعری سے دلچسپی لی اور انہیں فروغ دینے کے سامان فراہم کیے۔ اس لیے اس زمانے کی ثقافتی زندگی کی بنیادوں کو استوار کرنے میں ان بزرگوں کا بڑا حصہ ہے۔

عالیٰ دین اور مشائخین کے علاوہ اس عہد کی دلی میں دوسرے علوم و فنون کے ماہر بھی بڑی تعداد میں موجود تھے، ان میں سے ہر ایک اپنے علم اور فن پر پوری قدرت رکھتا تھا اور اس زمانے کی ثقافتی زندگی پر ان کے نقوش بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ طب کے علم اور فن کو ان لوگوں نے خاص طور پر ترقی دی اور اس کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا۔

حکیم احسن اللہ خاں کا نام اس سلسلے میں بہت نمایاں ہے۔ وہ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم فاضل تھے۔ مختلف علوم پر ان کی گہری نظر تھی۔ بہت قابل اور سمجھ دار سمجھے جاتے تھے۔ لوگوں کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ انہوں نے فنون حکمت و ہندسہ و ہیئت خدمت فضائل عصر سے حاصل کر کوئن طبابت کو اپنے والد ماجد (حکیم محمد عزیز اللہ خاں) سے حاصل کیا اور از بس کہ حافظہ پارہ لوح محفوظ تھا اور طبیعت جزو تقدیر تھی۔ چند مدت سے مدارج کمال سے کوئی باقی نہ رہا کہ طے نہ کیا ہو اور شفاۓ مرشاء داد الہی ہے جس کی زندگی سے مسیحا نے ہاتھ دھوئے ان کے نسخے سے جی کیا۔ اسی واسطے ساکنین شہر اور قاطبین دہر سوائے اس زندہ اہل کمال کے اور کسی طرف رجوع نہ کرتے۔ ان کی شہرت اور مقبولیت کی وجہ سے حضرت معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی عرش آرام گاہ نے اپنے پاس بلا کر عطائے علمت اور عناہت خطاب عمدۃ الملک حاذق الزمان سے مشرف فرما کر خاص اپنے معالجے کے واسطے معین کیا اور قائم زیست یہ سمجھے کہ اگر یہ سالنہ کرام ایک دم الگ ہو تو زندگی اس بادشاہ گردوں جاہ کی محال ہے اور ان کے انتقال کے بعد ہندوگان گردوں نواساں حضرت ظل الہی فلک بازگاہی ابو ظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ بادشاہ غازی غلہ اللہ ملکہ، و سلطانہ و الفاضل علی العالمین برہ و احسانہ نے کمال قدردانی و رتبہ عناسی سے اپنے ستہ جلوس میں طلب کیا اور سعادت نبض گری سے مستعد فرما کر احترام الدولہ اور ثابت جنگ خطاب سابق پر زیادہ کیا۔ اور از بس کہ حضور فیض گنجور حضرت ظل اللہ کے مزاج اقدس میں ان کے کہالات جائے گیر ہوئے۔ روز بروز ترقی مدارج اور ارتفاع مناسب ظہور میں آنے لگا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ یہاں تک بادشاہ جم جاہ کی طبیعت پر تصرف ہوا کہ کوئی امر جزوی و کلی سے بے مشورہ صلاح اس صاحب تدبیر جانب کے وقوع میں نہیں آ سکتا۔“ غرض حکیم احسن اللہ خاں بڑے ہائے کے عالم، طبیب، حکیم اور مدبر تھے۔ ان کے علاوہ اس زمانے میں حکیم غلام نجف خاں کی بھی خاصی شہرت تھی۔ یہ حکیم احسن اللہ خاں اور حکیم شریف خاں کے شاگرد تھے۔ حکیم احسن اللہ خاں سے قرابت قریبہ بھی

تھی۔ اس لیے انہوں نے ان کی تعلیم میں انہماک کا اظہار کیا اور بہت تھوڑے عرصے میں وہ اپنے وقت کے اہم عالم اور طبیب ہو گئے۔ بہادر شاہ ظفر نے عبداللہ کا خطاب دیا۔ ایک زمانے تک طبیب کی حیثیت سے سرکار کمپنی کے ملازم رہے۔^۱ ”حکیم غلام حیدر خاں اور حکیم غلام حسن خاں کا شمار بھی اس زمانے کے اہم طبیبوں میں ہوتا تھا۔ حکیم غلام حیدر خاں کے بارے میں سرسید نے لکھا ہے کہ ”نقائے کامل اُن کے دست حق پرست میں ودہت ہے۔ راقم کو حضرت موصوف کی غنیمت میں نسبت شاگردی حاصل ہے۔“ اور حکیم غلام حسن خاں کے بارے میں لکھا ہے کہ ”کتاب طبیب میں مہارت اور علاج معالجہ میں دست گاہ تمام رکھتے تھے۔“ ان کے علاوہ حکیم نصر اللہ خاں، حکیم صادق علی، حکیم امام الدین، حکیم فتح اللہ خاں، حکیم پیر بخش، حکیم حسن بخش خاں، حکیم محمد یوسف خاں وغیرہ کو بھی اس زمانے میں بڑی شہرت حاصل ہوئی تھی۔ یہ سب کے سب نہ صرف فن طب کے ماہر اور علاج معالجے میں اعلیٰ درجے کے طبیب تھے بلکہ دوسرے علوم کے ماہرین کی حیثیت سے بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ انہوں نے اپنے زمانے میں علمی، فنی اور انسانی فضا قائم کی، خلق خدا کو فائدہ پہنچایا۔ اس لیے اُس زمانے کی ثقافتی زندگی میں ان کا مرتبہ بھی بہت بلند ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اُس کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے اور نکھارنے سوارنے میں انہوں نے بڑا کام کیا ہے۔

بہر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُس زمانے میں اعلیٰ درجے کے ادیب اور شاعر پیدا ہوئے ہیں اور انہوں نے صحیح ادبی اور شاعرانہ ماحول پیدا کیا ہے۔ اس شاعرانہ ماحول کے اثرات قلمی اور شعر دونوں میں نظر آتے ہیں۔ قلمی اُس زمانے میں تہذیب و ثقافت کا بڑا مرکز تھا۔ اور لوگ اُسے دلی کی تہذیب و ثقافت کی علامت سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ جذباتی نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس زمانے کے بادشاہوں نے باوجود اُن نامازگار حالات کے جن سے انہیں اس وقت دوچار ہونا پڑا، حتیٰ الامکان تہذیب اور ثقافت کی

۱۔ سرسید احمد خان : تذکرہ اہل دہلی : صفحہ ۳۸۔

۲۔ ایضاً : صفحہ ۵۰۔

۳۔ ایضاً : صفحہ ۵۱۔

طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ کی اور ان کی اس توجہ نے قلمیے کو ایک بہت بڑا تہذیبی اور ثقافتی مرکز بنا دیا۔ اس وقت تک اردو زبان قلمیے میں داخل ہو چکی تھی۔ اور لوگ قلمیے کی زبان کو معیاری اور مستند زبان سمجھتے تھے۔ فارسی کا اثر بھی باقی تھا لیکن اب رفتہ رفتہ اس کی جگہ اردو نے لے لی تھی اور اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کے وقت میں تو سارے قلمیے میں اردو زبان ہی کو تہذیب و ثقافت کی زبان سمجھا جاتا تھا۔ بادشاہ سے لے کر معمولی آدمی تک سب ہی اس کو اپنی مادری اور تہذیبی زبان سمجھتے تھے۔ اس صورت حال نے قلمیے کو تہذیب و ثقافت کا منہج اور سرچشمہ بنا دیا تھا۔ اور اس کے اثرات اس زمانے کی زندگی پر بہت گہرے تھے۔ بہادر شاہ کے زمانے میں اردو زبان و ادب کو دوبار کی سرپرستی حاصل ہوئی اور دیستان دہلی کے اردو ادب کا ایک مرکز بن گیا جس کا سب سے درخشندہ ستارہ عظیم غالب ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ غالب اس زمانے کے بہت بڑے شاعر ہیں اور انہوں نے شاعری کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ بھی اس زمانے میں بعض اہم شاعر نظر آتے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر خود شاعر تھے اور انہیں شاعروں سے دلچسپی بھی تھی۔ اس لیے انہوں نے قلمیے میں شعر و شاعری کا اچھا خاصا ماحول پیدا کر لیا تھا۔ ذوق ان کے استاد تھے اور انہیں ملک الشعراء کا منصب حاصل تھا۔ ان کی وفات کے بعد غالب کو یہی حیثیت حاصل ہوئی۔ مومن قلمیے میں ملازم تو نہیں تھے لیکن ان کا وہاں آنا جانا ضرور تھا۔ اگرچہ انہیں مسائل کی بھنا اور صلے کی ہروا نہیں تھی کیونکہ بہت خود دار آدمی تھے لیکن کبھی کبھی کوئی انعام مل ضرور جاتا تھا۔ قلمیے میں باقاعدگی سے مشاعرے ہوتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کو خود ان مشاعروں سے دلچسپی تھی، اس لیے اس وقت کے تقریباً تمام اہم شاعروں کو ان مشاعروں میں شریک کر لیتے تھے۔ غرض شاہ وقت بہادر شاہ ظفر کے دلچسپی لینے کی وجہ سے اس زمانے میں نہ صرف قلمیے میں اچھا خاصا شاعرانہ ماحول پیدا ہو گیا تھا بلکہ قلمیے سے باہر شہر میں بھی گھر گھر شعر و شاعری کے

چرخے تھے۔ غالب ، مومن ، شاہ نصیر ، ذوق ، ظفر ، آشفہ ، نیر و رعشاں ، عیش ، مجروح ، ظہیر ، عارف ، صہبائی وغیرہ کے اردو فارسی لغتوں سے دلی کی ساری فضا گونجی ہوئی تھی۔ یہ اردو شاعری کے شباب کا زمانہ تھا بادشاہ سے لے کر فقیر تک سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے^۱۔

اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ قلمی میں ایک زمانے تک بار نہ ہانے کے باوجود ایک شاعر کی حیثیت سے غالب کی عظمت اُس زمانے میں بھی تسلیم کی جاتی تھی ، اور اس عہد میں اعلیٰ درجے کے شاعرانہ ماحول کو پیدا کرنے میں اُن کا بڑا ہاتھ تھا۔ انہوں نے اردو اور فارسی دونوں میں اعلیٰ درجے کی شاعری کی ، اور وہ اپنے زمانے میں ان دونوں زبانوں کے مسلم الثبوت استاد سمجھے جاتے تھے۔ شیفہ کے خیال میں وہ ایسے نکتہ منہج نغز گفتار تھے کہ کم دیکھنے میں آئے ہیں۔^۲ سرسید نے انہیں موسیٰ اسلمی شیوہ بانی ، ہانی ہائے الفاظ و معانی ، عندلیب جبارستان سخن گسری ، طوطی شکرستان معنی پروری^۳ کہا ہے اور لکھا ہے : ”میں اپنے اعتقاد میں ان کے ایک حرف کو چتر ایک کتاب سے اور ان کے ایک کل کو چتر ایک نگزار سے جانتا ہوں اور اگر دیکھا جائے تو حق بھی یہی ہے۔ خوشا حال ان لوگوں کا جو آپ کی خدمت یا برکت سے مستفید ہوئے ہیں۔ اور جوہر گراںماہ آپ سے حاصل کرتے ہیں۔ اس کو مفنم جان کر بھی جزودان حافظ اور صندوق لیاض میں امانت رکھنے ہیں“^۴ ، ذوق بھی اس زمانے میں مسلم الثبوت استاد سمجھے جاتے تھے اور چونکہ بادشاہ پادر شاہ ظفر کے استاد تھے ، اس لیے اس زمانے میں انہیں کچھ زیادہ ہی اہمیت دی جاتی تھی۔ شیفہ نے ان کے بارے میں لکھا ہے : ”ثبوت مشتے کہ او راست دیکرے نہ دہدہ شد و معلّمًا و طب و یاس کہ شیوہ بسیار گویان است در کلامش کم تر و بر جمیع اصناف سخن قدرت

۱۔ سرزا فرحت اللہ بیگ : دلی کا ایک یادگار مشاعرہ ، مضامین

لرحمت : حصہ اول : صفحہ ۴۴۱

۲۔ شیفہ : گلشن بے خار : صفحہ ۱۳۹

۳۔ سر سید احمد خان : تذکرہ اہل دہلی : صفحہ ۱۰۴

۴۔ ایضاً : صفحہ ۱۰۴

تمام دارد۔ بالجملہ از شعرائے مسلم و ملوک است و باین ہمہ کثرت فکر و
 ہجوم اشعار بنویزہ ترتیب دیوان نہ پرداختہ صحبتی گاہ گاہ اتفاق سی اند
 از متخلفات زمان و مقتضات دوراں است“۔ اس زمانے میں شاعرانہ ماحول
 میں ان کی حیثیت بھی بہت بلند تھی اور وہ بھی بہت مقبول تھے۔ بقول
 سرسید: ”دقیقہ سنجان روزگار سے گئے جا سکتے ہیں کہ جس کا کلام وحی
 نظام فخر مستقیم میں شرف مآخروں میں ہو اس کی ذات فائز البرکات
 نبی نوع میں کس قدر فضل و شرف رکھتی ہو گی“۔ ذوق کے ساتھ ساتھ
 مومن نے بھی اس زمانے کے شاعرانہ ماحول میں اضافہ کیا ہے۔ شیفہ
 ان کے بارے میں لکھتے ہیں: ”شاعری دون مرتبہ اوست اسان چون سخن
 دربی فن است امراض نامستحسن زبان جادو طرازش سحر را بحرہ اعجاز
 وسائیدہ و سخن دلپذیرش طول را بحمایہ“ ایجاز گردانیدہ ، گوہر افشانی
 طبع نساں بارش داسن داسن کاف جواہر در جیب و آستین مفلسان انداخت و
 گل ریزی اندیشہ ہار فشارش جمن جمن ریاض جنت جہشم نظارگیاں جلوہ گر
 ساختہ“۔ اس زمانے کے شاعروں میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے اور ان
 کی بلندی کو سب ہی نے تسلیم کیا ہے۔ سرسید کے خیال میں: ”انہوں
 نے سخن کوئی کو بھد اعجاز پہنچایا اور شعر نے ان سے مرتبہ حکمت
 کا پایا۔ نکات سخن اور دقائق فن ان کے قلم سے اس طرح گرتے ہیں جیسے
 ابر سے باران لطافت“۔ شیفہ بھی اس زمانے کے مشہور شاعر ہیں اور
 انہوں نے نہ صرف اعلیٰ درجے کی شاعری کی ہے ، بلکہ شاعروں کو اپنی
 شاعرانہ بصیرت سے نئی زندگی بخشی ہے۔ وہ شاعر ہی نہیں تھے ، شاعری
 کے بہت اچھے نقاد بھی تھے۔ اس لیے اس زمانے کے شاعرانہ ماحول کو
 عظمت سے ہمکنار کرنے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ صہبائی اگرچہ
 اردو کے شاعر نہیں تھے لیکن فارسی زبان پر انہیں پوری طرح عبور حاصل
 تھا۔ اور اس میں اعلیٰ درجے کی شاعری کرتے تھے۔ نیر و خشاں بھی

۱۔ شیفہ: گلشن بے خار: صفحہ ۴۷

۲۔ سر سید احمد خان: تذکرہ اہل دہلی: صفحہ ۱۶۷

۳۔ شیفہ: گلشن بے خار: صفحہ ۱۶۶

۴۔ سرسید احمد خان: تذکرہ اہل دہلی: صفحہ ۱۵۰

فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ عیش مجروح، عارف اور ظہیر نے اردو میں شاعری کی۔ اور اگرچہ ان کی شاعری میں وہ بات تو نہیں جو غالب، مومن اور ذوق کے یہاں ہے لیکن انہوں نے شاعری کی اس روایت کو باقی ضرور رکھا ہے جس کی بنیاد ان شعراء نے ڈالی تھی۔ اور پھر بہادر شاہ ظفر تھے، جنہوں نے نہ صرف اردو میں اعلیٰ درجے کی شاعری کی ہے بلکہ وہ ایک ایسا محور تھے جس کے گرد یہ پورا شاعرانہ ماحول گھومتا تھا۔ ان کی طبیعت میں بڑی عاجزی اور انکساری تھی۔ اس لیے وہ آخر وقت تک ذوق اور پھر غالب سے اصلاح لینے رہے لیکن اس سے ان کی قادر الکلامی پر حرف نہیں آتا۔ بلکہ یہ تو ان کی بڑائی کی دلیل ہے۔ ان کے زمانہ حکومت میں لال قلمی کی زندگی ناسازگار حالات سے دوچار رہی لیکن ان حالات میں بھی انہوں نے اس زمانے کے شاعروں کا خیال رکھا اور حتیٰ المقدور ان کی پرورش اور دیکھ بھال کی۔ شعر و شاعری سے انہیں گہرا لگاؤ تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اس میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنے اس پاس زمانے کے تقریباً تمام شاعروں کو جمع کر لیا اور لال قلمی میں اردو شاعری کی ایک نضا قائم ہو گئی تھی۔

شاعری کے ساتھ اس زمانے میں دوسرے فنون کو بھی بہت فروغ ہوا۔ بہادر شاہ ظفر نے مصوری سے بھی دلچسپی لی اور اس وقت کے نامور مصوروں کو نوازا۔ انہوں نے مصوری کے ہستان دہلی کی روایت کو باقی رکھا، جس نے اس زمانے میں کم از کم دو اہم مصور راجہ جیون رام اور حسین نظر پیدا کیے۔ ان کی وجہ سے دلی میں مصوری کا شوق بھی عام ہوا۔ اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کو موسیقی سے بھی بڑی دلچسپی تھی اور ان کے دور حکومت میں لال قلمی موسیقی کا بھی اچھا خاصا مرکز بن گیا تھا۔ موسیقی کی باقاعدہ محفلیں منعقد ہوتی تھیں اور اس میں بڑے موسیقار حصہ لیتے تھے۔ ناصر لدیر فراق نے نبی خاں کی زبان ان محفلیں کی روداد بیان کی ہے لکھتے ہیں: "میرا قاعدہ تھا کہ میں ایک مہینے میں لال قلمی سے بارہ دری کے دو بھرے کیا کرتی تھی۔ ایک دوسری کو ایک چوبیسویں کو۔ ان قاریخوں کے اثر میر درد صاحب

کے وقت سے راگ کی دو محفلیں ہوتی تھیں اور اس دھوم دھام سے ہوتی تھیں کہ لال قلعے کے بادشاہ اور بادشاہ زادے پسند کرتے تھے۔ جب میں جہاں پناہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو جاتی تو حضور والا فرماتے : ”ہم سمجھ گئے آج چاند کی دوسری یا چوبیسویں ہے۔ بارہ دری جانے کی جھٹی چاہتی ہو۔ اچھا جاؤ یہ خواجہ صاحب کے یہاں کی بڑی ہر برکت محفلیں ہیں۔ مجد شاہ ہیا اور شاہ عالم ثانی اور اکبر شاہ ثانی اور ولی عہدی تک میں بھی ان میں شریک ہوا ہوں۔“ جب میں ہلٹ کر لال قلعے میں آئی تو حضور کو آداب بجالائی۔ حضور فرماتے : ”کہو خاتم اس تاریخ میں محفل کیسی رہی۔ کون کنجی اچھا کئی؟ کس گوئے نے خواجہ مجد نصیر سے زیادہ داد لی؟“ جو کچھ مجھے حال معلوم ہوتا عرض کر دیتی۔ ”ایک اور جگہ لکھا ہے : ”سب شاہزادوں کو کالے بجانے کا بڑا شوق تھا۔ اچھے اچھے گوئے اور کلاؤت نوکر رکھ کر اس بات کو ان سے سیکھنے تلے۔ کوئی قسم کالے کی ایسی نہ تھی جسے یہ لوگ ادا نہ کرتے ہوں، کوئی ساز ایسا نہ تھا جو یہ لوگ سلیقے سے نہ بیاتے ہوں۔ اچھے اچھے استاد اس کام میں ان کے آگے کان پکڑتے تھے۔ مگر سارنگی ان میں سے کسی ایک کو نہ آئی۔ کہتے تھے ”انسان یہ ٹیڑھی کھیر ہے، نہ اس میں کوئی پردہ ہے، نہ سنہری ہے، رستہ کیوں کر جلا جائے؟ یہ پیشہ وروں کا ہی حصہ ہے ان کی ہڈی بولتی ہے۔ مرزا گوہر صاحب، مرزا کالے صاحب مرزا چڑیا صاحب ستار بیاتے میں استاد ہو گئے تھے۔“ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں موسیقی سے لوگوں کو کتنی دلچسپی تھی اور وہ اس میں کس طرح ڈوبے ہوئے تھے۔ خوش نویسی کا بھی اس زمانے میں بڑا چرچا تھا۔ اور اُسے بھی لوگ ایک اہم فن کی طرح سیکھتے تھے۔ بادشاہزادوں اور ان کے باپ دادوں کو اس شوق ضرور ہوتے تھے؛ ایک نجوم، ایک مصوری، ایک خوش نویسی کا اور ان سب میں کمال پیدا کرتے تھے۔ بادشاہ کو بھی اس فن سے دلچسپی تھی اور وہ عربی فارسی خط کے کامل تھے۔ خوش نویسی میں ان کے استاد میر کاو صاحب تھے۔ اور بادشاہ نے بھی

اس پتھر میں سیکڑوں کو ساگرد کیا تھا۔ اس زمانے کے خوش نویسوں میں سید محمد امیر، آغا صاحب، مرزا عبداللہ بیگ، امام الدین احمد خان، محمد جان، اخوان عبدالرسول قندھاری، حافظ کاکو خان، میر امام الدین، مولوی حیات علی، ہنٹل شکر ناتھ، بدرالدین علی خان مہرکن، فیض علی خان، مرزا شاہرخ بیگ اور محمد عالم خاص طور پر مشہور ہیں، اور ارباب موسیقی میں بہت خان، واگ رس خان، میر فاضل احمد، بہادر خان ستارون، رحیم حسین ستارون، نظام خان، قائم خان، گلاب سنگھ، پکھاؤ جی، اور مکھوا پکھاؤ جی کے نام سر فہرست آتے ہیں۔ ان سب نے اس زمانے کی دلی میں ان فنون کی صحیح فضا پیدا کر کے انہیں متھانے کمال پر پہنچا دیا تھا۔

یہ تو اس تہذیبی اور ثقافتی روایت کی تفصیل تھی جس کا تعلق مشرق سے تھا لیکن اس زمانے میں مشرق کی یہ تہذیبی اور ثقافتی روایات مغرب کی تہذیبیں اور ثقافتی روایت کے ساتھ شہر و شکر ہوتی ہیں۔ انگریزوں کی آمد کے بعد سے یہ سلسلہ باقاعدگی سے شروع ہوا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں شدت پیدا ہوتی گئی۔ لال قلعے تک اس کے اثرات پہنچے اور وہاں بعض لوگوں کے رہن سین تک پر اس کا اثر ہوا۔ بعض شہزادوں نے قلعے کے اندر مغربی طرز کی عمارتیں تعمیر کرائیں۔ انگریزی لباس پہنا اور رہن سین کا انگریزی انداز اختیار کیا۔ اکبر شاہ ثانی کا دوسرا بیٹا مرزا باہر انگریزی طرز اختیار کرنے کے لیے خاص طور پر مشہور ہے۔ اُس نے لال قلعے میں دیوان عام کی پشت پر رنگ محل کے احاطے میں مغربی طرز کا ایک مکان تعمیر کرایا۔ وہ مغربی طرز کا لباس پہنتا تھا، جس کی کپیٹ وردی کی سی تھی۔ اس کے مغربی طرز کے کوٹ پر سینے کے دونوں طرف ستارے لگے ہوتے تھے۔ وہ پاؤں میں بھاری بوٹ پہنتا تھا اور اُس کے ہاتھ میں ایک بھاری سی جینڑی ہوتی تھی۔ اس انداز سے وہ چھ گھوڑوں کی گاڑی میں بیٹھ کر شہر میں نکلتا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں کی تہذیب و ثقافت کے اثرات بری طرح اندر ہی اندر مشرقی تہذیب و ثقافت پر اپنا رنگ

چڑھا رہے تھے۔ ہر چند کہ شروع شروع میں اس کی حیثیت تقلید اور نقالی کی تھی لیکن جب انگریز باقاعدہ دلی پر حکمران ہو گئے، اور انہوں نے اس سر زمین پر اقامت اختیار کر لی تو مشرق و مغرب کی تہذیبوں کا یہ اتصال اس زمانے کی زندگی کا بنیادی جزو بن گیا۔ جب انگریز دلی میں فاتح کے حیثیت سے داخل ہوئے تو بیشتر لوگوں نے کوئی خاص مزاحمت نہیں کی۔ بلکہ ان کے اس اقدام کو ایک حد تک پسند کیا۔ کیونکہ ان کے اس اقدام سے وہ ہنگامے ختم ہو گئے جن کی وجہ سے دلی ایک زمانے تک انتشار کی آماجگاہ بنی رہی تھی۔ انگریزوں نے اپنا تسلط قائم کرنے کے بعد تعلیمی اور علمی معاملات کی طرف توجہ کی جس کا اثر اس زمانے کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی پر بڑا گہرا ہوا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم دہلی کالج کا قیام تھا، جو بہت لمبے عرصے میں ایک علمی اور تعلیمی ادارے سے زیادہ ایک تہذیبی اور ثقافتی مرکز بن گیا۔ مسلمانوں نے اس کی مخالفت بھی نہیں کی۔ بلکہ اُس وقت بعض اہم علماء نے اس ادارے کے ساتھ تعاون کیا۔ خود مولانا شاہ عبدالعزیز اس سلسلے میں پیش نظر آتے ہیں۔ ”جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے دہلی کالج قائم کیا، اور لوگ وہاں تعلیم حاصل کرنے کے متعلق متامل تھے تو آپ نے ان سب شبہات کو رفع کیا اور علی گڑھ کالج قائم ہونے سے پچاس سال پہلے انگریزی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کا ضویٰ دیا“۔ اس لیے مسلمان اس ادارے کے ساتھ وابستہ ہونے لگے۔ کالج کا افتتاح ۱۸۲۵ء میں ہوا۔ اور اُس شاہانہ عطیے میں سے اس کالج کے لیے پانچ سو روپے ماہانہ مقرر کیے گئے۔ مسٹر جے۔ ایچ۔ ایلر متاسی مجلس کے سکریٹری ایک سو پچھتر روپے ماہانہ پر اس کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ہند مولوی کی تنخواہ ایک سو پچیس روپے قرار پائی اور دو اور مولوی پچاس پچاس کے رکھے گئے۔ باقی پچیس پچیس اور اسی تیس کے تھے۔ طلباء کے لیے بھی وظائف مقرر ہوئے۔ سالانہ رپورٹیں باقاعدہ مجلس تعلیم عامہ کی خدمت میں بھیجی جاتی تھیں جن میں مولویوں کے عزل و نصب، سالانہ امتحان کے نتائج اور دوسرے امور متعلق کالج درج ہوتے تھے“۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ کالج دن دن رات چوکی ترقی

۱۔ شیخ محمد اکرام : رود کوثر : صفحہ ۳۹۴

۲۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق : مرحوم دہلی کالج : صفحہ ۶

کرتا گیا ، اور اس نے دلی کی تہذیب اور ثقافتی زندگی میں اپنے لیے جگہ بنا لی ۔

دہلی کالج کا سب سے اہم تہذیبی اور ثقافتی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اردو زبان کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ۔ اردو زبان اس وقت تک فارسی کی جگہ لیے بیکی تھی اور دلی میں ہر شخص اس کا شیدائی تھا ۔ اس زمانے میں جیسا کہ چلے لکھا جا چکا ہے ، بڑے بڑے عالم ، ادیب اور شاعر موجود تھے ۔ اور وہ درباری اور سرکاری زبان بھی سمجھی جاتی تھی ۔ اس کالج نے اردو زبان کو بہت اہمیت دی اور اس کی ترقی کے لیے بڑا کام کیا ۔ اس کالج کی بڑی خصوصیت یہ تھی اور اسی میں اُس کی کامیابی کا راز تھا کہ ذریعہٴ تعلیم اردو تھا ، عربی ، فارسی ، سنسکرت کی تعلیم تو خیر اردو میں ہوتی ہی تھی ، لیکن دوسرے علوم جو داخل نصاب تھے ، اُن کی تعلیم کا ذریعہ بھی اردو تھا^۱ ۔ سائنس کی تعلیم تک اردو میں ہوتی تھی ، اور ماسٹر رام چندر اور دوسرے اساتذہ نہایت خوش اسلوبی سے یہ کام انجام دیتے تھے^۲ ۔ ادب کی طرف بھی اس کالج نے خاص توجہ دی ۔ مختلف موضوعات پر کتابوں کے ترجمے بھی یہاں خاصی تعداد میں ہوئے ۔ یہاں شاعری بھی ہوتے تھے ، ادبی محفلیں بھی ہوتی تھیں ، تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری تھا اور ان سب باتوں نے مل کر اس کالج کو ایک ثقافتی مرکز کی حیثیت دے دی تھی ۔ جو لوگ اس کالج سے وابستہ تھے ، اُن میں بیشتر بڑے لائق اور قابل تھے اور انہوں نے علم و ادب میں اضافہ کیا ہے ۔ مسٹر پٹرووس ، ڈاکٹر اسپرنگر اور مسٹر ٹیلر یہ کالج کے تین پرنسپل ایسے گزرتے ہیں کہ انہوں نے کالج کی سچی خدمت کی اور اُس کی ترقی و اصلاح میں دل سے کوشش کی ۔ طلبہ و اساتذہ پر اُن کی بڑا اثر تھا اور شہر والے بھی اُن کا ادب کرتے تھے ۔ خاص کر مشرقِ شیعے کی اصلاح اور اردو زبان میں مغربی علوم کے ترجموں کے متعلق مسٹر پٹرووس اور ڈاکٹر اسپرنگر نے جو بے ریا کوشش کی وہ بہت قابلِ قدر رہے^۳ ۔ عربی کے اساتذہ میں مولوی ملوک العلی بڑے چہ

۱۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق : مرحوم دہلی کالج : صفحہ ۱۵

۲۔ ایضاً : صفحہ ۲۶

۳۔ ایضاً : صفحہ ۱۳۷

عالم تھے اور دور دور اُن کے علم و فضل کی شہرت تھی۔ مولوی امام بخش صہبائی صدر مدرس فارسی اپنے وقت کے بہت بڑے فارسی ادیب تھے۔ مصنف اور شاعر بھی تھے۔ اُن کی کتابیں نصاب تعلیم میں داخل تھیں۔ شہر میں اُن کی بڑی عزت تھی۔ فارسی کتابوں کے علاوہ اُنہوں نے اردو صرف و نحو لکھی اور شمس الدین کی تصنیف 'مدائن البلاغۃ' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ شعرائے اردو کا انتخاب بھی کیا تھا جو اس زمانے میں چھپ گیا تھا۔ مولوی سبحان بخش بھی کالج میں مدرس تھے، اُن کی کتاب 'محاورات ہند' مشہور ہے۔ ابن خلکان کی تاریخ کا ترجمہ 'وفیات اعیان' انہیں کا کیا ہوا ہے۔ 'تذکرہ مفسرین' اور 'تذکرہ حکما' بھی ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ ماسٹر رام چندر سائنس اور ریاضی کے استاد تھے اور ان موضوعات پر اُنہوں نے کئی کتابیں لکھی تھیں۔ مولوی احمد علی فارسی کے مدرس تھے۔ انہوں نے 'تاریخ کشمیر' کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ پنڈت رام کشن دہلوی بھی کالج میں مدرس تھے۔ اُنہوں نے علم طب پر ایک رسالے کا اردو میں ترجمہ کیا تھا اور ڈاکٹر اسپرنگر کے ساتھ مل کر قواعد صرف و نحو تالیف کی تھی۔ ایک کتاب زراعت پر بھی ان سے یادگار ہے۔ ماسٹر حسین اگرچہ بچوں کو پڑھاتے تھے لیکن تصنیف و تالیف کا شوق تھا اُنہوں نے 'تاریخ مغلیہ' کا ترجمہ اردو میں کیا۔ اس کے علاوہ میکانکس کی شرح شریف، قانون ہمدی نوجداری، قانون وراثت وغیرہ کے ترجمے بھی ان ہی کے کئے ہوئے ہیں۔ ہر دیو سنگھ بھی کالج میں منشی تھے اُنہوں نے اصول حساب پر ایک کتاب کا ترجمہ کیا۔ ماسٹر نور محمد نے ہنگال اور تاریخ مغلیہ کا ترجمہ کیا۔ مولوی حسن علی خاں نے 'قانون مال'، 'گلستان سعدی' اور 'الف لیلہ' (منتخب) کے ترجمے اردو میں کئے۔ ان کے علاوہ کالج کے طالب علموں نے بھی تصنیف و تالیف میں بڑا نام پیدا کیا۔ ماسٹر رام چند مولوی نفیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، مولانا محمد حسین آزاد، ڈاکٹر ضیاء الدین متعدد کتابوں کے مصنف ہیں اور اُن کی تصانیف اردو زبان میں بڑا درجہ رکھتی ہیں۔ مولوی کریم الدین بھی کالج کے طالب علم تھے۔ اُن

۱۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق : مرحوم دہلی کالج : صفحہ ۱۴۸

۲۔ ایضاً : صفحہ ۱۴۸ - ۱۵۲

کی 'تعلیم النساء'، 'گلستان ہند'، 'تذکرہ شعرائے ہند' (طبقات شعرائے ہند) 'گلدستہ نازنینان'، 'تذکرۃ النساء'، 'ترجمہ ابوالقدا'، 'تاریخ شعرائے عرب' وغیرہ مشہور ہیں۔ ان اساتذہ اور طلباء نے اس کالج کے نام کو روشن کیا۔ اور تصانیف سے چار جلد لگا دیے۔ انہیں کی بدولت کالج ایک تعلیمی، علمی، تہذیبی اور ثقافتی ادارہ بن گیا اور مشرق و مغرب کی تہذیبی روایات کو انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ ہیں ان کے سب سے بڑے کارنامے ہیں۔

غرض دلی اس زمانے میں تہذیب و ثقافت کا بڑا مرکز تھا اور اس میں بڑے لائق اور قابل لوگ جمع تھے۔ بادشاہ کو خود تہذیبی اور ثقافتی معاملات سے دلچسپی تھی اور ان کی اس دلچسپی نے لال قلعے کو ایک ثقافتی مرکز بنا دیا تھا۔ قلعے کے باہر شہر میں بڑے بڑے عالم، سنکر، شاعر اور ادیب تھے جنہوں نے فکر و عمل سے تہذیب و ثقافت کی صحیح قضا قائم کر دی تھی۔ انگریز بھی اس سلسلے میں بیش بیش تھے اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ دہلی کالج کا قیام تھا جس نے اس زمانے میں صحیح علمی اور ادبی ماحول پیدا کیا اور اس طرح ایک اہم تہذیبی اور ثقافتی ادارے کی حیثیت اختیار کر لی۔ اگرچہ انگریز اس کے روح رواں تھے لیکن اس میں مشرق کی تہذیبی اور ثقافتی روایات بھی پروان چڑھتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کیونکہ انہوں نے مشرقی علوم و ادبیات کے بعض اہم علم برداروں کو اس ادارے میں جمع کیا تھا۔ یہ لوگ کشادہ دل اور روشن خیال تھے اس لیے انہوں نے اس عہد کے تنازوں کو سمجھا اور وقت کی ضرورتوں کو محسوس کیا۔ چنانچہ ان کی علمی اور ادبی کاوشوں نے اس ادارے کو مشرق و مغرب کی ثقافتی روایات کا ایک سنگم بنا دیا۔ اس صورت حال نے اس زمانے کے تہذیبی اور ثقافتی ماحول میں ایک نئی زندگی پیدا کی اور اس طرح دلی ایک دفعہ پھر تہذیب و ثقافت کا ایک اہم مرکز بن گئی۔

۶

یہ سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی ماحول تھا جس میں غالب پیدا ہوئے۔ ان پر اس ماحول کا گہرا اثر نظر آتا ہے اور وہ اس کی پیداوار معلوم

ہوتے ہیں۔ اس ماحول نے انہیں پیدا کیا ہے اور ان کی شخصیت اپنی بساط
 بھر خود بھی اُس کو پیدا کرنے کا باعث بنی ہے۔ خاص طور پر اس زمانے
 کے علمی اور ادبی ماحول کو پیدا کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ ظاہر ہے کہ
 اُس زمانے کے سیاسی حالات سے انہیں براہ راست کوئی سروکار نہیں تھا۔
 اس لیے وہ خود تو ان حالات کو متاثر نہ کر سکے لیکن ان کا اثر انہوں
 نے براہ راست نہیں تو بالواسطہ طور پر قبول ضرور کیا۔ یہی حال کم و بیش
 معاشی حالات کا ہے۔ اس زمانے کے معاشی حالات کو وہ خود تو متاثر
 نہ کر سکے لیکن ان حالات کے اثرات ان پر ضرور موجود ہیں۔ البتہ اس
 زمانے کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی سے وہ خود بھی متاثر ہیں اور ان کی
 شخصیت نے زندگی کے ان شعبوں کو متاثر بھی کیا ہے۔ غالب کی شخصیت
 اُس زمانے کی معاشرتی زندگی کی علامت ہے۔ وہ تہذیب و ثقافت کی صحیح
 نمائندگی کرتے ہیں۔ انہوں نے اس میں بڑے چڑا کر حصہ لیا ہے۔ یہی وجہ
 ہے کہ ان کی شخصیت اُس زمانے کے تہذیبی اور ثقافتی آئین پر ایک نہایت
 ہی درخشندہ ستارہ نظر آتی ہے۔

غالب
کی
تصانیف

آردو

(۱)

دیوان غالب

غالب کا متداول دیوان در اصل ان کے کلام کا انتخاب ہے۔ اس کے بارے میں آزاد نے آب حیات میں یہ لکھا ہے کہ یہ انتخاب غالب نے مولانا فضل حق خیر آبادی اور مرزا خانی کوتوال کے مشورے سے کیا تھا۔ لیکن امتیاز علی خاں عری نے اس سے اختلاف کیا ہے اور شیفتہ کے 'گلشن بے خار' کے اس بیان کو کہ 'دیوانش را بعد لکھنؤ و ترمب دگرنگریست و فراوان ابیات از آن حذف و مانتظ کردہ قصورے قلیل انتخاب زدہ، بنیاد بنا کر یہ لکھا ہے کہ 'یہ تذکرہ مرزا صاحب کی نظر سے گزر چکا تھا، اور انہوں نے نہ صرف اس کی تقریظ لکھی تھی بلکہ اس کی بعض کوتاہیوں کی طرف مرتب کی توجہ بھی منعطف کی تھی۔ اگر مرزا صاحب اپنے کلام کے خود منتخب نہ ہوتے تو شیفتہ کیوں لکھتے اور یہ فرض محال وہ سنی سانی لکھ بھی دیتے تو مرزا صاحب اس پر نکتہ چینی کیوں نہ کرتے' — حقیقت جو کچھ بھی ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب کا متداول دیوان ان کے کلام کا انتخاب ہے اور یہ انتخاب بڑے سلیقے سے کیا گیا ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ غالب کی شہرت اسی دیوان کی وجہ سے ہے۔

اس دیوان کا پہلا ایڈیشن سرسید کے بھائی سید محمد خان جادو کے مطبع سید المطابع یا مطبع سید الاخبار سے شعبان ۱۲۵۷ھ (اکتوبر ۱۸۸۱ء) میں

چھپ کر شائع ہوا۔ یہ نسخہ ۱۰۸ صفحات کو محیط ہے اور اس میں ۱۰۹۵ شعر ہیں۔ اس کے شروع میں غالب کا فارسی دیباچہ اور آخر میں نواب ضیاء الدین احمد جہادر لیر و خشاں کی تفریط ہے جو انہوں نے ۱۲۵۴ھ میں مرتب کیا تھا اور جب تین برس بعد ۱۲۵۷ھ میں شائع ہوا تو اس میں ۲۵ شعروں کا اضافہ کر دیا۔^۱

اس ایڈیشن کے نسخے بالکل نایاب ہیں۔

غالب کے اردو دیوان کا دوسرا ایڈیشن ۱۲۶۳ھ - ۱۸۴۷ع میں مطبع دارالسلام حوض قاضی دہلی میں چھپا۔ اس میں بھی غالب کا فارسی میں لکھا ہوا دیباچہ اور لیر و خشاں کی تفریط شامل تھی۔ کل اشعار تعداد میں ۱۱۵۹ تھے۔ اس کے نسخے بھی آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے۔ اس کا ایک نسخہ پنجاب ہونیورسٹی لاہور کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اسی نسخے سے سرورق کی عبارت کا متن، غالب کا لکھا ہوا دیباچہ اور نواب ضیاء الدین احمد خاں لیر و خشاں کی تفریط کا التباس چاں پیش کیا جاتا ہے :

دیوان اردو

تصنیف مشہری بند فلک البروج صحبانی، الصبح نصبحائے دوران، شہنشاہ شعرائے مالک ایران و ہندوستان، دقاق غواشی و رسوز سخن سنجی و لکھ دانی، خلاق مضامین و معانی، سر آمد ارباب فضل و کمال، سہر سہر نبات و اجلال، چناب مستطاب منبع الاقتاب، مرزا امجد اللہ خاں جہادر ادا اللہ برکاتہم و حسناتہم، المتخلص بہ غالب و اسد بہ تصحیح و مقابلہ چناب۔ صدر المدح در مطبع دارالسلام دہلی واقع محلہ حوض قاضی مہندی و اقل العباد عنايت حسين در ماہ مئی ۱۸۴۷ع باہتمام نور الدین احمد لکھنوی علیہ الطباع ہوشیدہ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مشام شمع آفتابیاں را صلا و نہاد انہیں نشینان را مزدہ کہہ لختے از
سایان بھمرہ گردانی آبادہ و دلمبے از عود ہندی دست بزم دادہ است۔

نہ چوب ہائے سنگ ژوب خوردہ بہ پنجار نا طبعی شکستہ، بے اندام تراشیدہ،
 بلکہ بہ تبر شکستہ، بہ کارد ریز ریز کردہ، بسویان خراشیدہ، ایلوں نفس گداختگی
 شوق بہ چسبجوتے آتش پارسے است، نہ آتشی کہ در کلغن ہائے ہند افسردہ
 و خاموش و از کف خاکستر ہمرگ خودش میرہ پوش بینی۔ چہ بروے مسلم
 است از نا ہائی باستخوان مرده نا ہار شکستن و از دیوانگی بہ رشتہ
 شمع مزارکشہ آویختن۔ ہر آئینہ بدل گداختن فیروزد و بزم افروختن را نشاید۔
 رخ آتش بصر بر افروزندہ و آتشی ہرست را ہبادفرہ در آتش سوزندہ
 لہک میداند کہ برو ہندہ در ہوائے آن رخشندہ آذر نعل دو آتش است کہ
 بہ چشم روشنی ہوشنگ از سنگ بروں تاختہ و در ایوان لہرہسپ نشو و نما
 یافتہ، خس را فروغ است و لالہ را رنگ و مغ را چشم و کدہ را چراغ۔
 چشتہ یزدان درون بہ سخن بر افروز را بہاسم کہ شرارے ازان آتش
 تانہاک بخاکستر خویش یافتہ بہ کاکو کا سینہ شتافہ ام و از نفس دمہ بران
 بر نہادہ ہو کہ در اندک ماہہ روزگار انمایہ فراہم تواند آمد کہ بچمرہ را
 فروختنی چراغ و رائیہ عود را بال شناسانی دماغ تواند بخشید۔
 یانا نگارندہ این نامہ را آن در سراست کہ پس از انتخاب دیوان ریختہ بگرد
 آوردن سرمایہ دیوان فارسی بر خیزد و بہ استفادہ کمال این فرہورن پس
 زانویٰ خویشین نشیند۔ امید کہ سخن سراہان سخنور ستانی پراگندہ ایائے
 را کہ خارج ازین اوراق یا ہند از آثار قراوش رگ کلک این نامہ سیاہ نشانند
 و چاہہ کرد آور را در ستائش و نکوہش آن اشعار ممنون و ماخوذ نہ سگانند۔
 یا رب این بولے ہستی نا شنیدہ، از نیستی بہ پیدائی نا رسیدہ یعنی نقی
 بہ ضمیر آمدہ تلاش کہ ہاسد اللہ خان موسوم و بہ میرزا نوشہ معروف
 و بہ غالب متخلص است چنانکہ اکبر آبادی مولد و دہلوی مسکن است
 فرجام کار غنی مدنی نیز یاد۔“

تقریظ نواب ضیاء الدین احمد خان

”.....ترجم کہ آئمہ سرودم نہ سعتہ باشی۔ یانا منتخب دیوان اردو
 زبان ست ریختہ کلک مسجعی لرتاب خدام، قسطنطین دالمی، اسطراب انیش، جوہر

انہیشتہ ہست دران اندیشیدی و گرانی قدر سبک اندران سنجیدی کہ این گرامی
 برادر زادہ ہا را کہ پکائی پکائی خلف الصدق دود مان ضمیر ہل ایوانا بائے
 مضامین دلپذیر است ، بہ تعلیم نو آسوزان لکو از بد فشناسی ، بر انگیزد
 و این از زلفہ جواہر ہارہ را کہ ہر یک ازان سیمیں ساعدہ شخص خرد را
 ہارہ و لازیں بیکر پوش را گوشوارہ است بہ شیشہ بیش طاق شناسائی
 ہر آویزد ۔ ہارے کار ساز ایزد بزرگ را ہزاران سیاس کہ دریں زمان کہ
 سنہ ۱۲۵۳ مقلدہ پجریہ نیوید علی صاحبہا الفضل التحیات و اکمل الصلوات ،
 بہ یک ہزار و دوست و پنجہ و چار رسیدہ ، آن دیریں بسیج و دانش
 آرزو بہ مساعلت روزگار راست ہنجار و قلاوژی ہفت بیدار ، خوشتر از آنکہ
 مہلواسم روای گرفت ۔ شاد کاسی در دل جا گزید و اندوہ تردد گردآوری
 بدو رفت ۔ چون باحصائے افراد این پایوں صحیفہ شقائق ہمگی اشعار شعری
 شعار غزل و قصیدہ و قطعہ و رباعی یک ہزار و نود و اند ہافتم۔ الا یا توانا
 پوشان ہوشی و شتوا گوشان گوشہ ! ہر شاہراہ شناخت فراوانی لیکو معانی
 باید رفت نہ در پھولہ پھارہ زنی خردہ ہر فانت ابیات گرفت ۔ چنانچہ
 خود آن والا آموزگار درگزارش این ہنچار بد ہاوسی نامہ خوبشن در پردہ ساز
 آن گفتار خود می سراید ۔ آری راست میفرماید ۔ فرد :

تنگم تا نباشد نغمہ غالب اندک

چہ نغمہ گریست اشعار من

از من یاد کاری و برائے دیگران تذکاری یاد

نکتہ تمام شد۔“

۶۱ - ۸۶۲ع میں دیوان غالب دوبارہ چھپ کر شائع ہوا ۔ اس کی

روداد مولانا مہر نے اس طرح بیان کی ہے :

”۸۶۰ع میں دیوان کا لیا اڈیشن چھاپنے کا خیال پیدا ہوا ۔ مئی

۸۵۷ع میں اردو دیوان کا ایک نسخہ خوش خط لکھوا کر نواب

یوسف علی خاں والی رام پور کے لیے بھیجا تھا ۔ جنوری ۸۶۰ع

میں رام پور گئے تو اس کی ایک نقل لے کر نواب ضیاء الدین خاں

کی لڑمائی کے مطابق اُن کے پاس ارسال کر دی ۔ رام پور ہی میں

تھے کہ عظیم الدین میرٹھی نے اردو دیوان کے چھاپے کی اجازت

کے لیے خط لکھا۔ واپسی پر وہ میرٹھ پہنچے تو منشی ممتاز علی صاحب جو غالب کے دوست تھے، عظیم الدین کے سفارشی بن گئے اور نواب مصطفیٰ خاں شیخ نے کاپیاں دیکھنے کا ذمہ اٹھا لیا۔ غالب راضی ہو گئے اور دلی پہنچ کر نواب ضیاء الدین احمد خاں والا قلعی نسخہ نواب مصطفیٰ خاں کے پاس میرٹھ بھیج دیا۔ عظیم الدین نے دیوان کا جھاننا ابھی شروع نہیں کیا تھا کہ منشی شیو نرائن صاحب اکبر آبادی نے دیوان کے لیے اصرار و ابرام کیا اور کہا کہ بڑے اہتمام سے اپنے مطبع میں چھاپوں گا۔ غالب نے اتفاقاً کر کے دیوان عظیم الدین سے واپس لیا اور منشی شیو نرائن کے پاس آگرو بھیج دیا۔ وہاں بھی اس کی اشاعت میں تاخیر ہوئی تو دلی میں محمد حسین خاں کے مطبع احمدی واقع شاہدرہ میں دیوان چھپوا لیا۔“

یہ نسخہ حد درجہ غلط چھپا تھا۔ اس لیے غالب نے از سر نو کان پور میں چھپوانے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ اپنے قلم سے مطبوعہ نسخے پر تمام غلطیاں درست کیں۔ اس کی پشت پر ایک رقمہ محمد حسین خاں مالک مطبع احمدی کے نام لکھ کر تصحیح شدہ نسخہ ان کے پاس بھیج دیا۔ محمد حسین خاں نے اُسے مطبع نظامی کان پور میں چھپوایا۔ یہ ایڈیشن ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ جون ۱۸۶۲ء میں مکمل ہوا۔“

مالک رام لکھتے ہیں :

”اس دوران میں شیو نرائن ابھی دیوان کا چھاپا شروع کر چکے تھے۔ لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ دیوان دہلی اور کان پور دو جگہ سے شائع ہو گیا ہے تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سر دست اس کا چھاپا ملتوی کر دیا تھا اور آخر اسے اگلے برس ۱۸۶۲ء میں پورا کر کے شائع کیا۔ وہ غالباً دیوان کے ساتھ مرزا کی تصویر بھی چھاپنا چاہتے تھے۔ چنانچہ غالب نے اپنی قلمی تصویر ان کی نظر کی تھی۔ مگر ان کے شائع کردہ دیوان کے ساتھ تصویر نہیں

۱۔ مہر : غالب : صفحہ ۳۸۹

۲۔ ایضاً : صفحہ ۳۹۰

جیسی ہے۔ غالب کی زندگی میں ان پانچ کے علاوہ اور کوئی
ادبیت شائع نہیں ہوا۔“

غالب کی وفات کے بعد انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی میں
متداول دیوان کے بے شمار ادبیت شائع ہوئے۔ ان کی تفصیل تحصیل حاصل ہے۔
ان میں صرف امتیاز علی خاں صاحب عرشی کا مرثبہ کیا ہوا ”دیوان غالب“
ایسا ہے جو اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس میں انہوں نے غالب کا تمام
مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام یکجا کر دیا ہے اور اس پر شاہت مفید
حواسی بھی لکھے ہیں۔ اس دیوان کو انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ نے
۱۹۵۸ء میں شائع کیا۔

سرور صاحب اس کے بارے میں لکھتے ہیں :

”غالب کے کلام کے جتنے ادبیت شائع ہوئے ہیں ان میں ’نسخہ حمیدہ‘
(انوار الحق) ’ارمغان غالب‘ (اکرام) ، ’انتخاب غالب‘ (عرشی)
’اردو دیوان غالب‘ (مالک رام) کی خاصی اہمیت ہے۔ غالب کے
ذہنی شعور کے مطالعے کے لیے ان نسخوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔
عبدالمطیف کو سب سے پہلے غالب کے سارے اردو کلام کو تاریخی
ترتیب کے ساتھ جمع کرنے کا خیال آیا تھا۔ مگر ان کے تیار کیے ہوئے
مواد کا صرف نصف حصہ چھپ سکا۔ اکرام نے پہلے ’غالب نامہ‘
اور بعد میں ’ارمغان غالب‘ میں یہ کوشش کی مگر ادھوری۔
مالک رام نے ’نسخہ حمیدہ‘ کے منتخب اشعار اور متفرق شعر
مروجہ دیوان میں شامل کر کے ، عام پڑھنے والوں کے لیے ایک
اچھا ادبیت تیار کر دیا۔ مگر زیر نظر ادبیت جو اردو کے مشہور
علاقہ اور غالبیات کے ماہر جناب امتیاز علی عرشی کی برسوں کی
صحت کا نتیجہ ہے نہ صرف ایک بڑی ضرورت کو پورا کرتا ہے ،
بلکہ کلام کی تاریخی ترتیب اور صحت ، نسخوں کے اختلاف کی
نشان دہی ، شرح اور ضروری حواسی کے لحاظ سے اب تک کی
ساری کاوشوں پر بھاری اور اردو میں ادبی تحقیق اور عالمانہ نظر
کا ایک قابل فخر اور ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔“

۱۔ مالک رام : ذکر غالب : صفحہ ۱۳۳

۲۔ آل احمد سرور : دیباچہ دیوان غالب : (عرشی)

نسخہ "حمیدہ"

غالب کا متداول دیوان جو بار بار شائع ہوا ہے، دراصل ان کے کلام کا انتخاب ہے۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے اشعار کہے تھے جو شائع نہیں ہوئے، لیکن محفوظ رہے۔ "دیوان غالب" کو ان اشعار کے ساتھ "دیوان غالب جدید" کے نام سے مفتی محمد انوار الحق نے ۱۹۱۹ء اور پھر ۱۹۲۶ء میں بھوپال سے شائع کیا۔ یہی دیوان "نسخہ" حمیدہ کے نام سے مشہور ہے۔

اس نسخے کے مرتب مفتی انوار الحق نے اس دیوان کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے :

"یہ بات تو علی العلوم سب کو معلوم ہی ہے کہ غالب نے اپنے چند سخن فہم احباب کے مشورے سے اشعار کا ایک بڑا حصہ مشکل اور مفق ہوئے کی بنا پر قلم زد کر دیا تھا۔ اور مروجہ اور مطبوعہ دیوان کی یہ سر و پا بربادہ غزلیں اسی دیوان کی بھی کبھی نشانیاں ہیں جو ابتائے زمانہ کی آسان ہندی سے شائع ہونے سے پہلے ضائع ہو گیا۔ اس کے علاوہ خود غالب کے مکتوبات نظم و نثر سے بھی اس کا قطعی ثبوت ملتا ہے۔ لیکن اب تو کسی ایسے ثبوت کی ضرورت ہی نہیں۔ کیونکہ اب تک جس دیوان کو معدوم ثابت کیا جاتا تھا، محض حسن اتفاق سے وہ یہ چندہ مکمل حالت میں مل گیا۔

اسی لیے کہ شوق کے ہاتھ اچھے ہاتھوں ہاتھ لیں اور قدر دانی کی نگاہیں اچھے دل میں جگہ دیں۔

اس نایاب کتاب کو محفوظ رکھنے کا شرف کتب خانہ "حمیدہ" بھوپال کو حاصل ہے۔ یہ تو یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ یہ دیوان چاہا کیونکر پہنچا۔ لیکن تاریخ، کتابت اور سہروں وغیرہ سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ یہ غالباً رئیس وقت نواب غوث محمد خان صاحب کے بیٹے میاں فوج دار محمد خان صاحب کے لیے لکھا گیا تھا۔ چنانچہ اس کے شروع میں ایک صفحے پر یہ لکھا ہوا ہے "دیوان ہذا من تصنیف

مرزا نو شاہ دہلوی المتخلص بہ اسد از کتب خانہ فیض آثار عالم پناہ
 میان فوج دار محمد خان بہادر دام اقبالہ " قلمی غرض غلط — اور
 اس کے سامنے ان کی سہر ہے ۔ اور خاتمے پر کاتب کے قلم کی یہ تحریر
 موجود ہے ۔ " دیوان من تصنیف مرزا صاحب و قبلہ المتخلص بہ اسد
 و غالب سلمہم رحمہ علی ہذا العبد المذنب حافظ معین الدین بتاریخ ہجری
 شہر صفر المظفر ۱۲۳۷ھ من المہجرت النبویہ صورت اتمام ہانت "۔
 اس کا خط نہایت پاکیزہ اور نظر فریب ہے ۔ شروع میں خوبصورت
 طلاقی کلام اور تمام صفحات پر سنہری جدول ہے ۔ جگہ جگہ میان
 فوج دار محمد خان صاحب کی سہریں ثبت ہیں جن میں سے بعض ۱۲۳۸ھ
 اور بعض ۱۲۴۱ھ کی ہیں ۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان کم
 سے کم ایک بار اور ممکن ہے چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے
 غالب کے پاس بھی گیا ہے اور ان کی نظر سے گفرا ہے ، اور انہوں
 نے خود اس میں جا بہ جا اصلاحیں کی ہیں ۔ کیونکہ اگرچہ ان
 اصلاحوں کا خط بہت خراب اور شکستہ ہے لیکن بہر بھی اس میں
 اور غالب کی طرز تحریر کے موجودہ نمونوں میں ایک گونا گونا مشابہت
 پائی جاتی ہے ۔ اور گو بعض اس کی بنا پر ان کو غالب کا قلمی نسخہ
 قرار دینا شاید درست نہ ہو ۔ لیکن خود ان اصلاحوں کی نوعیت
 ایسی ہے کہ ان کو مصنف کے ہوا اور کسی کے قلم کی طرف
 منسوب کرنا مشکل ہے ۔ کیونکہ ان میں سے اکثر ایسی ہیں کہ
 لفظ کو کاٹ کر اس کی جگہ دوسرا لفظ رکھ دیا ہے یا کبھی مصرع
 کی کچھ صورت بدل دی جاتی ہے ۔ بہت سی غزلیں بھی اسی قلم سے
 حاشیے پر بڑھائی گئی ہیں جن میں سے بیشتر مروجہ دیوان میں جیسے
 موجود ہیں ۔ البتہ بعض ایسی بھی ہیں کہ ان میں بھی دوبارہ بہر
 کچھ انتخاب ہوا ہے اور مطبوعہ دیوان میں ان کے پورے شعر شائع
 نہیں ہوئے ۔ لیکن حقیقت میں اس امر کا ثبوت کہ یہ غالب کا
 گم شدہ دیوان ہی ہے ، خط کی مشابہت اور کاتب کی تحریر کا محتاج
 نہیں ہے بلکہ اس سے بڑی وجہ اور یقینی دلیل خود اس کے اشعار ہیں

آفتاب آمد دلیل آفتاب

ناظرین جب اس کا مطالعہ کریں گے تو خود کہہ دیں گے کہ

غالب کا کلام ہے ، اور غالب کے سوا اور کسی کا ہو ہی نہیں سکتا۔ مروجہ دیوان میں جتنی کئی چھٹی غزلیں ہیں وہ سب اس میں مکمل موجود ہیں۔ جو اشعار منفرد طور پر تلاش کر کے بعض دیوانوں میں بڑھائے گئے تھے اور جن کی بابت قیاسی طور پر کہا جاتا تھا کہ غالب کے ہیں ، وہ ابھی سب کے سب اس میں پائے جانے ہیں۔

اس دیوان میں ۲۵۵ + غزلیں ہیں اور کل ۸۸۳ اشعار ہیں۔ اس کے علاوہ قصیدے ، رباعیاں اور قطعات بھی تعداد میں متداول دیوان سے زیادہ ہیں۔

اس اعتبار سے یہ دیوان خاصی اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں غالب کا ایسا کلام مل جاتا ہے جو عام دیوان میں نہیں ملتا۔

- ۱۔ مفتی انوار الحق؛ دیباچہ 'دیوان غالب' (نسخہ 'حمیدیہ')؛ صفحہ ۵-۷
- ۲۔ غالب کے شعر مطبوعہ کلام کے بارے میں مولانا مہر لکھنے ہیں :

”غالب نے ابتدا میں میرزا ایدل کے رنگ میں اردو شعر کہنے شروع کیے تھے اور دس برس کی مدت میں ایک دیوان جمع کر لیا تھا۔ جب ہوش آیا اور شاعری کی حقیقت سے آگاہی ہوئی تو ان میں سے صرف دوڑے سے اشعار باقی رکھے ، باقی قلم انداز کر دیے۔ انہی اشعار کا ایک مجموعہ انجیل حضرت نواب حمید اللہ خان بہادر فرمایا روئے بھوپال کی نوجہات عالیہ سے ’نسخہ‘ حمیدہ‘ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جو اردو اشعار دیوان کی طباعت کے بعد کہے گئے ، وہ با تو ان کے رفعات میں آ گئے ہیں یا بعض کسی مسودات سے لے کر شائع کیے جا چکے ہیں۔ مثلاً چند چیزیں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے ’الہلال‘ میں چھاپ دی تھیں۔ کچھ اشعار دیوان کے اس ایڈیشن میں چھپ چکے ہیں جو نظامی بدایونی نے خاص اہتمام سے شائع کیا تھا۔ کچھ اشعار آس صاحب نے ’مکمل شرح کلام غالب‘ میں چھاپے ہیں۔ لیکن بعض اشعار اس وقت تک منظر عام پر نہیں آئے۔

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۶۱ پر)

نسخہٴ حمیدہ کے دو ایڈیشن بیروبال سے شائع ہوئے تھے۔ اب یہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۰)

حضرت مولانا ابوالکلام سے معلوم ہوا کہ نواب سعید الدین احمد خان طالب مرحوم کے پاس اردو دیوان کا ایک قلمی نسخہ تھا، جس میں غالب کے غیر مطبوعہ اشعار بھی تھے۔ مولانا نے احترام نے ان اشعار کی نقل لے لی تھی۔ ارادہ یہ تھا کہ انہیں ’الہلال‘ (دور اول) میں شائع کر دیں۔ لیکن سوہ اتفاق سے ’الہلال‘ بند ہو گیا اور بعض دوسرے مسودات کے ساتھ یہ اشعار ابھی شائع ہو گئے۔

میں نے اس دیوان کی تلاش شروع کر دی۔ مولانا مظہر الدین صاحب شیرکوٹی مرحوم مالک ’الامان‘ و ’وحدت‘ کی وساطت سے طالب مرحوم کے متعدد عزیزوں سے ملا۔ لیکن قلمی دیوان کا کوئی سراخ نہ مل سکا۔ اس تلاش میں نواب صلاح الدین مرحوم کی یکم سے ایک اور قلمی دیوان مل گیا، جس کے حاشیے پر اور بعض اوراق پر متفرق اشعار درج تھے۔ میرا خیال ہے کہ کاتب نے انہیں غیر مطبوعہ سمجھتے ہوئے الگ درج کیا۔ لیکن ان میں سے بعض مطبوعہ دیوان میں موجود ہیں۔ کچھ اشعار ’اردوئے معلیٰ‘ میں چھپ چکے ہیں مگر اب تک دیوان میں شامل نہیں ہو سکے۔ مثلاً :

میں ہوں مشتاق چٹا چھہ یہ چٹا اور سہی

تم ہو ہمداد سے غوش اس سے سوا اور سہی

متفرق اشعار ’الہلال‘ یا دوسرے رسائل کے حوالے سے دیوان غالب کے نسخہٴ نظامی میں چھپ چکے ہیں۔ مثلاً واثی رام پور کے غسل محبت کا قصہ، دو تین قطعات، سخن نکیہ، کہن نکیہ والی محزل، بعض اشعار رام پور والے ’مکاتیب غالب‘ میں شائع ہو چکے ہیں۔ مثلاً برسات والا قطعہ جو نواب کاتب علی خان مرحوم کو بھیجا گیا تھا۔ اس کا شعر یہ ہے :

جناب قبلہ حاجات اس ہلاکش نے

بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۶۲ پر)

لایا ہوا ہے اور کسی قیمت پر دستیاب نہیں ہوتا ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۱)

جو اشعار اب تک غیر مطبوعہ سمجھے جا سکتے ہیں ، اس لیے کہ کسی مجموعے میں شامل نہیں ہوئے ، وہ ذیل میں درج ہیں :

آپ نے مستی الخضر کہا ہے تو سہی
یہ بھی اے حضرت ایوب گلا ہے تو سہی
رج طاقت سے سوا ہو تو نہ پیشوں کیوں سر
ذہن میں غویں تسلیم و رضا ہے تو سہی
ہے غنیمت کہ یہ امید گزر جائے گی عمر
نہ ملے داد مگر روز جزا ہے تو سہی
دوست ہی کوئی نہیں ہے جو کرے چارہ گری
نہ سہی لیکہ کھائے دوا ہے تو سہی
غیر سے دیکھئے کیا خوب نہا ہی اس نے
نہ سہی ہم سے ہر اس بت میں ونا ہے تو سہی
نقل کرتا ہوں ایسے نالہ اعمال میں نہیں
کچھ نہ کچھ روز ازل تم نے لکھا ہے تو سہی
کبھی آجائے گی کیوں کرتے ہو جلدی غالب
شہرہ تیزی شعیر قضا ہے تو سہی

ممکن نہیں ہے بھول گئے بھی آریہ ہوں
میں دشت غم میں آہوئے صیاد دہندہ ہوں
ہوں دود مند جبر ہو یا اختیار ہو
کہ نالہ کشیدہ کہ اشک چشیدہ ہوں
جان لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا ذہن
از بس کہ لٹخی غم ہجراں چشیدہ ہوں
نے سب سے علائقہ نہ ساحر سے واسطہ
میں معرض مثال میں دست بریدہ ہوں
ہوں خاکسار ہر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاک
نے دانہ قتادہ ہوں نے دام چیدہ ہوں

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۶۳)

اب پروفیسر حمید احمد خان صاحب نے اس کو از سر نو مرتب کیا ہے اور مجلس ترقی ادب لاہور اس کو شائع کر رہی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۲)

جو چاہیے نہیں وہ سری قدر و منزلت
میں یوسف بہ قیمت اول خریدہ ہوں
ہر گز کسی کے دل میں نہیں ہے سری جگہ
ہوں میں کلام تغز ولیے نا شنیدہ ہوں
اہل ورع کے حلقے میں ہر چند ہوں ذلیل
ہر عاصیوں کے زمرے میں ہوں ہر گزیدہ ہوں
ہانی سے سک گزیدہ ڈرے جس طرح امد
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

حاشیے اور متن کے علاوہ مولہ بالا قلمی نسخے کے اول و آخر کے بعض اوراق پر چند اشعار اردو اور فارسی کے موجود ہیں جو میرے علم کے مطابق آج تک کہیں شائع نہیں ہوئے۔ مثلاً یہ اشعار جو غالباً لوہارو والوں کی طرف سے تقاضائے تشریف آوری کے جواب میں کہے گئے :

خوشی ہے وہ آنے کی برسات کے
ہنیں بادۂ ناب اور آم کھائیں
سر آواز موسم میں اندھے ہیں ہم
کہہ دلی کو چھوڑیں لوہارو کو جائیں
سوا ناچ ہے جو کہ مطلوب جان
نہ وان آم پائیں نہ انگور پائیں
ہوا حکیم باورچیوں کو کہہ ہاں
ابھی جا کے ہو چھو کہہ گل کیا پکائیں
وہ کھٹے کہاں پائیں املی کے بھول
وہ کڑوے کرہلے کہاں سے منگائیں
فقط گوشت ، سو بھڑ کا ریشہ دار
کہو اس کو کیا کھا کے ہم حظ الہائیں

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۶۳ پر)

(۳)

عود ہندی

غالب کے خطوط کا پہلا مجموعہ 'عود ہندی' کے نام سے ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ (۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء) کو یعنی مرزا کی وفات سے تقریباً چار ماہ پہلے شائع ہوا۔ اگرچہ تمام مسودہ ۱۸۶۶ء میں مکمل ہو کر مطبع میں دیا جا چکا تھا۔ یہ نسخہ ۱۸۸۰ء صفحات پر چھپا تھا۔ اس کے شروع میں منشی ممتاز علی خاں کا دیباچہ اور آخر میں حکیم غلام مولا صاحب قلنی میرٹھی کی تقریظ اور مختلف اصحاب کے چار تاریخی قطعے ہیں۔

حالی نے لکھا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ مگر سنہ مذکورہ میں جب کہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے اور ہمہ تن 'سہر نیم روز' کے لکھنے میں مصروف ہو گئے، اس وقت بہ ضرورت ان کو اردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہو گی۔ قیاس کہتا ہے کہ انہوں نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد سے اردو زبان میں خط لکھنے شروع کیے ہیں۔

لیکن مولانا سہر نے اس سے اختلاف کیا ہے اور لکھا ہے کہ غالب ۱۸۵۰ء سے قبل اردو میں خط و کتابت شروع کر چکے تھے لیکن چونکہ اس زمانے میں فارسی کا رواج تھا، اس لیے اس کو اس وقت زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان خطوط کی اہمیت کو محسوس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۳)

دو شعر سہرے کے ہیں جو نواب شہاب الدین احمد خان ثاقب

کی شادی کے موقع پر کہے گئے تھے :

ہم نشین تارے ہیں اور چاند شہاب الدین خاں

یزم شادی ہے فلک کا ہیکشاں ہے سہرا

ان کو اڑیاں نہ کہو بحر کی موجیں سمجھو

ہے تو کشتی میں ولے بحر رواں ہے سہرا

سہاراجہ الور نے 'گلستان' کا ایک نہایت عمدہ نسخہ میر پنچہ کش

سے لکھوایا تھا اور بہت روایہ اس کی تزئین پر صرف کیا تھا۔

۱۔ مالک رام : ذکر غالب : صفحہ ۱۳۳

۲۔ حالی : یادگار غالب :

۳۔ سہر : غالب : صفحہ ۳۹۷

کیا گیا۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں کے دلوں میں ان کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا۔

سب سے پہلے منشی شیو نرائن نے ان خطوط کو چھاننے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن غالب نے ان کو مناسب خیال نہیں کیا اور منشی شیو نرائن کو لکھا :

”اردو کے خطوط جو آپ چھانا چاہتے ہیں یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقم ایسا ہو گا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہو گا۔ ورنہ صرف سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخن وری کے نتائج ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرورت ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ان کا چھاننا میرے خلاف طبع ہے۔“

لیکن ۱۸۹۱ء میں چودھری عبدالغفور سرور اور منشی ممتاز علی خاں کے اصرار پر ان خطوط کو شائع کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے جو ان صاحبوں نے اکٹھے کر لیے تھے۔

مہر صاحب لکھتے ہیں :

”منشی ممتاز علی خاں نے مختلف رقعات جمع کرائے۔ سرور نے اپنا مجموعہ مع دیباچہ منشی صاحب کے حوالے کر دیا۔ خواجہ غلام غوث خاں صاحب نے خبرنے بعض دوسرے خطوط فراہم کر دیے۔ اس وقت تک جی خیال تھا کہ تمام خطوط کی اشاعت ضروری نہیں۔ صرف وہ شائع کیے جائیں جن میں علمی رنگ نمایاں ہو۔ اسی لیے غالب نے خواجہ غلام غوث خاں کو لکھا تھا کہ اب یہ عبارت جو آپ کو لکھ رہا ہوں مجوزہ مجموعہ‘‘ نثر میں شمول کے لائق نہیں ہے لیکن بعد میں جتنے خطوط مل سکے، علمی اور غیر علمی کے امتیاز کو نظر انداز کرتے ہوئے مجموعے میں داخل کر دیے گئے۔ اس مجموعے نے ’عود ہندی‘ نام پایا۔“

اس مجموعے پر ممتاز علی خاں نے پیش لفظ لکھا اور اس میں ان خیالات کا اظہار کیا :

”مجھے ملت سے اس کا خیال تھا کہ فارسی تصنیفیں تو ان کی بہت مراتب ہوئیں اور چھاپی گئیں۔ لوگوں نے فیض الہائی، تمویذ بازو بنائے مگر کلام اردو نے سوائے ایک دیوان کے ترتیب نہ پائی۔ یہ دولت ارباب شوق کے ہاتھ نہ آئی۔ حالانکہ نثر اردو ان کی اوروں کی فارسی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ یہ سلاست بیان، شستگی زبان، روزمرہ کی صفائی اور ان کی شوخی کس کو سسر ہے۔ اے ایسی ترتیب دیجیے، قدر دانوں پر احسان کیجیے۔“

اور مرزا صاحب کے شاگرد یکتا چودہری عبدالغفور سرور تخلص سے یہ ذکر آیا تو انہوں نے جتنے خطوط، مرزا صاحب کے ان کے نام آنے لگے، سب کو ایک جا کر کے، اور اس پر ایک دیباچہ لکھ کے وہ مجموعہ عنایت کیا۔ عرصے تک سرگرم ملازمی رہا۔ جا بجا سے اور تحریروں مرزا صاحب کی ہم پہنچائیں۔ بڑی محنت الہائی۔ تب مینا پر آئی۔ اور مجموعہ مرتب ہوا۔ آج پورا اپنا مطلب ہوا۔ خواجہ محلام لکھت خاں بے خبر تخلص جو نواب معلی القاب لفٹیننٹ گورنر بہادر محالک مغربی و شمالی کے میر منشی اور میرے مخدوم خاص اور حضرت غالب صاحب کے تخلص بالاختصاص ہیں، اس تلاش میں میرے معین و مددگار رہے۔ بہت کچھ ذخیرہ ان کی بدولت ہم پہنچا۔ اس کتاب کی دو فصل اور ایک خانہ ہے۔ پہلی فصل میں چودہری صاحب کے مراتب کیے ہوئے خطوط اور ان کا لکھا ہوا دیباچہ، دوسری فصل میں میرے جمع کیے ہوئے رقعات اور خانے میں چند تحریریں ہیں جو جناب غالب نے اوروں کی کتابوں پر تحریر فرمائی ہیں۔

’عود ہندی‘ اس کتاب کا نام ہے۔ خوبو اس کی تمام عالم میں پہلے۔ اسی دعا پر ختم کلام ہے۔“

’عود ہندی‘ کے اس البتیشن میں عبدالغفور سرور نے دیباچہ لکھا تھا اور اس میں یہ خیالات ظاہر کیے تھے :

”اب ارباب اختیار کو معلوم ہو کہ میں انکسار ظہور عبدالغفور

منگھلی بہ سرور ماریروی بدو شعور سے اہل سخن کا طالب اور صاحب کلام کا خواہاں تھا ۔ جب کلام بلاغت نظام رشک صاحب فخر طالب جناب امد اللہ خان غالب کا دیکھا ، دل کو بہایا ، پکتا پایا ۔ قریب مواصلات میں قدم بڑھایا ۔ ہر کتابت کا جواب آیا ۔

سبحان اللہ ! وہ زبان کہاں پاؤں کہ ان کے خلق کا بیان لب پر لاؤں ۔ مجھ سے ناچیز حقیر پر وہ ذرہ نوازی سہر وار فرمائی کہ میری نظر میں میری آبرو بڑھائی ۔ کبھی جواب مراسلہ میں تساہل و درنگ اور اصلاح شعر و عبارت میں دریغ اور تنگ نہ فرمایا ۔ جو نامہ کہ بہ نام میرے بہ عبارت اردو تحریر کیا ، مکتوب سادہ رویوں سے دلربا تر ۔ اور ہر سطر اس کی سلسلہ سویوں سے تاب فرما زیادہ ہے ۔ جس آنکھ نے دیکھا وہ یقیناً ہے ۔ جس کان نے سنا وہ شنوا ہے ۔

اس تنہا متناذ ہونا اور آپ ہی آپ سوز اٹھانا خلاف انصاف جانا دل مائل تمام بہ شہرت عام ہوا ۔ اور ہنوز یہ قصد فائز تمام تھا کہ بہ حسن اتفاق فخر زمان ، وحید دوران ، جناب ممتاز علی خان صاحب مہ وطن میرٹھ ۔ کہ عالم ریعان شباب میں بہ تہذیب نفس شب بیدار ، تہجد گزار ، دل نرم ، ہنگامہ محبت گرم ، اخلاق مجسم ، شفیق مکرم فطرت ارجمند ، ہمت بلند ، خصائل حمیدہ ، اوصاف پسندیدہ ، پاک نہاد متحد با اتحاد ، پاکیزہ روش ، اخلاق منش ، سخن شناس ، انصاف اساس ، خوش تقریر ، عظیم النظیر ہیں ، رونق افزائے ماریروہ ہوئے اور قدوم القدس لزوم سے اس قصے کو مشرف کیا ۔

ایک روز محفل مدوح میں ذکر ہمہ دانی و شیوا یانی جناب استاد ی مخدومی درمیان آیا ۔ ارشاد کیا کہ کلام مرزا صاحب نسیم جان فرا اور شمیم دل کشا ہے ۔ فارسی کا کیا کہتا ، اردو بھی پکتا ہے ۔ نظم و نثر فارسی میں تو بھلی بہ حلیہ انطباع ہوا ۔ لیکن نثر اردو زیور طبع سے عاری آیا ۔ اگر وہ خطوط کہ بہ نام تمہارے آئے اور تم نے سنائے ہیں ، جمع کرو تو میں بیڑا اٹھاتا ہوں ۔ اس تعویذ سے نسیم تاثیر نے شجہہ دل کھلایا ۔ منشا خاطر ظہور میں آیا ۔ وہ مکتوب کہ بہ نام میرے آئے تھے ، ترتیب دیے ۔ گویا جواہر ہے ہا کان

قلم دان سے نکال کر کشتی' اوراق میں جمع کیے۔ چونکہ محبت جناب غالب سرے حال پر بہت غالب ہے۔ لہذا نام اس اشعار کا 'سہر غالب' مناسب ہے۔ سال ختم تالیف بھی اس نام سے مطابق پایا طبیعت اور بڑھی۔ تحریر تاریخ کو دست قلم بڑھایا۔

اشعار مملو بہ حد مطالب لکھی
یعنی بے دوستان طالب لکھی
موسوم کیا جو 'سہر غالب' سے سرور
تاریخ بھی اس کی سہر غالب لکھی

*۱۲۷۸

کو کتب شعر شاعران ہند پر تو التفات غالب سے روشن اور خاک فکر ہندیان آبیاری سکرت مدوح سے کشن ہو چو۔ آہیں ثم آمین! اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ سرور نے 'عود ہندی' کی اشاعت سے قبل 'سہر غالب' کے نام سے غالب کے خطوط کا مجموعہ مرتب کر لیا تھا۔ لیکن بعد میں اس کو دوسری تحریروں کے ساتھ شامل کر دیا۔ مجموعہ 'عود ہندی' کے نام سے شائع ہوا۔

'عود ہندی' کو پانچوں ہاتھ لیا گیا اور گزشتہ سو سال میں اس کے مندرجہ ذیل ایڈیشن شائع ہوئے :

- ۱۔ مطبع میرٹھ ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۸ ع (۲ رجب ۱۲۸۵ھ)
- ۲۔ مطبع نارا لئی دہلی ۲۳ فروری ۱۸۷۸ ع (۲ صفر ۱۲۹۵ھ)
- ۳۔ مطبع نول کشور کان پور ستمبر ۱۸۷۸ ع (رمضان ۱۲۹۵ھ)
- ۴۔ مطبع مفید عام آگرہ مئی ۱۹۱۰ ع
- ۵۔ مطبع نول کشور کان پور ۱۹۱۳ ع (بہار چہارم)
- ۶۔ مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۲۷ ع
- ۷۔ فیشنل پریس الہ آباد ۱۹۲۹ ع
- ۸۔ مطبع انوار احمدی الہ آباد
- ۹۔ مطبع کرمی لاہور

۱۔ عبدالغفور سرور : دیباچہ 'عود ہندی'

۲۔ مولانا سہر غالب : ۳۰۳-۳۰۴

۱۰۔ مطبع گلزار ہند اسٹیم پریس لاہور

۱۱۔ مجلس ترقی ادب لاہور۔ مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل جون

۱۹۶۷ء

(۳)

اردوئے معلیٰ

”اردوئے معلیٰ“ غالب کے خطوط کا دوسرا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ ۶ مارچ ۱۸۶۹ء کو چھپ کر شائع ہوا۔ یہ ”اردوئے معلیٰ“ کا پہلا حصہ تھا اس میں ۶۴ صفحات تھے۔ اس کے آخر میں تین صفحات کا غلط نامہ تھا۔ اسی مطبع سے یہ حصہ دوبارہ یکم وجب ۱۳۰۸ھ (۱۱ فروری ۱۸۹۱ء) کو شائع ہوا۔

اردو معلیٰ کی ترتیب میں غود غالب نے بھی دلچسپی لی۔ وہ اس طرح کہ جب ’غود ہندی‘ کی طباعت میں تاخیر ہوئی تو بعض احباب کے اصرار پر انہوں نے اپنے کچھ خطوط جمع کرنے کی کوشش کی تاکہ ان کو دوسرے مجموعے کی صورت میں شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس سلسلے میں اپنے احباب کو خط لکھے اور خطوط کی نقلیں بھیجنے کی طرف اس طرح توجہ دلائی :

”مطبع اکمل المطابع میں چند احباب میرے مسودات اردو جمع کرنے اور ان کو چھپوانے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ مجھ سے مسودات مانگتے ہیں اور اطراف و جوانب سے فراہم کئے ہیں۔ میں مسودہ نہیں رکھتا۔ جو لکھا وہ جہاں بھیجنا ہوا بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے ہمارے پاس بہت ہوں گے۔ اگر ان کا ہاوسل بنا کر یہ سیل ڈاک بھیج دو گے یا آج کل میں کوئی ادھر آنے والا ہو اس کو دے دو گے تو موجب میری خوشی کا ہوگا۔“

(خط بنام علاؤالدین احمد خاں)

”اچھی حضرت! یہ منشی ممتاز علی خاں کیا کر رہے ہیں۔ رقمیں جمع کئے اور نہ چھپوانے کی الحال پنجاب احاطے میں ان کی بڑی خواہش ہے۔ جانتا ہوں کہ وہ آپ کو کہاں ملیں گے جو آپ ان سے کہیں

استعارات کی خجالت سے در شاہوار ہانی ہانی - جس کی رنگینی فقرات سے
 خون جگر لعل رسانی - نہیں نہیں - یہ متالش کچھ سرمایہ نازش نہیں -
 کیا موتی کیا لعل ان کی وجہ قدر و مقدار یعنی آب و تاب اندک
 تعمیر میں ناپاب ہے - اور یہ قیامت تک پکساں - تہی دستان سرمایہ
 سخن کو فیض رساں عبارت متین کی کیفیت دیکھ کر جامی تو کیا
 افلاطون خم نشیں کے ننسے ہرن ہوئے ہیں اور اس کے ادواک غوامض
 میں اپنی عقل و خرد کھوئے ہیں - جہاں سر خوشان خستہ معانی
 جرعد خوار بادۂ گفتار اور نشہ حسن بیان سے سرشار ہوں پھر ہم
 سے نارسیہ اس پختگی مطالب کو کیا پائیں ، کہاں سے ایسی قوت
 متغزلہ لائیں - سوائے اس کے کہ ہم راہ ہار یک دیکھ کر قدم لڑکھڑائیں
 اور اپنی نااہلی پر عرق افعال میں غوطہ کھائیں - مگر افسوس کہ
 اس جنس گرانہ ارز کا کوئی خریدار نہ ہوا اور یوسف مصر مستعدانی
 کا طالب دیدار نہ ہوا - حضرت کا ظہور حضرت اکبر شاہ کے عہد
 میں ہوتا ، شاہ عباس دارائے ایران کے عصر میں ہوتا - نظیری اپنا
 نظیر دیکھ لیتا ، ظہوری کو فن شعر میں اپنا حریف غالب نظر آجاتا -
 غیر اب ہم یوں دل خوش کرتے ہیں کہ اگر حضرت اس وقت میں
 زینت بھری جہاں ہوتے تو ہم کہاں ہوتے - یہ ہمارے طالع کی خوبی
 یہ ہماری خوش نصیبی کہ ایسے منتخب روزگار کے جال با کمال سے
 متقیں انوار فیض ہوئے اور شرف قدم ہوسی بہرہ اندوز - جب حضرت
 کو دیکھ لیا گویا سب سخندان ہمیشہ کو دیکھ لیا - جب حضرت
 کا کلام سن لیا سب کا کلام سن لیا - سبیں میرے قول کی یہ اردو کی
 تحریر ہے کہ سہل الممتنع بلکہ ممتنع النظیر ہے - اس اردو کا نیا انداز
 ہے کہ جس کے دیکھنے سے روح کو امتزاز ہے جو کہ بعد تکمیل
 ہو جائے کلیات نظم و نثر فارسی کہ وہ ایک آویزۂ گوش فصاحت و
 ہیراہے گاویں بلاغت ہے اور ہندوستان سے ایران تک ہر نکتہ
 سنج کی ورد زبان ہے مدت سے حضرت کو طرز تولیاد اردو سے اگاڑے
 اور خط و کتابت میں اسی کا برتاؤ ہے - جب شائقین ہنر دوست نے
 اس نمک ہندی کا مزہ چکھا ، ہر ایک سرمایہ لدت مائلہ مسجد کر
 طلب کار خواستگار ہوا - اس واسطے منشی جواہر سنگھ صاحب جوہر

کہ یہ صاحب اخلاقی و مروت میں یکتا اور علم دوست و پختہ آشنا ملازمین معزین سرکار سے ہیں اور آپ بہشتن دار ہیں علم فارسی کو خوب جانتے ہیں اشعار بھی اسی زبان میں فرماتے ہیں منشی صاحب کے اشعار قابل دید ہیں جناب مرزا صاحب قبلہ کے شاگرد و شہید ہیں چنانچہ خود جناب مرزا صاحب فرماتے ہیں - ع - دو معرکہ تغیم کہ جوہر داریم - ان کی طبع والائے یہ القضا کیا کہ ہم گوہر ہائے شب افروز ملک تحریر میں منسلک ہو کر زینت بخش عروس سخن ہوں اور یہ گلہائے ہراگندہ جمع ہو کر ایک جا گلستہ ہوں تا اس کی رواج روح پرور سے دماغ تکتہ سراہان عبرت چمن ہو، اس واسطے - میرزاغزالہ صاحب مستم اکمل المطابع دہلی نے سعی بے پایاں اور لالہ بہاری لال صاحب منشی مطبع مذکور نے کوشش فراوان سے اکثر خطوط جمع کیے اور قصد الطباع کیا اور "اردوئے معلیٰ" نام رکھا گیا اور ان خطوط کو دو حصوں پر منقسم کیا - پہلے حصہ میں صاف صاف عبارت کے خط تحریر کیے تا کہ طلبائے مدرسہ نائدہ الہائیں - دوسرے حصہ میں مطالب مشککہ کی تحریر اور تقریظ وغیرہ لکھی تا مستوران معنی باب اس کے دیکھنے سے مزا پالیں اور منشی صاحب موصوف نے اس ہیچمدان خاکسار یعنی مجروح دل انکار سے اس کا دیباچہ لکھنے کو فرمایا - بندہ یہ سن کر حیران ہوا کہ یا رب در شاہوار کے ماسے خرف ریزوں کا کیا اعتبار اور نعل و زمرہ میں پتھر کے ٹکڑوں کا کیا وقار - مگر الامر فوق الادب سمجھ کر اور اپنے کو اسی خوان نعمت کا ذلہ چیں جان کر یہ چند سطریں لکھیں - بقول عرفی :

چو ذرہ گرچہ حقیریم نسبتم این بس

کہ آفتاب بود نقطہٴ مقابل ما

قربان علی بیگ سالک کی تقریظ

"شیدائیان شاید دلفریب سخن ہر وقت اس کے خریدار اور شہندگان

حسن معانی ہر دم اس کے خواستگار رہتے ہیں کہ اچھا کلام جو مطبوع طبایع ناظرین خرد پیشہ اور پسند خواطر شائقین درست اندیشہ ہو میسر آئے - صاحب نظران دیدہ وور جن کی آنکھیں شہستان معانی کی سیر سے سیر ہوتی ہیں -

مشاہدہ ماہ پیکراں مہر شمال سے تسلی نہیں ہائے۔ اور رنگین مشامان نکتہ برور جن کے دماغ میں گلستان سخن جو نیر اعظام سپہر سخنوری و ماہ منیر آمان معنی گستری شہسوار عرصہ نکتہ دانی پکتہ قاز میدان جادو یانی قرماں روائے کشور تازک خیالی زینت انزلے اورنگ بیعتالی ناثر نثری رفعت۔ شاعر شعری رتبت۔ چمن آرائے گلستان فصاحت۔ حدیقہ پیرائے خیابان بلاغت۔ فروغ بزم آفرینشی۔ نور دیدہ بینش۔ استاد یگانہ۔ مسلم الثبوت زمانہ روشک عرف و عبرت طالب جناب استاذی نیم الدولہ دیرالملک اسد اللہ غاں جہادر نظام جنگ غالب کی زبان معجز بیان پر آیا ہوا اور خاصہ پروین افشاں سے نکلا ہوا علی الخصوص یہ سائیدہ ہے نظیر و مجموعہ دلپہر جس کا ہر حرف باعث نظارۃ چشم نظارگیاں اور ہر لفظ سبب تازگی دیدہ مشتاقان ہے۔ ہر سطر کو دریائے موج خیز معانی اور ہر فقرہ کو گلزار ہمیشہ بہار رنگین بیانی کہتا چاہیے۔ عبارت سے سلسیل کی سلاست پیدا۔ مضامین سے آب کوثر کی لطافت پیدا۔ کمنہ انداز رسا میں گردن معانی شکار۔ شیرینی ادا پر ادائے شیریں لبان نثار۔ غور کیجیے کہ فراہم آقا اس نسخہ سے بدل کا۔ اور طبع ہونا اس کتاب سے مثل کا کیونکر غنیمت نہ سمجھا جائے ناظرین کو لطف آروانی و شائقین کو مذاق سخن فراوانی مبارک۔ کیوں کر شکر فراہمی نہ ادا کیا جائے۔ ہاں اے سالک اندوہیں کیسا شکر یہ کہا کلام ہے اے بے خبر گروہ و ہنگام ماتم علم ہے۔

باید چو شمع در دل شبہا گریستی

سر گرم بودن از تہ دل با گریستی

نا سازگار جسم مرا نا گداختن

نا خوش گوار چشم مرا نا گریستی

گریست از تراوش سر چشمہ حیات

باید بعر خضر و مسیحا گریستی

پنوز یہ نامہ دلاویز تمام و کمال تشریف طبع نہ پا چکا تھا کہ سپہر

سے سہر نے بتاریخ ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ ہجری جامہ حیات جناب مغفور و مرحوم کو چاک کیا۔ آفتاب علم و کمال کو ریخ خسوف دکھایا۔ ماہتاب فضل و ہنر کو صند کسوف میں بھنسا یا۔

اس ستم کار سے کوئی بچ چکا
 ہاتھ اس واقعہ سے کیا آیا
 نہ سوجھا کہ عالم میں تاریکی چھانے کی - زمانہ کو نسکین نہ ہاتھ
 آنے کی - آنکھیں اشک بار دل بیقرار ہوں گے مگر :
 نہیں غروب نہ از بینے کہیں امت
 مقتضائے طبیعتش ایسی امت
 اپنی عادت سے ناچار ہے - دشمنی اہل کمال سے اس کا شعار ہے - کوئی
 مبتلائے آفت ہو - خواہ گرفتار مصیبت ہو - اس کو اپنی گردن کا رنگ
 دکھانا - کسی نہ کسی پگاندہ آفاق کا نقش ہستی صفحہ روزگار سے مثافہ -
 سخن آرائی نوحہ سرائی سے کیوں کر بدل ہو - سخن منجی کے عوض کہیں
 فالہ پر درد اور کبھی آہ سرد لب پر ہے - کہیں جب یہ بارگراں اندوہ دل
 پر ہو دل کی مجال ہے کہ بیش نہ جائے - کسی تاریخ خائیمہ کتاب - کیسا
 سال وفات ہاں گفتگو کو مختصر کرتا ہوں اور ایک قطعہ لکھتا ہوں -

قطعہ

کیا کہوں کچھ کہا ہیں جانا
 لب پہ نالوں کا اژدہام ہوا
 صفحہ مرگ حضرت غالب
 سبب رنج خاص و عام ہوا
 ہے یہی سال طبع سال وفات
 آج ان کا سخن تمام ہوا
 (۵)

مکاتیب غالب

غالب نے دربار رام پور سے منسلک ہونے کے بعد جو خطوط والیان
 ریاست کو لکھے تھے ، وہ اس مجموعے میں یک جا کر دیے گئے ہیں -
 مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے ان کو مرتب کیا ہے اور ایک مفصل
 مقدمے اور مفید حوالے کے ساتھ ان کو رام پور سے شائع کیا ہے - اس
 کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا تھا - اس کے بعد اس کے چار

ایشن اور شائع ہوئے۔ آخری ایڈیشن ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔

اس مجموعے کے سرورق پر یہ عبارت ملتی ہے :

”حکیم الدولہ دیرالملک مرزا احمد اللہ خان بہادر نظام جنگ دہلوی متخلص بہ غالب کے آؤں عرائض و خطوط کا مجموعہ جو نواب فردوس مکاں، نواب خلد آشیان (طاب ثراہا) یا دیگر وابستگان دربار کی خدمت میں لکھے گئے تھے۔“

مکاتیب غالب کی تراجم اور اشاعت کی تفصیل بشیر حسین زیدی صاحب نے اس طرح بیان کی ہے :

”نواب فردوس مکاں کے دامن جود و سخا میں پناہ لینے والے حضرات کی طویل فہرست میں مفتی محمد سعد اللہ مراد آبادی ، میرزا احمد اللہ خان غالب دہلوی ، منشی مظفر علی خان امیر لکھنوی ، منشی امیر احمد مینائی ، صاحب عالم ، میرزا رحیم الدین حیا دہلوی ، شیخ علی بخش بیار ، میر عویض علی عبدل ملیح آبادی خوش نویس مستملق اور منشی الہا پرشاد لکھنوی داستان گو وہ ممتاز ہستیاں ہیں جن سے ارباب علم و ادب بخوبی واقف ہیں۔

لیکن ان تمام صاحبان فضل و کمال میں نجم المولود دیرالملک، میرزا احمد اللہ خان بہادر غالب دہلوی کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ آغاز ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق خیر آبادی کی وساطت سے نواب فردوس مکاں نے انھیں فن سخن میں اپنا بشیر خاص مقرر فرمایا تھا۔ ابتداً نواب فردوس مکاں وقتی عطیات سے میرزا صاحب کی امداد فرماتے رہتے تھے لیکن غدر کے بعد ان کی پینشن بند ہو گئی تو نواب صاحب نے جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ ماہوار تنخواہ جاری فرما دی تھی، جو ان کے انتقال کے بعد تک خلد آشیان کے خزانے سے ملتی رہی اور مرزا صاحب کی وفات پر ان کے مہینہ حسین علی خان شاداں کے وظیفے کی شکل میں تبدیل ہو گئی۔

اس رشتے کی بدولت ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۹ء تک دربار رام پور اور میرزا غالب کے درمیان سلسلہ مراسلت جاری رہا۔ اس مراسلت کا

معتقدہ حصہ محکمہ عالیہ دارالانشا (پولیشکل ریکارڈس آفس) رام پور میں محفوظ تھا۔ ۱۹۳۵ء میں اختر نے اعلیٰ حضرت ہندگان حضور پور کپتان ہڑپائیس عالی جاہ، فرزند دل پذیر دولت انگلشیہ، مخلص الدولہ ناصرالملک، امیرالامراء نواب سید محمد رضا علی خان بہادر مستعینچنگ فرمان روائے رام پور دام اقبالہم و ملکیم کی توجہ بہاؤں اس نادر و قابل ذخیرے کی اشاعت کی طرف مینول کرانے کی جرأت کی۔

ہندگان اعلیٰ حضرت کی ذات گرامی اپنے آہائے کرام کی طرح سرپرستی، علوم و آداب میں عموماً اور پرورش زبان اردو میں خصوصاً اقرات و اسائل میں ممتاز ہے۔ بنا بریں حکم عالی نافذ ہوا کہ اس مجموعے کو باحسن وجوہ مرتب کر کے القادۃ ارباب ذوق کے لیے شائع کر دیا جائے۔

میں نے مولوی امتیاز علی عرشی (ناظم کتب خانہ رام پور) کو جن میں علمی قابلیت، ذوق سلیم اور علم و ادب کی عملی خدمت کے جذبات جمع ہیں اور مجھے ان سے آئندہ کے لیے بہت بلند اور خوش آئند توقعات ہیں، اس ادبی خدمت کے سر انجام پر مامور کیا اور وقتاً فوقتاً مناسب ہدایات اور مشورے دیتا رہا۔ ان کی مسلسل دو سال کی سعی و جانفشانی کے بعد آج یہ مجموعہ اس قابل ہوا ہے کہ اعلیٰ حضرت شہرہار رام پور دام اقبالہم و ملکیم کے حضور میں پیش کیا جا سکے۔“

اور مولانا امتیاز علی خان عرشی نے دیباچے میں اس مجموعے کا تعارف اس طرح کر لیا ہے :

”۱۹۳۵ء میں جناب معلی القاب عالی مرتبت سید بشیر حسین صاحب بہادر زیدی، چیف منسٹر ریاست رام پور نے حقیر عرشی کو حکم دیا کہ ہندگان اعلیٰ حضرت ہڑپائیس کپتان عالی جاہ، فرزند دلپذیر دولت انگلشیہ، مخلص الدولہ، ناصرالملک، امیرالامراء، نواب سید محمد رضا علی خان بہادر مستعینچنگ فرمانروائے رام پور دام اقبالہم و ملکیم کے ایمائے بہاؤں کے مطابق میرزا اسد اللہ خان بہادر

غالب دہلوی کے مکاتیب جو موصوف نے نواب فردوس سکاں ، نواب خلد آسپاں (طاب ثراہا) یا دیگر وابستگان دربار کے نام لکھے تھے ، اور عرصے سے محکمہ عالیہ دارالانشا میں محفوظ تھے ، ضروری حواشی اور ایک سیر حاصل مقصد کے ساتھ مرتب کروں ۔

سیری علمی بے بضاعتی اس بارگراں کی کسی طرح متعطل نہ تھی اور دامن ہمت اس طرف بے باہان کے احاطے کو کوتاہ نظر آتا تھا مگر یہ مقضائے :

من دریں رتبہ از کجا ، لیکن

مور پروردہ سلیمان است

یہ تعمیل حکم ترتیب مکاتیب کا کام شروع کیا اور مسلسل دو سال کی شب و روز کی محنت کے بعد اس مجموعے کی ترتیب کے غرض سے سبک دوش ہوا ۔^{۱۱۰}

(۶)

خطوط غالب

غالب کے خطوط کا یہ مجموعہ منشی مہیش پرشاد نے مرتب کیا اور اس کی پہلی جلد برویسو عبدالستار صدیقی صاحب کی نظر ثانی کے بعد ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا ۔ اس پر عبدالستار صدیقی صاحب نے ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہے اور اس میں مہیش پرشاد صاحب کی محنت کو سراہا ہے ۔ لکھتے ہیں :

”غالب کے اردو خطوں کے دو مشہور مجموعوں ’عود ہندی‘ اور ’اردوئے معلیٰ‘ کو شائع ہونے سے پہلے برس ہو چکے اور اب تک یہ دونوں کتابیں کئی بار چھپیں ، مگر اردو فن کے ان سادہ برکار نمونوں کو خوش اسلوبی سے ترتیب دینے یا ان کے متن کی ، جیسی چاہیے تھی ، تصحیح کرنے کی کوشش نہ ہوئی ۔ ہر نئی اشاعت میں کچھ نئی غلطیاں داخل ہوئیں ۔ چاہے ان کے اخیر اشاعتوں کا مشکل ہی ہے کوئی صاحب غلطیوں سے بچا ہے ۔ ان غلطیوں کی خاطر خواہ

اصلاح تب ہی ہو سکتی ، جب غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خط سب کے سب مل جائے ۔ اصل خطوط کا ہاتھ آنا تو بڑی بات، چھاپے کے برائے نسخوں کا ملنا بھی دشوار ہو گیا ۔ جون جون زمانہ گزرتا جاتا تھا ، کام کی مشکلیں بڑھتی جاتی تھیں اور یقین نہ آتا تھا کہ کوئی کبھی اس کٹھن کام کو کر سکے گا ۔ ہزار آئیں منشی ہمیشہ ہرشاد کی ہمت کو کہ وہ کمر ہاندہ کے الٹ کھڑے ہوئے اور بڑی مستعدی سے غالب کے خطوں کے متعلق بہت وافر مواد جمع کیا ۔ نہ صرف ’عود ہندی‘ اور ’اردوئے معلیٰ‘ کے خطوں کو اک جا کر کے تاریخی سلسلے سے ترقیب دیا ، بلکہ جو اور خط کہیں اور شائع ہوئے تھے ، ان کو بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا اور کچھ ایسے خط بھی ، نہ معلوم کن مشکلوں سے حاصل کیے ، جو اب تک شائع نہیں ہوئے تھے ۔ اس سارے ذخیرے کو انھوں نے تاریخی سلسلے سے مرتب کیا اور کئی برس کی لگاتار محنت اور دوڑ دھوپ کے بعد ایک ضخیم مجموعہ ’خطوط غالب‘ کے نام سے دو جلدوں میں تیار ہوا۔ پہلی جلد اب شائع ہوئی ہے اور امید ہے کہ دوسری جلد کا چھاپا بھی اسی سال ہو جائے گا ۔“

منشی سہیل ہرشاد اس مجموعے کے بارے میں لکھتے ہیں :

”۱۹۲۳ع کی بات ہے کہ مجھے مرزا غالب کے خطوط کو پڑھنا پڑا ۔ اس وقت مطبوعہ خطوط کے اغلاط و اسقام معلوم ہوئے اور ان کے باب میں بعض امور کا خیال ہوا ۔ چنانچہ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج یہ لفظ حضرت غالب کے قدردانوں کی خدمت میں پیش ہو رہا ہے۔ ’عود ہندی‘ اور ’اردوئے معلیٰ‘ میں جتنے خطوط ہیں ، وہ سب اس مجموعے میں اک جا کر دیے گئے ہیں ۔ اور ان کے علاوہ بہت سے خط اس میں شامل ہیں ، جو ان دونوں کتابوں کے کسی نسخے میں نہیں ملتے۔ بلکہ کسی اور کتاب یا مختلف ادبی رسالوں میں شائع ہوئے ہیں، کچھ ایسے بھی ہیں، جو اب تک کہیں شائع نہیں ہوئے۔ یا شائع ہو چکے ہیں مگر ان میں جا بجا غلطیاں تھیں ۔ جو خط ’عود ہندی‘

یا 'اردوئے معلیٰ' میں ہیں ، ان کے مقابلے اور تصحیح کی کوشش کی گئی ہے ۔ جہاں کہیں ایک متن کے دو یا زیادہ نسخوں میں اختلاف تھا ، بہتر صورت کو متن میں رکھا اور اختلاف اگر کاتب کے سہو پر مبنی پایا گیا تو اس سے قطع نظر کیا گیا ۔ صرف اہم اختلافات حاشیے میں دے گئے ہیں ۔ کہیں کہیں متن میں کوئی لفظ کم معلوم ہوا اور اس کے بغیر جملہ ناقص ہو گیا تھا تو ضروری لفظ بڑھا دیا گیا اور اس طرح کا اضافہ کہیں دار لکھنویوں کے اندر رکھا گیا ہے ۔

ہر ایک مکتوب الہ کے نام کے خط تاریخی ترتیب سے مرتب کئے گئے ہیں ۔ ہر مکتوب الہ کے نام کے پہلے خط کی تاریخ کے لحاظ سے مکتوب الہوں کی تقدیم و تاخیر کی گئی ہے ۔ 'ہود ہندی' میں بہت تھوڑے خط آئے ہیں ، جن میں تاریخی درج ہیں مگر ان میں اکثر ایسے ہیں کہ ان میں دن اور مہینہ لکھا گیا ہے مگر سنہ نہیں ہے ۔ 'اردوئے معلیٰ' کے بہت سے خطوں میں تاریخی ہیں لیکن کہیں ہجری کہیں عیسوی تاریخی ہیں، کہیں دونوں، اور بعض تاریخی خط نہیں ہیں ۔ اس مجموعے میں تمام تاریخوں کو ایک ڈھنگ پر رکھنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ جن خطوط میں صرف ہجری تاریخیں ہیں ۔ ان کے مطابق عیسوی تاریخ خط کے آخر میں درج کر دی گئی ہیں ۔ اس التزام کے ساتھ کہ جتنا حصہ اصل میں نہیں ہے، وہ کہیں دار لکھنویوں کے اندر رکھا گیا ہے ۔ کہیں حاشیے میں تاریخ دے دی گئی ہے ۔ جس خط میں کوئی تاریخ درج نہیں ملی ، اس کے زمانے کا تعین الدرونی شہادت یا کسی اور ذریعے سے کی گئی ۔ مثلاً منشی ہر گوبال لکنہ کے نام کے پہلے خط کا وقت 'اسعد الاخبار' اگرہ کے ۲۰ اگست ۸۳۹ھ کے برجے سے معین کیا جا سکا ۔ اس لیے کہ اس میں منشی صاحب کے دیوان پر میرزا غالب کی لکھی ہوئی ترقیہ کا ذکر ہے۔" غرض یہ مجموعہ بڑی محنت اور تلاش و جستجو سے مرتب کیا گیا ہے ۔ اس میں والیان ریاست رام پور کے نام وہ خط بھی شامل کر لیے گئے ہیں ،

جو 'مکاتب غالب' کے نام سے استاذ علی عرشی صاحب نے مرتب کر کے شائع کیے تھے ۔
 الفسوس ہے کہ 'خطوط غالب' کی صرف ایک جلد شائع ہوئی۔ دوسری جلد شائع نہ ہو سکی ۔

(۷)

نادرات غالب

میرن صاحب کے نواسے آفاق حسین آفاق دہلوی نے اس مجموعے میں وہ خطوط جمع کر دیے ہیں جو غالب نے منشی نسی بخش حقیر اکبر آبادی کے نام لکھے تھے ۔

میر سہدی مجروح اور میر الفضل علی میرن صاحب ان خطوط کو جمع کرتے رہے اور بالآخر یہ آفاق حسین صاحب کو ورثے میں ملے اور انہوں نے ان کو مرتب کیا، حواشی لکھے اور ۱۹۴۹ء میں پہلی بار یہ مجموعہ مشہور پریس کراچی میں چھپوا کر ادارۃ نادرات کراچی سے شائع کیا ۔
 آفاق حسین صاحب کہید میں لکھتے ہیں :

"بزرگوں کے تبرکات میں مرزا غالب کے یہ غیر مطبوعہ خطوط بھی شامل تھے ، جنہیں 'نادرات غالب' کے نام سے ارباب نظر کی خدمت میں سرمایہ' ناز بنا کر پیش کیا جا رہا ہے ۔ یہ خطوط مرزا غالب کے عزیز دوست میر سہدی حسین مجروح اور میر الفضل علی عرف میرن صاحب نے فراہم کیے تھے ۔ لیکن کسی وجہ سے ان کی اشاعت کی نوبت نہ آ سکی ۔ چونکہ میں نے اس خانوادے میں آنکھیں کھولی ہیں اس لیے اس گنج گراں ماہ کو محفوظ رکھنے کا شرف بھی میرا ہی حصہ رہا ۔ اس صحیفہ' ادب کا مملکت و تصرف ہر چند ہر چند میرے لیے قابل رشک رہا ہے ۔ لیکن دنیائے ادب کو اس سے محروم رکھنا بھی ایک گناہ سے کم نہ تھا ۔ ویسے بھی اس کی اشاعت ادبی خدمت کے علاوہ ایک ایسا قوس فرض تھی ، جسے ادا کیے بغیر سبک دوشی ممکن نہ تھی ۔ مجھے اپنی سعادت پر بجا طور پر فخر ہے کہ یہ کام میرے ہی ہاتھوں انجام پا رہا ہے ۔ اردو زبان اپنے سرمایہ' ادب میں

اس گراں مایہ اضافے پر جس قدر تازہ کرے کم ہے۔“
بابائے اودو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے ’سرفائد‘ کے عنوان
سے اس مجموعے کا تعارف کرایا ہے۔ لکھتے ہیں :

”آفاق حسین آفاق صاحب میرن صاحب کے نواسے ہیں۔ ’اردوئے
معلیٰ‘ جن کی نظر سے گزری ہے وہ میرن صاحب سے بخوبی واقف ہیں۔
میرن صاحب کو مرزا صاحب سے عقیدت نہیں، عشق تھا اور مرزا
صاحب بھی ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ان کے پاس مرزا صاحب
کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہت سے خط تھے۔ ان میں سے چند انہوں
نے مجھے بھی عنایت فرمائے تھے۔ آفاق صاحب کو مرزا صاحب کے
خطوں کا ایک مجموعہ جو اب تک شائع نہیں ہوا، لڑکے میں ملا ہے۔
یہ سب خط مرزا صاحب کے قدر شناس اور عزیز دوست منشی نبی بخش
حقیر کے نام ہیں۔ مرزا صاحب منشی نبی بخش حقیر کی سطن فہمی
اور ذوق کے بہت قائل تھے اور ان سے انہیں خاص تعلق اور خلوص
تھا، جو ان رقعات کے لفظ لفظ سے نمایاں ہے۔ اس بنا پر یہ خطوط
بہت قیمتی قدر ہیں۔

آفاق صاحب نے صرف خطوط کی اشاعت پر بس نہیں کی بلکہ مرزا
صاحب کے بہت سے نجی اور معاشرتی حالات، قلم سے تعلق اور
روزمرہ کی زندگی کی بہت سی باتیں بھی اس مجموعے میں شامل کر دی
ہیں۔ ایک اور اچھا کام یہ کیا کہ ان خطوں میں نیز دوسرے خطوں
میں جن اصحاب اور مقامات کے نام آئے ہیں، ان کے حالات بھی
تلاش کر کے لکھ دیے ہیں۔ بعض خطوں کے سنہ اور تاریخ کی تصحیح
بھی کر دی ہے۔

مرزا غالب پر بہت سی کتابیں اور مضامین لکھے گئے اور ابھی
اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ یہ مجموعہ جسے آفاق صاحب نے
’نادرات غالب‘ کا نام دیا ہے، اس موضوع میں قابل قدر اضافہ ہے۔
اس میں بہت سی ایسی باتیں ملتی ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں

ملیں گی۔ آفاق صاحب نے نہ صرف بہت سے ان غیر مطبوعہ نادر رقعات کو ضائع ہونے سے بچا لیا جو منشی نبی بخش حقیر کے نام ہیں۔ بلکہ انہی طرف سے تلاش و تحقیق کے بعد ایسے حواشی وغیرہ کا اضافہ کیا ہے جن میں بہت سی کار آمد معلومات ہیں۔“

(۸)

خطوط غالب

غالب کے خطوط کا مجموعہ مولانا غلام رسول سہر نے مرتب کیا ہے۔ اور اس مجموعے میں وہ تمام خطوط آگئے ہیں جن کا مرتب کو سراخ مل سکا ہے۔ اس میں صرف وہ خطوط نہیں ہیں جو ’مکتب غالب‘ اور ’نادرات غالب‘ میں شائع ہو چکے ہیں۔

اس مجموعے میں خطوط کو تاریخی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ جن خطوط پر تاریخیں نہیں تھیں، ان کے بارے میں داخلی شہادتوں کی بنا پر فیصلہ کیا گیا ہے کہ وہ کس زمانے کے ہوں گے۔

مولانا سہر نے اس مجموعے میں ان لوگوں کے حالات بھی بڑی محنت سے مرتب کر کے درج کر دیے ہیں، جن کو غالب نے یہ خطوط لکھے تھے۔ ابتدا میں تعارف کے عنوان سے مولانا سہر نے اس مجموعے کی خصوصیات اس طرح بیان کی ہیں :

”اس مجموعے میں میرزا کے وہ تمام خطوط آگئے ہیں، جن کا مرتب کو سراخ مل سکا۔ صرف دو مجموعوں کو چھوڑا گیا۔ ایک مکتب ورام پور کا مجموعہ، دوسرا منشی نبی بخش حقیر کے نام خطوط کا مجموعہ، جو ’نادرات غالب‘ کے نام سے چھپا۔

تمام خطوط تاریخ وار مرتب کر دیے گئے ہیں۔ جن خطوط پر تاریخیں ثبت نہیں تھیں، ان کے بارے میں داخلی شہادتوں کی بنا پر قیاساً فیصلہ کیا گیا کہ وہ کس زمانے کے ہوں گے۔ اغلب ہے اکثر قیاس درست ہوں۔ اگر کہیں لغزش ہوئی تو اسے مرتب کی۔ منشی ناراضا کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔

تمام مکتوب الہم کے حالات لکھ دیے گئے ہیں تا کہ مرزا کے ساتھ ان کے تعلق کی حیثیت واضح ہو جائے اور خطوط ملاحظہ فرماتے وقت وہ حیثیت سامنے رہے۔

خطوط میں جا بجا مقامی اور تاریخی تلمیحات ہیں، جن کی حقیقت مکتوب الہم سے مخفی نہ تھی۔ لیکن عام خواندگان کرام تشریح کے بغیر انہیں سمجھ نہیں سکتے۔ اور خطوط سے بقدر طلب و ذوق لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ مرتب نے حتی الامکان تمام تلمیحات کی تشریح کر دی ہے۔

ابتدا میں مقدمہ لکھا ہے، جس میں انشاءً غالب کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ ان خصوصیات کو مد نظر رکھتے ہوئے خطوط کا مطالعہ یقیناً زیادہ دلچسپی کا باعث ہو گا۔^{۱۱} شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے اس مجموعے کے کئی ایڈیشن شائع کئے ہیں، آخری ایڈیشن چوتھی بار ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا ہے۔

(۹)

تکات و رقعات غالب

یہ مختصر سا مجموعہ میجر لارڈ الٹرکٹر محکمہ تعلیم پنجاب نے مرتب کروایا اور فروری ۱۸۶۷ء میں محمد سعادت علی خان صاحب نے مطبع مراجمی دہلی میں چھپوا کر شائع کیا تھا۔ اس کے سرورق پر یہ عبارت ملتی ہے :

”حسب الحکم میجر فلو صاحب بہادر ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن مالک پنجاب“

یہ دو رسالے نابی بہ نکات غالب و رقعات غالب

تصنیف جناب اسد اللہ خان

محمد سعادت علی خان کے مطبع مراجمی میں طبع ہوئے

اس میں غالب کے دو مختصر رسالے شامل ہیں۔ ایک تو ”تکات غالب“

اس رسالے میں غالب نے فارسی زبان کے قواعد پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ رسالہ اردو زبان میں ہے۔ دوسرے رسالے میں غالب کے چند فارسی خطوط

ہیں جو انہوں نے 'ہنج آہنگ' سے انتظام کیے ہیں ۔
 'نکلت و رقعات غالب' کو غالب کے شاگرد ماسٹر ہمارے لال آدوب
 نے مرتب کیا ہے ۔

(۱۰)

قادر نامہ

اس مختصر سی کتاب کو غالب نے عارف کے بیٹوں باقر علی خان اور
 حسین علی خان کے لیے مرتب کیا تھا۔ یہ رسالہ 'آمد نامہ' اور 'خائق باری'
 کے طور پر لکھا گیا ہے ۔

'قادر نامہ' کا پہلا ایڈیشن مجلس پریس دہلی سے ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) میں
 شائع ہوا تھا ۔ اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں راقم نے
 دیکھا ہے ۔

فارسی

(۱۱)

کلیات غالب

غالب کے فارسی دیوان کا پہلا ایڈیشن ۱۸۳۵ء میں مطبع دارالسلام دہلی میں چھپا تھا۔ اس کے بعد کلیات مکمل صورت میں مطبع نول کشور سے ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا۔ اس کی تفصیل مالک رام نے اپنے ایک مضمون میں پیش کی ہے لکھتے ہیں :

”ہم یہ خیال کرتے ہیں حق یہ جانب ہیں کہ دیوان ستمبر، نومبر ۱۸۳۵ء میں مرتب ہوا۔ دوسری بات یہ کہ اس کا نام ’سیخانہ‘ آرزو سرانجام‘ رکھا گیا تھا۔ بد قسمتی سے قاحال اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ اس وقت تک دیوان کا جو سب سے پرانا مخطوطہ ملا ہے، خدا بخش اورنٹیل لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔ اس کی کتابت کی تاریخ ۱۱ ربیع الآخر ۱۲۵۳ھ (۲۷ جولائی ۱۸۳۸ء) ہے اور اس کے کاتب غالب کے مشہور دوست لائے چھچ مل کھتری ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ مخطوطہ اصل نسخہ سے ’سے خالہ آرزو سرانجام‘ ہی کی نقل ہو۔ پھر حال یہ خطی نسخہ بھی غالب کا دیکھا ہوا ہے اور اس کے حاشیے میں بعض چیزیں خود ان کے قلم سے اضافہ ہوئی ہیں۔

فارسی دیوان پہلی مرتبہ ۱۸۳۵ء میں چھپا۔ جیسا کہ اس کے صفحہ اول پر تحریر ہے۔ یہ نواب ضیاء الدین احمد خان نیر بخشان کی تصحیح و ترتیب ہے۔ مطبع دارالسلام حوض قاضی دہلی میں طبع ہوا تھا۔ یہ بڑے سائیز کے پندرہ سطری مسطر پر لکھا گیا ہے۔ کاتب خوش خط اور بڑی حد تک صحیح نویسی سے غلطی کم کرتا ہے۔ اس کے آغاز اور آخر میں خود غالب کا لکھا ہوا دیباچہ اور تقریب ہے

جو اس وقت بھی دیوان میں ملتی اور پنج آہنگ کے آہنگ چہارم میں بھی شامل ہے۔ دیوان میں نظم و نثر ۵۰۶ صفحات پر محیط ہے۔^{۱۱۱}
 دیوان کا دوسرا ایڈیشن بہت مدت بعد ۱۸۶۳ ع میں شائع ہوا۔ یہ ۵۶۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۱۲)

ابر گہریار

غالب کی یہ تمام منظوی کلمات فارسی میں شامل تھی۔ لیکن ۱۰۸۰ھ مطابق ۱۸۶۳ ع میں حکیم غلام رضا خاں کے اصرار پر علیحدہ چھپوائی۔ یہ منظوی اکمل المطایع دہلی میں مہر فیخرالدین کے ایہام سے چھپی۔ اس کے ساتھ انہوں نے دو قصیدے، تین قطعے اور دس رباعیاں بھی شامل کر دیں۔ بعد میں ان کو ’سبد چین‘ میں بھی شامل کر لیا گیا۔^{۱۱۲}

(۱۳)

سبد چین

’سبد چین‘ میں غالب کا متفرق فارسی کلام ہے۔ یہ مجموعہ سب سے پہلے ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۷ ع میں مجد مرزا خاں کے مطبع مجدی، کوچہ چیلان دہلی میں چھپ کر شائع ہوا۔

۱۹۳۸ ع میں مالک رام صاحب نے اس کا نیا ایڈیشن تیار کیا جو جتید برق پریس دہلی میں چھپا اور مکتبہ جامع دہلی کی طرف سے شائع ہوا۔ مالک رام صاحب لکھتے ہیں: ”پہلے ایڈیشن میں ترقیب کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ اس میں یہ نقص دور کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا مرزا کا بہت سا

۱۔ مالک رام: غالب کی فارسی تصانیف، انکار غالب نمبر ۱۹۶۶

صفحہ ۱۴۰

۲۔ غلام رسول مہر: غالب: صفحہ ۱۶۲

کلام جو ادھر ادھر منتشر حالت میں پڑا تھا وہ بھی اکٹھا کر کے اس میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اس ایڈیشن میں ۸۰ شعر ہیں۔^۱

(۱۴)

ہنج آہنگ

’ہنج آہنگ‘ غالب کی فارسی نثر کا مجموعہ ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن مطبع سلطانی دہلی میں ۱۸۴۹ ع حکیم غلام نجف خاں کے اہتمام سے چھپا۔ یہ ایڈیشن ۹۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن اپریل ۱۸۵۳ ع میں منشی نور الدین احمد لکھنوی کے مطبع دارالسلام دہلی میں چھپ کر تیار ہوا۔ اس ایڈیشن میں ۴۴ صفحات ہیں۔ پہلے ایڈیشن کے مقابلے میں اس ایڈیشن میں دو نثری تقریریں زیادہ ہیں۔ ایک تو دیباچہ ’دیوان رفیعہ نواب حسام الدین احمد خاں دوسرے دیباچہ‘ تذکرہ الموسوم بہ طلسم راز فراہم آوردہ میں مہدی۔

غالب کی زندگی میں ’ہنج آہنگ‘ کے بھی دو ایڈیشن شائع ہوئے

(۱۵)

سہر نیم روز

غالب نے ’سہر نیم روز‘ ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۳ ع) میں مکمل کی اور اس کا پہلا ایڈیشن مرزا فتح الملک غلام فخرالدین عرف مرزا فخر کے مطبع فخر المطابع دہلی سے شائع ہوا۔ یہ ایڈیشن بڑے سائز کے ۱۱۶ صفحات پر مشتمل تھا۔

اس کتاب میں غالب نے خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھی ہے۔ ۱۸۵۰ ع میں جواد شاہ ظفر نے یہ کام ان کے سپرد کیا تھا اور اس لیے وہ قلعے میں بالاعادہ ملازم ہو گئے تھے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ ’ہرتوستان‘ کے نام سے پوری تاریخ دو حصوں میں لکھیں گے۔ پہلے حصے ’سہر نیم روز‘ میں اسیر تیمور سے لے کر ہمایوں تک کے حالات و واقعات کی تفصیل ہوگی۔

۱۔ مالک رام : ذکر غالب : صفحہ ۱۲۷

۲۔ مالک رام : غالب کی فارسی کی تقریریں ، ”انکار“ فروزی

اور دوسرے حصے 'ماہ نیم ماہ' میں جلال الدین اکبر سے لے کر جہاد شاہ ظفر تک کے تاریخی حالات و واقعات کا بیان ہوا۔ بعد میں اس منصوبے میں شاہ وقت کے حکم سے یہ تبدیل ہوئی کہ بجائے امیر تیعور کے آغاز آفرینش سے اس کتاب کو شروع کیا گیا تھا۔ واقعات کو فراہم کرنے کا کام حکیم احسن اللہ خاں کے سپرد کیا گیا تھا۔ غالب ان واقعات کو فارسی کے قالب میں ڈھالنے پر مامور تھے۔ غالب نے پہلا حصہ 'سہر نیم روز' کو مکمل کر لیا، اور وہ چھپ کر شائع بھی ہو گیا لیکن 'ماہ نیم ماہ' کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ کیوں کہ ۱۸۵۷ء میں غدر پڑا، اور وہ بساط الٹ گئی۔ جہاد شاہ اور ان کے خاندان پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹے۔ چنانچہ 'ماہ نیم ماہ' مکمل نہ ہو سکی۔

چونکہ 'سہر نیم روز' میں 'ماہ نیم ماہ' کا ذکر تھا۔ اس لیے لوگ اس کے بارے میں دریافت کرتے رہتے تھے۔

غالب لکھتے ہیں :

"اکثر صاحب اطراف و جوانب سے 'ماہ نیم ماہ' کے بھیجنے کا حکم بھیجتے ہیں اور میں جی میں کہتا ہوں کہ جب 'سہر نیم روز' کی عبارت نہ سمجھتے تو 'ماہ نیم ماہ' کو لے کر کیا کریں گے۔ صاحب ! 'سہر نیم روز' کے دیباچے میں میں نے لکھ دیا ہے کہ اس کتاب کا نام 'ہرتوستان' ہے اور اس کے دو مجلد ہیں۔ پہلی جلد میں ابتداء خلقت عالم سے پہاڑوں بادشاہ تک کی سلطنت کا بیان، پہلے حصے کا نام 'سہر نیم روز' اور دوسرے حصے کا نام 'ماہ نیم ماہ'۔ پہلا حصہ چھاپا گیا۔ جا بجا بھیجا گیا قصہ تھا جلال الدین اکبر کے حالات لکھنے کا کہ امیر بکر تک کا نام و نشان مٹ گیا۔"

(۱۶)

دستبوی

'دستبوی' کا پہلا ایڈیشن منشی پر گویال تفتہ، منشی نبی بخش حاتیر، مرزا حاتم علی بیگ سہر اور منشی شبو نرائن آرام، کی نگرانی میں مطبع

منفرد خلائی آکرہ میں نومبر ۱۸۵۸ء میں چھپا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۸۶۵ء میں لٹریری سوسائٹی روہیلکھنڈ بریلی کے مطبع میں قاضی عبد الجلیل جتوں کے اہتمام سے شائع ہوا۔ تیسرا ایڈیشن اسی مطبع سے ۱۸۷۱ء میں چھپ کر شائع ہوا۔

غالب نے اس کتاب میں اپنے حالات اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی تفصیل لکھی ہے۔ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے انہوں نے اس کو لکھنا شروع کیا اور ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء کو ختم کیا۔

برگواہاں قلمتہ کو لکھتے ہیں :

”میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد سحر اور اپنی سرگزشت یعنی پندرہ سہینے کا حال نثر میں لکھا ہے اور التزام اس کا کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم میں لکھی جانے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ جو نظم اس میں درج ہے وہ بھی بے آمیزش عربی ہے۔ ہاں اشخاص کے نام نوی بدلیے وہ عربی، انگریزی، ہندی، جو ہیں لکھ دے ہیں۔“

’دستنبو‘ کا فارسی متن اور اس کا ترجمہ رسالہ ’اردوئے معلیٰ‘ دہلی (شمارہ ۳-۴) میں بھی شائع ہوا ہے۔

(۱۷)

کلیات نثر غالب

”پنج آہنگ“ کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تھا مگر نیم روز ۱۸۵۴ء میں چھپ نہی، اور ’دستنبو‘ کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۶۵ء میں نکلا تھا۔ یہ کتابیں جلد ہی لاپاب ہو گئیں۔ اس لیے منشی لال کشور نے جنوری ۱۸۶۸ء میں ان تینوں کو ’کلیات نثر غالب‘ کے نام سے شائع کر دیا۔

(۱۸)

قاطع برہان

غالب نے 'قاطع برہان' کو ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۸۶۰ء میں مکمل کیا اور یہ کتاب ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۲ء) میں مطبع نول کشور میں چھپی۔ اب تک روایہ اس کی قیمت مقرر ہوئی۔ اس سے پہلے ایڈیشن میں ۹۸ صفحات تھے۔ آخر میں غالب کی لکھی ہوئی تقریظ بھی شامل تھی۔ اس کی کئی مشہور شاعر امیر اللہ تسلیم نے کی تھی۔ ان کی تاریخ بھی اس ایڈیشن کے آخر میں درج ہے۔

یہ کتاب غالب نے غلو کے بعد لکھی۔ اس زمانے میں ہر طرف خاموشی اور اداسی کا عالم تھا۔ اس زمانے میں انہوں نے وقت گزارنے کے لیے پندرہ تیرہ کی کتاب 'برہان قاطع' کا مطالعہ شروع کیا۔ اس کتاب میں انہیں بے شمار غلطیاں نظر آئیں۔ چنانچہ 'قاطع برہان' کے نام سے ان غلطیوں کو شائع کیا۔

صاحب عالم مارہروی کو لکھتے ہیں :

"اس درمیانگی کے دنوں میں جیسے کی 'برہان قاطع' میرے پاس تھی۔ اس کو میں دیکھا کرتا تھا۔ ہزارہا لغت غلط و ہزارہا بیان لغو، عبارت ہوج، اشارات پا در ہوا۔ میں نے سو دو سو لغت کے اشراط لکھ کر ایک مجموعہ بنایا ہے اور 'قاطع برہان' اس کا نام رکھا ہے۔ چھپوانے کا مقدر نہ تھا۔ مسودہ کاتب سے صاف کروا لیا ہے۔ اگر کہو تو یہ سہیل مستعار بھیج دوں۔ تم اور جودھری صاحب اور جو اور سخن شناس اور منصف ہوں اس کو دیکھیں اور پھر میری کتاب میرے پاس پہنچ جائے۔"

(۱۹)

درلش کاویاتی

'درلش کاویاتی' در اصل 'قاطع برہان' کا دوسرا ایڈیشن ہے جس کو غالب نے کچھ ترمیم اور اضافے کے ساتھ ۱۸۶۵ء میں اکمل المطابع دہلی میں چھپوا کر خود شائع کیا۔ اس ایڈیشن میں کل ۱۵۶ صفحات تھے۔

‘قاطع برہان’ کی اشاعت کے بعد غالب کی مخالفت کا ایک طوفان اٹھا اور مندرجہ ذیل رسالے ان کے جواب میں لکھے گئے :

- ۱۔ ‘عمرق قاطع’ مولفہ مولوی سادات علی - یہ - مطبوعہ ۱۸۶۳ء مع مطبع احمدی عابدیہ دہلی صفحات ۹۶۔
- ۲۔ ‘قاطع برہان’ مولفہ مرزا رحیم بیگ۔
- ۳۔ ‘قاطع القاطع’ مولفہ مولوی امین الدین پشاوروی۔
- ۴۔ ‘سوالہ برہان’ مولوی آغا احمد علی۔

غالب اور ان کے احباب نے ان کے جواب میں مندرجہ ذیل رسالے لکھے :

- ۱۔ ‘ذائقہ ہندیان’ مولفہ نجف علی مطبوعہ اکمل المطابع دہلی ۱۸۶۳ء ۲۸ صفحات۔
 - ۲۔ ‘لطائف غیبی’ ۳۴ صفحات کا یہ رسالہ در حقیقت غالب نے خود لکھا تھا لیکن اپنے دوست سیف الحق میاں داد خان سیاح کے نام سے شائع کیا تھا۔
 - ۳۔ ‘سوالات عبدالکریم’ غالب کا لکھا ہوا رسالہ ضخامت کل ۸ صفحات۔
 - ۴۔ ‘قامہ غالب’ یہ خط غالب نے میرزا رحیم بیگ مصنف ‘قاطع برہان’ کے نام لکھا تھا۔ اگست ۱۸۶۵ء میں چھپا۔ ‘عود ہندی’ میں بھی شامل ہے۔
 - ۵۔ ‘تبع نیز’ غالب کا لکھا ہوا ۳۲ صفحات کا یہ رسالہ اکمل المطابع دہلی میں چھپا۔ اس میں مولوی احمد علی کے اعتراضات کے جواب دیے ہیں۔ یہ رسالہ ۱۸۶۷ء میں شائع ہوا۔
- (۲۰)

گل رعنا

‘گل رعنا’ غالب کے فارسی اور اردو کلام کا انتخاب ہے۔ یہ انتخاب غالب نے کلکتہ کے دوران قیام میں اپنے دوست مولوی میراج الدین احمد کی فرمائش پر کیا تھا۔

مالک رام صاحب اس کے متعلق لکھتے ہیں :

”مولوی سراج الدین احمد کلکتہ کے ہفتہ وار فارسی اخبار ’آئینہ‘ سکندر کے ایڈٹر بھی تھے۔ وہ مرزا کے کلام کے بہت قدر دان تھے۔ چنانچہ انہوں نے فرمائش کی کہ آپ اپنے اردو اور فارسی کلام کا انتخاب میرے لیے تیار کر دیجیے۔ اس پر مرزا نے وہیں کلکتہ میں ۱۸۲۸ء میں ’گل رعنا‘ کے نام سے ایک انتخاب مرتب کیا۔ بد قسمتی سے یہ کتاب ناپید ہو گئی۔ البتہ غالب نے اس کے آغاز و انجام کے لیے جو فارسی نثر لکھی تھیں، وہ محفوظ رہ گئیں اور یہ بھی اس لیے کہ یہ ’ہنچ آہنگ‘ میں شامل کر لی گئی تھیں۔ اس انتخاب کے چند اوراق مولانا حسرت سوبانی مرحوم کے پاس تھے جو ان کی وفات کے بعد ان کے قیمتی کتب خانے کے ساتھ خالص ہو گئے۔ خوش قسمتی دیکھیے کہ ۱۹۵۷ء میں میرے ایک سربراہ دوست نے اچانک اس کا ایک مکمل نسخہ مجھے تحفہ میں دیا۔ میرے علم میں یہ اس کتاب کا واحد نسخہ ہے۔“

مالک رام صاحب نے اس کو دلی سے شائع بھی کر دیا ہے۔ ’گل رعنا‘ کا ایک قیمتی نسخہ حکیم محمد نسی خان صاحب کے کتب خانے میں بھی ہے۔

(۲۱)

الغالب

’الغالب‘ غالب کے فارسی اور اردو کلام کا انتخاب ہے جو انہوں نے نواب غلام آشیان کی فرمائش پر ۱۸۶۶ء میں مرتب کیا۔ اس انتخاب کو امتیاز خان صاحب عرشی نے مقدمے اور حواشی کے ساتھ مطبع قیثمہ بمبئی میں چھپوا کر ۱۹۳۲ء میں شائع کیا۔ بشیر حسین زیدی صاحب ’تقریب‘ کے عنوان سے اس انتخاب کے بارے میں لکھتے ہیں :

”نواب غلام آشیان نے فارسی و اردو کے چہدہ اشعار کی ایک بیاض مرتب فرمانے کے سلسلے میں مرزا اسد اللہ خان غالب سے فرمائش کی کہ اپنے اردو اور فارسی کلام کا انتخاب ارسال کر دیجیے تاکہ اسے شامل بیاض کر لیا جائے۔ ستمبر ۱۹۶۶ء میں، میرزا

۱۔ مالک رام : غالب کی فارسی تصانیف ’انکار غالب‘ نمبر ۶۶

صاحب نے اس ارشاد کی تعمیل کی اور ہجے بعد دیگرے کاپات اردو و فارسی کے خود کردہ انتخابات جداگانہ کتابی صورت میں نقل کرا کے ، نواب علیہ آشیان کے حضور میں ڈاک کے توسط سے پیش کیے ۔

سرکار کے ملاحظے کے بعد ، یہ دونوں نسخے کتاب خانے کو بھیج دیے گئے ۔ اس عہد کے مستظہین کتب خانہ نے ، صرف فارسی انتخاب کو شعبہٴ دوادین میں داخل ہونے کا شرف عطا کیا ، اور رسم زمانہ کے مطابق انتخاب اردو کو ناقابل التفات خیال کر کے ، کتاب خانے کے ’ردی گھر‘ میں گمنامی کی گہری نیند سلا کر مطمئن ہو گئے ۔ حسن اتفاق سے مولوی استیاز علی خان عریض ، ناظم کتاب خانہ نے ’ردی گھر‘ کی متاع کاسد کا جائزہ لیتے ہوئے ، دوسرے نوادرات کے ساتھ اردو انتخاب بھی برآمد کر لیا ، اور میرزا صاحب کی نہی ہوئی زندگی کا یہ کارنامہ ، ملک کے ارباب ذوق کے لیے محفوظ ہو گیا ۔^{۱۴۴}

عرشی صاحب نے اس انتخاب کی تفصیل دیباچے میں لکھی ہے اور اس کی قدر و قیمت کی وضاحت کی ہے ۔ اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں :

”مرزا صاحب نے یہ انتخاب چند روز کے اندر مرتب کیا تھا ۔ عجلت میں ہوں بھی ذہن کی تمام قوتیں کامل اشتراک و ہم آہنگی سے کام نہیں کر سکتیں ۔ میرزا صاحب کے یہاں اس پر مستزاد یہ تھا کہ آئے دن کی بیاریوں سے ان کے قوائے ظاہر و باطن بے حد کمزور و ناتوان ہو گئے تھے ۔ تنگ دستی اور پریشان روزگاری نے طرح طرح کی دماغی الجھنوں میں الگ گرفتار کر دیا تھا ۔ اب انہیں شعر و سخن کی جگہ کافور و کفن کی پڑی رہتی تھی ۔ اور صرف موت کی آس پر ہی رہے تھے ۔ ان حالات میں مستبعد نہیں کہ اچھے برے میں فرق و تمیز کرنے وقت ان سے اچھے شعر نظر انداز ہو گئے ہوں ، اور دو چار معمولی اشعار کو کسی وقتی جذبے کے تحت چن لیا ہو ۔

پہر حال یہ انتخاب بے حد قابل قدر اور غالب سے متعلق ادب میں ایسا نایاب اضافہ ہے جس کی قدر و قیمت میں برابر ترقی ہوتی رہے گی۔“

(۲۲)

مثنوی دعاء صباح

”مثنوی دعاء صباح“ اس دعا کا ترجمہ ہے جو حضرت علیؑ سے منسوب ہے۔ غالب نے اس دعا کا منظوم فارسی ترجمہ اپنے ہوائے عباسی بیگ عشر کی فرمائش پر کیا۔

مالک رام لکھتے ہیں :

”یہ مختصر سا رسالہ ہے۔ اوپر جلی قلم سے عربی عبارت اور اس کے نیچے کسی اور کا کیا ہوا فارسی تتری ترجمہ ہے۔ پھر اس کے نیچے غالب کا منظوم ترجمہ ہے۔ یہ مثنوی مرزا کی زندگی ہی میں مطبع قول کشور میں چھپی نہیں لیکن اس پہلے الیٹن کے نسخے نایاب ہیں۔ میرے علم میں اس کا صرف ایک نسخہ ہے۔ اس میں کل ۲۶ صفحے ہیں۔ ”دعاء صباح“ کے ۱۲۳ شعر پہلے ۲۴ صفحات میں آ گئے ہیں۔ صفحہ ۲۴ پر سات شعر ایک اور دعا کے ہیں جو حضرت زین العابدینؑ سے منسوب ہے اور جس سے متعلق روایت ہے کہ اسے ”دعاء صباح“ کے بعد سجدے میں پڑھنا چاہیے۔“

(۲۳)

متفرقات غالب

”متفرقات غالب“ میں پروایسر حید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب نے غالب کے متفرق کلام کو ایک نادر و نایاب بیاض کو سامنے رکھ کر مرتب کیا اور یہ کتاب ۱۹۴۷ء میں رام پور کے ہندوستان پریس میں چھپ کر شائع ہوئی۔

یہ مجموعہ غالب کے فارسی خطوط، مثنوی باد مخالف اور ایک اور

۱۔ عرشی : دیباچہ انتخاب غالب

۲۔ مالک رام : غالب کی فارسی تصانیف : ”انکار“ غالب کہیں : صفحہ ۱۴۲

مثنوی پر (جو ۱۸۵۳ ع) میں تشیح کے الزام سے برأت کے اظہار کے لیے لکھی گئی تھی، مشتمل ہے۔

مسعود صاحب 'مقدمہ' میں لکھتے ہیں :

"مرزا غالب کے غیر مطبوعہ مکتوبات و منظومات کا یہ مجموعہ جو 'متفرقات غالب' کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے، غالب کے قدر دانوں کے لیے خاصی دلچسپی کا باعث ہو گا۔ اور غالب کے متعلق تحقیق کرنے والوں کے لیے کچھ نیا سواد فراہم کر دے گا۔ اس مجموعے میں جو چیزیں شامل ہیں، ان کے بارے میں کچھ ضروری باتیں ذیل میں بیان کی جاتی ہیں :

میرے کتب خانے میں ایک بیاض ہے جس میں مرزا غالب کے اڑتالیس (۳۸) فارسی خط، دو فارسی قطعے، ایک فارسی مثنوی، اور ایک اردو غزل بھی شامل ہے۔ یہ کل خط ایسے لوگوں کے نام ہیں جو کلکتہ میں مقیم تھے۔ اور یہ سب نظمیں ایسی ہیں جو غالب نے کلکتہ کے قیام کے زمانے میں کہی تھیں۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کسی کلکتہ کے رہنے والے ہی نے یہ تمام چیزیں اس بیاض میں جمع کی ہیں۔ ان میں سے چند نظمیں اور چند خطوط کے اقتباس ایسے ایک مضمون کے سلسلے میں رسالہ "النائر" لکھنؤ کے دسمبر ۱۹۳۸ ع کے پرچے میں شائع کر دیے تھے۔"

'متفرقات غالب' کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں غالب کے غیر مطبوعہ خط ہیں اور دوسرے حصے میں غیر مطبوعہ منظومات۔ خط مولوی سراج الدین احمد، مرزا احمد بیگ خان، ابوالقاسم خان ادارہ جام جہاں نما اور شیخ ناسخ کے نام ہیں۔ منظومات کے حصے میں ایک غزل در توصیف میرزا احمد بیگ خان، طہان و مرزا ابوالقاسم خان قاسم، قطعہ، قاسم بہ غالب، قطعہ، غالب بہ قاسم، قطعہ، حذم در جواب قطعہ، قاسم، مثنوی باد مخالف، ایک سلام اور ایک مثنوی شامل ہیں۔ آخر میں دو ضمیمے ہیں، ضمیمہ الف میں رقعہ "ناطق بنام غالب اور ضمیمہ ب میں جواب مثنوی غالب کو درج کیا گیا ہے۔

۱۔ پروفیسر مید مسعود حسن رضوی ادیب : مقدمہ متفرقات غالب :

مسعود صاحب نے 'مبتذات غالب' پر ایک مقبول مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں غالب کی ان غیر مطبوعہ تحریروں کی اہمیت پر تفصیلی بحث کی ہے ۔

(۲۳)

باغ دودر

'باغ دودر' غالب کی فارسی نظم و نثر کا مجموعہ ہے ۔ اس کا واحد قلمی نسخہ سید وزیرالحسن صاحب عابدی کے پاس محفوظ تھا ۔ اس مجموعہ کو عابدی صاحب نے پہلے اورنٹیل کالج میگزین میں چھاپا اور اب اس کو کتابی صورت میں بھی چھاپ دیا گیا ہے ۔ لیکن یہ کتاب باقاعدگی کے ساتھ ۱۹۷۰ ع میں اورنٹیل کالج کے جشن صد سالہ کے موقع پر شائع کی جائے گی ۔

عابدی صاحب دیباچہ 'اشاعت ثانی میں لکھتے ہیں :

"اس سے پہلے 'باغ دودر' راقم نے مجلہ 'دانش کدہ خاور شناسی' دانش گاہ (یونیورسٹی اورنٹیل کالج میگزین) میں دو قسطوں میں شائع کی تھی ۔ پہلی قسط میں کتاب کا حصہ 'نظم' ۱۹۶۰ میلادی مسیحی میں اور دوسری قسط میں حصہ 'نثر' ۱۹۶۱ میں طبع ہوا تھا ، لیکن تحقیق نامہ 'باغ دو درجو تعلیقات پر مشتمل ہے ۔ اور تیسری قسط کے طور پر چھپنا تھا ، ابھی مطبع کو نہیں دیا گیا تھا کہ کالج کی طرف سے فیصلہ ہوا کہ 'باغ دودر' ادارے کے جشن صد سالہ میں تاسیس (سال ۱۹۷۰ م) کی یاد گار مطبوعات کے سلسلے میں مستقل کتاب کے طور پر شائع کی جائے ۔ چنانچہ تحقیق نامے کو تیسری قسط کے طور پر چھاپنے کے بجائے کتاب کی اس دوسری اشاعت میں شامل کر کے بھی کیا جا رہا ہے ۔"

'باغ دودر' موجودہ صورت میں ۱۳۰ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اصل کتاب ۱۹۸۰ ملحقے پر ختم ہو جاتی ہے ۔ البتہ صفحات میں عابدی صاحب کے

لکھے ہوئے حوالے ہیں۔ صفحہ ۲۹۸ پر خاتمہ کتاب کے تحت مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے :

”آفریدگار مہر و ماہ را سپاس کہ دوس زبان فرخنده تواماں کتاب فیض انتساب سید چین از تصنیف خان والا شان شہنشاہ قلمرو سخن گسٹری ، یکمہ لاز عرصہ“ معنی برووی ’علامہ عصر‘ باقی مہائی نظم و نثر رشک عرفی و فخر طالب نجم الدولہ دبیر الملک احمد اللہ خان غالب رحمۃ اللہ علیہ حسب فرمائش منشی پیرا سنگھ صاحب کھتری ساکن دہلی واقع کوچہ گندی گلی کہ یکمہ از شاگردان حضرت مصنف اند بخط بدخط احقر العباد عنایت علی بتاریخ ہفتم جولائی ۱۸۹۰ ع روز پنجشنبہ صورت اختتام پزیرفت۔“

اور شروع میں مندرجہ ذیل عبارت ہے :

دو دو دار و این باغ آراستہ
درو بند از ہر دو برخاستہ

”بنامیزد سید چین میوۃ را گویند کہ بایان موسم برشاخسار ماند و چون آن را ہیئتہ شاخسار سراسر بے بار ماند ۔ ہر آئینہ آئینہ ہی از الطباع کلیات فارسی گفتہ شد با آئینہ ہنگام فراہم آوردن نگارشی دست ہم نہ دادہ بود اینک در اوراق جداگانہ ضبط کردہ شد و این را سید چین نامیدہ آمد ۔ دائم کہ از فراہم آوردن دہ ہزار بیت کلیات چہ کشود کہ از ہی ایات کہ در شمار بہ ہزار ننواند رسید خواہد گشتود ۔ فاسور کہن را از تراوش گریز نیست ، تا باید زیست سخن باید گفتہ ناچار تا وقفہ ام این مجموعہ“ مقالات پریشان انتہا نہ خواہد پزیرفت ۔ خیانتکہ در علم و عمل تا تمام می گنوم ۔ این نیز نامکام خواہد ماند چون زنجیرۃ نظم کراں پزیرفت ، تا گاہ باران نثری چند آوردند ۔ آن را نیز درس مجموعہ گنجانیدم و باغ دودر نامیدیم ۔ از آن جا کہ سید باغ دودر یک ہزار و دوحصد و ہشتاد و سہ عدد دارد ۔ و از روئے حسن اتفاق با آغاز نگارشی صحیفہ مطابق اثناد ، این نام لطیف دیگر دارد۔“

’باغِ دودر‘ کا پہلا حصہ منظومات پر مشتمل ہے ۔ اس میں قطعات ، ترکیب بند ، ترجیع بند ، مثنویاں ، قصائد ، غزلیات ، فردات اور رباعیات شامل ہیں ۔ دوسرے حصے میں مثنویات کو یک جا کیا گیا ہے ۔ اس میں مختلف نگارشات، خطوط، نامنشی جواہر سنگھ جوہر، رائے جھج مل کھتری ، محمد فضل اللہ ، منشی نبی بخش ، نواب علاؤالدین خان ، جان جا کوہ ، میر ولایت علی ، رجب علی خان ، تفضل حسین خان، ہرگوپال تندرہ بانکے لال ، میر احمد حسین میکشی ، قطب الدولہ شاہ صاحب ، نوروز علی خان، ہیرا سنگھ شامل ہیں ۔

عابدی صاحب نے ان سب پر مقدمہ ، حواشی لکھے ہیں جو کتاب کے آخر میں شامل ہیں ۔

غالب کی شاعرانہ عظمت

غالب ایک عظیم شاعر ہیں۔ ان کی شاعرانہ عظمت کو سب ہی نے تسلیم کیا ہے۔ اردو میں شاید وہ تنہا شاعر ہیں، جن کی شاعری دل نشیں اور دل آویز ہونے کے ساتھ ساتھ خیال انگیز اور فکر خیز بھی ہے۔ وہ دلوں کو لہانی، حواس پر منڈلاتی اور روح پر سرخوشی بن کر چھا جاتی ہے۔ لیکن اس کا شعر بس چہیں پر ختم نہیں ہو جاتا۔ وہ فکر کو اذن پرواز بھی دیتی ہے۔ اس کے ہاتھوں ذہن میں اجالا بھی ہوتا ہے اور وہ ادراک میں تیزی اور شعور میں بیداری بھی پیدا کرتی ہے۔ غالب صرف محسوسات ہی کے شاعر نہیں ہیں، ان کے جہاں غور و فکر اور سوچ بچار کا بھی خاصا سامان ملتا ہے۔ وہ زندگی کو دیکھنا اور بسر کرنا ہی نہیں سکھاتے، اس میں حقیقتوں کی تلاش و جستجو کا دوس بھی دیتے ہیں۔ اور نہ صرف یہ بلکہ ان حقیقتوں کے مختلف پہلوؤں کا ادراک بھی ان کے عیش نظر رہتا ہے۔ وہ بظاہر معمولی سی بات کہتے ہیں، لیکن اس کی تہ میں انسانی زندگی کی کوئی بڑی ہی اہم حقیقت ہوتی ہے۔

بادی النظر میں وہ کوئی بڑا ہی نام نہ نہ تکتہ ہوتا ہے۔ غالب عظیم انسان نہیں ہیں اور عظیم شاعر بھی، عظیم فن کار بھی ہیں اور عظیم مفکر بھی۔ زمانے کے عظیم فیاض بھی ہیں اور تہذیب کے عظیم علم بردار بھی اور ان کی شاعری ان کی عظیم شخصیت کے انہیں پہلوؤں کی ایک نہایت ہی حسین اور دل آویز تصویر ہے۔

اس تصویر میں عظمت کا رنگ بہت نمایاں نظر آتا ہے ۔ وہ بڑی ہی باوقار معلوم ہوتی ہے ۔ وجاہت اس کے ایک ایک انداز سے ٹپکتی ہے ۔ شان و شکوہ اس کے ہر خط سے بھونٹا پڑتا ہے ۔ اس میں جلال بھی ہے ، جلال بھی ۔ وہ ہرکار بھی ہے ، سادہ بھی ۔ اس میں گہرائی بھی ہے ، گہرائی بھی ۔ وسعت بھی ہے ، ہمہ گیری بھی ۔ بلند آہنگی بھی ہے ، آہستہ روی بھی ۔ اس میں بڑا تنوع ہے ۔ بڑی ہی رنگا رنگی ہے ۔ وہ ہشت پہلو رکھتی ہے بلکہ بڑی ہی پہلودار شاعری ہے ۔ وہ آئندہ ہے اور آئندہ بھی دکھائی ہے ۔ ہر شخص اس آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ سکتا ہے ۔ ہر فرد کو اس میں اپنے گرد و پیش کی تصویر نظر آ سکتی ہے ۔ اس کے آہنگ میں اس عہد کے دل کی دھڑکنوں کو سنا جا سکتا ہے ۔ بظاہر وہ محدود ہے کیوں کہ وہ ظرف تنکائے غزل سے باہر نہیں نکلتی ۔ لیکن اس کی وسعتوں کا کوئی ٹھکانا نہیں ۔ اس میں اختصار اور اجمال ضرور ہے لیکن اس کے باوجود اس میں جو غضب کی گہرائی و گہرائی ہے وہ کسی دوسری جگہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتی ۔ ہر چند کہ وہ دشنہ و خنجر اور باد و ساغر سے گہرا ربط رکھتی ہے لیکن اس کی تہ میں ناز و غمزہ کی بات اور مشاہدہ حق کی گنگناہ کو دیکھا اور سنا جا سکتا ہے ۔ وہ بڑی ہی ہرکار شاعری ہے ۔ اس کو دیکھ کر بعض اوقات آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس کی جگمگاہٹ دلوں کو نور اور آنکھوں کو سرور بخشتی ہے ۔ وہ بڑی ہی مریح اور زونکار ہے اور اکثر اس میں ان شبستانوں کا سا ساحل نظر آتا ہے ، جس میں ہر وقت رنگ و نور کی بارشیں ہوتی رہتی ہیں اور جن کی آب و تاب اور چمک دمک میں یہ یک وقت حسن و جلال بھی نظر آتا ہے اور عظمت و جلال بھی !

غالب غزل کے شاعر ہیں ۔ انہوں نے غزل کے بنیادی موضوع حسن و عشق کی حقیقت سے بڑی ہی بھرپور تصویریں کھینچی ہیں ۔ ان کی عظیم شاعری زندگی سے معمور ہے ۔ وہ زندگی آمیز بھی ہے اور زندگی آموز بھی ۔ اسی لیے وہ زندگی سے بیزاری نہیں سکھاتی ۔ بلکہ زندگی کو بسر کرنے کا درس دیتی ہے ۔ اس میں جذبات کی بڑی اہمیت ہے لیکن وہ تمام تر جذباتی نہیں ہے ۔ اس میں روایت کے اثرات ہیں لیکن روایتی ہونے سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں ۔ اس میں ایک فرد کی انفرادی کیفیات کی ترجیح ضرور ہے ۔

لیکن وہ ایک سماجی پس منظر بھی رکھتی ہے ۔ وہ اپنے زمانے کی یہوداوار ہے ۔ اس میں زمانے کے مخصوص حالات کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔ اسی لیے اس کی سماجی اہمیت بھی ہے ۔ وہ ایک تہذیب کی عکاس اور آئینہ دار ہے ۔ اس میں فراری ذہنیت کا احساس نہیں ہوتا ۔ وہ تو بنیادی انسانی جذبات کی عکاسی کرتی ہے ۔ اس سے انسانی زندگی کے جذباتی پہلوؤں کا صحیح اندازہ ہوتا ہے ۔ اس میں بڑی ہی ستھری نفا ہے ۔ وہ بڑی پاک صاف اور شفاف ہے ۔ جیسے کوئلہ و نسیم میں دھل کر نکلی ہو ۔ اس میں تہذیبی چاؤ غالب ہے ۔ وہ بڑی سہج ہے ۔ اس لیے تہذیب کرتی اور سہج بناتی ہے ۔ اس سے دلوں میں تاریکی اور نکاہوں میں اندھیرا نہیں ہوتا ۔ وہ تو زندگی میں شمعیں سی فروزاں کرتی اور دلوں میں دے سے جلاتی ہے ۔ روشنی دینا اور منور کرنا ہر حال میں اس کے بھٹی نظر رہتا ہے ۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ جذباتی زندگی کے شعور کو عام کرتی ہے ۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر سوچنا اور غور کرنا سکھاتی ہے ۔ اس لیے اس کے خالص جذباتی پہلو میں بھی ایک مفکرانہ آہنگ کا احساس ہوتا ہے اور ایک فلسفیانہ زاویہ نظر کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے ۔

یہ عتیقہ شاعری سیدھی سادا اور سہاٹ نہیں ہے ۔ اس میں بیچ و خم ہیں ۔ تشبیہ و فراز ہیں ۔ یہ خاصی چاودار ہے ۔ اس میں تپیں ہیں۔ اس میں رمز و ایما ہے ۔ اشارہ و کنایہ ہے ۔ یہ کچھ نہ کہنے پر بھی نہ جانے کیا کیا کچھ کہتی ہے ۔ اسی لیے اس میں معنوی گہرائی کا احساس بھی ہوتا ہے اور صوری گہرائی بھی نظر آتی ہے ۔ غالب کی عظمت اسی میں ہے کہ عشقہ موضوعات کو پیش کرتے ہوئے وہ عینی رجحانات کا شکار نہیں ہوئے۔ ذہنی الجھنوں نے ان کا راستہ نہیں روکا۔ اسی لیے ان کی صورت مسخ نہیں ہوئی۔ وہ اس وقت کے ایک عام صحت مند انسان کی ذہنی و جذباتی کیفیت کی پوری طرح ترجمانی کرتی ہے ۔ یہ انسان ایک خاص معاشرے کا فرد ہے ۔ چنانچہ اس کی عام حرکات و سکنات اس معاشرے سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ اسی لیے اس کی ایک ایک بات میں اس معاشرے کا عکس نظر آتا ہے ۔ غالب نے اس معاشرے میں آنے والے فرد کی جذباتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنی عتیقہ شاعری میں بے نقاب کیا ہے ۔ یہی سبب ہے کہ غالب کی عشقہ شاعری اپنی ایک مضبوط بنیاد رکھتی ہے ۔ وہ محض خیالی

نہیں ہے۔ اس میں حلیات و واقعت کا خون ہے۔ خلوص و صداقت کی گرمی ہے۔ اس کا اپنا ایک نظام ہے۔ اس کا آغاز حسن پرستی سے ہوتا ہے کہ یہ حسن پرستی الساقی فطرت میں داخل ہے۔ غالب نے اس حسن کو اپنے آس پاس اور گرد و پیش دیکھا ہے۔ وہ اس حسن سے متاثر ہوئے ہیں۔ اس نے ان کے دل کو لہرایا ہے۔ ان کی زندگی میں رنگینی پیدا کی ہے اور اس طرح یہ زندگی ان کے لیے ہلا کی حسین اور یہ دنیا غضب کی دل آویز بن گئی ہے۔ غالب نے اس حسن اور دل آویزی سے زندگی کو ہسر کرنا سیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی ان کے لیے ایک فن بن گئی ہے اور انہوں نے ہمیشہ اس کو ایک فن ہی سمجھا ہے۔ ان کی ساری شاعری میں شروع سے آخر تک اس خیال کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ زندگی کو فن بنانے کی فکر میں سرگرداں دکھائی دیتے ہیں۔ یہ کاوش ان کے یہاں برابر جاری رہتی ہے۔ اسی لیے ان کے یہاں زندگی کے سارے ساتھ اس کا سوز بھی سلا جلا نظر آتا ہے۔ جب انہیں زندگی میں خاطر خواہ حسن نہیں ملتا اور وہ فن بنتی ہوئی نہیں دکھائی دیتی، تو وہ اداس اور غمگین دکھائی دیتے ہیں اور وقتی طور پر روٹھنے کا سا انداز ان کے یہاں پیدا ہوجاتا ہے۔ یہی ان کے غم کی بنیاد ہے۔ انہیں زندگی کو حسین دیکھنے کی کھنا ہے۔ جب یہ کھنا پوری نہیں ہوتی تو وہ اپنے اوپر اداسی طاری کر لیتے ہیں۔ ان کا دل غم کھانے میں بہت بوجھ ہے۔ ان کے لیے مٹے کھانے کے کم ہونے کا رنج بھی بہت زیادہ ہے، بلکہ یہی تو ان کا غم ہے۔ اسی لیے غالب نے حسن کو اتنی اہمیت دی ہے۔ یہ حسن صرف گوشت پوست کے انسانوں ہی میں نہیں ہوتا۔ یہ تو کائنات کی ہر چیز میں ہوتا ہے۔ یہ حسن قول و فعل میں بھی ہے۔ رشتے اور رابطے میں بھی ہے۔ انسان کی کوئی بات بھی اس سے خالی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب زندگی ہسر کرنے کے لیے ایک حسن نظر کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہی خیال ان کی شاعری میں تہذیب کو پیدا کرتا ہے اور اسی سے وہ خود بھی سہمہ بنتی ہے۔ غالب کی زندگی اور فن کا محور بھی حسن اور اس کے مختلف پہلو ہیں۔ یہ حسن غالب کے یہاں کسی ایک چیز تک محدود نہیں۔ اس کا عمل دخل تو زندگی کے مختلف اور متنوع پہلوؤں میں ہے۔ وہ تو انہیں ہر طرف جھایا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی لیے تو وہ حیرانی کے ساتھ اس کو دیکھتے ہیں اور

سوچنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں ؟ اور ان کا غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے ؟ شکن زلف عنبریں کیوں ہے ؟ اور نگہ سرمہ ما کی کیا حقیقت ہے ؟ اور نہ صرف یہ بلکہ یہ خیال بھی ان کے ہاں غور و فکر کی غریبک پیدا کرتا ہے کہ آخر اس کے علاوہ زندگی میں جو حسن ہے وہ کہاں سے آیا ہے ؟ سبز و گل کے حسن کا منبع کیا ہے ؟ ابر کیا چیز ہے ، ہوا کیا ہے ؟ اور یہ سلسلہ کہیں رکنا نہیں ۔ غالب کی شاعری میں انہیں مناظر اور مظاہر کی تلاش و جستجو ہے ۔ اس کا آغاز حیرت سے ہوتا ہے ۔ اور حیرت ہی غور و فکر کی بنیاد ہے ۔ لیکن غالب صرف اس غور و فکر تک ہی اپنے آپ کو محدود نہیں رکھتے ۔ غور و فکر کے ساتھ ساتھ اس سے لطف اندوز ہونے اور اس کے ہاتھوں پیدا ہونے والی مسرتوں سے سینہ بھر لینے کی تمنا بھی ان کے ہاں جاری رہتی ہے ۔ اس صورت حال سے ان کی عظم کو سہارا ملتا ہے اور وہ اس کے لیے ایک ستون بن جاتی ہے ۔ غالب کے عشق کا منبع بھی ہیں حسن اور اس سے پیدا ہونے والی لذت ہے ۔ اس کا وجود حسن سے دلچسپی لینے اور متاثر ہونے کے نتیجے میں ہوتا ہے اور حسن سے یہ دلچسپی انسانی فطرت میں داخل ہے ۔ اس لیے غالب کے نزدیک عشق ایک بنیادی انسانی جذبہ ہے ۔ اس کے بغیر انسان کی تکمیل ممکن نہیں ۔ غالب اسے ایک رشتہ سمجھتے ہیں ۔ ان کے نزدیک وہ ایک تعلق ہے ۔ ایک لگاؤ ہے ۔ ایک نسبت ہے ۔ جس کی نوعیت یہ یک وقت جذباتی بھی ہے ، ذہنی بھی ، جسمانی بھی ہے ، روحانی بھی ۔ لیکن غالب افلاطونی عشق کے قائل نہیں ہیں ۔ طبعاً وہ رومانی ہیں ۔ ان کے عشق میں اس رومانی مزاج کے اثرات بھی ملتے ہیں ۔ لیکن اس کے باوجود وہ عشق کا تمام اثر فحشیل تصور نہیں رکھتے ۔ ان کی شاعری میں نو عشق عام انسانوں کا عشق رہتا ہے ۔ اسی لیے وہ اسے انسانوں کی جذباتی زندگی کا ایک نظام سمجھتے ہیں ۔ خواہش اور جذبہ اس عشق کی بنیاد ہے ۔ انسان اس خواہش کی تکمیل اور اس جذبہ کی تعمیل چاہتا ہے ۔ اس لیے فنی رابطے بنتے اور رشتے قائم ہوتے ہیں ۔ اور انسانی زندگی کے تنبیہ و نرازا انہیں رشتوں اور رابطوں کے گرد گھومتے ہیں ۔ انسان ان کو قائم اور باق رکھنے کے لیے نہ جائے کیا کیا کچھ کرتا ہے ۔ عجب عجب حرکتیں اس سے سرزد ہوتی ہیں ۔ لیکن وہ اس سے دامن نہیں ہٹا سکتا ۔ ہر حال

غالب کے عشق کی نوعیت انسانی ہے ۔ اس کی بنیادیں حقیقت پر استوار ہیں ۔ وہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے ۔ لیکن اس کی تکمیل آسان نہیں ۔ اس کے لیے تو نہ جانے کیا کیا کچھ کرنا پڑتا ہے ۔ نہ جانے کیسے کیسے ہفت خواں طے کرنے پڑتے ہیں ، لب کہیں جا کر وہ رونق ہستی کا باعث بنتا ہے ۔ اس کے بغیر البتہ بے شمع نظر آتی ہے ۔ عشق سے طبیعت کو زیست کا مزا ملتا ہے ۔ وہ اسے درد کی دوا بھی سمجھتے ہیں اور درد لا دوا بھی ۔ لیکن عشق کی آزمائشوں سے گذرنا ان کے نزدیک آسان نہیں ۔ وہ تو اس کو ٹبرد بیشہ سمجھتے ہیں اور اسی لیے ان کے خیال میں وہ طلب گار مرد ہوتا ہے ۔ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تو باب ببرد ہونے کی ضرورت ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو انسان اس کی ایک دھمکی میں مرجھاتا ہے ۔ غالب عشق کا ایک فعال تصور رکھتے ہیں ۔ کیونکہ وہ اس کو زندگی اور اس کی کشمکش سے الگ کر کے نہیں دیکھتے ۔ اسی لیے معاشرتی زندگی، ان کے خیال میں، اس پر اثر انداز ہوتی ہے ۔ وہ معاشرتی زندگی کو متاثر کرتا ہے ۔ حالات ہیں اس کی قدریں متعین کرتے ہیں ۔ ماحول ہی اس کے معیاروں کو بناتا ہے ۔ یہ خیالات غالب کے عشق کو حقیقت سے قریب کرتے ہیں ۔ اس کی حیثیت تمام تر جذباتی ہی نہیں رہتی ۔ وہ بعض غم عشق ہی کو سب کچھ نہیں سمجھتے ، غم حیات کو بھی دیکھتے ہیں ۔ بلکہ بعض چمک تو غم حیات کا خیال ان کے جہاں غم عشق پر غالب آ جاتا ہے ۔ اور غم حیات ایک ایسی چیز ہے کہ محبوب کی وفا سے بھی اس کی تلافی نہیں ہو سکتی ۔ اور پھر عشق غالب کے جہاں صرف دلیاوی معاملات تک محدود نہیں ہے ۔ وہ ایک روحانی حیثیت بھی رکھتا ہے ۔ اس لیے غالب اس کے وجدانی پہلو پر بھی غور کرتے ہیں ۔ اور جہاں سے ان کی شاعری میں عشق کی مفکرانہ تحلیل اور اس کے فلسفیانہ تجزیے کا آغاز ہوتا ہے ۔ غرض غالب کے تصور عشق کی نوعیت انسانی ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کے اظہار میں زندگی کے ان گنت انسانی اور اخلاقی حقائق بے نقاب ہوتے ہیں ۔ غالب کی عظمت اس میں ہے کہ انھوں نے ان سب کو پیش کرنے میں ایک فلسفیانہ آہنگ کو پیش نظر رکھا ہے ۔ اور اس فلسفیانہ آہنگ کے ساتھ ایک انسان کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ۔ جو کچھ وہ دیکھتا ہے ، جو کچھ وہ محسوس کرتا ہے ، جو کچھ سوچتا ہے ، ان سب کی تصویریں غالب کی شاعری میں ملتی ہیں ۔

اس عشقہ شاعری میں اس حقیقت کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ غالب کا مزاج بنیادی طور پر فلسفیانہ ہے ۔ اور یہ فلسفیانہ مزاج کسی حدود کا پابند نہیں ہے ۔ یہ تو پھیل کوئی کران ہوتا چاہتا ہے ۔ اس کی نظر کو ساری زندگی پر ہوتی ہے ۔ وہ تو کل کائنات کو اپنے پیش نظر رکھتا ہے ۔ غالب نے بھی اپنے آپ کو صرف عشق اور اس کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی ہی تک محدود نہیں کیا ہے ۔ انہوں نے عشق کو وسعت ضرور دی ہے ۔ اس کو متنوع معاملات کا حامل ضرور بنایا ہے ۔ لیکن وہ اس دائرے سے باہر بھی نکلے ہیں اور حیات و کائنات کے مختلف مسائل کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے ۔ ان معاملات کی نوعیت ما بعد الطبیعیات ہی ہے ، اخلاقی بھی ۔ نفسانی بھی ہے ، عمرانی بھی ۔ غالب نے ان سب میں فلسفیانہ حقائق کی تلاش و جستجو کی ہے ۔ لیکن اس سلسلے میں انہوں نے جنی باتیں بھی کہیں ہیں ، وہ کسی قد کسی زاویے سے انسان اور انسانی زندگی کو سمجھنے میں معاون ضرور ہوتی ہیں ۔ غالب ان باتوں کو اسی مقصد سے پیش کرتے ہیں ۔ ان میں انسان کی بلندی اور اس کے ارتقا اور تہذیب کا خیال ہوتا ہے ۔ غالب کے نزدیک انسان عظیم ہے ۔ اس کی عظمت کا کوئی ٹھکانا نہیں ۔ یہ دنیا ، یہ زندگی ، یہ ساری کائنات انسان کی ہے ۔ انسان کے لیے ہے ۔ انسان نہ ہو تو اس کی کوئی حیثیت نہیں ۔ ان کو انسان سے الگ کرنے کا خیال غالب کے یہاں سب سے زیادہ نمایاں ہے ۔ لیکن اس کی وضاحت انہوں نے براہ راست نہیں کی ہے ۔ بالواسطہ طور پر اس خیال کو جگہ جگہ واضح کیا ہے ۔ جہاں کہیں بھی وہ انسان کی زبانوں حالی ، اس کی محرومی اور ناکامی کا بیان کرتے ہیں ، وہاں دو حلیت اس کی تھیں میں ہی خیال ہوتا ہے ۔ انسان کی عظمت کا احساس زندگی میں انسان کی محرومی کے خیال کو ابھارنا ہے ۔ غالب کا میلان تصویریت اور عینیت کی طرف ہے ۔ جس وجہ سے کہ وہ انسان کے لیے ایک مثالی ماحول کی تمنا کرتے ہیں ۔ اور جب زندگی میں اس کے لیے یہ ماحول نہیں پیدا ہوتا تو وہ اس کی شکایت کرتے ہیں اور یہ خیال ہر جگہ ان کے یہاں نمایاں ہوتا ہے کہ انسان اس ماحول کے نہ ہونے کے باوجود زندہ رہتا ہے اور اسی میں اس کی عظمت کا راز ہے ۔ زندگی انسان کو جینے نہیں دیتی ۔ زندگی میں وہ جن چیزوں کی تمنا کرتا ہے ، وہ ایسے نصیب نہیں ہوتیں ۔ لیکن اس کے باوجود وہ زندگی سے منہ نہیں

موڑنا۔ بلکہ ان نامازگار حالات میں بھی زندگی بسر کرتا ہے۔ غالب کی فکر میں ان خیالات کی گونج جگہ جگہ سنائی دیتی ہے۔ اور وہ درحقیقت انہیں کی بدولت غفلت ہے ہم کنار ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

غالب کو اپنے مسائل تصوف پر بڑا ناز ہے۔ وہ ان پر بڑا فخر کرتے ہیں اور وہ نخر و ناز ہے جا نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے یہاں تصوف انسان اور انسانیت کی ذہنی اور روحانی تہذیب کے لیے ایک راہ عمل ہے۔ غالب اس تہذیب پر ایمان رکھتے ہیں اور انسانی ارتقا میں ان کے کردہ یک اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لیے اس کا پورا نظام غالب کے یہاں مل جاتا ہے۔ توحید غالب کا ایمان ہے لیکن یہ توحید صرف ذات باری کے بیان تک محدود نہیں۔ وہ تو اس سلسلے میں وحدت الوجود کے تمام پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں اور اس کا مقصد صرف مابعد الطبیعیاتی ہی نہیں ہوتا بلکہ انسان کو بعض حدود کا پابند بنانا ہوتا ہے۔ کہ ان حدود میں رہ کر ہی ذہنی تہذیب ہو سکتی ہے۔ اصل شہود اور شاہد و مشہود کو ایک سمجھنا، ہر حجاب کو بردہ ساز جانا، ایک برقی حسن کے جلوے سے زمین تا آسمان ہر چیز کو سرشار دیکھنا اور اسی طرح کی ان گنت باتیں جو غالب کے یہاں جگہ جگہ ملتی ہیں، درحقیقت ان کی بنیاد انسان کی ذہنی تہذیب ہے۔ اس طرح سوچے بغیر انسانی زندگی کو سمجھا نہیں جا سکتا اور اس کی اصل حقیقت سے اس کو واقفیت نہیں ہو سکتی۔ ان خیالات کے باوجود انسان کی زندگی میں بے راہ روی بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ معیاروں کا خیال اس کی نظروں سے اوجھل بھی ہو سکتا ہے۔ بنیادی انسانی قدریں اس کے یہاں نظر انداز ہو سکتی ہیں۔ ظاہر ہے اس طرح وہ ارتقا کے راستے پر آگے نہیں بڑھ سکتا اور اس کی ذات ایک مثالی نظام حیات کو قائم کرنے میں معاون نہیں ہو سکتی۔

انسان یہ سب کچھ کرتا ہے اور اس کی بدولت اسے زندگی کو بسر کرنے کے آداب آ جاتے ہیں اور وہ اس کو بسر کرتا بھی ہے لیکن اس کے باوجود زندگی بسر کرنے میں اسے خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوتی۔ جو کچھ وہ کرنا چاہتا ہے، نہیں کر سکتا۔ اسی لیے وہ زندگی میں انسان کو اس کی غفلت کے باوجود محسوس محسوس نہیں ہیں۔ قید حیات و بند غم میں انہیں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ انہیں تو وہ دونوں ایک معلوم ہوتے ہیں اور

ان کے خیال میں موت سے پہلے انسان کو اس سے نجات نہیں مل سکتی۔ زندگی میں انہیں موت کا کھٹکا لگا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان کی نگاہیں کارگاہ ہستی میں لالچے کو داغ ساں دیکھتی ہیں اور انہیں وہ محسوس ہوتا ہے کہ خون گرم دہقان ہی در حقیقت برقی حرمن کا ہیولا ہے۔ انہیں خیالات کا یہ اثر ہے کہ غالب انسانی زندگی کو قریب اور عالم کو دام خیال سمجھتے ہیں۔ اور انہیں اس کی کوئی مضبوط بنیاد نظر نہیں آتی۔ لیکن اس کے باوجود وہ زندگی سے سانس نہیں ہیں۔ ان کے جہاں قنوطیت نہیں ہے۔ حزن و یاس سے وہ کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ زندگی کا انداز نظر انہیں غم سے دوچار کرتا ہے۔ وہ اداس ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن زندگی کی مسرتوں سے کنارہ کشی اختیار نہیں کرتے۔ مسرتوں کا خیال ہم ہر صورت ان کے پیش نظر رہتا ہے اور وہ اس خیال کو زندگی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ غالب کے خیال میں وہی انسان عظیم ہے جو ان مسرتوں کو تلاش کرتا ہے۔

یہ خیالات غالب کی شاعری میں بہت نمایاں ہیں۔ ان کو پیش کرنے میں ایک منکرانہ انداز اور فلسفیانہ آہنگ ہے۔ غالب کی بڑائی اس میں ہے کہ انہوں نے ان خیالات کو زندگی سے الگ نہیں کیا ہے۔ وہ انسانی زندگی کو سمجھنے اور بسر کرنے میں مدد و معاون ہوتے ہیں۔ انسانی زندگی سے گہرے لگاؤ ہیں ان کے خیالات کو پیدا کیا ہے۔ اسی لیے ان کی بنیادوں میں استواری نظر آتی ہے۔

غالب کی فکر ماورائی نہیں ہے۔ ان کے خیالات محض مابعدالطبیعیات ہی سے تعلق نہیں رکھتے۔ ان کی نوعیت انسانی ہے اور وہ انسانی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جہاں انسانی نفسیات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ ایک اجتماعی زاویہ نظر سے عمرانی معاملات کی ترجمانی بھی ملتی ہے۔ اپنے زمانے کے تہذیبی اور معاشرتی پہلوؤں کو انہوں نے اپنی غزلوں میں بڑی خوبی سے سمویا ہے۔ ان کی شاعری میں جگہ جگہ ان کی اپنی شکست کی آواز ضرور سنائی دیتی ہے۔ لیکن ایک تہذیب اور ایک نظام معاشرت کی آواز شکست سے بھی اس میں قدم قدم پر دوچار ہونا پڑتا ہے۔ غالب نے ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولی تھی جو انقطاع و زوال سے دو چار تھا۔ جس میں ہر چیز کی

بنیادیں ہل چکی تھیں۔ جس میں زندگی کے تمام شعبے کچھ اکھڑے اکھڑے نظر آتے تھے۔ تہذیب کے آفتاب کو کہیں لگ رہا تھا۔ سیاسی قدروں کے ستارے جھلجھلا رہے تھے۔ معاشرتی معاشی قدروں کی شمعیں بجھ چکی تھیں۔ اس صورت حال نے اجتماعی زندگی میں ایک حشر سا برپا کر رکھا تھا۔ نفسی نفسی کی کیفیت تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آفتاب سوا فیڑے ہو گیا ہے۔ زندگی میں ایک عجیب انتشار تھا۔ افراد ان حالات کے ہاتھوں پریشان تھے۔ انہیں ایک حکومت کے دم توڑ دینے کا بڑا غم تھا۔ ایک تہذیب کے متزلزل ہو جانے کی وجہ سے ان کی آنکھیں پر غم تھیں۔ ان کے دلوں میں آندھیوں کے غبار تھے۔ اور ان کی زندگی ایک ذہنی کرب کے عالم میں گھل رہی تھی۔ غالب نے اس صورت حال کو شدت سے محسوس کیا۔ انہیں غود بھی ان حالات کا غم تھا۔ اسی لیے ان کی آنکھیں بھی پر غم دکھائی دیتی ہیں۔ غالب کے یہاں جو شدید غم ہے اس کی نوعیت بظاہر انفرادی نظر آتی ہے لیکن اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو اس میں اجتماعی رنگ و آہنگ کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ غالب کا سارا غم درحقیقت معاشی معاشرتی انداز کی ناہمواری کی پیداوار ہے۔ اس ناہمواری کا نتیجہ تھا کہ غالب جو کچھ کرنا چاہتے تھے، وہ نہ کر سکے۔ انہوں نے زندگی سے جن چیزوں کا تقاضا کیا، وہ انہیں نہ مل سکیں۔ کیوں کہ حالات اس کے لیے سازگار نہیں تھے۔ ساری زندگی میں انتشار تھا۔ اس انتشار کے عالم میں افراد کی ممتاؤں کے بر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی صورت حال غالب کے دل میں داغ بن گئی ہے۔ اور اس نے ان کی ساری شاعری میں ایک کسک کا سا عالم پیدا کر دیا ہے۔ غالب کی لے یوں تو بڑی جاندار ہے لیکن وہ اسی وجہ سے زخمی معلوم ہوتی ہے۔ اس کو سن کر دل بہر آتا ہے اور آنکھیں پر غم ہو جاتی ہیں۔

اپنے زمانے کے عمرانی معاملات کو غالب نے کھلم کھلا پیش نہیں کیا ہے۔ ان کو پیش کرنے میں ان کی تہ داری، ان کی رمزیت اور ایمائیت اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ لیکن جو شخص ذرا بھی سماجی شعور رکھتا ہے اور جس کو غزل کے مزاج سے تھوڑی سی بھی واقفیت ہے، وہ ان کی شاعری میں اجتماعی معاملات و مسائل کو بخوبی دیکھ سکتا ہے۔ غالب غزل کے مخصوص اشاروں اور کتاہوں میں یہ باتیں کرتے ہیں۔ لیکن اس پردے کے

بجھے معنویت کی جو اصل روح ہے ، اس کو بنیوی دیکھا جا سکتا ہے ۔
 غالب جب دل کے سوزِ نہاں سے چلتے اور اپنے عدم سے بھی برے ہوتے
 کا ذکر کرتے ہیں ، جب ان کے یہاں تباہی اہل دنیا کا شکوہ ہوتا ہے اور وہ
 افسردگی کی آرزو کرتے ہیں ۔ جب ان کی نگاہیں دل سے جگر تک ایک
 ساحل دریائے خون دیکھتی ہیں ۔ حالانکہ اس سے قبل اس رہ گزر میں جلوۂ گل
 بھی گرد نظر آتا تھا ۔ جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ خموشی میں نہاں
 لاکھوں غموں کشتہ آرزوئیں ہیں اور جب انہیں اپنا وجود گورِ غریباں کا
 چراغِ مرده نظر آتا ہے ، جب وہ ہر موسم میں ماتمِ بال و ہر کی صدائیں
 سنتے ہیں ، جب انہیں اپنی اسیری کا احساس ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ کو
 گرفتارِ الفتِ صیاد سمجھتے ہیں ۔ جب ان کی نظریں بادۂ شبانہ کی سرمسیوں
 کو ختم ہوتے ہوئے دیکھتی ہیں ، جب انہیں داغِ فراقِ صحبتِ شب کی
 جلی ہوئی شمعیں خاموش نظر آتی ہیں تو درحقیقت ان کا زاویہٴ نظر اجتماعی
 ہی ہوتا ہے ۔ اور وہ اس اجتماعی زاویہٴ نظر سے اپنے زمانے کے عمرانی حقائق
 کو بے نقاب کرتے ہیں ۔ لیکن غالب ان عمرانی حالات کی حد درجہ ناسازگار
 کیفیت کو محسوس کرنے کے باوجود قنوطیت اور ہاسٹ کا شکار نہیں ہوتے ۔
 زندگی سے روگردانی کا خیال ان کے یہاں پیدا نہیں ہوتا ۔ جولانی
 ان کے یہاں باقی رہتی ہے ۔ انہیں تھک کر بیٹھنا نہیں آتا بلکہ کہیں کہیں
 تو ایک ہلکی سی لٹکار کا سا آہنگ ان کے یہاں نمایاں ہو جاتا ہے ۔ بادۂ شبانہ
 کی سرمسیوں کو ختم ہوتا ہوا دیکھ کر جب وہ لذتِ خوابِ سحر
 سے اٹھتے اور بیدار ہونے کا پیغام دیتے ہیں تو اس خیال کی پوری طرح
 وضاحت ہو جاتی ہے ۔ غالب زندگی کے شاعر ہیں ۔ اس لیے ان حالات کی
 حد درجہ مایوس کن حالت دیکھ کر بھی وہ ان حالات سے مایوس نہیں
 ہوتے بلکہ نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے پر اکساتے ہیں ۔ زندگی اور
 اس کی قدروں کا خیال ہی ان سے یہ سب کچھ کراتا ہے ۔ انسانیت ہی
 انہیں یہ سب کچھ کرنے پر مجبور کرتی ہے ۔ یہاں بھی ایک تو تنکر کا
 پہلو ان کی شاعری میں غالب دکھائی دیتا ہے اور دوسرے ان خیالات کی
 نوعیت انسانی نظر آتی ہے ۔ اور اسی میں غالب کی بڑائی ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ ان خیالات و نظریات نے غالب کو عقلم
 بنانے میں نمایاں حصہ لیا ہے ۔ معنوی گہرائی اور گہرائی ان کی عظمت کی

بنیاد ہے۔ لیکن ان خیالات و نظریات کو جس طرح انہوں نے فن کا روپ دیا ہے ، اور یہ معنویت جس طرح ان کے بیان جہالبائی اقدار سے ہم آہنگ ہوئی ہے ، اس کا بھی ان کو عظیم بدلے میں بڑا ہاتھ ہے ۔ غالب کے یہاں موضوع اور فن ، مواد اور ہئیت کی مکمل ہم آہنگی ملتی ہے ۔ انہوں نے اظہار کے نئے حسلے تلاش کیے ہیں ، فن کو نئی وسعتیں دی ہیں اور حسن و جمال کا ایک نیا عالم پیدا کیا ہے ۔ ان کے اظہار میں اس تہذیب کی روح ہے جس میں انہوں نے آنکھ کھولی اور جس کے سامنے میں ان کا نشو و نما ہوا ۔ ان کا فن اس معاشرے کا عکس ہے جس کے وہ ایک فرد تھے اور انہوں نے جن جہالبائی اقدار کو پیدا کیا ہے ، ان میں اس زندگی کی گرمی اور روشنی ہے جو خود ان کے اندر اور ان کے آس پاس اور گرد و پیش موجود تھی ۔ غالب کے فن میں رجاؤں ہے ، رنگینی ہے ، ولولہ ہے ، حوصلہ ہے ۔ اسی لیے وہ سجا سجاوا نظر آتا ہے اور زندگی کی شعاعیں اس میں سے بھڑکتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں ۔ غالب نے الفاظ سے بڑا کام لیا ہے ۔ الفاظ جس طرح ان کے یہاں زندگی سے بھرپور نظر آتے ہیں ، کسی اور اردو شاعر کے یہاں نظر نہیں آتے ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ غالب کے الفاظ میں معنویت کا بخون ہوتا ہے ، خیال کی گرمی ہوتی ہے ۔ اسی لیے تو وہ جس شاعرانہ حسن کو پیدا کرتے ہیں ، اس کی مثال ساری اردو شاعری کی روایت میں کہیں اور نہیں مل سکتی ۔ غالب نے ان الفاظ سے گل و گلزار کھلائے ہیں اور کچھ اس طرح چمن آرائی کی ہے کہ اس کی شاعری پر ایمان لانا پڑتا ہے ۔ ان الفاظ کو ملا کر جو ترکیبیں وہ تراشتے ہیں وہ ان کے فن میں لٹکاریاں سی کرتی ہیں اور ساتھ ہی ان کی دروہست سے وہ جو ایک صوتی آہنگ پیدا ہوتا ہے اس پر سے ہزار ترنم قربان کیے جا سکتے ہیں ۔ غالب کے یہاں غضب کا ترنم ، موسیقیت اور نغمگی ہے اور اس کا سبب وہ ہے کہ غالب کی فکر ہی مترنم ہے ۔ ان کے خیالات ہی اپنے اندر ایک آہنگ رکھتے ہیں ۔ غالب کی تخیل بلا کی سحر کار ہے ۔ اس لیے وہ تشبیہات و استعارات ، علامات و اشارات کے روپ میں نئی دنیاؤں کو پیدا کرتی ہے ۔ اس کی ہرک تھلک کی وہ بے باقی ہے جو غالب میں بدوجہ اتم موجود تھی ۔ اور جس نے ان کے فن میں رنگا رنگ بھول کھلائے ہیں ۔ غالب کا فن مختلف رنگوں کا مرکب ہے ۔ اس کا پہلا ٹو چنپ و سوز ، تخیل کی

پرواز ، ادراک کی قوت وجدان کے حسن اہد اور نا اہدی کی کشمکش ، جذب و مستی ، شوخی و سنگینی ، فعالی اور جولانی ، طنز و مزاح ، جدت و ندرت اور نازہ خیالی و نازہ کاری سے لیا ہوا ہے ۔ غالب درحقیقت انہیں کا مرکب تھے ۔ اسی لیے ان کا عکس ان کے فن میں بھی نظر آتا ہے ۔ بہر حال اس میں بڑا حسن ہے ، بڑی رنگینی ہے ، بڑی رعنائی ہے ، بڑی ہی لیے دے رہنے والی کیفیت ہے ، بڑا وقار ہے ، بڑا رکھ رکھاؤ ہے ۔ وہ بڑا سہل فن ہے ، وہ ایک عظیم تہذیب اور بڑی باوقار معاشرت کا عکس اور آئینہ دار ہے ۔ غالب کو عظیم بنانے میں اس فنی اور جہالتی پہلو کے بھی کچھ کم حصہ نہیں لیا ہے ۔ ان کو عظیم بنانے اور ان کی شاعری کو عظمت سے ہمکنار کرنے میں اس کا یہ جہالتی پہلو برابر کا شریک ہے ۔

غالب بڑے پہلو دار شاعر ہیں ۔ ان کی شاعری میں بڑا تنوع ہے ۔ بڑی ہی رنگا رنگی ہے ۔ بڑی ہی گہرائی اور گیرائی ہے ۔ وہ صرف جذبات ہی کو متاثر نہیں کرتی ، ذہن پر بھی اس کا گہرا اثر ہوتا ہے ۔ وہ خیال انگیز اور فکر خیز بھی ہے ۔ وہ انسان ، زندگی اور کائنات سے تعلق رکھتی ہے ۔ انہیں کے معاملات و مسائل کو اس نے اپنے دامن میں سمویا ہے ۔ وہ زندگی سے ایذا نہیں کرتی ، اس کو بسر کرنا سکھاتی ہے ۔ وہ کائنات سے دوگردانی کا درس نہیں دیتی ، کائناتی حلیتوں کے ادراک کی طرف متوجہ کرتی ہے ۔ ماحول سے چشم پوشی اس کا مقصد نہیں ۔ وہ تو اس کے مختلف پہلوؤں کا شعور پیدا کرتی ہے ۔ اس میں بڑی زندگی ہے ۔ وہ بڑی ہی ہمہ گیر ہے ۔ اس میں بڑا حسن ہے ، بڑی ہی دلاویزی ہے ۔ اس لیے اس میں عظمت کا احساس ہوتا ہے اور وہ خود غالب کو بھی عظیم بناتی ہے !

غالب کی شاعری
کا
آفاقی پہلو

اس میں شبہ نہیں کہ شاعری ، شاعر کے ذاتی احساسات اور انفرادی تجربات کا آئینہ ہے ۔ لیکن شاعر کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ اپنے ان ذاتی احساسات اور تجربات میں عمومیت کا کچھ ایسا رنگ بھرتا ہے کہ وہ ایک عام انسان کے احساسات اور تجربات کا روپ اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اس طرح اس کا ہر تجربہ انسانی زندگی کی ایک عام حقیقت بن کر سامنے آتا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر آپ اپنی جگہ یہی بن جاتی ہے اور ہر انفرادی خیال اور جذبے کا اطلاقی عام اجتماعی اور انسانی خیال اور جذبے پر پورے لگتا ہے ۔ بڑا شاعر صرف اس گور جنڈات و احساسات ہی تک محدود نہیں رکھتا ، بلکہ اس کو فکر سے ہم آہنگ کر کے انسانی زندگی کے فلسفیانہ اور نفسیاتی حقائق کی تصویر بھی بنا دیتا ہے ۔ یہی شاعری کا آفاقی چلو ہے ۔ اسی چلو کی بدولت شاعری عظمت سے ہم کنار ہوتی ہے اور اس کا تخلیق کرنے والا عظیم شاعر کہلاتا ہے ۔

غالب کی شاعری میں شروع سے آخر تک یہی صورت حال نظر آتی ہے ۔ وہ ایک عظیم شاعر ہیں ۔ ان کی شاعری میں عظمت ہے ۔ اس لیے کہ انہوں نے اس میں جن جنڈات و احساسات کی ترجمانی کی ہے ، ان میں ہر جگہ آفاقی چلو اپنی جھلک دکھاتا ہے ۔ بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں وہ مقامات بھی آتے ہیں ، جہاں یہ آفاقیت اپنے معراج کمال پر نظر آتی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آفاقیت کے اس معراج کمال ہی نے انہیں عظیم بنایا ہے۔ اس آفاقیت ہی کا یہ اثر ہے کہ غالب کی شاعری میں تاثر کا سحر پیدا ہو جاتا ہے اور ان کے اشعار دلوں میں اترتے ہیں

اور روح پر سرخوشی بن کر چھا جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ انسان ان کی شاعری میں اپنے ہی جذبات و احساسات کا ارتعاش سامعوس کرنا ہے اور اس آئینے میں اس کو اپنے ہی انکار و خیالات اور معاشات و مسائل کے غد و غال بے نقاب نظر آتے ہیں۔

یہ شاعری موضوع کے اعتبار سے وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ اس میں تنوع اور رنگا رنگی ہے۔ وہ ظرف تنگنائے غزل میں محدود ہونے کے باوجود اپنے دامن میں کشادگی رکھتی ہے۔ اس میں حسن کی رنگینیاں، محبوب کی رعنائیاں، عاشق کی الم سامانیاں، سب ہی کچھ موجود ہیں۔ غالب کا کال یہ ہے کہ انہوں نے ان موضوعات کے ان گنت پہلوؤں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ محبوب کے بیان حسن میں، اس کی سیرت و شخصیت کی ترجمانی میں، عشق و عاشقی کی بے شمار واردات و کیفیات کے تذکرے میں، زندگی کی سرتوں اور شامعانیوں، مجبوروں اور محرومیوں کی شاعرانہ عکاسی میں، ہر انسان کو اپنی ہی تصویر دکھائی دیتی ہے۔

حسن و جمال اور اس کے مختلف پہلوؤں کا احساس غالب کی شاعری کا ایک اہم موضوع ہے اور ان سب کا بیان انہوں نے بڑے ہی درجے پونے انداز میں کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ حسن و جمال سے دلچسپی غالب کی گہٹی میں بڑی تھی۔ اس دلچسپی کو پیدا کرنے میں ان کی نسلی خصوصیت اور خاندانی مزاج کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ ماحول کے اثرات بھی اس میں شامل تھے۔ کیونکہ جس ماحول میں غالب نے آنکھ کھولی اور جس تہذیبی روایت کے سائے میں ان کا نشو و نما ہوا، اس میں حسن اور حسن پرستی کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ ناسازگار سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات نے اس تہذیبی روایت کی بہت سی دوسری خصوصیات کو پس منظر میں ڈال دیا تھا۔ شجاعت اب صرف تصور میں باقی رہ گئی تھی۔ سپہ گری کا خیال صرف فخر کرنے کے لیے افراد کے دلوں میں پیدا ہو جاتا تھا لیکن احساس حسن اور ذوق جمال کی شمعیں ابھی تک اس تہذیبی روایت کی محرابوں میں فروزاں تھیں۔ اب یہ احساس حسن اور ذوق جمال باعث تسکین ہی نہیں تھا، اس کی حیثیت ایک پناہ گاہ اور وسیلہ فرار کی بھی ہو گئی تھی۔ وہ غم غلط کرنے کا ایک ذریعہ اور سنگین حقائق کو تھوڑی دیر کے لیے فراموش کر دینے کا ایک وسیلہ بھی تھا۔ لیکن بنیادی طور پر

یہ احساس حسن اور ذوقِ جمال، ایک عام انسان کی فطری کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ غالب نے اپنی شاعری میں جہاں حسن اور اس کے متعلقات کی ترجیح کی ہے، وہاں عام انسان کی فطری کیفیت کو ظاہر کیا ہے۔ اور بات ہے کہ اس میں ایک تہذیب کی حسن پرستی بھی اپنی جہلک دکھاتی ہے۔ غالب نے اس حسن اور حسن پرستی پر کیسے کیسے حسین اور دلنویز اشعار کی تخلیق کی ہے :

سادگی و ہرکاری بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آڑا پایا

شب ہوئی بھر انجم رخشندہ کا منظر کھلا
اس نکاح سے کہ گویا بت کدے کا در کھلا
مند نہ کھٹے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے مند پر کھلا

رنگ شکستہ، صبح چار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شکفتن گل پائے ناز کا

بلانے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

کوئی میرے دل سے بوجھے، ترے تیر نیم کش گو
بد خلش کہاں سے ہوئی جو جگر کے ہار ہوتا

جلی اک کوند گئی آنکھوں کے آئے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقریر بھی تھا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم
میں معتاد فتنہ عشر نہ ہوا تھا

جہاں تیرا قتل قدم دیکھتے ہیں
خیابان خیابان ارم دیکھتے ہیں

دل سے مٹا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت ہے ناخن کا جدا ہو جانا

جب وہ جالِ دل فروز، صورتِ سحرِ نیمِ روز
آپ ہی ہو تظارہ سوز، پردے میں منہ چھپائے کیوں

دیکھو تو دل فریبیؔ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ بارِ بھی کیا گلی کتر گئی

دل ہوائے خرامِ ناز ہے بھر
عشرِ حنائی کے قراری ہے

حالِ جیسے کڑی کہاں کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

ساقِ ہم جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطربِ ہم نغمہ ریزنِ تمکین و ہوش ہے
پا شب کو دھکھکنے تھے کہ ہر گوشہٴ بساط
داسانِ باغبان و کفِ گلِ فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقِ و ذوقِ صدائے چنگ
ہم چشتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے

نہ شعلے میں یہ کرشمہ، نہ برقی میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تندِ خو کیا ہے

مانگے ہے بھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہِ رخِ ہم پریشان کیے ہوئے
چاہے ہے بھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرے سے تیز دشنہٴ مڑگاں کیے ہوئے
اک نو بہارِ ناز کو ناکے ہے بھر نگاہ
چہرہٴ فروغِ مے سے گلستانِ کیے ہوئے

بظاہر یہ اشعار غالب کے ذاتی اور انفرادی تجربات سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں ان کا ذاتی رد عمل بھی نمایاں نظر آتا ہے لیکن ان میں جو باتیں کہی گئی ہیں، ان کا اطلاق ہر انسان پر ہو سکتا ہے۔ ان تجربات میں ہر انسان کو اپنے ہی تجربات کی جھلک نظر آتی ہے۔

غالب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان تجربات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ ہر شخص کو اپنے تجربات معلوم ہوتے ہیں اور ان میں اپنے مخصوص انداز بیان سے یہ کیفیت پیدا کر دی ہے کہ وہ دل میں اثر جاتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ تو میرے ہی دل کی بات ہے۔ غالب کے جاں اس سلسلے میں ایک جدت اور اچھولا پن ہے، جو دلوں میں اپنی جگہ بناتا ہے۔ اس میں التهاب کی کیفیت ہے، جو حواس کے غاروں میں ارتعاش کی سی کیفیت پیدا کرتی ہے اور ان تمام باتوں سے مجموعی طور پر ان کے اس قسم کے اشعار میں ایک آفاق رنگ و آہنگ پیدا ہو جاتا ہے۔

حسن اور حسن پرستی کے ساتھ غالب کی شاعری میں عشق و عاشقی کے معاملات اور واردات و کیفیات کی ترجیحی بھی ملتی ہے اور حسن پرستی کے موضوعات کے مطالعے میں عشق و عاشقی کے موضوعات کچھ زیادہ ہی نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان معاملات اور واردات و کیفیات میں غالب نے بڑا تنوع پیدا کیا ہے۔ وہ بہت وسیع اور ہمہ گیر ہیں۔ کیونکہ ان میں انسانی زندگی کے رنگا رنگ تجربات کی تصویریں ملی ہیں۔ ان تصویروں میں حقیقت پسندی کا رنگ بہت گہرا ہے۔ ان میں روایت سے تھوڑا سا انحراف ضرور ملتا ہے۔ جذبے کے ساتھ شعور کی ہم آہنگی بھی نظر آتی ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود غالب نے ان کو اس طرح شاعری کے سانچے میں ڈھالا ہے کہ وہ ان کے انفرادی معاملات اور جذبات و احساسات ہوتے ہوئے بھی عام انسانوں کے جذبات و احساسات معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان میں رومان حقیقت کے ساتھ اور جذبہ شعور کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ غالب نے ان کو اس طرح شاعری کے سانچے میں ڈھالا ہے کہ وہ ان کے انفرادی معاملات اور جذبات و احساسات ہوتے ہوئے بھی عام انسانوں کے معاملات اور جذبات و احساسات

معلوم ہوئے ہیں اور ان میں انسانی زندگی کے نفسیاتی حقائق کی صحیح تصویریں نظر آتی ہیں۔ یہ اشعار ان کی شاعری کے اسی رجحان کے صحیح ترجمان اور عکاس ہیں :

عشق سے طبیعت نے زیست کا سزا پایا
درد کی دوا ہائی ، درد ہے دوا پایا

دل میں ذوقِ وصل و یاد ہار تک باقی نہیں
آگ اس گھر کو لگی ابھی کہ جو تھا جل گیا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں
وہ ستم گر مرے مرنے پہ ابھی راضی نہ ہوا

وائے دیوانگیؔ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیران ہونا
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود ہشیاں کا ہشیاں ہونا

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائیں گے کیا

کوئی میرے دل سے ہوجھے، ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی ، جو جگر کے ہار ہوتا

غم فراق میں تکلیف سیر کل مت دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

گو میں رہا رہیں ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

درد دل لکھوں کہوں کر، جاؤں ان کو دکھلاؤں
انکلیاں لٹکار اپنی ، خامہ خوں چمکی اپنا

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہارا بھی تو آخر زور چلنا ہے گریباں پر

میں اور صد ہزار نوائے چگر خراش
تو اور ایک وہ نہ تنہا کد کیا کہوں

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پہوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل! تیرا ہی سنگ آستان کیوں ہو

رہے اس شوخ سے آزدہ ہم چندے تکلف سے
تکلف ہر طرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

عشی مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رنگ آ جائے
میں اے دیکھوں پہلا کب مجھ سے دیکھا جائے
گرچہ ہے طرز تغافل پردہ دار راز عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

جی ڈھونڈنا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیشے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

یہ اشعار عشق و عاشقی کے مختلف پہلوؤں کی تصویریں پیش کرتے
ہیں۔ ان میں ایک خاص مزاج، ایک خاص افتاد طبع، ایک خاص زاویہ نظر،
ایک خاص تہذیبی فضا اور ایک خاص معاشرتی ماحول کے اثرات بہت نمایاں
ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ان میں ایسے جذبات و احساسات کی
ترجائی ہے، جو تمام سالوں میں مشترک ہیں۔ جو ازل سے ہیں اور جو
ابد تک رہیں گے۔ ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عشق انسان کا بنیادی جذبہ
ہے اور اس جذبے کے زیر اثر جو کیفیات اس پر طاری ہوتی ہیں، وہ بالکل

فطری ہیں۔ ہر انسان کو ان منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہی ان کا آفاق پہلو ہے اور غالب نے اس قسم کے اشعار میں اسی آفاق پہلو کو نمایاں کیا ہے۔

عشق اور اس کی واردات و کیفیات بھی عجیب عجیب صورتیں اختیار کرتی ہیں۔ کبھی تو انسان اس راہ پر چل کر اس کی لذتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے اور مسرتوں سے اپنے سینے کو بھر لیتا ہے۔ لیکن کبھی یہ مسرتیں اسے نصیب ہی نہیں ہوئیں اور اس راہ کی ہر منزل اس کے لیے رنج و غم کا سامان پیدا کرتی ہے۔ انسانی زندگی میں یہ دواؤں پہلو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ملے جلے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ہر مسرت پر غم کا سایہ ہوتا ہے۔ ہر شادمانی بالآخر المیائی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ عشق کی رنگینوں اور رعنائیوں کا خاتمہ محرومیوں اور نا کامیوں پر ہوتا ہے اور ان رنگینوں اور رعنائیوں کے پائپوں پیدا ہونے والی مسرتیں اور شادمانیاں، مصائب و آلام میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں ذوق وصل و یاد ہر تک باقی نہیں رہتی۔ وہ اندوہ و نا اہلی سے اپنے آپ کو جھڑانا چاہتا ہے لیکن اس کا محبوب ستم گر اس پر راضی نہیں ہوتا۔ پھر بھی محبوب سے محبت اور اُس سے لطف اندوز ہونے کی آرزو ہر حال اس کے دل میں باقی رہتی ہے۔ وہ اس کے کوچے میں جاتا ہے، رہ گھر پر بیٹھتا ہے لیکن خواہش پوری نہیں ہوتی اور آرزو کی تکمیل کا سامان پیدا نہیں ہوتا۔ وہ زمانے کے ستم بھی اٹھاتا ہے۔ نامازگار حالات بھی اس کے راسخے میں حائل ہوتے اور سامان ستم بنتے ہیں۔ وہ رہیں ستم پائے روزگار رہتا ہے۔ لیکن محبوب کے خیال سے پھر بھی غافل نہیں رہتا۔ اسی عالم میں وقت گزرتا جاتا ہے۔ رخصتی عمر کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے اور وہ وقت کے ساتھ ساتھ فنا کے قریب ہوتا جاتا ہے۔ بالآخر شعلہ عشق سپہ بوش ہو جاتا ہے، تنہا کی شمع بجھ جاتی ہے، آرزو کا چراغ گل ہو جاتا ہے۔ یہی انسانی زندگی کا انجام ہے۔ یہی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ کسی انسان کو ان حالات سے مفر نہیں۔

غالب عشق و عاشقی کے معاملات اور واردات و کیفیات کی ترجمانی میں انسانی زندگی کے انہیں حقائق کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ غالب نے عشق و عاشقی کے مختلف پہلوؤں پر اپنی شاعری میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ اس میں شبہ نہیں، کہ آپ اپنی بے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن غالب کی انسان دوستی، انسانیت پرستی اور افاقیت پسندی نے ان سب میں ایک جگہ اپنی کا رنگ و آہنگ ضرور پیدا کر دیا ہے۔ وہ جب اپنی بات کرتے ہیں اور اپنے انفرادی جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں، تو اس میں ایسی باتیں زیادہ ہوتی ہیں، جو تمام انسانوں میں مشترک ہیں۔ غالب کے ایسے ہی اشعار میں ان کا انسانی شعور اپنے شباب پر نظر آتا ہے اور نفسیاتی ژوف اپنی اپنے معراج کمال پر دکھائی دیتی ہے۔

غالب کے اس انسانی شعور اور نفسیاتی ژوف اپنی نے ان کی شاعری میں ایسے موضوعات کو بھی جگہ دی ہے، جو حیات و کائنات کے بنیادی معاملات و مسائل کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور ان کی شاعری میں ان موضوعات کو نمایاں جگہ حاصل ہے۔ اور یہی موضوعات ہیں، جن کی بدولت ان کی شاعری عظمت سے ہمکنار نظر آتی ہے۔ حسن و عشق کے معاملات و مسائل کو بھی، وہ حیات و کائنات کے معاملات و مسائل سے الگ کر کے نہیں دیکھتے۔ بلکہ ان کو انہیں مسائل کا حصہ سمجھتے ہیں اور انسانی زندگی کے بنیادی معاملات و مسائل سمجھ کر ان کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر ان کی نگاہ تعمیر و تحسین اس حقیقت کی بھی جستجو کرتی ہے کہ خود زندگی کیا ہے؟ اس زندگی میں انسان کی کیا حیثیت ہے؟ وہ زندگی کے تقاضوں کو کس حد تک پورا کرتا ہے؟ اور پھر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ زندگی بے ثبات ہے۔ اس کی حیثیت خواب و خیال سے زیادہ نہیں۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ وہ عظیم ہے اور اس کی عظمت کا راز اس میں ہے کہ وہ زندگی کے اس احساس بے ثباتی کے باوجود اس کو بسر کرتا ہے اور اس کو برتنے میں ہیش ہیش رہتا ہے۔ اس سلسلے میں اپنی ذات کا احساس اور خودی کا خیال اس کے لیے سبب راہ ثابت ہوتا ہے اور وہ اسی کی روشنی میں ناسازگار حالات کی تاریکیوں کو چیرتا ہوا زندگی کے راسخے پر آگے کی طرف بڑھتا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود زندگی کے تجربات اس کو قدم قدم پر یہ احساس دلاتے ہیں کہ وہ مجبور محض ہے اور اس کو خود اپنا وجود ان حالات کا شکوہ سنج نظر آتا ہے۔

اسی لیے غالب کی نگاہ دور رس زندگی میں غم کو دیکھتی ہے اور وہ قید حیات اور بند غم کو لازم و ملزوم سمجھنے کے لیے بھروسہ ہو جاتے ہیں۔ خواہش و آرزو اس غم میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ ہزاروں خواہشیں ایسی ہوتی ہیں کہ ہر خواہش پر اس کا دم ٹکلتا ہے۔ لیکن اس زندگی میں یہ خواہشیں بھلا کب تکمیل سے ہمکنار ہوتی ہیں۔ یہ صورت حال تو انسان کو خود اپنا نوحہ خواہ بنا دیتی ہے اور وہ داغ حسرت پستی لیے ہوئے ایک شمع کشتہ کی طرح اس زندگی سے رخصت ہونا ہے۔ انسان کی بڑائی اس میں ہے کہ ان تمام حالات کے باوجود زیست کرنے کی شمع اس کے دل میں فروزاں رہتی ہے اور وہ زندہ رہنے کی جد و جہد کرتا ہے۔ ہر انسان کو زندگی کے سفر میں ان منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ غالب نے ان بنیادی انسانی حقائق کی ترجمانی بڑے ہی منکراۓ انداز میں کی ہے۔ یہ اشعار ان کے اس قسم کے افکار و خیالات کو پوری طرح عیاں کرتے ہیں :

نقشِ لریادی ہے کس کی شوخیؔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن پر بیکر تصویر کا

غنجہ بھر لگا کھلنے؄ آج ہم نے اپنا دل
خون کیا ہوا دیکھا؄ گم کیا ہوا پایا

دل میں ذوق وصل و یاد ہار تک باقی نہیں
آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا؄ جل گیا
میں ہوں اور افسردگی کی آرزو؄ غالب! کہ دل
دیکھ کر طرزِ تباہ اہل دنیا؄ جل گیا

ہوئے گل؄ نالہ؄ دل؄ دود جراثیمِ محفل؄
جو نری ہزم سے نکلا سو پریشان نکلا

نہا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے یسٹر بھی مرا رنگ زرد لہا
دل تا جگر کہ ساحل درہائے غوں ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل؄ آگے گرد تھا

دہر میں نقشِ وفا ، وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا
کس سے ، بھروسے ، قسمت کی شکایت کیجئے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

کیا آئینہ خائے کا وہ نقشہ ، تیرے جلوے نے
کرے جو ہر تو خورشید ، عالم شہنشاہ کا
مری تعمیر میں مضمحل ہے اک صورت خرابی کی
ہولنی برفِ خرمن کا ہے ، خون گرم دھقان کا
نظر میں ہے بہاری جادو راہ فنا غالب !
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

یہ نہ تھی بہاری قسمت کہ وصال یار ہونا
اگر اور جینے دے ، ہیں انتظار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے ، یہ کہاں بھی کہ دل ہے
غم عشق اگر نہ ہوتا ، غم روزگار ہوتا

بلندی میں بھی وہ آزاد و خود ہیں کہ ہم
اٹنے بھر آئے ، در کعبہ اگر وا نہ ہوا

میں اور بزم سے ہے ہوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی تو یہ ساقی کو کیا ہوا تھا

ہوں مدت کہ غالب مر گیا ، ہر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ 'ہوں ہوتا تو کیا ہوتا ؟'

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ہرے ہوتا کاش کے ، مکان اپنا
ہم کہاں کے داتا تھے ؟ کس ہنر میں پکتا تھے ؟
سب سب ہوا غالب ! دشمن آسمان اپنا

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان
ہو رہے کا کچھ نہ کچھ گہرائی کیا

نہ گل نغمہ ہوں، نہ پردہ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

ایک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمی، یزم ہے اک رقص شرر ہونے تک
غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

نغمہ ہائے غم کو ہی اے دل غایت جانے
بے صدا ہو جانے کا یہ ساز ہستی ایک دن

ہی کہ دشوار ہے ہر کام کا آسان ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ نہاں ہو گئیں
ریخ سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے ریخ
مشکایں اتنی پڑیں بھہر کہ آسان ہو گئیں

قید حیات و بند غم، اصل میں دونوں ایک ہی
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پانے کیوں

ہے آدمی بجائے خود اک بھتر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

خیال مرگ کب لے سکیں دل آزرہ کو ہنسنے
مرے دام کتنا میں ہے اک صید زبوں وہ بھی

میں "عشرت کی خواہش ساقی" گردوں سے کہا کیجئے
لیجئے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگون وہ بھی

غزاق کیا ؟ فصل کل کہتے ہیں کس کو ؟ کوئی موسم ہو،
وہی ہم ہیں ، نفس ہے اور ماتم ہال و پر کا ہے

عمر ہر چند کہ ہے برق غرام
دل کے خون کرنے کی فرصت ہی صبی

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر ابھی کم نکلے
ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد ہانے کی
وہ ہم سے ابھی زیادہ حسد، تیغ ستم نکلے

ان اشعار میں جو جذبات و احساسات اور افکار و خیالات پیش کئے گئے ہیں ، ان کا تعلق کسی نہ کسی طرح انسانی زندگی کے بنیادی حقائق سے ہے ۔ ازل سے انسان ان حقائق سے دوچار ہے ۔ زندگی کے سفر میں قدم قدم پر ایسی منزلیں آتی ہیں ، جب اس کو ان حقائق کا احساس ہوتا ہے کہ یہ زندگی بے اساس اور اس زندگی میں اس کی بستی بے ثبات ہے ۔ اس کا وجود ہی فنا کی دلیل ہے ۔ زندگی ایک کرب مسلسل ہے اور وہ اس کرب مسلسل میں زندگی کے دن گزارتا ہے ۔ اس زندگی میں ہر چیز موت کی طرف دوڑ رہی ہے ۔ ہر خوشی پر غم کا سایہ منڈلا رہا ہے ۔ اس لیے خوشی اگر انسان کو حاصل بھی ہو جائے ، تب بھی وہ اس سے خاطر خواہ لطف اندوز نہیں ہو سکتا ۔ تغیر کا احساس اور فنا کا خیال ہر لمحہ اس کو زندگی کی بے ثباتی کا احساس دلاتا رہتا ہے ۔ کائنات کی ایک ایک چیز میں اس کو یہی بے ثباتی نظر آتی ہے اور وہ اس کو دیکھ کر اپنے دل و جگر کو خون کرتا رہتا ہے ۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود جینے ، زندہ رہنے ، زندگی کو برتنے اور بسر کرنے کی خواہش اس کے جہاں کم نہیں ہوتی ۔ اس لیے وہ ان حالات میں بھی ولولوں اور حوصلوں کی شمعوں کو فروزاں رکھتا ہے اور اسی میں اس کی بڑائی ہے ۔ غالب نے انہیں حقائق پر مختلف زاویوں سے ان اشعار میں روشنی ڈالی ہے اور ان موضوعات نے ان کی شاعری کے آفاقی رنگ و آہنگ کو اپنی انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے ۔

غالب کی شاعری کے بنیادی موضوعات حسن و عشق اور حیات و کائنات کے معاملات و مسائل ہیں۔ انہوں نے اُن سب کو خالص انسانی زاویہٴ نظر سے دیکھا ہے اور ان سب کی ترجمانی میں اُن کے یہاں انسان دوستی کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر انسان کو غالب کے پیش کیے ہوئے یہ مسائل اپنے مسائل معلوم ہوتے ہیں اور وہ ہر جگہ ان معاملات و مسائل کے پردے میں اپنی ہی تصویر دیکھتا ہے۔ اور یہی ان کے کلام کا آفاق پہلو ہے !

غالب کی شاعری
کے
نئے زاویے

غالب کے یہاں ایک انقلابی کی روح اور ایک باغی کا مزاج تھا ۔
 یہ اور بات ہے کہ وہ عملی زندگی میں کوئی انقلاب اور بغاوت نہ کر سکے ۔
 لیکن جہاں تک شعر و ادب کی دنیا کا تعلق ہے ، وہ اس میں ایک بہت بڑے
 انقلابی اور باغی نظر آتے ہیں ۔ ان کی بہت شکنی میلان بہت نمایاں ملتا ہے ۔ انہوں
 نے روایت پرست ہونے کے باوجود روایت کے بہت سے بت توڑے ہیں اور
 رسم و رواج کے بہت سے سوسنائوں کو ڈھابا ہے ۔ لیکن اس کی تہ میں ان
 کے یہاں ایک نعمیہ رجحان کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے ۔ وہ نئی دنیاؤں
 کو تعمیر کرنے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔ انہوں نے بہت سے بنوں کو
 توڑا ہے ۔ لیکن بے شمار حسین بنوں کو بنایا بھی ہے ، اور اس اعتبار سے ان کی
 شاعری میں ایک نئی دنیا نظر آتی ہے ۔ وہ نئی ہے ۔ اس میں نئے حالات کی
 عکاسی ہے ۔ نئے ماحول کی ترجمانی ہے ۔ نئے احساس و شعور کی تصویر کشی
 ہے ۔ اس میں ایک نئے ذہن کا پرتو صاف نظر آتا ہے ۔ اسی لیے وہ ذہن
 میں نئی تحریک پیدا کرتی ہے ۔ اس کو صحیح طور پر سمجھنا اور اس سے اثر
 قبول کرنا آسان نہیں ہے ۔ اس کے لیے ایک نئے ذہن کی ضرورت ہے ۔ یہ
 نیا ذہن بغیر ایک ذہنی قرینیت کے پیدا نہیں ہو سکتا ۔ یہ ذہنی قرینیت
 کلام غالب کے ان گنت زاویوں کو سامنے لا کر کھڑا کر دیتی ہے ۔ اور
 نہ نئے زاویے ان کے کلام کو بہت ہی وسیع و ہمہ گیر اور اڑا ہی پہلو دار
 بنا دیتے ہیں ۔ یہاں تک کہ وہ ایک ناہید اکثر سمندر نظر آنے لگتا ہے ۔

اردو شعراء کے دیوان عام طور پر حمد و نعت سے شروع ہوتے ہیں۔ لیکن 'دیوان غالب' کا آغاز حمد و نعت سے نہیں ہوتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ غالب توحید پر ایمان نہیں رکھتے تھے یا یہ کہ عشق رسول سے انہیں کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ بہت بڑے موجد تھے۔ ان کے عشق رسول سے سرشار ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے دیوان کو شکوہ و فریاد سے شروع کرتے ہیں اور یہ شکوہ ان کا ذاتی شکوہ نہیں ہے۔ یہ فریاد ان کی اپنی فریاد نہیں ہے۔ اس شکوہ و فریاد میں تو انسانیت کی لے نمایاں ہے اور اس انسانیت کی لے میں شکوہ و فریاد ہے۔ غالب اس خیال کو زندگی کی سب سے بڑی حقیقت سمجھتے ہیں۔ ان کی آنکھ انسان کو گھاٹل دیکھتی ہے۔ انسانیت انہیں زخموں سے چور نظر آتی ہے۔ اس اعتبار سے وہ بڑی ہی مظلوم مخلوق ہے۔ انسان مجبور محسوس ہے۔ وہ کچھ کر نہیں سکتا۔ حالات کے سامنے اس کی پیش نہیں جاتی۔ وہ پیدا ہوتا ہے اس لیے کہ اسے مرنا ہے اور مرنے سے چلے بھی اسے نہ جانے کتنی بار موت آتی ہے۔ ہر لمحے اس کو موت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کی زندگی ایک مستقل کرب کے عالم میں گزرتی ہے۔ مسرت کے لمحے اس کو بس برائے نام ہی نصیب ہوتے ہیں اور ہر مسرت ایک غم کا پیغام ہوتی ہے۔ وہ اسی کشمکش میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کی زندگی کے ایک ایک چالو سے لے بھی ٹپکتی ہے۔ ایک ایک بات سے لے ثباتی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ فطرت کی بڑی ہی حسین تخلیق ہے لیکن اس کی ہستی کا خمیر بے بسی اور بے ثباتی سے اٹھا ہے۔ اس لیے وہ اس فطرت کی شکوہ منج ہے، جس کے ہاتھوں اس کی تخلیق ہوئی ہے۔ غالب نے اسی حقیقت کو اپنے اس شعر میں پیش کیا ہے :

لفظ قریادی ہے کس کی شوخی، تحریر کا

کاغذی ہے پیریں پر بیکر تصویر کا

غالب اس حقیقت کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اسی لیے یہ نقش انہوں نے فطرت کی شوخی، تحریر کا قریادی نظر آتا ہے۔ یہاں انہوں نے فن کار کی چابک دستی کی داد بھی دی ہے۔ اس تخلیقی عمل میں جو دل کشی اور دل آویزی ہے، اس کو سراہا بھی ہے۔ لیکن یہ نقش انہیں غالی نظر آتا ہے اور یہ ان کے نزدیک فطرت کی سب سے بڑی صنم نظریں ہے۔ نقش کبھی غالی نہیں ہوتا۔

فن کے شاہکار میں تو ابدیت ہوتی ہے ۔ وہ تو ہمیشہ ہمیشہ باقی رہتا ہے ۔ لیکن یہ کہسی عجیب بات ہے کہ زندگی اور فطرت کا سب بڑا فنی شاہکار یعنی انسان فانی ہے ۔ انسان کو خود اس حقیقت کا احساس ہے ۔ اسی لیے تو اس کا وجود کاغذی نظر آتا ہے ۔ کاغذی سے غالب کی مراد بے ثباتی بھی ہے ۔ لیکن اس میں اس کے فریادی ہونے کی طرف بھی ایک بہت واضح اشارہ ہے کیونکہ ایک زمانے میں ایران کی سرزمین پر یہ رواج عام تھا کہ فریادی کو کاغذ کے کبڑے چٹانے جاتے تھے ۔ انسان کے بے ثبات وجود کا خیال آئے ہی یہ سارا منظر غالب کے ذہن پر منڈلانے لگتا ہے ۔ ایک پہلی سی کوندلی ہے اور یہ شعر تخلیق ہوتا ہے ۔ اس کی معنویت انسانی زندگی کی ایک نہایت ہی اہم اور بنیادی حقیقت کو اپنے دامن میں رکھتی ہے ۔ غالب اس حقیقت کو سمجھتے ہیں لیکن اس کو سمجھنے کے باوجود ذہنی طور پر اس سے مطابقت پیدا نہیں کر پاتے ۔ اس لیے اس حقیقت کا احساس ایک دکھ کی سی کیفیت ان پر طاری کر دیتا ہے ۔ وہ اس پر کڑھتے ہیں ۔ یہی سبب ہے کہ ان کی لے فریادی ہو جاتی ہے اور اس فریادی لے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو ہر نقش فریادی اور ہر پیکر تصویر کا پرہین کاغذی نظر آنے لگتا ہے ۔ اس معنویت کے شدید احساس نے غالب سے یہاں نقش فریادی ، شوخی ، تحریر ، پرہین کاغذی اور پیکر تصویر کے نئے اشاروں کی تخلیق کرائی ہے ، اور ان سب نے اس کو جہالباقی اعتبار سے چار چاند لگا دیے ہیں ۔

غالب کی انقلاب پسندی یہاں موضوع اور فن دونوں میں نمایاں ہے ۔ ایک بے چین روح ہی کو اس مضمون کا خیال پیدا ہو سکتا ہے اور اس کے ہاتھوں ان نئے اشاروں اور کتابوں میں اس کی وضاحت ہو سکتی ہے ۔ کلام غالب میں یہ اشارے اور کتابے بڑی اہمیت رکھتے ہیں ۔ جہالباقی اقدار کو پیدا کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے ۔ یہاں بھی سارا کھیل اشاروں اور کتابوں ہی کا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کی بدولت خود معنویت میں نئی جان بڑ گئی ہے ۔

اردو شعراء نے ننہائی اور ہجر و فراق کے مضمون کو طرح طرح سے باندھا ہے ۔ اسی لیے اردو کی شعری روایت میں یہ مضمون خاصا ہمال ہے ۔ اس میں کوئی نئی بات پیدا کرنا خاصا مشکل کام ہے ۔ لیکن غالب نے اپنے دیوان کی پہلی غزل کے دوسرے شعر میں نئی بات پیدا کی ہے ۔ یہاں ان کے

بیش نظر تنہائی اور ہجر و فراق کی تکلیف کا بیان ہے ۔ یہ بیان انہوں نے کیا ہے اور بظاہر صرف اتنی سی بات کہی ہے کہ تنہائی کی رات کاٹنا بڑا ہی مشکل کام ہے ۔ اس شام کی صبح نہیں ہوتی ۔ بڑے بڑوں کو جب اس سے سابقہ پڑتا ہے او وہ خون نہونکنے لگتے ہیں ۔ ان کی حالت غیر ہو جاتی ہے اور ہزاروں جتن کرنے کے باوجود بھی یہ رات ان سے کاٹے نہیں کٹتی ۔ اس مختصر ، سادہ اور ہامال مضمون کو غالب نے اپنے اس شعر میں پیش کیا ہے :

کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا ، لانا ہے جوئے شیر کا

لیکن چند پہلو اس میں ایسے نمایاں ہیں ، جن کی بدولت یہ شعر بہت بلند ہو گیا ہے ۔ ان پہلوؤں میں سب سے زیادہ توجہ طلب تو اس کی چھپی ہوئی اور نہ در نہہ معنویت ہے ، جو اس کو نہایت ہی وسیع اور پرمکیر بناتی ہے ۔ اور دوسرے اس کا مخصوص جاہلیاتی اظہار ، جو اس معنویت کو نئی زندگی سے ہمکنار کرتا ہے ۔ بظاہر تو اس میں تنہائی کی سخت جانی کا ذکر ہے ۔ لیکن غالب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جو تکلیفیں عاشق کو ہجر و فراق کے عالم میں الہائی (بڑی) ہیں ، ان کا بیان نہیں کیا جا سکتا ۔ یہ تکلیفیں اتنا طویل کھینچتی ہیں اور ان کا سلسلہ اس قدر دراز ہوتا ہے کہ یہ رات کبھی کبھی ہی نہیں ۔ بے چارا عاشق سر سر کے جیتا ہے اور بالآخر اس کو جان بحق تسلیم ہونا پڑتا ہے ۔ لیکن غالب ایسی سیدھی سادی بات نہیں کرتے ۔ وہ بڑے پہلودار شاعر ہیں ۔ بظاہر ان کے شعر میں جو معنویت نظر آتی ہے ، اس کی نہہ میں کچھ اور ہی ہوتا ہے ۔ کون جانے کہ یہاں تنہائی کی سخت جانہاں اس عام انسان کی سخت جانہاں ہیں ، جو انسانیت اور انسانی زندگی کی علامت ہے ۔ جس کا نفس کسی کی شوخی تحریر کا فریادی ہے اور جس کا پیراہن غالب کو کاغذی نظر آتا ہے ۔ غالب بڑے پہلو دار شاعر ہیں ۔ ان کی بات سیدھی سادی ہونے کی بجائے نہہ در نہہ ہوتی ہے ۔ وہ استعاروں ، اشاروں اور کنایوں میں باتیں کرتے ہیں ۔ مشاہدہ حق کی کلنگو بادہ و ساغر میں اور ناز و غمزے کی بات دشمن و خنجر میں کرنا ان کا مخصوص انداز ہے ۔ اس پہلو کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو یہ

بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ اس شعر میں غالب نے ، جہاں تک پرمایہ بیان کا تعلق ہے ، استعارے کا استعمال کیا ہے اور اس پردے میں اسی خیال کی وضاحت کی ہے کہ دلیا میں انسان کی زندگی ایک مستقل تنہائی اور ایک مسلسل ہجر و فراق ہے ۔ تنہائی اور ہجر و فراق کی یہ شب تار اس سے کاٹے نہیں کتنی ۔ اس پر وار ہوئے رہتے ہیں ۔ وہ زخم کھاتا رہتا ہے اور ان زخموں کی تکلیف کبھی کم نہیں ہوتی ۔ ان کے مسلسل ہونے کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ غرض وہ اسی عالم میں زندگی کی رات کو گزارتا ہے ۔ لیکن یہ رات گذرتی نہیں ۔ تکلیفوں کی وجہ سے اس کا کھاجا منہ کو آتا ہے ۔ وقت گزارنے کی تمام تدبیریں ناکام ہو جاتی ہیں اور بالآخر وہ جان چاں آگریں کے سرد کر دیتا ہے ۔ یہی انسانی زندگی کا انجام ہے ۔ انسانی زندگی جو ایک مستقل سخت جانی اور ایک مسلسل کرب کی داستان ہے انسان کا سب سے بڑا محبوب مسرت کا خیال اور نشاط کا احساس ہے ۔ وہ زندگی پر جان دیتا ہے ۔ ان دونوں کو حاصل کرنے ہی میں اس کی زندگی گذرتی ہے ۔ لیکن اس کی یہ تمنا پوری نہیں ہوتی اور ساری زندگی اس پر ایک ہجر و فراق کا عالم طاری رہتا ہے ۔ تنہائی کسی حال میں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی ۔ یہ تنہائی تو درحقیقت وہ محرومی ہے ، جس سے انسانی زندگی عبارت ہے ۔ یہ محرومی فریاد کی زندگی میں بھی تھی ، جس نے شعریں کو حاصل کرنے کے لیے جوئے شیر کو نکالنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا ۔

غالب نے جہاں سخت جانی ہائے تنہائی کے استعارے میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ دیا ہے ، انسانی زندگی کے نہ جانے کتنے معاملات و مسائل کی تصویر کھینچ دی ہے اور نہ جانے کتنے ٹھوس اور سنگین حقائق بے نقاب کر دیے ہیں ۔ شام کو صبح کرنے کے لیے جوئے شیر کی مثال دے کر نہ صرف یہ کہ غالب نے جہاں بالکل ایک نیا شاعرانہ پیکر تراشا ہے بلکہ انسانی زندگی کی ایک اہم حقیقت کی وضاحت بھی کر دی ہے ۔ اسی لیے جہاں معنویت اور حسن کا امتزاج اپنے شباب پر نظر آتا ہے ۔ موضوع اور فن کی تکمیل اور ہم آہنگی کی معراج اسی کو کہتے ہیں ۔

اور پھر آگے چل کر غالب نے عاشق کے جذبہٴ بے اختیار شوق کا

ذکر کیا ہے جس سے شمشیر بھی متاثر ہوتی ہے اور جذبہٴ عشق کی بے اختیاری کو دیکھ کر اس کا بھی شوق فراوان جوش میں آ جاتا ہے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قتل کرنے کے لیے ایک والہانہ انداز میں آگے بڑھتی ہے۔ عاشق کے قتل ہونے اور اس کو قتل کرنے میں مزہ آتا ہے اور اس طرح کاروبار شوق کی تکمیل ہوتی ہے ۔ یہ دونوں یہاں ایک بڑے مقصد کے لیے سرگرم کار ہیں ۔ ان دونوں کے سامنے ایک عظیم نصب العین ہے اور یہ مقصد اور نصب العین ہے، عشق کی آخری منزل نکل رسانی اور کاروبار شوق کے بلند ترین مقامات کا حصول ۔ اس صورت حال کے بغیر عشق بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے ۔ غالب کے یہاں عشق سارے باندھے کی چیز نہیں ہے ۔ وہ ایک اندرونی خواہش اور دلی جذبہ ہے ، جس میں عاشق کو ایک روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے ۔ اس میں جان دینے کو وہ اپنی زندگی کی معراج سمجھتا ہے ۔ محبوب اس کام میں کسی طرح بچھے نہیں رہتا ، بلکہ برابر کا شریک ہوتا ہے ۔ عاشق کے دل میں اس کے ہاتھوں قتل ہونے کی آرزو بیدار ہوتی ہے تو وہ اس آرزو کو بورا کرنے کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ جی اس کا مقصد ہے ۔ غالب نے اس خیال کی تصویر کشی بڑے ہی دل سواہ لیتے والے انداز میں کی ہے :

جذبہٴ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے

سینہٴ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

جذبہٴ بے اختیار شوق یہاں محبت کرنے والے کے والہانہ جذب و شوق کو واضح کرتا ہے ۔ شمشیر محبوب کی علامت ہے اور سینہٴ شمشیر سے دم کا باہر آنا ، اس کیفیت کی عکاسی ہے، جو محبوب کے دل میں عاشق کے جذبہٴ بے اختیار شوق کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہے ۔ یہ ایک بڑا ہی مکمل اور بھرپور خیال ہے ۔ لیکن غالب کی نظر اتنی سطحی نہیں تھی ۔ وہ اپنے آپ کو صرف اسی خیال تک محدود نہیں کر سکتے تھے ۔ درحقیقت اس شعر میں بھی جو معنویت ہے، وہ پچھلے دو شعروں ہی کی معنویت کا تسلسل ہے ۔ غالب یہاں بھی جذبہٴ بے اختیار شوق ، شمشیر اور سینہٴ شمشیر کے استعاروں میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انسان اپنے اندر ایک والہانہ شوق اور جذبہ رکھتا ہے ، اسی کا نام زندگی ہے ۔ انسانیت کی تمام ترقی اسی جذب و شوق سے عبارت ہے ۔ انسانیت کی تکمیل اس کے بغیر خواب و

خیال ہے ۔ نصب العین اور مقصد اس کے بغیر اپنے آپ کو کہاں نہیں کرتے ۔ بلکہ انسان میں جذب و شوق نہ ہو تو وہ اس سے گریزاں رہتے ہیں ۔ لیکن اگر انسان کے جذب صادق کا انہیں یقین ہو جائے ، تو وہ اس کو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور اس سے ہم آغوش ہونے کی کما خود ان کے دل میں موجیں مارتے لگتی ہے ۔ انسانی زندگی کا ارتقا اسی طرح عمل میں آتا ہے ۔ اس کی ترقی بھی صورت اختیار کرتی ہے ۔

غالب کے اس شعر کو اگر اس انداز سے دیکھا جائے تو اس میں معنویت کا ایک نیا زاویہ پیدا ہوتا ہے اور اس معنویت سے شعر کی حیثیت بہت بلند ہو جاتی ہے ۔ بلکہ فنی اور خیالی اعتبار سے بھی اس میں ایک ترقی نظر آنے لگتا ہے ۔ کیونکہ یہ نیا زاویہ جذبہ بے اختیار شوق کو صرف سیدہ شمشیر ہی نہیں رہنے دیتا ۔ بلکہ یہ سب غلاموں اور اشاروں کا روپ اختیار کر لیتے ہیں اور اس طرح ان کا وجود بڑی اہمیت اختیار کر لیتا ہے ۔ کیونکہ وہ یہ یک وقت نئی معنویت کو بھی پیدا کرتے ہیں اور نئی خیالیاتی اقدار بھی ان کے ہاتھوں روکنا ہوتی ہیں ۔

اس کے بعد جو شعر اس غزل میں آتا ہے ، وہ بظاہر معنوی اعتبار سے بہتہ تمام اشعار سے الگ معلوم ہوتا ہے ۔ غالب اس شعر میں تو بظاہر یہ کہتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ عقل چاہے جتنے بھی جتن کرے لیکن دنیا میری بات کو سمجھ نہیں سکتی ۔ اس کے پاس جتنے بھی جال ہیں ، وہ سب بچھا شے جالیں لیکن میری گفتگو اتنی بلند ہے اور میرا عالم تقریر اس قدر ارفع ہے کہ وہ میری گفتگو اور تقریر کے عطا کو اسیر نہیں کر سکتی ۔ مطلب بظاہر یہ ہے کہ غالب کی بات کا سمجھنا آسان نہیں ۔ دنیا جہاں کے علوم اور ان علوم کے سامنے میں پرورش پانے والی عقل ، اس کے اسرار و رموز تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی ۔ غالب نے بظاہر اسی خیال کو سامنے رکھا ہے :

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بیہائے

مدعا عفا ہے اپنے عالم تقریر کا

لیکن اگر غالب اور ان کے فن کے مخصوص مزاج کو دیکھا جائے ،

تو اس میں کچھ معنویت پیدا ہوتی ہے اور اس معنویت میں بھی اس سے قبل کے اشعار میں پیش کی جانے والی معنویت کا تسلسل نظر آتا ہے ۔ دراصل

غالب یہاں بھی یہی کہنا چاہتے ہیں کہ انسان ایک عجیب و غریب مخلوق ہے ۔ اس کو سمجھنا آسان بات نہیں ہے ۔ وہ جو کچھ کہتا ہے ، جس خیال کا اظہار کرتا ہے ، اس میں بے شمار عوامل اور محرکات کا خون ہوتا ہے ۔ اس لیے اس کی باتوں کا سمجھنا علم اور عقل کے بس کی بات نہیں ۔ انسانوں کی باتوں میں احساس، جذبے، ادراک اور شعور کی تہہ در تہہ کیفیات ہوتی ہیں ۔ ان تہوں کو بھلا کون کھول سکتا ہے ؟ اس لیے ترقی کی اتنی منزلیں طے کر لینے کے باوجود کوئی بھی انسان کو پوری طرح سمجھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا ۔

غالب نے اس شعر میں بظاہر اپنی بات کہہ کر انسان کی بلندی کو واضح کیا ہے ۔ اور دام شنیدن اور عطا کے اشاروں سے کام لے کر اس میں نہ صرف معنوی وسعت اور بلندی پیدا کی ہے بلکہ انداز بیان کو حسن و جمال سے بھی معمور کر دیا ہے ۔

غزل کے آخری شعر میں غالب نے بظاہر عالم وحشت کی تصویر کھینچی ہے ۔ یہ عشق کی ایسی منزل ہے جہاں پہنچ کر عاشق کو کسی طرح چین نہیں ملتا ۔ امیری اس کا مقدر بن جاتی ہے لیکن وہ ہر لمحے آتش زہر پا رہتا ہے اور یہ کیفیت زنجیروں کو بے کار کر دیتی ہے ۔ اس کے حلقے موئے آتش دیدہ ہو کر بے کار ہو جاتے ہیں ۔ عشق کی وحشت ہر صورت اپنا کام کرتی رہتی ہے ۔ اس کی گرسی کی تاب بھلا کون لا سکتا ہے :

اس کہ ہوں غالب امیری میں بھی آتش زہر پا

موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

لیکن کون جانے کہ غالب نے اس میں امیری ، آتش زہر پا ، موئے آتش دیدہ اور زنجیر کے اشاروں میں اس کے علاوہ اور کیا کیا کچھ کہا ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ امیر خود وہ انسان ہو جس کا تذکرہ انہوں نے اس غزل کے پہلے شعر میں کیا تھا ۔ اس کی امیری اس منزل کی علامت ہو ، جس پر انسان کسی خاص نصب العین کو حاصل کرنے کی غرض سے پہنچنا چاہتا ہے اور اس کے آتش زہر پا ہونے والی کیفیت وہ قوت ازادی ہو، جس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا ۔ جس کے سامنے زنجیریں کٹ کر گر جاتی ہیں اور اس کا ہر حلقہ ایک موئے آتش دیدہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ اور یہ معلومیت بعد از قیاس نہیں ہے ۔ کیوں کہ غالب اپنے اس مخصوص

انداز میں کچھ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ ان کی شاعری اس قسم کے خیالات سے ابھری اڑی ہے ۔

یہ معنویت نہ صرف یہ کہ بلند اور عظیم ہے بلکہ اس سے شعر کا حسن بھی دوبالا ہو جاتا ہے ۔ اس معنویت کے ہاتھوں غالب کے اس شعر میں ایک اڑی ہی تہ دار میں علامتی فضا پیدا ہوتی ہے ، جس سے اس کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے ۔

غرض یہ کہ غالب کا کلام اپنے دامن میں معنویت اور ان دونوں کے کچھ ایسے نئے زاویے رکھتا ہے ، جن میں ان کی انسان دوستی اور انقلاب پسندی کی تصویر ابھری ہوئی نظر آتی ہے ۔

غالب
کی

شاعری میں
شوخی اور شگفتگی
کے عناصر

غالب ایک بڑی ہی رنگین ، ایک بڑی ہی ہرکار اور ایک بڑی ہی پہلو دار شخصیت رکھتے تھے۔ زمانے نے انہیں ہر تو ان کو خود اپنی شکست کی آواز بنا دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان میں گلی نقہ ، اور ہر دہ ساز ، ہونے والی خصوصیت موجود تھی۔ اردو میں ان کی سی باغ و بہار شخصیت کا شاعر کوئی اور پیدا نہیں ہوا۔ ویسے یہ بہت بڑا دعویٰ ہے کہوں کہ سودا ، انشا اور اکبر کے بے شاعر بھی اردو میں پیدا ہوئے ہیں ، جن کی بنیاد ہی شوخی اور شگفتگی پر ہے۔ لیکن غالب کی شخصیت میں جو بات تھی ، وہ ان شعراء میں بھی نہیں ہے۔ غالب کی طبیعت میں جو رچاؤ اور ان کے مزاج میں جو ہرکاری تھی ، اس سے سودا ، انشا اور اکبر محروم تھے۔ ان سب کے یہاں شوخی ضرور ہے لیکن ان کی شوخی کی تہہ میں کسی سے الجھنے ، کسی سے لڑنے ، کسی کی نفی کرنے کا ہاتھ ضرور کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ غالب کے یہاں یہ الجھنے والی بات نہیں تھی۔ وہ ہر چیز سے محفوظ ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ہر بات ان کے یہاں لطیف احساس کو بیدار کرتی تھی۔ وہ غلط باتوں پر بھی ہنسکرا سکتے تھے۔ منجندہ معاصرت پر بھی ان کی طبیعت رواں ہوسکتی تھی۔ اور یہ سب کچھ کرشمہ تھا مزاج کی اس خصوصیت کا جسے عام طور پر احساس مزاج یا (Sense of Humour) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ غالب کی شخصیت میں یہ خصوصیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور یہ اسی کا اثر ہے کہ ان کی شخصیت میں شوخی کا وہ رچاؤ ملتا ہے جس نے ان کی شاعری میں گلی کارہاں کی ہیں اور اسے زعفران زار بنا دیا ہے۔

ہوں تو ان کی شخصیت میں غم بھی ہے لیکن اس غم نے ان کے چہان
 لازمی نہیں پیدا کی ۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ اس غم کے باوجود زندگی
 سے دل چسپی لے سکتے ہیں ۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر ہنس سکتے ہیں ۔
 مسکرا سکتے ہیں ۔ انہیں رونا نہیں آتا ، وہ روتے میں بھی ہنستے ہیں ۔
 انہیں ہنسنے پر رونا نہیں آتا ، روتے پر ہنستا ضرور آتا ہے ۔ اور ان کی
 شخصیت کی یہ خصوصیت بڑی حد تک اس معاشرتی ، تہذیبی اور فکری ماحول
 کی بھی پیدا کردہ ہے ، جس میں انہوں نے آنکھ کھولی اور جس میں ان کے
 ذوق و شعور کا نشو و نما ہوا ۔ غالب نے اس رچی ہوئی تہذیب کے دور
 آخر کو دیکھا ، جس کو مغلوں نے کئی صدیوں میں پیدا کیا تھا ۔ ان کے
 زمانے میں یہ تہذیب انحطاط پھر ضرور تھی لیکن اس کی ہمتی سے انکار نہیں
 کیا جا سکتا ۔ اس ہمتی نے اس زمانے کے افراد میں خود اعتمادی پیدا کی
 اور انہیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا ۔ اس زمانے کی نیم مٹھلی
 اور نیم سیاسی تحریکوں نے افراد کے دلوں میں ولولوں کے چراغ روشن کیے ،
 امنگوں کی شمعیں فروزاں کیں اور اس کا نتیجہ ایک عام جولانی کی صورت
 میں رونما ہوا ۔ غالب کی شخصیت اسی صورت حال کی ترجمان ، عکاس ،
 بلکہ علم بردار ہے ۔ اور ان کے کلام میں شوخی کی جو چاندنی سی چھائی
 ہوئی نظر آتی ہے ، اس میں اس صورت حال کا بڑا ہاتھ ہے ۔

غالب کے مزاج کی یہ شوخی سب سے زیادہ ان کی شاعری پر اثر انداز
 ہوئی ہے ۔ اس شوخی نے اس میں زندگی اور جولانی پیدا کی ہے ، جدت اور
 انج پیدا کی ہے رنگینی اور ہرکاری پیدا کی ہے ، اور ان سب نے مل کر
 اس کو ایک اچھا خاصا نگار خانہ بنا دیا ہے ۔ ایک ایسا نگار خانہ ، جہاں
 ہر تصویر اپنے رنگوں کی شوخی اور اپنے خطوط کے بانکپن سے چھائی جاتی
 ہے ۔ غالب کی شوخی نے ان تصویروں کو زندگی سے اس طرح ہم آہنگ
 کیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک سہ سے بولتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ۔

یہ شوخی غالب کی شاعری کا کوئی ایک پہلو نہیں ہے ۔ ان کی شاعری
 کے ہر پہلو میں یہ شوخی ہے ۔ اور غالب کی شاعری کسی ایک پہلو سے
 عبارت ہی نہیں ہے ۔ اس میں بڑا تنوع ہے ۔ بڑی رنگا رنگی ہے ۔ بڑی
 وسعت ہے ۔ بڑی ہمہ گیری ہے ۔ لیکن اس تنوع ، رنگا رنگی ، وسعت اور
 ہمہ گیری میں شوخی کا عنصر ضرور نمایاں نظر آتا ہے ۔ انہوں نے حسن و

عشق کے معاملات اور واردات و کیفیات کی تصویر کشی بھی کی ہے اور اس کے ان گنت پہلوؤں کو اپنی غزلوں کا موضوع بنایا ہے ۔ تصوف کے مسائل اور فلسفے کے نکات بھی انہوں نے اپنی غزلوں میں پیش کیے ہیں ۔ عمرانی اور مذہبی معاملات کے اسرار و رموز کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ لیکن ان سب کے بیان میں ان کی طبیعت کی شوخی عجیب عجیب زاویوں سے اپنے آپ کو رونما کرتی رہی ہے ۔ یہ بہ ذات خود ہی اہم نہیں ہے ۔ اس اعتبار سے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ اس نے ان کی شاعری میں ایک نئی فضا ، ایک نیا انداز اور ایک نیا آہنگ پیدا کر دیا ہے اور اس طرح ان کی غزلوں میں معنوی اور فنی اعتبار سے ایک نئی زندگی کی لہر س دوڑا دی ہے ۔

غزل کی شاعری سوز و گداز کی شاعری ہے ۔ وہ شوخی کو گوارا نہیں کرتی ۔ لیکن غالب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس شوخی کو غزل کے لیے گوارا بنا دیا ہے اور وہ ان کی غزلوں کا ایک لازمی جزو نظر آتی ہے ۔ اس شوخی کا پتہ ان کے یہاں حسن کے بیان میں بھی چلتا ہے ، محبوب اور محبت کرنے والے کے جو روابط ہیں اور ان کے نتیجے میں جو حالات پیدا ہوتے ہیں ، ان میں بھی اس کی چھلک نظر آتی ہے ۔ عشق اور کاروبار شوق کی جو تفصیل انہوں نے پیش کی ہے ، اس میں بھی اس شوخی کا عنصر کار فرما دکھائی دیتا ہے ۔ اس عشق کے جو نتائج نکلتے ہیں اور جو اس کا انجام ہوتا ہے ، اس کی جزئیات میں بھی شوخی اپنا اثر دکھاتی ہے ۔ غرض غالب کسی جگہ بھی اس شوخی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ بلکہ اس سے خاطر خواہ کام لیتے ہیں ۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کے ایسا کرنے سے غزل کے کارگہ شیشہ گری کو ٹھیس نہیں لگتی ۔ یہ آپہنچہ اس تندی، صہیا سے پگھلنا نہیں ۔ اس کی آب و تاب پوری طرح باقی رہتی ہے بلکہ اس میں جو شراب ہے ، اس کی مستی میں کچھ اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کے ظاہری رنگ میں کچھ اور بھی تیزی پیدا ہو جاتی ہے اور ان دونوں چیزوں سے دل کو سرور اور آنکھوں کو نور ملتا ہے ۔

اردو غزل کی روایت میں عشق کا آغاز دل دہنے سے ہوتا ہے ۔ عاشق کو محبوب سے محبت ہو جاتی ہے ۔ گویا وہ اپنے دل سے ہاتھ دھو لیتا ہے اور اس کا دل محبوب لے لیتا ہے ۔ غالب نے اس خیال کو پیش تو کیا ہے

لیکن اس کو پیش کرتے ہوئے صرف یہ بات ہی نہیں کہی ہے کہ عاشق نے دل محبوب کو دے دیا اور اس طرح عشق کا آغاز ہو گیا بلکہ اس خیال میں یوں ایک پہلو پیدا کیا ہے:

کہتے ہو نہ میں گے ہم ، دل اگر بڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے ، ہم نے مدعا پایا

یہاں غالب کہتا یہ جانتے ہیں کہ دل تو ان کے پاس موجود ہی نہیں ہے ۔ اس کے گم ہونے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے ۔ ایسی صورت میں محبوب کا شوخی سے یہ کہنا کہ اس کو دل بڑا ہوا مل گیا ، تو وہ نہیں دے گا کوئی معنی نہیں رکھتا ۔ یہاں محبوب کے بیان اور اس کے جواب دونوں میں شوخی ہے اور یہ شوخی ہی اس شعر کی بنیاد ہے ۔

غالب ایک عاشق شاعر کی خصوصیات اپنی شخصیت میں رکھتے ہیں ۔ وہ حسن پرست ہیں اور حسن برستی میں سے ان کے عشق کا سوتا پھوٹتا ہے ۔ لیکن اس رابطے کا خیال ان کے یہاں کیسے کیسے دلچسپ خیالات پیدا کرتا ہے ۔

ایک جگہ کہتے ہیں :

جانتے ہیں خوب رویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے
اور پھر دوسرے شعر میں کہتے ہیں :

حافل ان مہ طلعتوں کے واسطے
جانتے والا بھی اچھا چاہیے

ان اشعار میں چاہے بڑی حقیقتوں کا بیان نہ ہو لیکن ان میں شوخی کا عنصر بڑی ہر لطف سی لضا پیدا کر دیتا ہے ۔

اپنی غزلوں میں غالب نے رندی اور شاہد بازی پر بہت زور دیا ہے اور عشق کی بنیاد شاہد بازی ہی بتائی ہے ۔ ظاہر ہے ایک رند شاہد بازی محبوب کو خاطر میں نہیں لاتا ۔ وہ اس کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر اپنا مطلب نکالتا ہے اور جب محبوب اس کے دام میں پھنس جاتا ہے تو اس کو خوشی حاصل ہوتی ہے ۔ لیکن جب اس کی طرف سے بیان وفا باندھنے کا اظہار ہوتا ہے تو وہ محبوب کی اس حرکت کو اس کی سادگی پر معمول کرتا ہے ۔ غالب نے کسی شوخی سے اس خیال کی ترجمانی کی ہے :

سادہ ہرکار ہیں خوبان غالب

ہم سے ہرآن وفا پائندہ تھے ہیں

اس شوخی نے غالب کی غزلوں میں بعض ایسے مضامین بھی پیدا کیے ہیں۔ جو بالکل نئے ہیں اور جو ان سے قبل کی غزلوں میں نظر نہیں آتے۔ مثلاً حسرت دیدار کا موضوع ویسے تو تغزل میں بہت عام ہے۔ عاشق کو محبوب کے دیدار کی حسرت رہتی ہے۔ وہ اس تک اپنا پیام مختلف طریقوں سے پہنچاتا بھی ہے۔ لیکن غالب کی شوخی اس پیام کو محبوب تک بالکل ایک نئے طریقے سے پہنچاتی ہے۔ وہ سرتاسر پر آنکھ کی تصویر کھینچتے ہیں تا کہ خط کو شروع کرنے ہی محبوب پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ عاشق حسرت دیدار کا شکار ہے :

آنکھ کی تصویر، سرتاسر پہ کھینچی ہے کہ تا

تجہ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرت دیدار ہے

سرتاسر پر آنکھ کی تصویر کھینچنا ایک ایسا خیال ہے جس میں حد درجہ سادگی اور معصومیت ہے۔ لیکن اس میں شوخی کا رنگ بھی بہت تیز کیا ہے۔ اور یہی اس کی جان ہے۔

یہ شوخی ایک جگہ غالب کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ساری دنیا کو چھوڑ کر، سارے شہر میں کان پر قلم رکھ کر یہ آواز لگائے پھرے کہ اگر کسی کو خط لکھوانا ہو تو لکھوا لے۔ اس خیال سے کہ محبوب کو ان گنت خط لکھنے والے ہیں۔ بہت ممکن ہے اس سے لکھوائیں۔ اس طرح انہیں خط کے مضمون کا علم ہوتا رہے گا اور دلچسپی بھی رہے گی۔ چنانچہ وہ ہر صبح کان پر قلم رکھ کر لکھ جاتے ہیں۔ بس یہی ان کا مشغلہ ہے :

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے

ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکالے

گویا عاشق کے لیے اب کوئی مشغلہ رہ ہی نہیں گیا ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ صبح سے شام تک خط لکھتا پھرے۔ اس خیال کے مضحکہ خیز ہونے ہی میں شوخی ہے۔ اور اس شوخی نے اس میں جلدت اور ایچ پیدا کر دی ہے۔

محبوب کے ہوسے کا معنی ہر عاشق ہوتا ہے اور اس نینا کا اظہار وہ نہ جانے کس کس طرح کرتا ہے۔ غالب اس موضوع کو بالکل نئے انداز

میں پیش کرتے ہیں۔ ایک شعر میں حسن طلب کا اظہار یوں کیا ہے :

خوشیہ نا شگفتہ کو ، دور سے مت دکھا کہ ہوں
ہوئے کو بوجھتا ہوں میں ، منہ سے مجھے بتا کہ ہوں

منہ سے بتائے میں حسن طلب موجود ہے اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ دور سے
کی صورت ہی میں نکل سکتا ہے۔ یہاں شوخی ہی اس اظہار تمنا کی جان ہے۔
ایک اور شعر میں غالب نے اس سے بھی زیادہ تہکھے انداز میں اس
مضمون کو باقدا ہے۔ کہتے ہیں :

ہوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جہ میں کہتے ہیں کہ ملت آئے تو مال اچھا ہے

یہاں بھی اس شعر کی بنیاد غالب کی شوخی ہی ہے۔ اگر شوخی نہ ہوتی
تو یقیناً اس شعر کو مبتذل کہا جاتا لیکن اس شعر میں شوخی نے
بڑی حد تک اس ابتذال کو کم کر دیا ہے۔ جب ابتذال کا خیال آتا ہے۔
شوخی سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے اور اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔
غالب دوسرے غزل گو شاعروں کی طرح محبوب کے کوچے میں
جاتے ہیں ، اور اس کوچہ گردی میں انہیں عجیب عجیب واقعات سے
دوچار ہونا پڑتا ہے۔ وہ بستر لے کے نکلتے ہیں۔ اس خیال سے کہ محبوب
کے در کے سامنے لگا دیں گے اور مزے سے لیٹے رہیں گے۔ یہاں دیدار کا
بھی امکان ہے اور وصال کا بھی۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ محبوب پہلے تو اپنے
در پر رہنے کی اجازت دیتا ہے مگر جیسے ہی بستر کھٹتا ہے ، وہ اپنے قول
سے بھر جاتا ہے اور نکال باہر کرتا ہے :

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پتھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لیٹا ہوا بستر کھلا

یہ ایک مضحکہ خیز سا خیال ہے لیکن شوخی نے اس کی مضحکہ خیزی
کو پس منظر میں ڈال دیا ہے اور اس طرح اس موضوع میں جان ڈال
دی ہے۔

غرض محبوب غالب کا بستر گول کرتا ہے لیکن اس بستر کے گول
ہونے کے بعد بھی وہ چین سے نہیں بیٹھتے اور اس کوچے کے گرد چکر لگاتے
رہتے ہیں۔ جہاں ہاسبان ان کو آڑے ہاتھوں لیٹا ہے۔ دربان کے ہاتھوں

ان کی خوب مرست ہوتی ہے ۔ کبھی پاسباں ان کا آتنا بھی نکل آتا ہے ۔
اس لیے محبوب جو ذلت دیتا ہے ، وہ اسے ہنسی میں ڈالتے ہیں :

دے دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ڈالیں گے
ہارے آتنا نکلا ، ان کا پاسباں ، اپنا

لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انہیں اُلٹ کے پاسباں کے قدم لینے پڑتے
ہیں ، ورنہ ان کی شامت آنے میں کوئی کسر نہیں رہ جاتی :
گدا سمجھ کے وہ چپ تھا ، مری جو شامت آئی
اُلٹا اور اُلٹ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے
ورنہ ہوتا یہ کہ مار کھاتی پڑتی ۔

لیکن وہ باز نہیں آتے ۔ ان کا جی ہار پا چاہتا ہے کہ محبوب کے
کروٹے میں صدا لگائیں تاکہ اسے خبر ہو جائے لیکن وہ سیاست دریاں سے
ڈرتے ہیں ۔ بس یہی ان کے راستے میں حائل ہو جاتی ہے :
دل ہی تو ہے ، سیاست دریاں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے

وہ صدا تو نہیں لگائے لیکن دوسری حرکتیں چاڑی رہتی ہیں ، جن کو
دیکھ کر محبوب گالیاں دیتا ہے ۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جتنی
دعاائیں یاد کر کے جاتے ہیں ، وہ سب صرف دریاں ہو جاتی ہیں :
واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تہیں جتنی دعاائیں ، صرف دریاں ہو گئیں

ان تینوں اشعار میں بھی اصل بنیاد شوخی ہے ۔ اس شوخی نے اسے دلچسپ
بنایا ہے ، ورنہ یہ ذات خود ان اشعار کے موضوعات میں کوئی خاص بات
نہیں ۔ شوخی ہی نے ان میں معنویت کی پھیلیاں بھر دی ہیں ۔

غزل کی روایت میں محبوب کی مجلس آرائی کو پیش کرتا ہوں تو ایک
بہت عام سی بات ہے ۔ تقریباً ہر شاعر نے اس پر طبع آزمائی کی ہے ۔ لیکن
ہاں تو اس میں محبوب کی زیادتی کا احساس ہونا ہے یا محبت کرنے والے کی
ناکامی اور ہامالی پر جا کے قان لوٹتی ہے ۔ غالب اس مضمون کو
اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان دونوں میں سے کوئی بات بھی ضرورت سے
زیادہ نہیں ابھرتی ۔ بلکہ اس کے بجائے ان کا خیال ایک دلچسپ مزاحیہ سی

نضا لٹم کر رہتا ہے ۔ چنانچہ اسی نضا کی طرف نظر زیادہ جاتی ہے ۔
یہ شعر دیکھیے :

میں نے کہا کہ 'ہزم ناز' چاہیے 'خبر سے نہیں'

من کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ 'ہوں؟'

جاں حزن و یاس اور ذلت و رسوائی سے کہیں زیادہ محبوب کی ستم ظریفی کا احساس بھایا ہوا معلوم ہوتا ہے اور غالب نے اپنی شوخی سے یہ صورت حال پیدا کی ہے ۔

ایک اور شعر میں نوبت محبت کرنے والے کی بے حیائی تک جا پہنچی ہے ۔ محبوب کی محفل میں اس پر انگلیاں اٹھتی ہیں اور اشارے ہوتے رہتے ہیں لیکن وہ اپنی جگہ بیٹھا رہتا ہے ، اٹھنے کا نام لیتا :

اس ہزم میں مجھے نہیں ہنتی حیا کئے

بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے

بظاہر اس شعر کی نضا مجموعی طور پر ایسی کچھ زیادہ ہنسائے والی نہیں ہے ۔ کیونکہ جہاں محبت کرنے والے کی محرومی کا غم بھی اس میں شامل نظر آتا ہے، لیکن "اشارے ہوا کئے" کا فقرہ جیسے ہی آتا ہے، شوخی کی ایک بجلی سی کوندتی ہے اور ساری نضا کو ایک لمحے کے لیے منور کر دیتی ہے ۔ غالب کی غزلوں میں فنون کے متعلق بعض اور اشعار بھی ایسے ملتے ہیں ، جن میں محبت کرنے والے کی ناکامی اور حسرت ، مجبوری اور معذوری کا احساس ہوتا ہے لیکن ایسے اشعار میں بھی غالب اپنی شوخی سے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیتے ہیں ، جن میں ایک شگفتگی ہوتی ہے ۔ یہ اشعار اس صورت حال کے ترجمان ہیں :

بوچھنے ہیں وہ کہ غالب کون ہے

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلاؤں کیا ؟

ہے خبر گرم ان کے آنے کی

آج ہی گھر میں پوریا نہ ہوا

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیان اپنا

بن گیا رقیب آخر، تھا جو راز داں اپنا

حیران ہوں دل کو روؤں کہ پیشوں چکر کو میں
مقدور ہو نو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

مرے ہوئے میں کیا ہے زموائی
اے وہ مجلس نہیں غلوت ہی سہی

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ

ہائے اس زود پشیمان کا پشیمان ہوتا

اور ایسے اشعار کی غالب کے کلام میں کمی نہیں ہے ۔ ان کا دہوان ایسے
اشعار سے بھرا پڑا ہے ۔ ان میں غالب کی شوخی بھر حال کام کرتی ہوئی
نظر آتی ہے ۔

اردو غزل میں محبوب سے ملنے اور ملاقات کرنے کے جن طریقوں
اور وسیلوں کا ذکر ہے ، ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے ۔ کہیں شاعر
دیوار کے سائے تلے بیٹھا ہے ۔ کہیں اس کے ارد گرد چکر کاٹتا ہے اور
بہت ہوا تو اس کی محفل میں جا پہنچتا ہے ، جہاں اس کی شامت ہی آ جاتی
ہے ۔ لیکن غالب کی شوخ مزاجی نے اس کام کے لیے ایک بڑا ہی لطیف
ذریعہ اور وسیلہ تلاش کیا ہے ۔ وہ مصوری سیکھتے ہیں :

سیکھیں ہیں مہِ رخوں کے لیے ہم مصوری

تکریب کچھ تو بھر ملاقات چاہیے

ظاہر ہے کہ مصوری ایک لطیف فن ہے اور اس کو مہِ رخوں کی ملاقات
کے لیے تفریب بنانا اس سے بھی لطیف بات ہے ۔ اس کو غالب کی شوخی
ہی پیدا کر سکتی ہے ۔

غالب کی شاعری میں روایت کا رچا ہوا شعور ملتا ہے لیکن وہ روایتی
شاعر نہیں ہیں ۔ ان کے یہاں روایتی شاعری سے انحراف ہے ۔ اور وہ اس کے
موضوعات سے اس حد تک برگشتہ ہیں کہ کہیں کہیں خود ان موضوعات
کو کچھ اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ اس کی تہ میں طنز کی ایک لہر
سے اُٹھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے غالب
ہماری شاعری کے روایتی موضوعات پر لفرے چست کر رہے ہیں ۔ ان کے
اس قسم کے اشعار اسی صورت حال کے ترجمان ہیں :

اس سادگی بہ کون نہ مر جائے ، اے خدا !
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

ہے کیا جو کس کے ہاندھے ؟ مہری بلا لڑے
کیا جانتا نہیں ہوں مہاری کمر کو میں ؟

لاغر اتنا ہوں کہ گر نو بزم میں جا، دے مجھے
میرا ذمہ دہکے کر گر کوئی بتلا دے مجھے

یہاں تلوار کے بغیر لڑنے ، محبوب کی کمر کے معدوم ہونے کے باعث
بزم محبوب میں نظر نہ آنے کے مضامین کو مستحیدگی کے ساتھ پیش نہیں کیا
گیا ہے ۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے ، جیسے وہ ان تمام باتوں کا مذاق اڑا
رہے ہیں ۔ اسی لیے یہاں ہلکی ہلکی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور طنز کا ہاتھ
کام کرتا ہوا نظر آتا ہے اور یہ سب کچھ ان کی شوخی ہی کا طفیل ہے ۔
خالص کی غزلیں شوخی کے عناصر سے بھری پڑی ہیں ۔ ان کی محلولوں
میں باعتبار مضامین جتنے پہلو بھی نمایاں ہیں ، ان سب میں اس شوخی
کے اثرات نظر آتے ہیں ۔ ان کا تصوف اور فلسفہ تک اس سے خالی نہیں ہے ۔
لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان کی اس شوخی کا شباب معاملات حسن و عشق
کی ترجیح ہی میں ملتا ہے ۔

غالب
کی
شاعری میں
اجتماعی شعور

غالب انیسویں صدی کے ایک ایسے شاعر ہیں جنہیں ، اُس زمانے کے مسلمانوں کی زندگی میں برہا ہونے والے آسوپ حشر کا بخوبی علم تھا ۔ وہ اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے ۔ انہیں اس حقیقت کا احساس تھا کہ اُن کے اُس پاس کی زندگی کا سیرازہ منتشر ہو چکا ہے ۔ اس کی تیرازہ جدی اُن کے بس کی بات نہیں تھی ۔ لیکن اس انتشار کو شدت کے ساتھ محسوس کرنا اور اُس پر خون کے آنسو بہانا ، اُن کے اختیار میں ضرور تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی شاعری میں جگہ جگہ اس انتشار کی تصویر کشی کی ہے ۔ اس تصویر کشی کی تہ میں اپنی تہذیب کو زندہ رکھنے کا خیال ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے ۔ جب وہ اپنی زبانوں حالی پر کڑھتے ہیں اور اپنی ہلمالی پر خون کے آنسو بہاتے ہیں تو در حقیقت اُس وقت کے مسلمانوں کی معاشری اور تہذیبی زبانوں حالی کا احساس کار فرما ہوتا ہے ۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ اس معاشرت اور تہذیب کی رسوائی ہو رہی ہے اور اُس کا چراغ آندھیوں کی زد پر ہے ۔

غالب نے جس زمانے میں آنکھ کھولی وہ سیاسی ، معاشرتی اور تہذیبی اعتبار سے ایک عجیب انتشار اور بد نظمی کی نشان دہی کرتا ہے ۔ اُس وقت اس پر عظیم میں مسلمانوں کا قائم کیا ہوا سیاسی نظام دم توڑ رہا تھا ۔ اُن کی معاشرت کی بنیادیں ہل چکی تھیں ۔ اُن کی تہذیب میں رخنے پڑ گئے تھے ۔ وہ بغل جو صدیوں تک اس سر زمین پر اسلامی اقدار کا پرچم لہراتے رہے تھے ، اب صرف نام کے حکمران رہ گئے تھے ۔ اُن کی طاقت ختم ہو چکی تھی ۔ اُن کے اقبال کا آفتاب گمنا گیا تھا ۔ اس انحطاط

و زوال کے باعث جو انتشار پیدا ہو سکتا ہے ، وہ اس ماحول میں نمایاں تھا ۔ افراد زندگی سے بیزار تھے۔ انہیں اپنے مستقبل کا علم نہیں تھا ۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے ۔ اُن کی زندگی میں ایک کھوکھلا پن پیدا ہو گیا تھا ۔ وہ اپنے آس پاس اور گرد و پیش ایک خلا ماحسوس کرتے تھے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس ماحول میں نئی زندگی کی لہریں اُٹھ رہی تھیں ۔ نئی قدروں کا وجود بھی ہو رہا تھا ۔ یہ اور بات ہے کہ ان سے اُس وقت افراد نے ذہنی طور پر مطابقت پیدا نہیں کی تھی ۔ انہیں اپنا ماضی بہت عزیز تھا ۔ وہ اس کی عظیم روایات کو اپنے سینے سے چمٹائے اور کلچر سے لگائے ہوئے تھے۔ انہیں اس روایت کی ارتقائی کیفیت کے رک جانے کا بڑا غم تھا ۔ اس غم کی وجہ سے اُن کی آنکھیں پریم تھیں ۔ ایک نئی زندگی کا آفتاب ضرور طلوع ہو چکا تھا لیکن ایک دھند سی اُس کو چاروں طرف گھبرے ہوئے تھی ۔ مسلمانوں کی زندگی کو بدلنے اور اُس کو نئے حالات سے آشنا کرنے کے خیالات بھی کسی نہ کسی صورت میں پیدا ہونے لگے تھے ۔ ان خیالات نے اس زمانے میں بعض تحریکوں کا رُوب بھی اختیار کر لیا تھا ۔ جہاد کے تصورات بھی عام ہونے لگے تھے۔ عمل کا خیال بھی نمایاں ہونے لگا تھا ۔ افراد شعور سے بھی کام لینے لگے تھے ۔ غرض اُس وقت کا ماحول، باوجود ناسازگار حالات کے، ایک انقلابی تبدیلی سے ہمکنار تھا ۔

غالب اسی ماحول کی پیداوار ہیں اور اُن کی شخصیت اور شاعری اسی ماحول کی آئینہ دار ہے ۔ غالب صرف اپنی انفرادیت ہی میں گم نہیں تھے، وہ اپنے آپ سے باہر نکل کر بھی دیکھتے تھے ۔ اُس زمانے کے مسلمانوں کی زندگی کا پورا نقشہ اُن کی آنکھوں کے سامنے تھا ۔ اُس وقت کے معاشرتی اور تہذیبی نشیب و فراز کی تصویر اُن کی نظر میں تھی ۔ اُنہوں نے مسلمانوں کی ایک عظیم سلطنت نو دم توڑنے ہوئے دیکھا ۔ اُن کی بلند پایہ معاشرت اور تہذیب کی شہرت اُنہیں گرتی ہوئی نظر آئی ۔ وہ ان حالات سے متاثر ہوئے اور یہ تاثر اتنا گہرا ہوا کہ وہ اس کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کے لیے مجبور ہوئے ۔ اُن کے خطوں میں تو ان حالات کی تفصیل کچھ اس طرح بکھری ہوئی ہے کہ اس کو دیکھ کر اس زمانے کے مسلمانوں کی زندگی کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے ۔ خیر ، خطوں میں تو یہ سب کچھ ہونا ہی

چاہے تھا۔ کیونکہ وہ ہر حال اُس زمانے میں لکھے گئے ہیں جب تلماز کار حالات اپنی اُنہا کو پہنچ گئے تھے۔ اور غالب کی زندگی ان ہی حالات کے سائے میں گذر رہی تھی۔ لیکن اُنہوں نے اپنی غزلوں میں بھی ان حالات کی تصویر کشی کی ہے۔ وہ مشاہدہ حق کی گفتگو بادہ و ساحل میں اور ناز و غمزہ کی بات دشنہ و خنجر میں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے اپنے ان اجتماعی اور قومی تاثرات کو غزل کے مخصوص اشاروں اور کئیابوں میں پیش کیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ غالب کی غزل کا ایک اہم موضوع حسن و عشق ہے۔ لیکن اُنہوں نے اس حسن و عشق کے مختلف پہلوؤں کو اپنے زمانے کے مخصوص معاشرتی پس منظر میں پیش کیا ہے۔ وہ اپنی عشقہ شاعری میں اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ اُن کے معاشرے میں بوالہوس کی کوئی حیثیت نہیں۔ حسن پرستی تو اہل نظر کا شیوہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حسن پرستی کے کچھ معیار رکھتے تھے۔ یہ حسن پرستی اُن کے خیال میں عشق کا منبع ہے اور عشق زندگی میں ایک مکمل نظام کی حیثیت رکھتا ہے۔ سماجی زندگی اس کو متاثر کرتی ہے اور خود وہ سماجی زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ ان دونوں کو الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اُن کے یہ اشعار اس حقیقت کو پوری طرح واضح کرتے ہیں :

ک گو میں رہا رہیں ستم ہائے روزگار

لیکن قمرے خیال سے غافل نہیں رہا

✓ تیری ولہ سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں

تیرے سوا بھی ہم یہ بہت سے ستم ہوتے

ل لکھد کسوب حوادث کا ٹھٹل کسر نہیں سکتی

مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اُنہا نے کی

کم جانتے تھے ہم بھی غم عشق کو ہر اب

دیکھا تو کم ہوتے ہم غم روزگار تھا

جہاں غالب نے غم عشق اور غم روزگار کے رشتے کی وضاحت کی ہے اور

دونوں کے باہمی ربط کو بے نقاب کیا ہے۔ ان سے صاف ظاہر ہے کہ

ناسازگار حالات کے باعث عشق کے عام تقاضوں کو پورا کرنا اور اس کے اعلیٰ معیاروں کا برقرار رکھنا آسان نہیں تھا ۔ یہ خیالات ان کے سماجی اور اجتماعی شعور پر دلالت کرتے ہیں ۔

لیکن یہ اجتماعی شعور صرف ان کی عشقیہ شاعری میں تک محدود نہیں ۔ یہ شعور تو ان کے بیاں اس قدر بڑھا ہے کہ وہ اپنی غزلوں میں اس زمانے کی زندگی کا اچھا خاصا سرئہ لکھنے لگے ہیں ۔ غزلوں کے ان اشعار میں اسلوب تو غزل کا ہے لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو ان میں اس زمانے کی سماجی حالت، اس کے بنیادی معاملات اور اساسی مسائل بے نقاب نظر آتے ہیں اور ان کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے کی سماجی زندگی کا کیا حال تھا ؟ افراد پر کیا بیت رہی تھی اور وہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہے تھے ؟

غالب کو مسلمانوں کی تہذیبی عظمت کا احساس تھا ۔ وہ یہ جانتے تھے کہ ان کی تہذیب نے جو روایت قائم کی ہے ، اس پر یقیناً فخر کیا جا سکتا ہے ۔ انسانی تاریخ میں اس نے جو کارہائے نمایاں انجام دے دیے ، ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن اس روایت کو اپنے ارتقائی سفر میں ناسازگار حالات سے بھی دوچار ہونا پڑا ۔ اس احساس کو غالب نے اس شعر میں ڈھالا ہے :

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش ہم دم نکلے
چہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

بظاہر تو یہ شعر ایک انفرادی جھڑپ کا ترجمان معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی تہ میں درحقیقت ایک اجتماعی احساس و شعور موجود ہے ۔

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے جس میں غالب نے اسی بنیادی خیال کو کچھ اور وضاحت سے پیش کیا ہے ۔ غالب کو مغلوں کی تہذیبی بساط کے اٹھنے کا بڑا غم تھا ۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں وہ اس کو چہت بڑا سانحہ سمجھتے تھے ۔ کیونکہ مسلمانوں کی اس عظیم سلطنت کی بنیادوں کے بل جانے کی وجہ سے انتشار اور افراتفری کا دور دورہ ہوا اور ان کی عزت خاک میں مل گئی ۔ غالب نے جب یہ شعر کہا تو اس کی تہ میں یہی خیال تھا :

نکلنا خلد سے آدم کا سننے آئے تھے لیکن

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

ہاں آدم کے خلد سے نکلنے کی تلمیح کا سہارا لے کر غالب نے اپنی تہذیبی روایات کے بارے میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ دیا ہے ۔ جتنا بھی غور کیجیے ، اس میں معنویت کی دنیا میں نظر آتی ہیں ۔

اس تہذیبی روایت کے انحطاط و زوال کی وجہ سے کساد بازاری کا دور دورہ ہوا ، معیار باقی نہ رہے ۔ قدریں منتشر ہو گئیں ۔ اصول ڈانوا ٹول ہو گئے ۔ اس انتشار اور ہنگامے میں کسی ایک کو بھی طاقیت نصیب نہ ہو سکی ۔ نفسی نفسی کا عالم پیدا ہوا ۔ ایک دوسرے سے توقعات اٹھ گئیں ۔ خستگی کی کوئی داد دینے والا نہ رہا کیونکہ خستگی تو ہر ایک کا مندر بن گئی تھی ۔ غالب نے اس شعر میں اسی بنیادی خیال کی ترجمانی کی ہے :

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد ہانے کی

وہ ہم سے بھی زیادہ خستہ تیغ ستم نکلے

صاف ظاہر ہے کہ سماجی زندگی کے انحطاط و زوال کے باعث پیدا ہونے والی زبانوں حالی اس شعر کی بنیاد ہے ۔

غالب کی ایک اور غزل ہے جس میں سوز نہاں سے بے محابا چلتے ، اس میں ذوق وصل اور یاد یار تک کے باقی نہ رہنے ، گھر کو آگ لگے اور اس میں سب کچھ جل جائے ، اپنے عدم سے پرے ہونے اور اُس کی وجہ سے آہ آتشیں تک کے بے اثر ہو جانے کا تذکرہ ہے ۔ اس میں غالب نے السردگی کی آرزو بھی کی ہے کیونکہ طرزِ تباہ اہل دنیا نے انہیں ایسا کرنے کے لیے مجبور کیا ہے ۔ اس کی تفصیل خود غالب کی زبان سنئے :

دل مرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا

آتش خاموش کی مانند گویا جل گیا

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں

آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بار ہا

میری آہ آتشیں سے بال عشقا جل گیا

ان اشعار میں ایک اجتماعی رنگ و آہنگ بہت نمایاں ہے ۔ غالب یہاں ہیں کہنا چاہتے ہیں کہ اُن کے معاشرے میں ہر شخص کا دل سوز نہاں سے

جل گیا ہے ۔ ساری زندگی میں ایک سلگنے والی کیفیت ہے ۔ پوری تہذیب میں ایک آگ سی اندر ہی اندر بھل رہی ہے ۔ دلوں کی بستیاں ویران ہیں ۔ اُنکوں اور حوصلوں پر اوس سی بڑکھی ہے ۔ اور ہر طرف ایک ماتم سا برپا ہے ۔ غالب خود بھی اس ماتم میں شریک ہیں ۔

جب زندگی کا قافلہ اس موڑ پر آ جائے تو ظاہر ہے کہ اُس میں کوئی دل کشی باقی نہیں رہتی ۔ افراد زندگی کی ہر چیز سے بیزار ہو جاتے ہیں ۔ میر کی نکتہ سے اُن کا جی گھبرائے لگتا ہے ۔ غالب کہتے ہیں :

عبت لہی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

غم فراق میں تکلیف میر کی مت دو
مجھے دماغ نہیں خستہ ہانے ہے جا کا
یہ اشعار اُس شکست خوردگی کو ظاہر کرتے ہیں جو اس زمانے کے مسلمانوں کی زندگی میں بہت عام تھی ۔ غالب نے جہاں اسی کا نقشہ کھینچا ہے ۔ اس انحطاط و زوال اور شکست خوردگی کے باعث پیدا ہونے والی تباہی اور بربادی کے ان گنت مناظر غالب کی غزلوں کے اشعار میں ملتے ہیں ۔ یہ چند اشعار دیکھیے :

گریہ چاہے ہے غریب سرے کاشانے کی
درو دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اُس شمع کی طرح جس کو کوئی بیجا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغ لا تھامی

بوئے گل نالہ دل ، دود چراغ محفل
جو قری بزم سے نکلا سو ہر شاں نکلا

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

غیر لبی محفل میں ہوئے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

ہم سب انحطاط و زوال ہی کے احساس کا نتیجہ ہے ۔ غالب کو ہر طرف
بیابان کی سی کیفیت نظر آتی ہے ۔ جگہ جگہ انہیں آگ سی بیڑ کٹی، تلے
سے لپکتے اور دھواں سا اٹھتا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔ وہ شمع کو خموش ہانے
ہیں اور ان مناظر کو دیکھ کر محرومی کا احساس ان پر چھا جاتا ہے ۔
اس عالم میں وہ لہو روئے ہیں اور زندگی کی محرومیوں کا شکوہ کرتے
ہیں ۔ غالب کا دیوان اس قسم کے اشعار سے بھرا پڑا ہے ۔ یہ اشعار دیکھیے :

خنجر بھر لگا کھلنے ، آج ہم نے اپنا دل
خون کیا ہوا دیکھا ، گم کیا ہوا پایا

دل میں ذوق وصل و یاد ہار تک باقی نہیں
آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا، جل گیا
میں ہوں اور سردی کی آرزو، غالب کہ دل
دیکھ کر طرز تباہ اہل دنیا ، جل گیا

ہوئے گل ، نالہ دل ، دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا ، سو پریشان نکلا

دل تا چکر کہ ساحل درہائے خون ہے اب
اس وہ گنر میں جلوۂ گل ، آگے گرد تھا

خموشی میں نہاں، خون گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغ مردہ ہوں ، میں بے زبان ، گور غریبان کا

گر یہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
درو دیوار سے لپکتے ہے بیابان ہونا

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ، ورنہ میرے حال پر
ہر گل تو ایک چشم خون نشان ، ہو جائے گا

۲۶۵

میں اور بزم سے ہے ، ہوں تشنہ کام آؤں
 گر میں نے کی تھی توبہ ، ساقی کو کیا ہوا تھا ؟
 ر گھر بازار ، جو نہ روئے بھی ، تو ویراں ہوتا
 بحر اگر بحر نہ ہوتا تو لیاہاں ہوتا

ر کوئی ویرانی سی ویرانی ہے !
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

۱ جاتا ہوں داغ حسرتِ ہستی لیے ہونے
 ہوں شمع کشتہ ، درِ غورِ محفل نہیں رہا
 بے داد عشق سے نہیں ڈرتا ، مگر اسد
 جس دل پہ ناز تھا مجھے ، وہ دل نہیں رہا

دردِ دل لکھوں کب تک ، جاؤں ، اُن کو دکھلاؤں
 آنگاہیاں نگارِ اپنی ، خداسہ غوں چکاں اپنا

موج غوں سر سے گزرتی ہی کیوں نہ جائے
آسمان ہمارے الہ چاہیں کیا ؟

غم سے مرنے ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
 کہ کرے تعزیت سہر و وفا ، میرے بعد

آتشِ پرست کہتے ہیں ، اہل جہاں مجھے
سرگرم نالہ ہائے شور بار دیکھ کر

ہے غوں جگر جوش میں ، دل کھول کے روٹا
 ہونے جو کئی دیدہ خونناہہ نشان اور

جوئے غوں آنکھوں سے جنے دو کہ ہے شامِ فراق
 میں یہ معجھوں کا کہ دو شمعیں فروزاں ہو گئیں

ک قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدام !
 گری ہے جس پہ کل بھلی ، وہ میرا آشیانہ کیوں ہو

اُس شمع کی طرح ہے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں، ہوں داغِ قاسمی
خزاں کیا، فصل گل کہنے ہیں کس کو، کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، فلس ہے اور ماتم ہال و ہر کا ہے

مجھ کی کشانِ عشق کی ہوجھے ہے کیا خبر؟
وہ لوگ رلتے رلتے سراپاِ الم ہوئے
لکھنے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکل
ہر چند اس میں ہائے ہمارے قلم ہوئے

غیر لیں محفل میں ہوسے جام کے
ہم رہیں ہوں قند لب پیغام کے

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں، وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

ہے سوج زن اک قلمِ خوں، کاش میں ہو
آتا ہے، ابھی دیکھیے، کیا کیا مرے آگے

ان اشعار میں بظاہر تو انفرادی معاملات کی ترجمانی نظر آتی ہے لیکن
فرا غور سے دیکھا جائے تو ان کی تہ میں اُس زمانے کے اجتماعی معاملات
کا احساس و شعور نظر آتا ہے اور غالب انفرادی رنگ و آہنگ کے پردے
میں انہیں اجتماعی معاملات کی ترجمانی کی ہے۔
ابک اور غزل کے چند مسلسل اشعار سے بھی اس کی وضاحت ہوتی
ہے :

وہ فراق اور وہ وصال کہاں؟
وہ شب و روز و ماہ سال کہاں؟

فرصتِ کلر و ہار شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں؟

ایسا آساں نہیں لہو رونا!
دل میں طاقت، جگر میں حال کہاں؟

فسکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وہاں کہاں

یہاں بھی لڑائی و وصال ، فرصت کار و ہار شوق ، ذوق نظارہ جہاں
و شہرہ کے اشاروں میں غالب نے اپنے زمانے کی اجتماعی صورت حال کی
ترجیاتی کی ہے ۔

یہ حالات ، ظاہر ہے ، کہ طاقت ختم ہونے کے نتیجے میں پیدا ہوئے ۔
اس موقع سے نئی طاقتوں نے فائدہ اٹھایا اور وہ حکمران بن بیٹھیں ۔ انہوں
نے افراد کو سبز باغ دکھائے لیکن انہیں اپنے پا بہ زنجیر ہونے کا احساس
بہر صورت باقی رہا ۔ اس شعر میں اس صورت حال کی ترجمانی ہے کہتے ہیں :
✓ ہوں گسرتار الفت صیاد
ورنہ باقی ہے طاقت پرواز

اس زمانے کے ہندوستان اور خصوصاً دلی کے سیاسی حالات کو سامنے رکھا
جائے تو اس شعر میں بڑی معنوی وسعت پیدا ہو جاتی ہے ۔ یہ وہ زمانہ
تھا ، جب سیاست فرنگ نے اپنا کھیل کھیلنا شروع کر دیا تھا ۔ اس سر زمین
پر دام بچھا دیے گئے تھے اور بھولے بھالے لوگوں کو اس دام میں اسیر
کر لیا گیا تھا ۔ لیکن ایسی بٹی پڑھائی تھی کہ وہ اس دام کو دام بیبی
نہیں سمجھتے تھے ۔ غالب نے اس شعر میں اسی حقیقت کو پیش کیا ہے ۔
غالب نے اپنے زمانے کے ان ناسازگار حالات کا صرف ونا ہی نہیں
رویا ہے ، نئی زندگی سے مطابقت پیدا کرنے اور اس کو ہاتھوں پاتھ لینے
کا پیام بھی دیا ہے ۔ جب وہ کہتے ہیں :

ک ۔ وہ بادۂ شبانہ کی سر مستیاں کسہاں
اٹھیں بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ نئی زندگی کا استقبال کر رہے ہیں ۔ اس میں
عمل کا ایک پیام بھی موجود ہے ، جو روحانی زاویہ نظر کو بھی ظاہر کرتا
ہے ۔

یہ چند خیالات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ غالب صرف اپنی
شکست کی آواز ہی نہیں تھے ، افسوس صدی کی آواز شکست بھی ان کی
آواز میں شامل تھی ۔ انہوں نے اس پر آنسو بہائے اور اپنے زمانے کی حکایت
خون چکان کچھ اس طرح لکھتے رہے کہ ان کی شاعری میں ایک اور ہی
عالم نظر آتا ہے ۔

غالب
کی
شاعری میں
غم دوراں

غالب آدمی کو بجائے خود ایک محشر خیال سمجھتے تھے ۔ اس لیے خلوت میں انہیں انجمن نظر آتی تھی۔ لیکن جہاں تک اپنی ذات کا تعلق ہے انہوں نے انجمن میں ایک خلوت بھی دیکھی ہے ۔ یوں اس میں شک نہیں کہ اپنی ذات سے وہ ایک انجمن تھے لیکن حالات نے اس انجمن کو خلوت بھی بنا دیا تھا کم از کم اس انجمن میں خلوت نظر ضرور آتی تھی ۔ اسی لیے اُن کی شخصیت کی دنیا میں کبھی انجمن ایک خلوت بن جاتی ہے اور کبھی خلوت ایک انجمن !

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ غالب نے محشر خیال اور ایک انجمن ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اس زندگی میں تنہا پایا ہے ۔ ایک علیحدگی سی محسوس کی ہے ۔ انہوں نے وصل کی تمنا کی ہے لیکن وہ ہجر و فراق کا شکار رہے ہیں ۔ جس چیز کو انہوں نے حاصل کرنے کی کوشش کی ہے ، وہ اُن سے دور بھاگی ہے ۔ جن عناصر سے انہوں نے انجمن آرائی کرنا چاہی ہے ، وہ اُن سے کنارہ کش ہو گئے ہیں ۔ اسی لیے ایک انجمن ہونے کے باوجود اُن سے انجمن آرائی نہیں ہو سکی ہے ۔ چنانچہ انہوں نے اپنے آپ کو تنہا محسوس کیا ہے ۔ بے یار و مددگار پایا ہے اور یہی وجہ ہے کہ زندگی اُن کے لیے دلکشی اور دلآویز ہونے کے باوجود ایک وبال جان بن گئی ہے ۔ پھر بھی انہوں نے اُس کو عزیز رکھا ہے ۔ وہ اس کے پیچھے دوڑتے ہیں ۔ اس سے ہم کنار ہونے کی کوشش کی ہے ۔ لیکن اس دوڑ بھاگ میں کتنی ہی منزلیں ایسی آتی ہیں ، جب زندگی نے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا ہے ۔ وہ اُن سے پھڑکنے لگی ہے اور اس طرح وہ تنہا رہ گئے ہیں ۔ اس تنہائی کو انہوں نے

ہمیشہ شفقت سے محسوس کیا ہے ۔ ان کا سارا غم اسی احساس محرومی کی بددوار ہے ۔

اور غم عشق ہو یا غم روزگار ، دونوں کے چشمے ان کے یہاں اسی احساس تنہائی اور احساس تنہائی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے احساس محرومی سے بہوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

زندگی غالب کو بہت عزیز تھی ۔ زندگی اور زندگی کو ہسر کرنا ہی ان کے نزدیک سب کچھ تھا ۔ وہ اس کی ایک ایک بات اور ایک ایک پہلو پر جان چھڑکتے تھے ۔ اور زندگی ان کے نزدیک مسرتوں کا نام تھی ۔ دلاویزیوں اور دلفریبیوں کا نام تھی ۔ ان مسرتوں ، دلاویزیوں اور دلفریبیوں سے وہ اپنے سینے کو بھر لینا چاہتے تھے ۔ لیکن زندگی کی یہ مسرتیں ، یہ دلفریبیاں ، یہ دلاویزیاں بھلا کس کا ساتھ دیتی ہیں ؟ ان سے محرومی ہی ایک حقیقت ہے ۔ یہی زندگی کا قانون ہے ۔ لیکن انسان اس حقیقت کا شعور رکھتے ہوئے بھی ان سب کو حاصل کرنے کے لیے سرگرداں رہتا ہے ۔ بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ انہیں کے سہارے جینا ہے ۔ لیکن ان سب کا احساس بھی ایک مخصوص ذہنی کیفیت کا تابع ہے ۔ یہ کیفیت نہ ہو تو ان کا احساس بھی مشکل ہے ۔ احساس کا انحصار بڑی حد تک حالات پر ہوتا ہے ۔ اگر حالات سازگار نہ ہوں تو یہ مسرتیں اپنے آپ کو رو پوش کر لیتی ہیں اور آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں ۔

اس عالم میں انسان چاہے بھی تو ان کو نہیں دیکھ سکتا ۔ وہ سامنے آ جائیں تب بھی ان سے محفوظ نہیں ہو سکتا ۔ اسی عالم میں انسان کو اپنی لیے اسی کا احساس ہوتا ہے ۔

زندگی اسے ناسازگار نظر آتی ہے اور تاریکی میں وہ اس طرح محصور ہو جاتا ہے کہ روشنی کی کرن اسے دور تک بھی دکھائی نہیں دیتی ۔ اس کا تصور بھی اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے ۔ یہ زندگی کی بڑی ہی کٹھن منزل ہوتی ہے ۔

غالب کو اپنی زندگی میں یہی صورت حال پیش آتی ہے ۔ انہیں حالات سے دو چار ہونا پڑا ہے ۔ زندگی کو وہ اپنے لیے سمجھتے تھے لیکن زندگی انہیں اپنے لیے نہیں سمجھتی تھی ۔ وہ زندگی کے شیدائی تھے لیکن زندگی ان کی شیدائی نہیں تھی ۔ وہ اس کے پیچھے دوڑتے تھے ۔ اُسے اپنی گرفت

میں اپنے کی کوشش کرتے تھے لیکن وہ خود اُن سے دور بھاگتی تھی۔ زندگی کا عیش تو اُن کے خیال میں لہجمل حسین خان کے لیے بنا تھا۔ حالانکہ غالب اس عیش کو اپنے لیے سمجھتے تھے۔ یہ عیش انہیں کسی قدر حاصل تو ہوا لیکن اس قدر حاصل نہ ہو سکا کہ اُن کی طبیعت سیر ہو جاتی۔ وہ ساری زندگی اس عیش کی تلاش و جستجو میں سرگرداں رہے۔ اُن کی زندگی اسی جد و جہد کی ایک کہانی ہے۔ یہ کہانی ایک المیہ ہے۔ اسی لیے اس میں ایک عظمت ہے۔ اس عظمت کو اُن حسرتوں اور ناکامیوں نے پیدا کیا ہے جو مرتے دم تک غالب کے ساتھ رہی ہیں۔ یہ حسرتیں اور ناکامیاں کچھ تو غالب کی زندگی میں آئیں بھی اور کچھ اُن کی مخصوص ذہنی اور جذباتی کیفیت نے اُن حسرتوں اور ناکامیوں کو پیدا بھی کر لیا۔ معمولی سے غم کو اُن کی یہ کیفیت ایک جہت بڑا غم بنا لیتی تھی۔ اسی لیے اُن کی زندگی میں حسرتوں اور ناکامیوں کا ایک ہجوم ملتا ہے۔ وہ زندگی بھر کڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس بات پر کڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ وہ جس چیز کی چٹی کھانا کرتے ہیں، وہ انہیں اتنی حاصل نہیں ہوتی۔ اسی لیے اس عالم میں اُن پر ایک محرومی کا احساس طاری ہو جاتا ہے۔ اُن کی زندگی اسی احساس محرومی سے عبارت ہے۔ لیکن اس احساس محرومی میں بھی زندگی کی خواہش اُن کے دل سے نہیں نکلتی۔ کامیابی اور کامرانی کا خیال بہر حال اُن کے دل میں باقی رہ جاتا ہے۔ ولولوں کے چراغ جلنے رہتے ہیں۔ ذوق و شوق کی شمعیں فروزاں رہتی ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ خواب و خیال کی دنیا میں ہوتا ہے۔ غالب اسی خواب و خیال کی دنیا میں کھو جاتے ہیں، وادی خیال کو مستانہ طے کرتا اُن کا شعار بن جاتا ہے۔ ناکہ اس کے بعد حسرت اور ناکامی کی اس دنیا میں باز گشت کی تمنا نہ رہے :

مستانہ طے کروں ہوں رہ وادی خیال
تا باز گشت سے نہ رہے مدعا مجھے

سرور صاحب نے اس کیفیت کو اُن کی نسلی خصوصیت سے تعبیر کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

”غالب کو اپنے حسب و نسب پر فخر تھا۔ مہرگری اُن کا آہانی پیشہ تھا۔ اُن کے باپ دادا اس لیے نہیں لڑتے تھے کہ انہیں کوئی

مقدس جہاد یا بڑا مشن عزیز تھا۔ لڑنا اُن کا پیشہ تھا۔ مگر یہ ایک ترک صرف لڑنے ہی نہیں تھے ، خواب بھی دیکھتے تھے ۔ اُن خوابوں میں بڑے بڑے معرکوں کا جلال اور شاید و شیب کا جہاں تھا ۔ یہ عیشِ امروزی کے قائل نہ تھے ، انہیں عیش کے خواب بھی ملتے تھے ۔ ترکوں کے جہاں رزم و بزم ایک خواب کے دو پہلو تھے ۔ غالب کے وقت تک آنے آنے بلوارِ فشر رہ گئی مگر یہ خواب دیکھنا نہ گیا ۔ غالب کو ایک تندرست ذہن ملا تھا ۔ بچپن میں بے فکری اور رنگ رلیوں سے سائبہ رہا ۔ اُن کی جوانی خاصی دیوانی تھی مگر یہ اُن کی ساری زندگی کی پیاس کو کبھی نہ بجھا سکی ۔ یہ اشعار اُن کے مزاج کی بڑی اچھی تفسیر ہیں :

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکالے
بیت نکالے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکالے

آنا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گمہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

نا کردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب ! اگر اُن کردہ گناہوں کی سزا ہے

لیکن یہ اشعار صرف نسلی خصوصیت ہی کے زیر اثر تخلیق نہیں کیے گئے ہیں ۔ اُن کے بیچھے اور ایسی بہت کچھ ہے۔۔۔ اُن کے بیچھے آرزوؤں اور تمناؤں کا وہ خون ہے جو غالب کی زندگی میں سب سے زیادہ نمایاں تھا ۔ اُن کی محرک وہ حسرتیں اور ناکالیاں بھی ہوئی ہیں جن سے غالب کی زندگی عبارت تھی اور جن کو غالب نے اپنے اوپر کچھ زیادہ ہی شدت سے طاری کر لیا تھا ۔ لیکن اس میں اُن کی شعوری کوشش شامل نہیں تھی ۔ خارجی حالات اس کے محرک ہوئے تھے ۔ غالب انہیں خارجی حالات کے زخمِ خوردہ تھے۔۔۔ اور اس کا انہیں بڑا غم تھا ۔ لیکن وہ مجبور تھے ۔ مشیت کے آگے اُن کی کچھ بھی پیش نہیں جاتی تھی ۔ اسی لیے تو وہ چیخ اٹھے تھے :

مارا زمانے نے ابد اللہ خاں سمجھیں
وہ ولولے کہاں ، وہ جوانی کدھر گئی

یہ زمانے کی صفائی غالب کی سب سے بڑی دشمن رہی ہے۔ اسی نے ولولوں کا خون کیا ہے۔ اسی نے جوانی کو خاک میں ملا دیا ہے۔ اسی کا اثر ہے کہ ہزاروں خواہشیں ایسی ہیں کہ ہر خواہش پر ان کا دم نکلا ہے۔ اسی کا یہ اثر ہے کہ ان کے ارمان اگرچہ بہت نکلے ہیں لیکن پھر بھی کم نکلے ہیں۔ اسی کا اثر ہے کہ انہیں خدا کے سامنے حساب دینے وقت بھی داغ حسرت دل کا شہار ہاد آتا ہے اور اسی کا اثر ہے کہ وہ ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی داد طلب کرتے ہیں۔ غالب کو زمانے کی اس صفائی کا بڑا غم تھا۔ وہ زندگی پھر اس غم میں ہابھولا رہے۔ اسی زمانے کے غم یا غم دورانے ان کی ان ذہنی و جذباتی کیفیات کو پیدا کیا ہے جو ان کے فکر و فن میں قدم قدم پر اپنے آپ کو رونما کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی شاعری میں شروع سے آخر تک کم و بیش انہیں کیفیات کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔

یہ غم، جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا، کچھ تو غالب کے ماحول میں موجود تھا لیکن کچھ غالب کی افتاد طبع نے بھی اس کو پیدا کیا ہے۔ زندگی کی مسرتوں کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کا خیال ان کی گھٹی میں بڑا تھا۔ ان مسرتوں سے سینہ پھر لینے کی تمنا ان کے مزاج کا بنیادی جزو تھی۔ ان مسرتوں کے چھوٹ میں اکتساب لذت ہی کو وہ سب کچھ سمجھتے تھے۔ لیکن سماجی حالات اس کے لیے سازگار نہیں تھے۔ کیونکہ یہ سیاسی انتشار اور معاشی افراتفری کا زمانہ تھا۔ زمانے کی گردش نے قسمتوں پر بھی گردش طاری کر دی تھی۔ ان حالات میں جس چیز کی تمنا کی جائے، اس کا ملنا آسان نہیں ہوتا۔ غالب نے ایسی گردش کے دن اس سے قبل نہیں دیکھے تھے۔ اس لیے انہیں یہ گردش کچھ عجیب سی معلوم ہوتی تھی۔ وہ اس پر کڑھتے تھے، ہریشان ہوتے تھے۔ لذت پرستی اور تعیش پسندی ان کی طبیعت میں داخل تھی۔ حالات کا اس لذت پرستی اور تعیش پسندی کی راہوں میں حائل ہونا ان کے لیے مصیبت کا سامان تھا۔ جتنا کہ یہ بات ان کے لیے غم کا باعث بن جاتی تھی۔ ان کا دل غم کھانے میں بہت بودا تھا۔ اسی لیے سے کفام کے کم ہونے کے رنج کو بھی وہ بہت محسوس کرتے تھے۔ سے کفام بالکل ہی نہ ہوتی تو خدا جانے ان کا کیا حال ہوتا :

علم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے منے کفام ، بہت ہے

غالب رئیس زادے تھے۔ انھوں نے اسارت اور جاہ و ثروت کی آغوش میں آنکھ کھولی تھی۔ لیکن ان کی زندگی میں ایسی منزلیں بھی آئیں ، جب اس اسارت کا خیال اور جاہ و ثروت کا احساس ہی ان کے لیے مصیبت بن گیا۔ زندگی بھر وہ اس اسارت اور جاہ و ثروت کو برقرار رکھنے اور اس کو سنبھالنے میں زمین آسمان ایک کرتے رہے۔ اس راہ میں کیسے کیسے نازک موڑ آئے۔ راستے کی ناہمواری کے باعث انہیں کیسی کیسی ٹھوکریں کھانی پڑیں۔ لیکن اس اسارت اور جاہ و ثروت کے خیال کو انھوں نے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے آپ سے جدا نہیں ہونے دیا۔ کیونکہ اس کو وہ اپنا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتے تھے۔ وہ ساری زندگی ٹھوکریں کھاتے، گرتے اور سنبھلتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کی زندگی ختم ہو گئی لیکن جاہ و ثروت کا خیال آخر دم تک باقی رہا۔ انھوں نے اس کو ٹھیس نہیں لگنے دی۔ لیکن اس سلسلے میں جن مصیبتوں اور پریشانیوں کا انہیں منہ دیکھنا پڑا ، وہ کبھی ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں آتی تھیں۔ انھوں نے ایک زمانے تک زندگی کو محض بھولوں کی سیج سمجھا تھا لیکن اب انہیں یہ معلوم ہوا کہ وہ تو کائنات کا بستر ہے۔ اسی صورت حال نے انہیں سماجی اور معاشی حالات کی ناسازگار کیفیت کا احساس دلایا۔ اس زمانے کی ساری سماجی زندگی انہیں ایک کرب کے عالم میں نظر آئی۔ لیکن زندگی کے اس کرب کو انھوں نے اپنی شخصیت کے آئینے میں دیکھا ہے۔ ان کے پاس کوئی اجتماعی زاویہ نظر نہیں تھا ، اس لیے انہیں اپنی ہی پریشانیاں زیادہ نظر آتی ہیں۔ لیکن جہاں بھی انھوں نے پریشانیوں کا تذکرہ کیا ہے ، وہاں زمانے کی ناسازگار کیفیت کو وہ محسوس کرتے ہوئے ضرور معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے خطوط میں اس کی ساری تفصیل ملتی ہے۔ چودھری عبدالغفور سرور کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

”میں ہانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا۔ نو برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اس کی جاگیر کے عوض میری اور میرے شرکاء حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد ہنسی خاں دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے۔ انھوں نے ۴۰ دیے، مگر تین ہزار روپے سال۔ اس میں سے خاص

میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپے مال - میں نے سرکار انگریزی میں یہ عین ظاہر کیا - گولبروک صاحب چادر ریڈیڈنٹ دہلی اور اسٹرننگ صاحب بہادر سکریٹری گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر - ریڈیڈنٹ معزول ہوئے - سکریٹری گورنمنٹ ناکام ہو گئے - بعد ایک زمانے کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپے سپینہ مقرر کیا - ان کے ولی عہد نے چار سو روپے سال - ولی عہد اس مقرر کے دو برس بعد مر گئے - واجد علی شاہ کی سرکار سے یہ صلہ مدح گسٹری پانچ سو روپے سال مقرر ہوئے - وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جیے - یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی - دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی - سات برس بھ کو روٹی دے کر بگڑی - ایسے طالع مہربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں - اب جو میں والی دکن کی طرف رجوع کروں یاد رہے کہ متوسط یا مر جاوے گا یا معزول ہو جائے گا - اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی خالی جائے گی اور والی شہر بھ کو کچھ نہ دے گا اور اچانک اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی - اور ملک میں گھٹے کے ہل بھر جائیں گے - اے خداوند بندہ پرور ! یہ سب باتیں وقوعی اور واقعی ہیں -

یہ ظاہر اس خط میں غالب نے اپنا رونا رویا ہے لیکن اس میں سلطنتوں کے مٹنے کا ذکر ہے ، بادشاہوں کے معزول ہونے کا بیان ہے ، جاگیروں کے ختم ہونے کا تذکرہ ہے ، جس کے نتیجے میں ایک عام افرائی می پیدا ہوئی ہے اور اس افرائی کا شکر بہت سے افراد ہوئے ہیں - غالب بھی ان میں شامل ہیں - اس عام افرائی میں انہیں جن حالات سے دو چار ہونا پڑا ہے ، اس کی تفصیل و جزئیات کی منہ بولتی تصویر ان غطوں میں موجود ہے -

مرزا فتنہ کو لکھتے ہیں :

”یہ تمہارا دعا گو اگرچہ امور میں پایہ عالی نہیں رکھتا مگر احتیاج میں اس کا پایہ بہت عالی ہے - یعنی بہت محتاج ہوں - سو دو سو میں میری پیاس نہیں بجھتی - تمہاری ہمت پر سو ہزار آفریں - جسے پورے

مجھ کو دو ہزار آجائے تو میرا قرض رفع ہو جاتا ۔ اور پھر اگر دو چار برس زندگی اور ہوتی تو اتنا ہی قرض اور مل جاتا ۔ یہ بانچ سو تو، تمہاری جان کی قسم، متفرقات میں جا کر سو ڈیڑھ سو بیج رہیں گے۔ سو میرے صرف میں آجائیں گے ۔ مہاجنوں کا جر سودی قرض ہے وہ پندرہ سولہ کے باقی رہے گا ۔ اور وہ جو بابو صاحب سے منگوائے تھے ، قیمت اس چیز کی جو ہمارے مذہب میں حرام اور تمہارے مشرب میں حلال ہے ، سو وہ دے گئے ۔ ہاں کہ آج کل میں بابو صاحب کا خط مع ہنٹوی آجائے۔ بابو صاحب کے جو خطوط ضروری اور کواغذ ضروری میرے پاس آئے ہوئے تھے ، وہ میں نے پانچشنبہ ۲۶ مئی کو پارسل میں ان کے پاس روانہ کر دیے اور اس میں لکھ بھیجا کہ ہنٹوی اور میرے بھیجے ہوئے لغاتے جلد بھیج دو ۔ پانچشنبہ کو آج پندرہ دن پورے ہوئے ۔“

مرزا علاؤالدین خان کو لکھتے ہیں :

”بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب ! وہ زمانہ نہیں کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا ، ادھر درباری مل کو مارا ۔ ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھیں جا لوئی ۔ ہر ایک کے پاس مسک سہری موجود ۔ شہد لگاؤ چالو ۔ نہ مول نہ سود ۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ ہووہی کے سر ۔ ہاں ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا ۔ کبھی الور سے دلواوا ۔ کبھی ماں نے کچھ آگرہ سے بھیج دیا ۔ اب میں اور ہاسٹہ روپے آٹھ آئے کلکٹری کے ۔ سو روپے رام پور کے ۔ قرض دینے والا ایک میرا مختار کار ، وہ سود ماہ بمانہ لیا چاہے ۔ دل میں قسط اس کو دینی پڑے۔ انکم ٹیکس جدا ، چوکیدار جدا ، مول جدا ، ری جدا ، بیجے جدا ، شاگرد ہیشہ جدا ۔ آمد وہی ایک سو ہاسٹہ ۔ تنگ آ گیا ۔ گزارا مشکل ہو گیا ۔ روزمرہ کا کام بند رہنے لگا ۔ سونچا کہ کیا کروں ، کہاں سے گنجائش لکالوں ۔ شہر درویش برجوان درویش ۔ صبح کی قیرید سٹروک ، چاشت کا گوشت آدھا وات کی شراب و گلاب موقوف ۔ بس ہائس روپے سپینہ بجا ۔ روزمرہ کا خرچ چلا ۔ ہاروں نے پوچھا قیرید و شراب کب تک نہ ہو گے ۔“

کہا گیا جب تک وہ نہ ہلائیں گے۔ پوچھا کہ نہ ہیو گے تو کس طرح جیو گے؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔“
مرزا قربان علی بیگ کو لکھتے ہیں :

”میری جان ! کن اوہام میں گرفتار ہو۔ جہاں باپ کو بیٹ چکا اب چچا کو بیوی رو۔ خدا تجھ کو جیتا رکھے اور تیرے خیالات و احتمالات کو صورت و قوسی دے۔ یہاں خدا سے بھی تولع باقی نہیں۔ مخلوق کا کیا ذکر، کچھ یں نہیں آتی۔ آپ اپنا نمائشی بن گیا ہوں۔ رنج و ذات سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے آپ کو غیر تصور کیا ہے۔ جو ذکر مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں : لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یہ ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا ، بڑا کافر مرا۔ ہم نے از راہ تعلیم جب بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرامگاہ و عرض نشیمن خطاب دے دی۔ چونکہ یہ اپنے آپ کو شاہ قندرو سخن جانتا تھا۔ سفر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تہویز کر رکھا ہے۔ آئیے نجم الدولہ بہادر ! ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ۔ ایک قرض دار کو بھوگ ستا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔ اجی حضرت ! نواب صاحب ، نواب صاحب کہیے۔ او خاں صاحب ! آپ سلجوقی اور الفراسابی ہیں ، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔ کچھ تو ا کسو ، کچھ تو بوللو۔ بولے کیا بے حیا ، بے عزت ، کوٹھی سے شراب ، گندھی سے گلاب ، ہزاز سے کپڑا ، میوہ فروش سے آم ، صرف سے دام قرض لیے جاتا ہے۔ یہ ابھی تو سوچا ہوتا کہ کہاں سے دیا جائے گا۔“

میر سہدی مجروح کو لکھتے ہیں :

”سیرن صاحب کو جب تک نہ کہو میں دلی نہ ہلاؤں—
بھائی ہوش میں آؤ ، غور کرو۔ یہ مقدور مجھ میں نہیں کہ ان کو جہاں ہلا کر ایک الگ مکان رہنے کو دوں۔ اور اگر زیادہ نہ ہو تو تیس روپے سپینہ مقرر کروں کہ بھائی ! یہ لو اور دریہ اور جاؤڑی اور اجمیری دروازہ کا بازار اور لاہوری دروازہ کا بازار ناہنے پھرو۔

اور اردو بازار اور خاص بازار اور بلاق بیگم کا کوچہ اور خان دوراں
خان کی حویلی کے کھنڈر گتے پھرو۔ اے میر مہدی ! تو درمائدہ
و عاجز ہانی ہت میں بڑا رہے۔ میرن صاحب وہاں بڑے ہوئے دلی
دھکھنے کو ترسا کریں۔ سرفراز حسین نوکری ڈھونڈتا پھرے۔
اور میں ان غم ہائے جاں گداز کی تاب لاؤں۔ مقدور ہوتا تو دکھا دیتا
کہ میں نے کیا کیا۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔“

اور یوسف مرزا کے قام لکھنے ہیں :

”میری جان ! خدا تیرا نکمپان۔ جانتے ہو کہ علی کا بندہ ہوں۔
اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا۔ اس وقت کلو کے پاس ایک
روبیہ سات آنے باقی ہیں۔ اس کے بعد نہ کمپیں بے قرض کی امید ہے،
نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل۔ اگر رام پور سے کچھ آیا تو غیر
ورنہ اتنا اللہ و انا الیہ راجعوں۔“

یہ خطوط، غالب ہیں کا نہیں، اس پورے دور کا مرثیہ ہیں، جس میں
ہر فرد کی انفرادیت آندھیوں کی زد پر تھی۔ کیونکہ معاشی افراتفری کی
وجہ سے زندگی کی بنیادوں میں کھوکھلا پن پیدا ہو گیا تھا۔ جاہ و ثروت
اور عزت و آبرو کے جنازے نکل چکے تھے۔ عظمت رختہ کی صرف یاد باقی
رہ گئی تھی۔ زیست کے لیے کوئی سامان نہیں تھا۔ افلاس نے قرض کے
دروازے کھول دیے تھے۔ کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ نفسی
نفسی کی کیفیت تھی۔ یہ گویا ایک میدان حشر تھا، جس میں ہر ایک کو
اپنی اپنی فکر تھی۔ سورج سوا نیڑے پر آ گیا تھا اور لوگ اس عالم میں
بڑے تلعلہ رہے تھے۔ غالب پر ان حالات نے گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔
ان کی زندگی کا ہر لمحہ ان حالات پر خون کے آنسو چائے گذرا ہے۔ انہیں
صرف اس بات ہی کا غم نہیں ہے کہ ان کے لیے زندگی دوبار ہو گئی ہے
— بلکہ اس بات کا بھی غم ہے کہ ان حالات میں دوسروں کے لیے بھی
زیست مشکل ہے :

ہونی جن سے توقع خستگی کی داد ہانے کی

وہ ہم سے ابھی زیادہ خستہ تیغ ستم نکلیے

وہ اس پر کڑھتے ہیں، پریشان ہوتے ہیں — بہت کچھ کرنا چاہتے
ہیں لیکن کچھ کر نہیں سکتے — اس لیے بے بسی اور کس پیرسی کا شکار

ہوجاتے ہیں۔ غالب کی زندگی اس بے بسی اور کسی ہمبسی سے عبارت ہے۔ اسی بے بسی اور کسی ہمبسی کے محسوس غم کے بادل اٹھے ہیں اور غالب کی زندگی کے افق پر منڈلانے لگے ہیں، چھا گئے ہیں۔ اور اس طرح برصے ہیں کہ غالب کو شہر اور کر دیا ہے۔

ظاہر ہے اس غم کو پیدا کرنے میں زمانے کا ہاتھ ہے۔ اسی لیے غالب اس غم کو پیش کرتے ہوئے غم دوراں کے شکوہ سنج نظر آتے ہیں۔ اس غم کی نوعیت اگرچہ بظاہر انفرادی ہے لیکن در حقیقت وہ ایک بڑا پس منظر رکھتی ہے اور اسی لیے وہ غالب کے یہاں ایک اجتماعی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ وہ غالب کے انفرادی غم کے بجائے ایک طبقے کا غم، ایک معاشرت کا غم، ایک تہذیب کا غم اور ایک نظام کا غم ہوجاتا ہے۔ غالب اس غم کو اسی طرح محسوس کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ غالب کے زمانے کے عام سماجی انتشار اور معاشی الراتفری نے بڑی حد تک ان کے یہاں غم دوراں کے اس احساس کو پیدا کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی میں کچھ اور معاملات بھی ایسے ہیں، جو اس کو جگانے میں برابر کے شریک ہیں۔ غالب کی زندگی میں سب سے پہلی ٹھوکر ان کی یتیمی تھی اور غالب اس زندگی میں دو بار یتیم ہوئے۔ پہلے ان کے والد عبداللہ بیگ خاں کا انتقال—والد کے انتقال کے بعد ان کے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے ان کی پرورش اپنے ذمے لی۔ لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ وہ بھی اس دنیا سے چل بسے۔ انہوں نے خود لکھا ہے ”پانچ برس کا تھا جو باپ مر گیا۔ آٹھ برس کا تھا چچا مر گیا۔“ اس طرح غالب گویا دوسری بار یتیم ہوئے—کم از کم انہوں نے محسوس ہی کیا۔ اور اگرچہ چچا کے انتقال کے بعد تنہا ہی ان کی زندگی نسبتاً زیادہ آرام و آسائش سے گزری لیکن یہ خیال ان کے دل میں بیٹھ گیا کہ وہ اس زندگی میں بے یار و مددگار ہیں۔ اگر شعوری طور پر نہیں تو کم از کم غیر شعوری طور پر وہ اس اعتبار سے اپنے اندر اور آس پاس ایک کمی سی ضرور محسوس کرتے رہے۔ یہ ایک بہت بڑا خلا تھا، جو ان کی زندگی میں کبھی بھی پر نہ ہو سکا۔ لڑکپن میں ان کا لہو و لعب میں بڑ جانا، درحقیقت اس غم کو غلط کرنے کے لیے ایک فرار کا ذریعہ بھی ہے۔ پھر سمنہ ناز یہ ایک اور تازہ یاد یہ ہوا کہ ۳۰ سال کی عمر میں

ان کی شادی کر دی گئی۔ اس شادی کو انہوں نے ساری زندگی ایک مصیبت ہی سمجھا کیوں کہ اس کی وجہ سے وہ بے یار و مددگار زندگی کے نا پیدا کنار سنٹر میں پھینک دیے گئے۔ اور ساری زندگی انہیں کنارہ نہ ملا۔

—وہ خود اس کو 'جیسی دوام' کہتے ہیں۔ لکھا ہے: 'مانویں رجب ۱۲۲۵ء کو میرے واسطے حکم دوام جیسی (یعنی نکاح) صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل خانے سے بھاگا۔ تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایاں کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی جیسی میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا یہ قیدی گریز پا ہے، دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فکڑ، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار، مشقت مقرر اور مشکل ہو گئی۔ طاقت یک قلم زائل ہو گئی۔ بے حیا ہوں۔ سال گذشتہ بیڑی کو زاویہٴ زندان میں چھوڑا۔ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ، مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا۔ کچھ دن کم دو سہنے رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں کیا۔ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکم رہا تو دیکھیے کب صادر ہو؟—ایک ضریف سا احوال ہے کہ اس ماہ ذی الحجہ میں چھوٹ جاؤں۔ پھر تقدیر بعد ربانی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بھی بعد لجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤں گا'۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مقابل زندگی ان کے لیے تمام عمر ایک مصیبت بنی رہی۔ شادی شدہ زندگی کے معاملات و مسائل نے نہ جانے کیا کیا کچھ ان سے کرایا۔ ہر حال اس زندگی نے غالب کے یہاں 'لغنی' حیات کے احساس کو زیادہ شدید کیا۔ اور زیست کرنی انہیں ہمیشہ دشوار نظر آئی۔ غم دوران کے احساس کو ان کی زندگی کے اس پہلو نے بھی شدید سے شدید تر کیا ہے۔ چنانچہ ساری زندگی میں انہیں اپنے آس پاس اس کی حکمرانی نظر آتی ہے۔

غالب کو ان تمام حالات نے اس بات کا یقین دلایا کہ مثبت ان کے خلاف ہے اور اسی لیے زمانہ ان کے لیے سازگار نہیں ہے۔ یہ احساس کچھ اور بھی شدید ہوا، جب انہوں نے اینٹوں اور ٹیکانوں کی سردسہری دیکھی۔ جب انہیں ایک زمانہ مخالفت پر آمادہ اور دشمنی پر کمر بستہ نظر آیا۔ لوگوں نے خطوں میں انہیں کالیاں لکھیں اور طرح طرح سے ان کی پکڑی

اچھالی۔ قسمت نے انھیں قید و بند کی صعوبتوں تک سے دو چار کیا۔
 غرض وہ "اوضاعِ اپنے زماں" کے ہمیشہ شکوہ منج رہے۔ انھوں نے تو
 ہمیشہ ان کے ساتھ نیکی کی لیکن اسی کا بدلہ انھیں ہمیشہ بدی کی صورت
 میں ملا :

کہوں کیا عویٰ اوضاعِ اپنے زماں غالب

بدی کی آس ہے، جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

اس کے ساتھ ہی بے مہری "بارانِ وطن" سے بھی انھیں ہمیشہ شکوہ
 رہا۔ اس کا اظہار انھوں نے واضح طور پر کیا ہے :

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب

تم کو بے مہری "بارانِ وطن" یاد نہیں ؟

اسی لیے تو وہ اپنے آپ کو مردمِ گزیدہ کہتے ہیں :

بانی سے سنگِ گزیدہ ڈرتے جس طرح اسد

ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردمِ گزیدہ ہوں

یہی وجہ ہے کہ ان کی نظریں دلی میں "قحطِ غمِ الفت" دھکیلتی ہیں

— اور وہ سوچ کر پریشان ہو جاتے ہیں کہ اگر اس معمورے میں رہے تو

کھائیں گے کیا۔ کھانے کے لیے غمِ الفت بھی تو یہاں موجود نہیں :

ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ الفت اسد

ہم نے یہ سنا کہ دلی میں رہیں، کھائیں گے کیا ؟

اور غالب ان حالات سے اس حد تک متاثر ہوئے کہ دہر میں انھیں

"نقلیِ وفا" وجدِ تسلی ہوتا ہوا نظر نہ آیا۔ ان کے خیال میں تو یہ ایک ایسا

لفظ ہے ، جو کبھی بھی شرمندہ معنی نہ ہو سکا :

دہر میں نقلیِ وفا ، وجدِ تسلی نہ ہوا

ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا

غرض غالب کو لوگوں کی ایک ایک بات اور ایک ایک انداز میں

زمانے کی سرد مہری نظر آتی۔ کہوں کہ انھیں اس بات کا یقین تھا کہ یہ

تمام حالات زمانے کی افراطی ہی کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں ۔

غالب کی زندگی اور شخصیت پر زمانے کا یہ غم اسی لیے چھایا ہوا

معلوم ہوتا ہے ۔ اس کو الگ کر لیا جائے تو ان کے یہاں کوئی اور اہم

بات باقی نہیں رہتی ۔ ان کے فکر و فن دونوں میں اس کی کارفرمائی ہے ۔ ان

کے سارے خیالات و نظریات اسی کے گرد گھومتے ہیں۔ جس خیال کا اظہار ہمیں انہوں نے کیا ہے، جو کیفیت بھی انہوں نے بیان کی ہے، جو تجربات بھی انہوں نے پیش کیے ہیں، ان میں غم دوراں کا اثر کسی نہ کسی صورت میں ضرور جھلکتا ہے۔ یہ اثر ان کے لیے مفید بھی ثابت ہوا ہے، مضر بھی۔ مفید تو اس طرح کہ اس کے سہارے انہیں زندگی کی سنگین اور ٹھوس حقیقتوں کا احساس ہوا ہے۔ غالب طبعاً رومانی تھے۔ اس اثر نے ان کی رومانیّت میں اعتدال اور توازن کی کیفیت پیدا کی ہے، جس کے سہارے وہ حقیقت سے قریب ہوئے ہیں اور مضر اس طرح کہ اس غم نے غالب کو بڑی حد تک بھپایا ہے۔ ہوں یہ بات صحیح ہے کہ غالب کے چاں بڑی زندگی اور جولانی تھی۔ وہ تھک کر بیٹھنا نہیں جانتے تھے۔ انہیں جد و جہد سے منہ موڑنا نہیں آتا تھا۔ لیکن غم دوراں نے ان کی ان صلاحیتوں کو بڑی حد تک محدود کر دیا۔ زمانے کا غم نہ ہونا تو ان کی یہ صلاحیتیں زندگی کے کسی میدان میں جولانیاں دکھا سکتی تھیں اور غالب نہ جانے کیا کچھ کر سکتے تھے۔ لیکن زمانے کے غم نے ان کا راستہ روک لیا۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتے تھے، نہ کر سکے۔ پھر بھی انہوں نے جد و جہد اور عمل کے خیال کو اپنے دل سے نہیں نکالا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہیں کہ زمانے کے غم نے انہیں زندگی بسر کرنا سکھایا ہے۔ وہ پریشانیوں سے گھبرائے نہیں ہیں کیوں کہ یہ پریشانیاں انہیں درس عمل دیتی رہی ہیں۔ اسی لیے تو وہ ان سے خوش ہوتے ہیں :

ان آبلوں سے ہاؤں کے گھبراہ گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش ازیک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خاند ہم

ان اشعار میں زندگی بسر کرنے کی خواہش ہے، عمل کا جذبہ ہے۔ ٹھوڑی سی اذیت بردستی چاں ضرور پیدا ہوتی ہے لیکن یہ اذیت بردستی درحقیقت فاسزگار حالات میں بھی ولولوں کے چراغوں کو جلانے رکھنے کی آرزو ہے۔ اس کیفیت نے غالب کو عظیم بنانے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ اور یہ عظمت سب سے زیادہ ان کی شاعری کے آئینے میں اپنے آپ کو رونما کرتی ہے۔

غالب کی شاعری حسن و عشق کے معاملات، حیات و کائنات کے مسائل اور عمرانی حالات کی ترجمانی پر مشتمل ہے۔ ان سب کی ترجمانی میں غم دوران کے اثرات ملتے ہیں۔ اور اس حد تک ملتے ہیں کہ غالب کا پیش کیا ہوا کوئی خیال یہی اس سے الگ نہیں معلوم ہوتا۔ سب کی جڑیں غم دوران کے احساس میں پیوست نظر آتی ہیں۔

جہاں تک عشقیہ شاعری کا تعلق ہے، غالب اس سلسلے میں خاصے رومانی ہیں۔ لذت کا خیال اور تعیش کا احساس ان کے یہاں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے تصور عشق کی بنیادیں تمام تر مادیت اور جنسیت پر استوار ہیں۔ لیکن اس کے باوجود حسن و عشق کی مختلف کیفیات کو پیش کرتے ہوئے غم دوران کا خیال ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہوتا۔ غالب نے اس کے سہارے اپنی عشقیہ شاعری میں رومان اور حقیقت کا ایک سنگم بنایا ہے۔ ان کے یہاں لذت کے احساس اور تعیش کے خیال کے باوجود وہ جو ایک وقار اور رکھ رکھاؤ کی کیفیت ملتی ہے، وہ جو ایک لیے لیے دینے دینے والا انداز نظر آتا ہے، اس میں اسی صورت حال کو دخل ہے :

گو میں رہا رہیں ستم ہائے روزگار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

سخنی کشان عشق کی پوچھے ہے کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے
قبری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم یہ بہت سے سم ہوئے
لکھنے رہے جنوں کی حکایات غوغاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

ہوئے ہیں ہاؤں پہلے ہی نبرد عشق میں زخمی
ندیا کا جائے مجھ سے تیرا جائے مجھ سے
سنبھلنے دے مجھے اے نا ابدی کیا قیامت ہے
کہ دامن خیال ہار چھوٹا جائے مجھ سے

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

غم اگرچہ جانگسل ہے یہ کہاں بھی کھل ہے
غم عشق اگر نہ ہوتا غم روؤ کار ہوتا

خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
پتھکنے میں جرخِ فیلِ فام کے

ہے غیر گرم ان کے آنے کی
آج ہی کھر میں پوریا نہ ہوا

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا کدہ
اس میں کچھ شائبہ "خوبی" لقمہ بھی تھا

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

لکڑی کو بھڑکے حادثہ کا محفل کر نہیں سکتی
مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

دل نا جگر کہ ساحلِ دریا نے خون ہے اب
اس وہگزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھوں رکھوں گر حساب میں

ان اشعار میں مختلف عشقیہ کیفیات و معاملات کا بیان ہے لیکن یہ بیان تمام تر جذباتی نہیں ہے۔ عقل و شعور بھی ان میں کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب نے معاملات و کیفیات عشق کو زندگی کی الجھنوں سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا ہے۔ ان کا عشق ایک پس منظر رکھتا ہے۔ اور اس پس منظر میں غم دوروں کے خط و خال نمایاں نظر آتے ہیں۔ اسی لیے ان کا عشق محض اکتسابِ لذت کا نام نہیں ہے۔ وہ تو ایک میدانِ کارِ زار ہے جس میں بے دریغ ناسازگار حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور یہ ناسازگار حالات صرف عشق ہی کے پیدا کیے ہوئے نہیں ہوتے، زمانے کی ناسازگار کیفیت بھی اس میں برابر کی شریک

ہوتی ہے ۔ چنانچہ غم عشق اکثر روزگار میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور اس غم روزگار کے ہاتھوں غم کے ایسے پہاڑ ٹوٹنے ہیں کہ محبوب کی وفا سے بھی جس کی تلافی نہیں ہو سکتی ۔ پھر حال غالب کے خیال میں غم عشق غم دوراں سے خالی نہیں ہوتا ۔ عشق کی بڑائی تو اس میں ہے کہ وہ غم عشق اور غم دوراں دونوں پر قابو پالے کیوں کہ اسی عالم میں وہ رہیں سمجھائے روزگار ہونے کے باوجود محبوب کے خیال سے غافل نہیں رہ سکتا۔ اور یہی ان کے خیال میں عشق کا کمال ہے ۔ لیکن یہ کام آسان نہیں ہے ۔ کیوں کہ ایسا کرنے کے لیے گروگر کو سنبھلنا پڑتا ہے۔ مرمر کے جینے کے آداب سیکھنے پڑتے ہیں ۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک غم دوراں پر قابو نہ پا لیا جائے ۔ کیوں کہ غم دوراں غم عشق کو شدید سے شدید تر بنا دیتا ہے ۔ غالب غم عشق سے نہیں گھبرائے ، غم دوراں سے گھبرائے ہیں ۔ ان کی طاقت لکھ کو کوب حوادث کا تحمل نہیں کر سکتی کیوں کہ وہ تو محض بتوں کے ناز اٹھانے کی خاصیت ہے ۔ اسی لیے زمانے کا غم انہیں بوری طرح ستاتا ہے ۔ جہاں تک کہ ان کے دل میں ذوق وصل و یاد ہار تک باقی نہیں رہتی۔ دامن خیال یار ان سے چھوٹنے لگتا ہے۔ اور وہ بوری طرح غم دوراں کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ یہ غم دوراں غم عشق کو بھی پس منظر میں ڈال دیتا ہے۔ اسی لیے تو غالب اس سے گھبرائے ہیں ۔

غالب کی عشقیہ شاعری انہیں خیالات کی تفسیر ہے ۔

یہ ٹھیک ہے کہ غالب فلسفی نہیں ہیں لیکن ان کی شاعری میں فلسفہ ضرور ہے ۔ انہوں نے حیات و کائنات کے مسائل پر غور ضرور کیا ہے ۔ سوچنے کی کوشش ضرور کی ہے ، اس لیے ان کی شاعری میں فلسفیانہ آہنگ جگہ جگہ ملتا ہے ۔ اس غور و فکر کے بعد جو نتائج انہوں نے نکالے ہیں ، ان میں غم دوراں کے احساس کی جھلک بھی نظر آتی ہے ۔ ان کے بنیادی فلسفیانہ خیالات و نظریات کی تہ میں اس کے اثرات بڑی شدت سے کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ جب وہ سوچتے ہیں کہ قید حیات و بند غم ایک ہی چیز کے دو نام ہیں ، جب انہیں یہ خیال آتا ہے کہ کشا کس پائے ہستی سے معنی آزادی ممکن نہیں ، جب انہیں یہ حقیقت نظر آتی ہے کہ ہستی فنا پر دلالت کرتی ہے ، جب ان کے جہاں یہ شعور بیدار ہوتا ہے کہ ساقی گردوں سے نئے عشق کی خواہش ایک لایعنی سی بات ہے کیوں کہ خود

وہ ایک دو چار جام واژگون لیے بیٹھا ہے ، جب وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ریخ کا خوگر ہونا ، ریخ کو مٹا دیتا ہے ، جب انہیں خموشی میں یہاں لاکھوں غوں گشتہ آرزوئیں نظر آتی ہیں ، جب وہ شیشہٴ دل کو سیلیٴ خارا سے لالہ رنگ دیکھتے ہیں ، تو در حقیقت اس کا بھرک زمانے کا غم ہی ہوتا ہے۔ غم دوران کا احساس ان کے یہاں اتنا شدید نہ ہوتا تو وہ اس طرح کے شعر پر گز نہیں کہہ سکتے تھے :

بید حیات و بند غم ، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے چلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیٴ آزادی
ہوئی زلیخیر موج آب کو فرصت روانی کی

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
ہاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے

مٹے عشرت کی خواہش ماق گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگون وہ بھی

ریخ سے خوگر ہوا انسان ، تو مٹ جانا ہے ریخ
منسکایں مجھ پر بڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

خموشی میں نہاں غوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغ کشتہ ہوں میں ، بے زبان ، گور غریباں کا

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے جی
انسان ہوں ، پیالہٴ و ساغر نہیں ہوں میں

حالاں کہ ہے یہ سیلیٴ خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشے بہ مٹے کا گہاں ہے

حنائے ہائے غزاں ہے ، ہزار اگر ہے یہی
دوام کائنات خاطر ہے عیش دنیا کا

ان اشعار میں غالب کا سارا فلسفہ نہیں ہے لیکن ان کے فلسفے کے بٹ ہے پہلو ان میں ضرور موجود ہیں۔ انسانی زندگی میں موت اور فنا ، غم اور پریشانی ، بے بسی اور عبوری کے خیالات جہاں کہیں بھی پیدا ہوتے ہیں ، وہاں صاف نظر آتا ہے کہ غم دوران ہی ان سب کا محرک ہے غالب اگر خود غم دوران سے روشناس نہ ہوتے اور اگر انسانی زندگی میں انہیں اس کا دروازہ کھلتا دکھائی نہ دیتا تو وہ زندگی کو اس زاویے سے نہ دیکھتے۔ کیوں کہ وہ اس مزاج کے انسان نہیں تھے۔ اس کے بغیر تو انسانی زندگی ان کے نزدیک محض سرور و انبساط اور مسرت و شادمانی کا قام بھی ۔

غم دوران کے شدید احساس نے غالب کے چار عمرانی معاملات کا شعور بھی پیدا کیا ہے ۔ ان کی شاعری میں ایک تہذیب ، ایک معاشرت ، ایک نظام کے سرور و فتنہ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس تہذیب اور معاشرت کے ختم ہونے کا انہیں بڑا غم ہے ۔ وہ اس پر خون کے آنسو بہاتے ہیں ۔ کیوں کہ اس تہذیب اور معاشرت کے خاتمے نے ماری و فتنی کو انتشار اور افراتفری کا شکل کر دیا تھا ۔ غالب جب اس تہذیب کے ختم ہونے کا تذکرہ کرتے ہیں ، تو گویا وہ اس انتشار اور افراتفری کا ماحم ہوتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی انتشار اور افراتفری نے غالب کو تہذیب اور معاشرت کا ماحم بنایا ہے ۔ غم دوران کے بغیر غالب اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے ۔ یہ باتیں انہوں نے دشنہ و خنجر ، اور بادہ و ساحر ، کے روپ میں ضرور کی ہیں لیکن تہذیبی ، معاشرتی اور عمرانی معاملات کے بارے میں انہوں نے جو کچھ کہنے کی کوشش کی ہے ، وہ اگرچہ بہت واضح نہیں ہے، لیکن دیکھنے والے اسے دیکھ سکتے ہیں ۔ یہ اشعار اس تہذیب، معاشرت اور نظام کا مرثیہ ہی تو ہیں ، جس کو غالب اپنی آنکھوں کے سامنے فنا ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے :

نوڑ پڑھے جب کہ ہم جام و میو بھر ہم کو کیا
آہاں ہے بادہ کفام کو یوسا کرے

وہ بادہ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھنے بس اب ؟ لذت خواب سحر گئی

شق ہو گیا ہے سینہ غوتا لذت فراق
تکلیف بردہ داریؔ زخم جگر گئی

میں اور بزم مٹے سے یوں تشنہ کلام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہؔ ساقی کو کیا ہوا تھا

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے ذلیل صحرؔ سو خاموش ہے

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اڑنے لہ ہائے تھے کہ گدازار ہم ہوئے

باد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں
جوئے خون آنکھوں سے جتنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سچھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

یاشب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہٴ بساط
داساق باغبان و کف کل فروش ہے
اور صبح دم جو دیکھیے آکر دو بزم میں
نے وہ سرور و سوزؔ نہ جوش و خروش ہے
داغ فراق صحت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہےؔ سو وہ بھی خاموش ہے

یہاں غالب نے جام و سبو کے ٹوٹ جانے کے بعد بادۂ کلفام کے برسنے کا جو ذکر کیا ہےؔ بادۂ شبانہ کی سرمستیوں کے ختم ہونے کا جو پیام سنایا ہےؔ ظلمت کدے میں شب غم کے جوش کی جو کیفیت انہیں نظر آئی ہےؔ آشیانے کے قریب دام سخت کے پنہاں ہونے کو جس طرح انہوں نے محسوس کیا ہےؔ شام فراق میں جس طرح جوئے خون انہوں نے آنکھوں سے جتنے ہوئے دیکھیے ہے اور داغ فراق صحت شب کی جلی ہوئی

شمع کو جو انہوں نے خاموش پایا ہے ، اُن میں تہذیبی اور عمرانی شعور کی جھلک صاف نظر آتی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ غم دوراں کے شدید احساس نے ان سے اس طرح کے اشعار کی تخلیق کرائی ہے ۔

غالب اس اعتبار سے ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں !

اس ساری بات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالب زندگی کے شہدائی تھے لیکن انہیں زندگی کا غم بھی تھا اور یہ غم ان کی ساری شخصیت پر محیط ہے ۔ زندگی کی شہنگی نے ان کے یہاں مسرتوں کے احساس کو یدار کیا ہے اور مسرتوں کے احساس نے ان کی شاعری کے بڑے حصے کو دامنِ باغباں اور کفِ گل فروش بنا دیا ہے ۔ لیکن اس کے باوجود اس میں ایک کسک سی محسوس ہوتی ہے اور اس کسک میں کا یہ اثر ہے کہ وہ کلِ نغمہ اور پردہ ساز ہونے کے بجائے ان کی اپنی شکست کی آواز بن گئی ہے :

نے کل نغمہ ہوں ، نہ پردہ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

غالب
کی
عشقیہ شاعری

اردو شاعری کی روایت میں جذبہ عشق کی ترجمانی کا پہلہ دوسرے موضوعات کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ بھاری نظر آتا ہے ۔ مجد قلی قطب شاہ کے زمانے سے لے کر موجودہ دور تک ، مختلف زمانوں میں اردو شعراء نے جذبہ عشق کی ترجمانی مختلف زاویوں سے کی ہے اور ماحول اور حالات کے زیر اثر مختلف تصورات عشق کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے ۔ جی وجہ ہے کہ ان تصورات میں یکسانی اور یک رنگی نظر نہیں آتی ، بلکہ رنگا رنگی کا احساس ہوتا ہے ۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مختلف زمانوں کے معاشرتی اور تہذیبی حالات ان تصورات عشق کی تشکیل کا باعث بنے ہیں ۔ اردو شاعری کی روایت میں کہیں عشق کے پرانے اور فرسودہ تصورات کو قیس اور فرہاد ، لیلیٰ اور مجنون ، شیریں اور فرہاد کی داستانوں کے پردے میں پیش کیا گیا ہے ، کہیں عشق کے خالص جنسی اور جسمانی تصورات کی ترجمانی کی گئی ہے ۔ کہیں عشق و عاشقی کے بعض تصورات کی حدیں تصوف اور معرفت و حقیقت سے جا ملی ہیں اور کہیں عشق و عاشقی کے اس تصور میں وسعتیں پیدا کی گئی ہیں اور اس کے مختلف پہلوؤں کی فلسفیانہ تحلیل کا رجحان نظر آتا ہے ۔ غرض اردو شاعری کی روایت نے مختلف اور متنوع تصورات عشق کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے ۔ یہی سبب ہے کہ وہ ان تصورات کی رنگا رنگ پہلوؤں کا ایک گلدستہ نظر آتی ہے ۔

غالب نے بھی اردو شاعری کی اس روایت میں اپنے تصورات عشق کو پیش کر کے بعض نئے پہلوؤں کی ترجمانی کی ہے ۔ غالب کا تصور عشق اردو شاعری کے روایتی تصورات عشق سے مختلف ہے ۔ یہ ٹھیک ہے کہ

ان کے یہاں بعض جگہ روایتی تصورات عشق کی جھلک نظر آتی ہے لیکن اس سلسلے میں جن افکار و خیالات کی انہوں نے ترجائی کی ہے ، وہ ماورائی نہیں ہیں ۔ ان میں بھی حقیقت پسندی کا احساس ہوتا ہے اور عشق کے وہ تصورات نمایاں نظر آتے ہیں ، جن کی بنیاد صحت مندی پر استوار ہے ۔ وہ صرف عشق کا اقلاطونی تصور پیش نہیں کرتے بلکہ روایتی عشق کی ترجائی میں بھی بنیادی طور پر عشق کے جسمانی اور جنسی تصور کو اپنے سامنے رکھتے ہیں ۔ اس لیے کہ یہ ان کا مزاج ہے ۔ وہ جب پرستش کی نئی کرتے ہیں اور خواہش کو اپنے عشق کی بنیاد قرار دیتے ہیں ، تو گویا اسی پہلو کو نمایاں کر کے پیش کرتا چاہتے ہیں ۔ ان کا مشہور شعر ہے :

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا ہوجتا ہوں اس بت یداد گر کو میں

اس شعر میں غالب نے صاف صاف اس حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ جو لوگ صرف عشق کو پرستش سے عبارت سمجھتے ہیں وہ احمق اور نادان ہیں کیوں کہ حسن اور محبوب کی پرستش ، بغیر کسی مقصد اور مدعا کے بے معنی چیز ہے ۔ اور پھر اس بات کی وضاحت کی ہے کہ خواہش عشق کی بنیاد ہے اور خواہش غالب کے خیال میں کسی بنیادی انسانی جذبہ کی تسکین اور کسی جسمانی تقاضے کی تکمیل ہے ۔ غالب نے اس شعر میں اردو شاعری کے روایتی تصورات عشق سے انحراف کیا ہے ۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ بغاوت کی ہے کیوں کہ حسن اور محبوب کی پرستش بغیر کسی مدعا ، مقصد اور خواہش کے اردو شاعری کی روایت میں عام تھی ۔ غالب نے نہایت جرأت اور بے ہائی کے ساتھ اس تصور سے اختلاف کیا اور حسن اور محبوب کی صرف بے مقصد پرستش کو بے معنی قرار دیا ۔ اس سے ان کے انقلابی اور باغیانہ مزاج کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ ایک ایسے نئے تصور عشق کو پیش کر رہے تھے ، جس کی بنیاد حقیقت پسندی پر استوار تھی ۔ ویسے یہ بات صحیح ہے کہ غالب کے یہاں عشق و عاشقی کے معاملات کی ترجائی صرف اس تصور تک محدود نہیں ہے ۔ ان کے یہاں عشق کا وہ تصور بھی ملتا ہے جس کی بنیادیں روحانیت پر استوار ہیں اور جس کی تہ میں معرفت اور حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کا خیال اور احساس بھی

موجود ہے۔ لیکن وہ ان کی شاعری کا وہ حصہ ہے جس کو ہم تصور اور فلسفے کے تحت رکھ سکتے ہیں۔ اس حصے میں غالب کی شعلیت کا ایک اور پہلو ابھرتا ہے، جس میں نسبتاً زیادہ فکری گہرائی نظر آتی ہے۔

غالب سے قبل اردو شاعری کی روایت میں عشق کے جو تصورات موجود تھے، ان میں سے بیشتر کی بنیادیں زوایق تصورات پر استوار تھیں۔ بعض تصورات فارسی شاعری کی روایت سے اردو شاعری کی روایت میں آئے اور بعض شاعروں نے انہیں تصورات کو اپنا معیار تصور کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی شاعری میں پیش کیے جانے والے مختلف تصورات عشق کسی نہ کسی طرح اردو شاعری کی روایت میں داخل ہو گئے۔ لوگوں نے اس کی پیروی بھی کی۔ اس وجہ سے کہ اس کا اثر بہت وسیع اور ہمہ گیر تھا۔ وہ اس سے دامن نہیں چھڑا سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری کی روایت کا مطالعہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ بیشتر شعراء ایسے تصورات عشق کی ترجمانی کرتے ہیں، جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً فارسی شاعری کی روایت کی طرح اردو شاعری کی روایت میں حسن پرستی بہت عام ہے۔ عشق کا منبع اور مخرج یہی حسن پرستی ہے۔ اس کے گرد اس کے مختلف تصورات گھومتے ہیں۔ عشق کرنے والا حسن سے متاثر ہوتا ہے۔ جس سے عشق کیا جاتا ہے، وہ ایک ایسی مخلوق ہے، جو عشق کرنے والے کو درخور اعتنا نہیں سمجھتی۔ بلکہ عجیب و غریب صورت حالات یہ پیدا ہوتی ہے کہ وہ جذب صادق رکھنے والے عاشق سے کنارہ کشی اختیار کر کے یا اختلاف کر کے دوسروں سے بیان وفا باندھتا ہے۔ اس لیے رقابت اردو شاعری کی روایت میں بہت عام ہے اور اس میں رقیب ایک بہت نمایاں کردار ہے۔ عاشق اس کے مقابلے میں ایک پامال مخلوق ہے، جو معشوق کی بے اعتنائی کی تاب نہ لا کر اپنی پوری انفرادیت کو ختم کر دیتی ہے اور اس کی کوئی حیثیت اس پورے نظام میں باقی نہیں رہتی۔ ناچار وہ غم کھاتا ہے۔ صحراؤں کی خاک چھانتا ہے۔ محبوب کے کوچے میں مارا مارا پھرتا ہے۔ دربان و پاسبان اس کی خبر لیتے ہیں۔ غرض وہ ایک ایسی مخلوق بن جاتی ہے، جس میں تمام تر افعال پسندی نمایاں ہو جاتی ہے۔ بالآخر وہ مر جاتا ہے لیکن مر کر بھی اسے چین نہیں ملتا۔ اس کے مرقد کے نشانات مٹا دیے جاتے ہیں اور محبوب کی ستم زانیاں اسے مرنے کے بعد بھی چین سے

نہیں بیٹھنے دیتیں۔ تقریباً تمام اردو شاعروں کے ہاں اس قسم کے خیالات ضرور ملیں گے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ بیشتر اردو شاعروں کے ہاں عشق کے جو تصورات ملتے ہیں، ان میں ایک عام انتہائیت پسندی کا احساس ہوتا ہے اور زندگی کی رسی، اس کی جولانی، احساس نشاط اور طریقہ خیالات اس میں دور دور تک نظر نہیں آتے۔ اگر اس قسم کے خیالات کی ترجیحی ملتی بھی ہے، تو اس میں اس صورت حالات کے رد عمل کی وجہ سے ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جس میں چھیڑ چھاڑ، لاک ڈاؤن اور عالمہ ہندی کے موضوعات زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ غالب سے قبل اردو شاعری کی روایت انہی دو میلانات سے عبارت نظر آتی ہے۔

غالب کی عشقیہ شاعری نے اس روایت کے سامنے میں آنکھ کھولی۔ اس نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے آس پاس اور گرد و پیش اس قسم کے تصورات عشق کو دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں بھی یہ تصورات بڑی حد تک نمایاں ہوئے۔ خاص طور پر غالب کے ابتدائی دور کی شاعری میں اس روایت کا اثر خاصا نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کا ایک سبب فارسی شاعری کی روایت سے ان کی گہری دلچسپی بھی ہے۔ اس زمانے میں، جیسا کہ اردو کے بعض نقادوں نے تسلیم کیا ہے، ان کے ہاں جو عشقیہ مضامین نظر آتے ہیں، ان میں سے بیشتر رسمی اور روایتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی ذہانت ان مضامین میں بھی اپنا جوہر دکھاتی ہے اور ان کی صداقت اور اخلاص ہندی کو ان اشعار میں بھی بڑی آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ان مضامین میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ غالب نے روایتی انداز کے پردے میں ایسی باتیں کہی ہیں، جن سے اس روایت کی تضحیک کا پتہ بھی نمایاں ہوتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ غالب نے ان تمام تصورات کو پوری طرح تسلیم نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ ان کو مضحکہ خیز بھی خیال کرتے تھے۔ چنانچہ ایسے اشعار ان کے دیوان میں جگہ جگہ مل جائیں گے، جن میں خاص روایتی انداز موجود ہے لیکن جن کو پیش کرتے ہوئے وہ ایسے پلوقلہ کو نمایاں کرتے ہیں، جن میں احساس مزاح کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ یہ چند اشعار دیکھیے :

جز قیسی اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحراء مگر، بہ لنگی چشم مسود تھا

قیسے بغیر مر نہ سکا کوہکن، اسے
سر گشتہٴ خار رسوم و قیود تھا

کہنے ہو نہ دیں گے ہم، دل اگر بڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے، ہم نے مدعا پایا
حال دل نہیں معلوم، لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بازیا ڈھونڈا، تم نے بازیا پایا
شور ہند ناصح نے، زخم ہر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی ہو چلے، تم نے کیا مزا پایا ؟
شوق ہر رنگ، رقیب ہر و سامان نکاز
قیس تصویر کے پردے میں بھی عرباں نکاز

میرزا خط ہے، ترا کا کل سرکش نہ دھا
یہ زمرہ بھی حریف دم الفی نہ ہوا

بغل میں شہر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں، ورنہ
سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے ہنماں کا

مانع وحشت خراس ہائے لیلای کون ہے
خاندانہٴ بھونو صحرا گرد بے دروازہ تھا

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کہا ؟
حصرت ناصح گر آئیں، دیدہ و دل فروش راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھاویں گے کیا ؟
گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھا ہوں میں
یہ جنوں عشق کے الداز چھٹ جائیں گے کیا ؟

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو ؟
اک نمائشا ہوا، گلا نہ ہوا

کتنے شہریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
 گالیاں کھا کے بے سزا نہ ہوا
 میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد !
 سنک اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

عرض و نیاز عشق کے قابل نہیں رہا
 جس دل پہ ناز تھا مجھے ، وہ دل نہیں رہا
 ہو گئی ہے غیر کی شہریں زبانی کلوگر
 عشق کا اُس کو گان ہم بے زبانوں پر نہیں

نیاست ہے کہ سن لیلٰی کا دشت قس میں آنا
 تعجب ہے وہ بولا ”یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں !“

ہے کیا جو کس کے ہالدمے؟ میری بلا ڈرے
 کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں ؟
 ”غیر سے رات کیا بتی؟“ یہ جو کہا تو دیکھئے
 سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ ہوں

کیا خوب ! تم نے غیر کو یومہ نہیں دیا
 بس چپ رہو ، ہمارے بھی سنہ میں زبان ہے

آنکھ کی تصویر سرناسے پہ کھینچی ہے کہ تا
 تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرت دیدار ہے

دست نگہ دیدہ خوبسار مجنوں دیکھنا
 یک بہاں جلوۂ گل فری پا انداز ہے

اُس بزم میں مجھے نہیں بتی حیا کیے
 بیٹھا رہا ، اگرچہ اشارے ہوا کہے

گدا سجدہ کے وہ چپ تھا ، مری جو شامت آئی
 اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے ہامیاں کے لیے

اس میں شبہ نہیں کہ ان اشعار میں غالب کا مخصوص تصور عشق نہیں ملتا۔ اس میں روایتی فضا ہے۔ فارسی کے کچھ ایسے شاعروں کے اثرات ہیں جن کے یہاں روایتی تصور عشق کا پہلو بہت نمایاں تھا۔ اس میں کہیں کہیں ناسخ اور ذوق کے اثرات بھی ملتے ہیں جو غالب کے ہم عصر تھے لیکن جنہوں نے اس زمانے کی شعری روایت میں اپنی دعاگ بٹھا دی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں بیدل کا اثر بھی نظر آتا ہے۔ بیدل جس طرح خالص انسانی زاویہٴ نظر سے حسن و مظاہر فطرت کو دیکھتے تھے، اس کی جھلک بھی ان اشعار میں کہیں کہیں دکھائی دیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں غالب کے یہاں، جہاں تک ان کے تصورات عشق کا تعلق ہے، پختگی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ یہ وہ دور تھا، جب ہر چیز انہیں متاثر کرتی تھی اور وہ اس کی طرف لپکتے تھے۔ اس لیے ان کے اس قسم کے اشعار کو معیاری سمجھنا اور ان کے صحیح تصورات عشق کا ترجمان تصور کرنا، شاید زیادہ صحیح نہیں ہے۔

غالب کے صحیح تصورات عشق کے ترجمان تو وہ اشعار ہیں، جن میں ان کی فنی خصوصیت، ان کے مخصوص ذہنی رجحانات، ان کے زمانے کے مخصوص تہذیبی اور اخلاقی معیار اور ایک انسانی اور آفاقی زاویہٴ نظر کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان اشعار میں غالب کہیں حسن اور کہیں حسن پرستی کو معیار تصور کر کے ان کے مختلف مظاہر کی تصویر کشی کرتے ہیں اور کہیں انسانی زاویہٴ نظر سے ان جذبات و احساسات کا نقشہ کھینچتے ہیں، جو تمام انسانوں میں مشترک ہیں اور کہیں ان مخصوص معیاروں کی وضاحت کرتے ہیں۔ جو اس زمانے کے افراد کو بہت عزیز تھے۔

یہ صورت حال غالب کے یہاں اس وقت پیدا ہوئی ہے، جب وہ روایت سے پوری طرح بغاوت کر کے ایک نئی دنیا میں سانس لینے لگے ہیں۔ جب انہوں نے اپنے اوپر خود اپنے آپ کو، اپنی شخصیت کو اور اپنی ذات کو غالب کر لیا ہے۔ اس عالم میں انہوں نے جن اشعار کی تخلیق کی ہے، وہ ان کے دیران میں بہت نمایاں ہیں۔ ان کو دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے عشق کا جو تصور پیش کیا ہے، وہ روایتی تصورات عشق سے مختلف ہے۔ اس میں ایک نو انسانی رنگ و آہنگ ملتا ہے اور ہر جگہ ایک آفاقی زاویہٴ نظر کی جھلک نمایاں نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ

ان کے اس قسم کے اشعار میں زندگی اور جولانی کا احساس ہوتا ہے، گرمی اور روشنی دکھائی دیتی ہے اور رنگینی اور رچاؤ کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔

غالب کی عشقیہ شاعری کے ان پہلوؤں کے عوامل اور محرکات کو سمجھنے کے لیے ان کی نسل اور خاندان، ان کی شخصیت اور کردار، ان کے زمانے کی فضا اور ماحول، ان کے عہد کے ذہنی اور فکری رجحانات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ کہوں کہ ان کی عشقیہ شاعری اور عقیدہ، نصورات کی تشکیل و تعمیر میں ان تمام پہلوؤں نے نمایاں حصہ لیا ہے۔

غالب مغلوں کی نسل سے تعلق رکھتے تھے—وہ مغل جو جنگ جو اور بہادر ہونے کے باوجود لطیف اور حسین و جمیل چیزوں کے شیدائی تھے۔ سو پشت سے جن کا پیشہ سپہ گری تھا اور بظاہر شعر و شاعری جن کے نزدیک ذریعہ عزت نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود جو شب و روز شعر و شاعری کی دنیا میں زندگی بسر کرتے تھے۔ جنہوں نے فن تعمیر، مصوری اور شاعری کو اپنے تخلیقی کارناموں سے انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔ مغلوں کی نسل سے تعلق رکھنے کے باعث غالب کو یہ تمام خصوصیات ورثے میں ملیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ خود فن سپہ گری میں کوئی کار ہائے نمایاں انجام نہ دے سکے، لیکن سپہ گروں کی خصوصیات مرتے دم تک ان کے ساتھ رہیں۔ ان کی جرأت مندی اور دلاوری، بے باکی اور بے نیازی کے رنگ ہمیشہ ان کی شخصیت میں نمایاں رہے۔ حد درجہ ناسازگار حالات بھی ان کے مزاج کی ان خصوصیات کو ڈانوا ڈول نہ کر سکے۔ ان کی زندگی کا قافلہ ان ناسازگار حالات میں سے گزرتا رہا۔ لیکن ان کے باوجود حسن و جمال کا احساس اور ادب و فن کا مذاق، ہمیشہ ان کے ساتھ رہا۔ وہ مرتے دم تک ان سے دلچسپی لیتے رہے۔ حسن و جمال جس حال میں جس جگہ بھی ہوں، ان کے دامن دل کو اپنی طرف کھینچتا رہا۔ ہر حال انہیں یہ دونوں چیزیں وراثت میں ملیں اور وہ ہمیشہ انہیں سینے سے لگاتے اور کلیجے سے چٹائے رہے۔

اس نسلی خصوصیت کے ساتھ ساتھ، خاندانی حالات بھی ان کی طبیعت اور مزاج پر اثر انداز ہوئے اور انہوں نے ان کی شخصیت میں ایک پہلو دار

کیفیت پیدا کی۔ غالب نے ایک ایسے خاندان میں آنکھ کھولی، جہاں ریاست اور امارت تھی ان کے آباؤ اجداد ہندوستان آنے سے قبل، وسط ایشیا میں اور ہندوستان آنے کے بعد یہاں بھی، اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ غالب کا بچپن ریاست اور امارت کے سانے میں بسر ہوا۔ اور اگرچہ آگرمے سے دلی منتقل ہونے کے بعد، ان کی زندگی کے انداز میں فرق ہوا، لیکن وہ نامساعد حالات سے دوچار ہونے کے باوجود، زندگی کی ان امیرانہ خصوصیات کو خیرباد نہ کہہ سکے، چو انہیں اپنے آباؤ اجداد کی طرف سے ملی تھیں۔ وہی جاہ و جلال کا خیال اور ہانسی و برتری کا احساس ان کی زندگی کا جزو بنا رہا۔ وہ خود زہر نہیں رہ سکتے تھے، دوسروں کو زہر دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ دنیا کی تمام چیزیں صرف ان کے لیے ہیں۔ ان سب کو ان کے دام کھانا کا اسیر ہونا چاہیے۔ غالب کو زندگی میں حد درجہ نامازگار حالات سے دو چار ہونا پڑا لیکن ان کے طبقے کی یہ خصوصیات ان حالات میں بھی ان کا دامن نہ چھوڑ سکیں۔ ان کی زندگی کا ایک ایک واقعہ اس خیال پر صداقت کی سہر لگاتا ہے۔

غالب کے مزاج کی یہ خصوصیات ان کی عشقہ شاعری اور ان کے تصورات عشق پر بھی اثر انداز ہوئی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان کے عشقہ تصورات کا تار و پود انہیں خصوصیات سے تیار ہوا ہے۔ حسن اور حسن پرستی کا خیال غالب کی شخصیت اور شاعری دونوں میں بہت نمایاں ہے۔ اس کو کسی حد تک ان کی انفرادیت کا نتیجہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس میں ان کی نسل، خاندان، ماحول اور گرد و پیش کے اثرات کو بھی بہت دخل ہے۔ مغلوں کی روایتی حسن پرستی، امیرانہ ماحول کی تعمیل پسندی اور بچپن کی لالہالی اور آزاد زندگی نے اس احساس کی تشکیل کی اور اس کو غالب کی شخصیت اور کردار کا بنیادی جزو بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اثرات غالب کی زندگی اور شاعری دونوں میں اس قدر نمایاں نظر آتے ہیں۔ غالب نے حسن کا بیان بڑی نفاست اور لطافت، لیکن بڑی جرأت اور بے باکی سے کیا ہے۔ اس بیان سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ اس میں ڈوب ڈوب گئے ہیں اور انھوں نے اس کے ایک ایک انداز اور ایک ایک پہلو میں اپنے آپ کو گم کر کر دیا ہے۔

اس حسن کے شدید احساس ہی نے انہیں صنف لطیف کا شیدائی بنا دیا ہے۔ نسوانی حسن کہیں بھی ہو، وہ اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ یوں تو وہ مظاہر فطرت سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ سبزہ زار ہائے مطرا بھی ان کے دل کو لہاتا ہے۔ لیکن بالآخر اس کی تان نازنین بتان خود آرا، ان کی صبر آزما نکاہوں اور طاقت رہا اشعاروں پر جا کر ٹوٹتی ہے۔ کلکتہ میں انہوں نے جو کچھ دیکھا، اس میں انہیں اسی صورت حال سے دو چار ہونا پڑا۔ چنانچہ اس کی یاد ہمیشہ ان کے سینے پر ایک تیر ماری رہی :

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں !
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنین بتان خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نکاہیں کہ حف نظر
طاقت رہا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ مہوہ ہائے تازہ شیریں کہ واہ ! واہ !
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

اس صورت حال کی بہترین ترجمان ان کی فارسی مثنوی 'چراغ دیر' ہے جو انہوں نے بنارس کی تعریف میں لکھی ہے۔ اس کے چند اشعار ان کے مزاج کی اس کیفیت کو بوری طرح ظاہر کرتے ہیں۔ اس لیے ان کا یہاں نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے :

بیا اے غصافل از کیفیت ناز
نکالے بر پرہیزادانش انداز

ہمہ جانہائے بے تن کن ہماقا
ندارد آب و خاک این جلوہ حاشا

نہاد شاں چو ہونے گل گراں نیست
ہمہ جانند جسمے درمیاں نیست

غس و غاش گلستان است گوئی
غبارش جوہر جان است گوئی

دریں دیرہندہ دیرستان غیرنگ
بہارش این است از گردش رنگ

چہ فروزدہیں چہ ماہ و ماہ چہ مرداد
چہ موسم فضاہش جنت آباد

به تسلیم ہوائے آن چمن زار
 ز موج گل بہاروں بسنہ زار
 فلک را قنفہ گر بر جبین نیست
 بس این رنگینی موج شلق چیست
 کف ہر خاکش از مستی کشنے
 سر ہر غارش از سبزی چشنے
 سوادش ہائے تخت بت ہرستان
 سرابش زہارت گاہ مستان
 عبادت خانہ ناقوسیان ست
 بہانا کعبہ ہندوستان ست

تابانی را پیولا شعلہ طور
 سراپا نور ایزد چشم بد دور
 میانہ نازک و دلہا توانا
 ز لادانی بکار خویش دانا
 قیسم بس کہ در لبہا طبعی ست
 دہن با رشک گل ہائے ربیعی ست
 اداے یک گلستان جلوہ سرشار
 خراسے صد قیامت قنفہ در بار
 بہ لطف از موج گوہر نرم و تر
 بدقازار خون عانی گرم دو تر
 ز انگیز قد انداز خراسے
 ببہائے گلبنے گسترده داسے
 ز رنگین جلوہ ہا غارت گر ہوش
 چار ہستر و نوروز آشوش
 ز تاب جلوہ خویش آتش افروز
 بتان بت ہرست و برہمن سوز
 ہر سامان دو عالم گلستان رنگ
 ز تاب رخ چراغان ہر لب گنگ

رسالہ از ادائے شست و شوئے
چسپ سوچے سوید آروئے

قیامت قیامت مژگان دراواں
ز مژگان بر صف دل تیرہ بازاں
بہ تن سرمایہٴ اقبالش دل
سرایا مزدۂ آسائش دل

بہ مستی موج را فرمودہ آرام
ز نغمے آب را بشنیدہ اندام
فتادہ شورش در قبالب آب
ز ماہی حد دلش در سینہ بے تاب

ز بس عرض نمکنا می کند گنگ
ز موج آغوش پا وا می کند گنگ
ز تاب جلوہ پا بے تاب گشتہ
کبر پا در صف پا آب گشتہ

مگر گوئی بنارس شاہدے ہست
ز گنگش صبح و شام آئینہ در دست

ان اشعار میں بنارس، اُس کے مناظر و مظاہر اس کی آب و ہوا،
اس کی عمارات و مکانات سے کہیں زیادہ اُن بتان بہت پرست و پرہیز سوز کا
ذکر رنگیں ہے، جن کا وجود غالب کے خیال میں چار ہست و نوروز
آغوش ہے۔ صنف لطیف کی تعریف میں ایسے حسین اور دلآویز اشعار ذرا
مشکل ہی سے کسی اور شاعر کے ہاں ملیں گے۔

ایک اور قطعہ میں بنارس کے ساتھ کالکتہ کا بھی ذکر کیا ہے اور تان
’غوبان کشور لندن‘ کے ذکر لطیف پر جا کر ٹوٹی ہے :

گفتش چیست این بنارس، گفت
شاہدے مست محو کل چیدن

گفتش چوں بود عظیم آباد
گفت رنگین تر از نضائے چمن

گفتش سلسبیل خوش باشد
گفت خوشتر نباشد از سوسن

حال کلکتہ باز چہستم ، گفت
باید اقلیم ہشتمش گفتی

گفتم آدم ہمسرد در وے
گفت از ہر دیار و از ہر فن

گفتم این جا چہ شغل سود دہد
گفت از ہر کہ ہست ترمیدن

گفتم این جا چہ کار باید کرد
گفت قطع نظر ز شعر و سخن

گفتم این ماہ ہیکراں چہ کس اند
گفت خوبان کشور لندن

گفتم ایشان مگر دلی دارند
گفت دارند لبیک از آہن

گفتم از ہجر داد آسودہ ام
گفت بگریز و سر بہ سنگ مزن

غالب کے کلیات فارسی سے یہ اشعار جہاں صرف اس خیال سے نقل کیے گئے ہیں کہ ان سے غالب کے احساس حسن اور ذوق جہال کا اندازہ ہوتا ہے اور خصوصیت کے ساتھ صنف لطیف کے حسن و جہال سے ان کی والہانہ دلچسپی کی وضاحت ہوتی ہے ۔

غرض غالب کے ہاں صنف لطیف کے حسن و جہال سے اکتساب لذت کا رجحان کسی نہ کسی صورت میں ضرور نمایاں ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی وہ مد و مخوں کے لیے مصوری سیکھتے ہیں تاکہ ملاقات کے لیے کوئی قریب پیدا ہو اور خوبان سے چھڑ چھاڑ کو بھی جاری رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ ان کا وصل نصیب نہ ہونے کی صورت میں ، اس کی حسرت بھی ان کے لیے عزیز ہے ۔ حسن غالب کو نہ صرف مہوش اور سرشار کر دیتا ہے بلکہ وہ اس کو دیکھ کر مبہوت ہو جاتے ہیں ۔ جب انہیں اپنے آس پاس اور گرد و پیش حسن کی فروانی اور آس کے جلووں کی بلا سامتی نظر آتی ہے ، تو وہ حیرت سے اوجھتے ہیں :

یہ بری چہرہ لوگ کیسے ہیں ؟
عمرہ و عشوہ و ادا کیا ہے ؟

شکن زلفِ عنبریں کیوں ہے؟—

لنکد چشمِ سرمدہ سا کیا ہے؟—

اور یہ کیفیت ایسی ہے کہ ہر انسان کے دل میں ان مناظر کو دیکھ کر اس کی ایک لہر سی اٹھتی ہے — اور یہ کیفیت تمام انسانوں میں مشترک ہے ۔ یہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی ۔ غالب نے حسن کے ان مختلف پہاؤں کا ذکر کر کے صرف اپنی ہی کیفیت کی ترجمانی نہیں کی ہے ، بلکہ انسانی فطرت کو بے لفاظ کیا ہے اور عالمِ انسان کی ایک بنیادی کیفیت کی عکاسی کی ہے ۔

حسن و جمال کا یہ خیال اور اُس کی اہمیت کا احساس غالب کے ہاں اس قدر بڑھا ہے کہ انہوں نے بعض اوقات اپنی ذات کی اہمیت کے احساس کو بھی خیر باد کہہ دیا ہے اور صرف یہ ایک ایسی منزل ہے ، جہاں پہنچ کر غالب اپنی انانیت کو مجروح کرتے ہیں اور حسن کے مقابلے میں اپنی بے بضاعتی اور کم سائیگی کا خیال ان پر غالب آ جاتا ہے ۔ جب وہ یہ کہتے ہیں :

غافل ! ان مہ طلعتوں کے واسطے

چاہئے والا بھی اچھا چاہئے

چاہئے ہیں خوبروہوں کو ، اسد

آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے

تو اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ غالب مہ طلعتوں کے واسطے چاہئے والا بھی ایسا چاہتے ہیں ، جو اچھا ہو — اور پھر مزاح لطیف کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اپنی کم سائیگی اور بے بضاعتی کی وجہ سے وہ خود اس قابل نہیں کہ خوبروہوں کو چاہئے کے قابل ہوں ۔ یہاں غالب کی انانیت اور خود پسندی خاصی حد تک مجروح ہو جاتی ہے — اور اس کی وجہ صرف حسن کی اہمیت کا احساس اور اُس کی برتری کا خیال ہے ۔

حسن کی اہمیت کا یہ شدید احساس غالب کے تخیل کی پرواز کو اس دنیا سے بھی آگے لے جاتا ہے اور وہ صرف اس دنیا کے لوگوں ہی کے حسن کا احساس نہیں رکھتے ، بلکہ اُن لوگوں کے حسن کا احساس بھی رکھتے ہیں ، جو اس دنیا میں موجود نہیں ہیں ۔ نہ جانے کتنے ایسے حسین خاکے ہیں مل چکے ہیں اور اُن میں سے بعضوں کا حسن کہیں کہیں لالہ و گل کی صورت میں رو نما ہوتا ہے :

سب کجیاں ، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

ایک ایسا شاعر جو نہ صرف اپنے آس پاس اور گرد و پیش کے حسن کا احساس رکھتا ہو بلکہ جس کو دنیا میں پیدا ہونے والی بے شمار حسین صورتیں خاک میں پنہاں ہو جانے کے بعد بھی لالہ و گل کی صورت میں نمایاں ہوتی ہوئی نظر آئیں ، اس کی حسن پرستی کا پہلا کیا ٹھکانا ہے ۔

غالب کے یہاں یہ حسن پرستی بے مقصد نہیں ہے ۔ وہ حسنین کو صرف دیکھنے ہی کے قابل نہیں ہیں ۔ وہ تو اُن سے قربت حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور اُن کی محفلوں میں پارہاں ہونے کی خواہش رکھتے ہیں ۔ انہیں ان سے ملنے کی آرزو ہوتی ہے اور وہ اُن کے وصل کو زندگی کی بنیاد سمجھتے ہیں :

اسد پہاڑ تماشاخانے کاستان حیات
وصال لالہ عذاران سرو قاست ہے

اور اُن کی حسن پرستی کی ٹان پیوں پر جا کر ٹوٹتی ہے ۔ اور یہ صورت حال غالب کو حقیقت پسندی سے قریب کرتی ہے ۔

غالب کے عشق کی بنیاد اُن کی یہی حسن پرستی ہے ۔ اُن کے عشق کا چشمہ اسی حسن پرستی سے بھولتا ہے ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اُن کے عشق میں جذباتیت نہیں ہے ۔ وہ کوئی مقصد رکھتا ہے ۔ اور اُس کا سب سے بڑا مقصد حسن و جمال سے اکتساب لذت اور بعض بنیادی انسانی جذبات کی تسکین اور جسمانی تقاضوں کی تکمیل ہے ۔

لذت کا احساس انسان میں بالکل فطری ہے اور اُس کا عمل اسی لذت پسندی سے عبارت ہے ۔ غالب کے عشق کی نوعیت بھی انسانی ہے ۔ اسی لیے اُس کی بنیادیں بھی لذت پسندی پر استوار نظر آتی ہیں لیکن غالب کی یہ لذت پسندی نشاط و طرب ہی تک محدود نہیں ہے ۔ وہ غم عشق سے بھی لطف اندوز ہوتے اور لذت حاصل کرتے ہیں :

عشق سے طبیعت نے ، زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پانی ، درد بے دوا پایا

لیکن اس میں شبہ نہیں کہ عشق میں صحیح لذت انہیں حسن ہی کے سہارے حاصل ہوتی ہے ۔ لذت کا شدید احساس ہی انہیں حسن کی طرف راغب کرتا ہے

اور وہ پوری طرح اُس کے شیدائی ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ معشوق کے حسن کا بیان، اُس کے عشوہ و ناز و ادا کی تصویریں، اُن حالات کے نقشے جن سے لذت حاصل کی جا سکتی ہے، اُن کی شاعری میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ اُن کی شاعری کا بہت بڑا حصہ اسی حسن، اُس کے متعلقات اور ان کے رد عمل پر مشتمل ہے، جن میں زندگی سے لطف انور ہونے کا خیال بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اُن کے بیانات میں معاملہ بندی کی خصوصیت پیدا نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے بڑے ہی لطیف معاملات، بڑے ہی لطیف جذبات اور بڑے ہی لطیف حالات کی تصویریں سامنے آتی ہیں۔ یہ چند اشعار اس صورت حال کی پوری طرح عکاسی کرتے ہیں:

اگر وہ سرو قد، گرم خرام لاز آ جاوے
کف پر خاک کاشن، شکل قمری، نالہ فرسا ہو

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم
میں معتد فتنہ، ہنر لم ہوا تھا

دیکھ اُس کے ساعد سین و دست پر نگار
شاخ گل جاتی تھی مثل شمع، گل پروانہ تھا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر، نقاب اُس شوخ کے رخ پر کیلا

کوئی میرے دل سے بوجھ، ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے ہار ہوتا

بلانے جاں ہے غالب اُس کی ہر بات
عبادت کیا، انارت کیا، ادا کیا،

جلی اک کووند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنہ، تقریر بھی تھا

دل ہے مٹا تری انگشت حنائی کا خیال
ہو کیا گوشت ہے ناخن کا جدا ہو جانا

کتنے شہریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
کالیماں کھا کے بے مزا نہ ہوا

دل ہوائے غرام ناز ہے پھر
عشرستان اسے قساری ہے

چال جیسے کڑی کہاں کا تیر
دل میں اسے کے جا کرے کوئی

آئے بہار ناز! کہ تیرے غرام ہے
دستار گرو شاخ گل نقش پا کروں

دیکھو تو دل تریبی انداز نقش پا
موج غرام باز بھی کیا گل کتر گئی

غنجہ! نا شگفتہ کو، دور ہے مت دکھا کہ ہوں
بوسے کو ہونچھنا ہوں میں، منہ ہے مجھے بتا کہ ہوں

سلطوت ہے تیرے جلوۂ حسن غیور کی
خون ہے مری نگاہ میں رنگ ادا کے گل

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر ہریشان ہو گئیں

صد رنگ گل کترنا، در پردہ قتل کرنا
نیچ ادا نہیں ہے، ہامند بے نیاسی

اسد ہند لبائے یار ہے لردوس کا لہجہ
اگر وا ہو تو دکھلا دوں کہ اک عالم گلستاں ہے

جدو کدچہ ہے عو شوخی* ابروئے یار ہے
آنکھوں کو رکھ کے طاق بہ دیکھا کرے کوئی

اس نزاکت کا برا ہو ، وہ پہلے ہیں تو کیا
ہاتھ آئیں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ رہے

کل کھلے ، غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی
سر خوش خواب ہے وہ نرگس غمور انہی

وہ نیشتر سہی ، پر دل میں چپ اتر جاوے
لگہ لہاز کو بھر کیوں نہ آشنا کہے

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
خیاہاں خیاہاں ارم دیکھتے ہیں

غالب کا دیوان اس قسم کے اشعار سے بھرا پڑا ہے ۔ ان اشعار سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ حسن ہے ، حسن کی اداؤں سے ، اس کی شوخیوں سے ، اس کی سچ دھج سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں ۔ وہ معاملہ بند شاعروں کی طرح حسن سے صرف ہوس کو پورا کرنا نہیں چاہتے بلکہ اس سے لطف اندوز ہونے اور لذت حاصل کرتے ہیں ۔ وہ چلے معشوق سرو قد سے ، اسی کی ساعد میں ، چشم بہکوں اور اس کی زلفوں سے کھینچتے ہیں ۔ اس کی تقریر ، اس کے غرام ناز ، اس کے نقش پا ، اس کی عبارت ، اشارت اور ادا سے متاثر ہوتے ہیں ، جھومنے لگتے ہیں ، مست ہو جاتے ہیں اور اس اثر حسن بار سے نہ صرف اُن کے عشق بلکہ اس کے اظہار میں بھی رعنائی آ جاتی ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب نے اس حسن کو محض نمائشی کی حیثیت سے بیان ہی نہیں کر دیا ہے ، بلکہ اپنی ذات ، اپنی شخصیت ، اپنی افتاد طبع اور اپنے ذہنی رجحانات کو پیش کرنے کی

کوشش کی ہے ۔ وہ اپنے انفرادی تاثرات اور جذبات و احساسات کو سامنے لانے میں ۔ در اصل بات یہ ہے کہ غالب کا احساس سطحی نہیں تھا ۔ وہ صرف خارجی حسن یا حسن کے خارجی پہلو ہی کو پیش کرنے کے قائل نہیں تھے ۔ کیونکہ خارجی حسن یا حسن کا خارجی پہلو بہ ذات خود اُن کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا ۔ انھوں نے تو اس حسن کے حیاتی پہلو اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ذہنی رد عمل کو پیش کیا ہے ۔ اُن کے بیان سے معشوق ہی کا حسن بے نقاب نہیں ہوتا ، اُس کی ادائوں اور اشاروں ہی کی تصویریں ہی سامنے نہیں آتیں ، بلکہ غالب کا حیاتی تاثر بھی سامنے آتا ہے ۔

غالب کا معشوق حسین ہے ، شعلہ خو ہے ، آتش نفس ہے ، سرو قد ہے ، ہری بھٹال ہے ۔ گویا مثالی حسن کی تمام خصوصیات اُس میں موجود ہیں ۔ لیکن وہ اُن سب باتوں کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص کردار بھی رکھتا ہے ۔ غالب نے اُس کے حسن کے ساتھ ساتھ اُس کے کردار کو بھی نمایاں کیا ہے ۔ اُس کے عادات و اطوار کی تصویریں بھی کھینچی ہیں ۔ وہ ستم شعار اور جفا پیشہ ضرور ہے لیکن کبھی کبھی اُس کے جی میں نیکی بھی آ جاتی ہے ۔ اس عالم میں وہ اپنی جفاؤں کو یاد کر کے شرماتا بھی ہے :

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے
جفا میں کر کے اپنی یاد شرماتا جائے ہے مجھ سے

وہ اردو شاعروں کے معشوقوں کی طرح ایسی مخلوق نہیں ہے جو اس دنیا کی مخلوق نہ معلوم ہو ۔ وہ اُسی دنیا کا انسان معلوم ہوتا ہے ۔ اسی لیے اس کے عمل میں ایک متوازن کیفیت نظر آتی ہے ۔ وہ خدی ضرور ہے لیکن بد مزاج نہیں ہے ۔ اس میں معصومیت ہے اور وہ بھولے سے سیکڑوں وعدے وفا کرتا ہے :

خدی کی ہے اور بات مگر بخوبی نہیں
بھولے سے اُس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے

غرض غالب نے اپنے معشوق کو انسانی اقدار کا علم بردار ثابت کیا ہے اور جگہ جگہ اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ وہ اس کو اس کی اسی خصوصیت کی وجہ سے چاہتے ہیں ۔

غالب اس معشوق سے اکتساب لذت ہی کو اپنے عشق کا نصب العین قرار دیتے ہیں اور اس اکتساب لذت کے سلسلے میں جو مختلف منزلیں آتی ہیں ، ان کی تفصیل غالب نے اپنے اشعار میں جگہ جگہ بیان کی ہے — یہ چند اشعار اسی تفصیل کو پیش کرتے ہیں :

غنچہ' نا شگفتہ گو ، دور سے مت دکھا کہ یوں
ہوے کو ہوجھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

بوسہ نہیں ، نہ دیجیے دہنام ہی سہی
آخر زبان تو رکھتے ہو تم ، گر وہاں نہیں

ساقیا دے ایک ہی ساغر میں سب کو مے کہ آج
آرزوئے بوسہ' سب ہائے میگوں سے مجھے

اسد ہند قبائے یار ہے ، فردوس کا غنچہ
اگر وا ہو تو دکھلا دوں کہ اک عالم کستاں ہے

دھونا ہوں جب میں اپنے کو ، سیمیں بدن کے ہاتھ
رکھتا ہے خد سے کھینچ کے ، باہر لگن کے ہاتھ

نیند اس کی ہے ، دماغ اس کا ہے ، راتیں اس کی ہیں
ٹہری زلفیں جس کے بازو ہر پریشان ہو گئیں

دل ہوائے خرام ہار سے بھر
محشرستان ہے قراری ہے

دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت
ہے نگاہ آشنا ٹہرا سر ہر سو مجھے

غالب کا احساس لطیف اکتساب لذت کے لیے خوب صورت اور لطیف ہنس منظر کو بھی تلاش کر لیتا ہے ۔ اگر اس عالم میں محبوب کی ذات انہیں میسر نہ آئے تو ان کی بے قراری اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے ۔ ہجر کی کیفیت

کا بیان اُن کے جہاں ایسے ہی مواقع پر ملتا ہے ۔ یہ غزل اس صورت کی
چہرین مثال ہے :

شب کہ برق سوز دل سے ڈبرہ ابر آب تھا
شعلہٴ جوالہ ، ہر اک حلقہٴ گرداب تھا
جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو
ہاں رواں سڑکوں چہم تر سے خون قاب تھا
ہاں سر پر شورے خواہی سے تھا دیوار جو
واں وہ فرق ناز ، محو بالش کم خواب تھا
ہاں نفس کرتا تھا روشن شمع بزم بے خودی
جلوۂ گل ، واں ، بساطِ صحت احباب تھا
فرش سے تا عرش واں ، طوفان تھا موج رنگ کا
ہاں زمیں سے آسماں تک ، سوختن کا باب تھا
ناکبیاں اس رنگ سے خونابہ لٹکانے لگا
دل کہ ذوق کاوش ناخن سے لذت باب تھا
مقدم سیلاب سے ، دل کیا نشاط آبنگ ہے
خانہٴ عاشق ، مگر سازِ صدائے آب تھا

ظاہر ہے کہ اس ہجر کی کیفیت کا پیدا کرنے والا وہ پس منظر ہے ، جس
کی معصوری غالب نے اس غزل کے اشعار میں کی ہے ۔ اس کیفیت کو لذت
کے خیال ہی نے پیدا کیا ہے اور محبوب سے قربت کی خواہش اس کی تخلیق
کا باعث بنی ہے ۔

غالب کے جہاں اکتساب لذت کی یہ خواہش اتنی شدید ہے کہ جب
اس کا سامان موجود نہ ہو تو وہ اپنے تخیل سے کام لے کر اس فضا کو
پیدا کر لیتے ہیں جو اکتساب لذت کے لیے ضروری ہوتی ہے ۔ یہ میلان اُن
کی رومانی مزاجی کا نتیجہ ہے ۔ وہ خود کہتے ہیں :

مستانہ طے کروں ہوں رہ وادیٴ خیال
تا باز گشت سے نہ رہے مدعا عجب

یہ وادیٴ خیال کو مستانہ طے کرنے کا خیال دراصل اکتساب لذت ہی
کے لیے ہے ۔ غرض تخیل غالب کے جہاں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور وہ اس
کے سہارے اکتساب لذت کے لیے بڑی ہی رنگین اور پرکار سی فضا پیدا

کمر لیٹے ہیں ۔ غالب کی تخیل رنگین کار اس نفا کو نہایت ہی حسین اور
داناویز ، رنگین اور پرکار بنا دیتی ہے ۔ اُن کی یہ غزل اس کیفیت کی بہترین
مثال ہے :

مدت ہوئی ہے ، بار کو سہاں کیے ہوئے
جوشِ نلح ہے ، بزمِ چراغان کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع بھر ، چکر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے ، دھوت مڑگاں کیے ہوئے
بھر وضع احتیاط ہے ، رکنتے لکا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں ، چاک گریباں کیے ہوئے
بھر گرم نالہ ہائے شر ہار ہے نفس
مدت ہوئی ہے ، سیر چراغان کیے ہوئے
بھر برسن جراثیمِ دل کو چلا ہے عشق
سامان صد ہزار مسکنداں کیے ہوئے
بھر بھر رہا ہے غامض مڑگاںِ بضوں دل
سازِ چمن طرازی داساں کیے ہوئے
باہم دگر ہوئے ہیں ، دل و دیدہ بھر رفیق
نظارہ و خیال کا سامان کیے ہوئے
دل بھر طواف کوئے ملائت کو جانے ہے
ہندار کا صنم کدہ ، ویراں کیے ہوئے
بھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے
بھر چاہتا ہوں ، ناسمہ دلدار کھولنا
جاں نذر دل فریبی عضواں کیے ہوئے
چلے ہے بھر ، کسی کو مقابل میں آرزو
مرے سے تیز ، دشنہ مڑگاں کیے ہوئے
اک سو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر ننگہ
چہرہ فروغِ مے ہے ، گلستان کیے ہوئے
بھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زہر بارِ سنت دریاں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے، پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں، تصور جاننا کیے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ ہم جوشِ عشق سے

بیٹھے ہیں پھر تہمت طوفان کیے ہوئے

جو شخص ایک نو چار لاز کو تا کتا ہو، جس کو آرزو ہو کہ کوئی فروغ سے
ہے چہرہ گلستاں کیے ہوئے اُس کے پاس آئے۔ جو سر سے تیز دشتہ مزگان
کو اپنے سینے میں اتار لینے کا مستی ہو، جس کو کسی کے در پر
سر زیرِ بار منت دریاں کیے ہوئے ہڑے رہنے کی خواہش ہو، اس کی لذت پرستی
میں شک و شبہ کی کس کو گنجائش ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ بہ
سب کچھ اکتسابِ لذت کے خیال ہی سے کرنا چاہتا ہے۔ غالب نے آگے
بڑھ کر اس کا اظہار اس طرح بھی کیا ہے :

کاشائے گلشن کمنائے چیدن

بنار آفرینا گندکار ہیں ہم

عشرتِ صحبتِ خویاں ہی غنیمت سمجھو

ہوئی غالب نہ اگر عمرِ طبعی نہ سہی

کہ کاری کا یہ اعتراف اور عشرتِ صحبتِ خویاں کو عمرِ طبعی کے مقابلے
میں غنیمت جاننے کا اظہار، حسنِ پرستی اور عشق و عاشقی میں غالب کی
حد درجہ بڑھی ہوئی لذتِ پرستی کے قبوت کے لیے کافی ہے۔

غالب حسنِ پرستی اور عشق و عاشقی کی دنیا میں صرف حسن و شباب
اور ناز و شہزہ ہی سے اکتسابِ لذت نہیں کرتے، صرف مسرت و شادمانی
ہی اُن کے لطف کا باعث نہیں بنتی، حسنِ پرستی اور عشقِ عاشقی کی راہ
میں جو ہر خارِ مقامات اُٹے ہیں، اُن سے بھی اُن کا جی خوش ہوتا ہے۔
اس میں بھی اُن کو لذت ملتی ہے۔ گویا غالب حسن و عشق کے ہاتھوں
پیدا ہونے والی اذیت میں بھی لذت محسوس کرتے ہیں۔ یہ لذت کبھی اُن
کے معشوق کے ہاتھوں اس کی کچ اداہوں اور بے نیازوں سے اُن تک
پہنچتی ہے۔ اور کبھی گردشِ روزگار کی فاعلِ غوارِ صورتِ حال اس کو
پیدا کرتی ہے۔ کبھی مطلوبہ چیز کو نہ ملنے کی صورت میں اپنے آپ کو
اُداس کر کے، غمگین بنا کر، اذیتِ پرستی کا شکار ہو کر، زندگی، ماحول

اور معاشرے اور خود اپنے اوپر احسان کرنے کا احساس اُن کے اندر پیدا ہوتا ہے ۔ غرض غالب کے یہاں اس اذیت پسندی کی کئی صورتیں ملتی ہیں :
ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے ، راہ کو ہر خار دیکھ کر

پھر کچھ اک دل کو بے نزاری ہے
سینہ جو پائے زخم کلری ہے

ستم کشی کا کیا دل بے حوصلہ پیدا
اب اس سے ربط رکھوں جو بہت ستم گر ہو

ہم کو ستم عزیز، ستم گر کو ہم عزیز
نا مہرباں نہیں ہے ، اگر مہرباں نہیں

نالہ جز حسن طلب ، اسے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا ، شکوۂ بے داد نہیں

شوق ہو گیا ہے سینہ ، خوشا لذت فراغ !
تکلیف بردہ داری " زخم چکر گئی
حالانکہ غم بہ ذات خود انہیں عزیز نہیں ۔ وہ اپنے دل کو اس قابل نہیں
سمجھتے کہ وہ غم اٹھا سکے :

غم کھانے میں بودا ، دل ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مئے کلفام ، بہت ہے

یہی احساس انہیں یہ نتیجہ لگانے پر مجبور کر دیتا ہے :
نہد حیات و بند غم ، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی ، غم سے نجات پائے کیوں

عشق و عاشقی کی دنیا میں غالب اس غم کو لذت بنا لیتے ہیں اور وہ اس
لذت سے مست و سرشار رہتے ہیں ۔

جیسا کہ اس سے قبل بھی کہا جا چکا ہے ، اکتساب لذت کے یہ
مختلف پہلو ان کی نسلی خصوصیات ، خاندانی حالات ، ماحول کے اثرات اور

ان سب کے زیر اثر تشکیل پائی ہوئی ان کی افاد طبع اور کردار کے پانہوں پیدا ہوا ہے۔ غالب جس طبقے سے تعلق رکھتے تھے، لذت پسندی اس کے افراد کی گھٹی میں بڑی بھی اور وہ اس کو اپنا نصب العین تصور کرتے تھے۔ بات یہ ہے کہ زندگی کے ایک خاص معیار نے اس طبقے کے افراد میں لطافت اور نفاست کے ساتھ وابستگی کے خیالات کو ان کی زندگی کا لازمی جزو بنا دیا تھا۔ ان کے پاس وقت بہت تھا۔ کرنے کے لیے بہت کم کام تھے۔ یہ افراد اپنے وقت کا زیادہ حصہ زندگی کی رنگ و لیوں میں گدازتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں لذت کا احساس اور لذت پرستی کا خیال نو پیدا ہونا ہی چاہیے تھا۔ غالب اسی طبقے کے ایک فرد تھے۔ اسی لیے اس کی ان خصوصیات کا ان کے کردار میں پیدا ہونا لازمی تھا۔ ان کی حد درجہ بڑھی ہوئی لذت پسندی کا ایک سبب ان کا یہ طبقاتی مزاج بھی ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ یہ لذت پسندی ان کے لیے کسی حد تک ایک فرار کی حیثیت بھی رکھتی تھی۔ نامآزگار حالات کے باعث وہ اسی لذت کے خیال سے دل بہلاتے تھے۔ یہ ان کے لیے جینے اور غم غلط کرنے کا ایک سہارا تھا۔ جی تمام اسباب ہیں، جنہوں نے غالب کے جہاں لذت کے خیال کو پیدا کیا ہے۔

غالب کے تصور عشق میں اس لذت پسندی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے ان کے تصور عشق کو جدید دور کے نفسیاتی نظریات عشق کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ کیوں کہ اسی پس منظر میں اس کی اصلیت کو پوری طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ مابعدالطبیعیات کے زمانے سے لے کر اس وقت تک، عشق کے متعلق مختلف نظریات پیش کیے جاتے رہے ہیں اور آج بھی اس کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن موجودہ زمانے میں عشق کے جس مادی اور جنسی تصور کو اہمیت حاصل ہے، وہ اپنی جگہ ان تمام نظریات سے اہم ہے۔ کیوں کہ ان کی بنیادیں نفسیاتی حقائق پر استوار ہیں۔ افلاطون نے عشق کا جو تصور پیش کیا تھا اور جس کے اثرات ایک زمانے تک اس دنیا میں رائج رہے، وہ تمام تر رومانی اور خیالی تھا۔ اس کی بنیادیں حقیقت پر استوار نہیں تھیں۔ اس کے عشق کی تان جذباتی حسن پرستی پر ٹوٹی ہے۔ بغیر کسی خواہش اور بنیادی انسانی جذبے کے عشق پروان چڑھتا ہے۔ اتصال جسمانی کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں

رکھتا۔ اس کا عشق تو صرف اتصال روحانی ہے اور حسن میں اپنے آپ کو بفر کسی جسمانی اور مادی مقصد کے فنا کر دینے کا نام ہے۔ مغرب و مشرق دونوں میں، چونکہ افلاطون کا اثر خاصا گہرا رہا، اس لیے صدیوں تک عشق کے اسی تصور کو لوگ سب کچھ سمجھتے رہے۔ مشرق کی روحانیت پرستی نے اس نظریے کو قبول کرنے میں کچھ اور بھی مدد کی۔ ادھر مغرب میں عیسائیت نے اس تصور کو پروان چڑھایا۔ چنانچہ یہ نتیجہ ہوا کہ عشق کو محض مخصوص اخلاقی قدروں کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا، جس کا اثر یہ ہوا کہ اس کی صورت کچھ بے کچھ ہو گئی۔ اس زمانے میں جنسی تصور موجود ضرور تھا۔ لوگ اس کی اہمیت سے ضرور واقف تھے لیکن اس کے اظہار کو ہیبت اور مجنوناہ کیفیت پر محمول کیا جاتا تھا۔ عاشق کی معراج یہ سمجھی جاتی تھی کہ اس میں کسی جنسی یا جسمانی خواہش کو دخل نہ ہو۔ چنانچہ ایسے عاشق کی مثالیں مشرق و مغرب دونوں جگہ نظر آتی ہیں۔ لوگ کسی انسان سے نہیں، بلکہ 'عشق' سے محبت کرتے ہیں۔ 'معتوق' کے خیال کو سینے سے لگائے رکھتا اور اسی میں جان دے دیتا ہی ان کے نزدیک سب کچھ تھا۔ اور یہ سب افلاطونی عشق کی کارفرمائیاں نہیں۔ لیکن اب بعض فلسفیوں اور ماہرین نفسیات کا یہ خیال لوگوں کے دلوں میں گھر کرنا جا رہا ہے کہ عشق کی نوعیت حقیقتاً جنسی ہوتی ہے۔ اس کی تہ میں جنس کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔ کیوں کہ جنسی عشق میں طرفین ہر اعتبار سے ایک دوسرے کے اتنا قریب ہو جاتے ہیں، جس کو ایک روح دو قالب ہونے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ عشق کا جنسی تصور ہی ایک ایسا تصور ہے، جس میں عشق کے دوسرے تصورات گھل مل جاتے ہیں۔ یا اس محور کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔

عشق کا یہ تصور مغرب میں تو غیر ~~مستحسن~~ ^{مستحسن} ہے ایک مخصوص طبقے میں رائج رہا ہے۔ ہمارے یہاں یہ تصور موجودہ دور میں پہنچا ہے لیکن اس وقت بھی مخصوص معاشرتی اور تہذیبی روایات اور مخصوص اخلاقی اقتدار نے اس کو عام نہیں ہونے دیا ہے۔ چاہے لوگ اس کو صحیح سمجھتے ہوں لیکن معاشرتی ہندسی انہیں اس کا اظہار نہیں کرنے دیتی۔ غالب کا زمانہ آج سے تقریباً سو سال پہلے کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں تو اخلاقی کی

گرفت اتنی سخت تھی کہ اس کا اظہار کرنا تو درکنار، کوئی اس کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

حالانکہ جاگیردارانہ ماحول نے ہر فرد کے دل میں لذت پرستی کی خواہشات چھپا رکھی تھیں۔ لیکن چونکہ زندگی میں ایک دورنگی کا دور دورہ تھا، اس لیے لوگ اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اس معاملے میں بھی ان کی طرف سے دورنگی کا اظہار ہوتا تھا۔

غالب اپنے ماحول کی پیداوار تھے۔ ان پر اپنے گرد و پیش کے اثرات بھی بڑے تھے۔ مروجہ روایات اور اخلاقی اقدار سے بھی ان کا پیچھا چھڑانا مشکل تھا۔ لیکن ان کی شخصیت میں دورنگی کی خصوصیت نام کو نہیں تھی۔ وہ جو کچھ سوچتے تھے، اس کو چھپاتے نہیں تھے۔ بلکہ اس کا اظہار کر دیتے تھے۔ چنانچہ ان کی عشقہ شاعری کی یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ انہوں نے جو کچھ جذبہٴ عشق کے متعلق سوچا ہے، اس کا اظہار بغیر کسی جھجک کے کر دیا ہے۔ غالب کا نقطہٴ نظر ہر معاملے میں جذباتی ہونے کے بجائے عقلی ہوتا تھا۔ وہ چیزوں پر غور کرنے کے عادی تھے۔ چنانچہ اپنے نظریہٴ عشق کو پیش کرنے کے سلسلے میں بھی انہوں نے ہی کیا ہے۔ وہ جنسی نظریہٴ عشق کے قائل تھے، کیوں کہ وہ عقلی تھا۔ اس لیے روایتی تصور عشق کی ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں تھی۔ ان کا خلوص انہیں اس پر ایمان لانے سے باز رکھتا تھا۔ صداقت اور صاف گوئی، جو ان کی شخصیت کا حصہ تھی، انہیں اس روایتی تصور عشق کو اپنانے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ چنانچہ جب وہ یہ کہتے ہیں :

بلبل کے کاروبار یہ ہیں خندہ ہائے گل

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہر نظریہٴ عشق کے متعلق ان کا یہ خیال ہے۔ بلکہ مروجہ روایتی تصور عشق ان کو ”دماغ کا خلل“ معلوم ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس عشق میں جو عجیب غریب باتیں ہوتی ہیں، ان کو اگر عقل و شعور کی روشنی میں جذبات سے الگ ہو کر دیکھا جائے، تو ان کا خلل دماغ معلوم ہونا یقینی ہے۔ ان پر تو بے اختیار ہنسے کو جی چاہتا ہے۔ غالب پر بھی اس کا یہی رد عمل ہوا ہے۔

حالانکہ ویسے جہاں تک عشق کے عقلی تصور کا تعلق ہے ، وہ اس کی اہمیت کے قائل ہیں ۔ ان کے خیال میں عشق خانہ ویران ساز کی وجہ سے زندگی میں ایک رونق رہتی ہے :

رواق ہستی ہے علق خانہ ویران سار ہے
انجمن ہے شمع ہے گوبرق غرمن میں نہیں

وہ اس بات کا احساس بھی رکھتے ہیں کہ بغیر عشق کے زندگی بے کار ہے ۔ اس کی تکلیفوں کے باوجود وہ اس کے وجود کو زندگی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں ۔ ان کے خیال میں بغیر اس کے عمر کٹ ہی نہیں سکتی ۔ بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں عشق میں آزار کے قائل ہیں ۔ اس کا ہونا ان کے نزدیک لازمی ہے "اندوہ عشق" کی کشمکش سے ، ان کے خیال میں عاشق کو کسی وقت بھی بجات نہیں مل سکتی ۔

جانی ہے کوئی کشمکش اندوہ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ عشق ہر کسی کا زور نہیں ۔ اس دنیا میں آکر انسان بے بس ہو جاتا ہے ۔ یہ آگ نہ لگائے لگتی ہے اور نہ بجھائے بجھتی ہے :

عشق ہر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ نہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

وہ اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ عشق ہی زندگی میں سب کچھ ہے ۔ اس سے طبیعت کو جو مزا ملتا ہے اس کی مثال دنیا کے پردے پر موجود نہیں ۔ وہ "درد کی دوا" بھی ہے اور "درد لادوا" بھی ۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی ، درد لا دوا پایا

غالب کے خیال میں عشق کی منزل میں قدم رکھنا معمولی انسان کے بس کی بات نہیں ۔ اس کے لیے تو پتھر کا کلیجا رکھنے کی ضرورت ہے ۔ ایک ایسا انسان محبت کر سکتا ہے ، جس میں اس کی تمام مصیبتوں کو اٹھانے

کی سکت ہو۔ کیوں کہ عشق 'نبرد پیشہ' ہوتا ہے۔ اس کو 'مرد کی طلب' ہوتی ہے۔ ورنہ معمولی انسان کو تو صرف اس کی 'دھمکی' ہی فنا کی نیند سلا دیتی ہے :

دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا

عشق نبرد پیشہ طلب کار مرد تھا

اور اس عشق کے لیے وہ صرف اپنے آپ کو مناسب سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ان میں اس کا مقابلہ کرنے کی وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جن کا مطالبہ عشق کرتا ہے :

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افکن عشق

ہے مکتور لب ساقی بہ صلا میرے بعد

غرض یہ کہ غالب عشق کی اہمیت، اور اس کی بڑائی کے قائل ہیں۔ اور انہیں اس بات کا احساس ہے کہ عشق کے ان تمام مطالبات کو ان کی شخصیت ہی پورا کرتی ہے۔ وہی اس پر پورے اترتے ہیں۔

بہر حال ان کے عشق کا یہ تصور ایک مخصوص تصور ہے۔ اس میں جذباتیت سے زیادہ عقلیت ہے، روحانیت سے زیادہ مادیت ہے۔ روحانیت سے زیادہ حقیقت ہے، عینیت سے زیادہ واقفیت ہے۔ غالب کے نزدیک عشق کا ایک منہد ہوتا ہے۔ اس کی تان ایک خواہش پر اڑاتی ہے۔ وہ معشوق اور اس کے حسن کو صرف پوجنے کے قائل نہیں ہیں۔ بلکہ ایک خواہش انہیں اس کی طرف راغب کرتی ہے اور وہ اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے عشق نبرد پیشہ کے ہاتھوں مقابلہ کرتے ہوئے فنا ہو جاتا تک پسند کرتے ہیں۔ جو لوگ ان کی اس خواہش کو پریشانی شاعر کرتے ہیں، وہ ان کے خیال میں احمق ہیں :

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار

کیا پوجنا ہوں اس بت بیدار گرو کو میں

یہ 'خواہش' کیا ہے؟—ظاہر ہے کہ یہ معشوق کے ساتھ لذت حاصل کرنے کی خواہش ہے۔ غالب اپنے عشق میں اس خواہش کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے سارے عشق کی بنیاد اسی پر استوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کا تصور عشق روایتی نہیں رہا ہے۔ اس میں وجدیت ہائی جاتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج اس کو حقیقت سے ہم آہنگ کہا جاتا ہے۔

غالب کے اس تصور عشق کی تشکیل ، جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے ، ان کی مادیت اور جنسیت، خود پرستی اور انانیت، دوسروں کو زیر اور اپنے آپ کو زیر رکھنے کی خواہش ، عیش و نشاط کی تلاش اور لذت کے شدید احساس کے باتوں ہوئی ہے ۔ یہی ان کے اس تصور عشق کے محرکات ہیں اور ان خصوصیات کو ان کے نسلی و خاندانی امتیاز کے احساس اور ماحول و گرد و پیش کے اثرات نے پیدا کیا ہے ۔ لیکن اس کے علاوہ عقل پرستی اور شعور کی بیداری نے مادگی اور صاف گوئی اور روایت سے بغاوت کے خیال اور اپنے آپ کو اپنے اصلی روپ میں پیش کرنے کی آرزو کو ان کی زندگی کا حصہ بنا دیا تھا ۔ چنانچہ غالب کی شخصیت کی یہ خصوصیات ان کے تصور عشق کی تشکیل میں مدد و معاون ثابت ہوئی ہیں اور عشق کے معاملے میں پیش کیے ہوئے تمام خیالات میں ان کے اثرات کا پتہ چلتا ہے ۔

غالب کی شخصیت میں انانیت اور خود پسندی کا رنگ سب سے زیادہ نمایاں تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اثرات ان کے تصور عشق میں بھی اپنی جھلک دکھاتے ہیں ۔ وہ اپنی ذات کے سامنے معشوق تکہ کو کچھ نہیں سمجھتے ۔ حالانکہ معشوق سے زیادہ انہیں کوئی اور چیز عزیز نہیں تھی ۔ معشوق کا وصل ان کے نزدیک زندگی کی معراج ہے ۔ لیکن 'حجاب پاس وضع' ان کو معشوق تک پہنچنے سے باز رکھتا ہے ۔ اور معشوق کا 'غرور عجز و ناز' اس کو ان کے پاس لے نہیں دیتا ۔

وہ اپنی خوفہ چھوڑیں گے ، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سرین کے کیوں بوجھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

واں وہ غرور عجز و ناز ، یاں بہ حجاب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں ، بسزم میں وہ ہلا لیں کیوں

اس قسم کے حالات ان کی شاعری میں کہیں کہیں پھر و فراق کی کیفیت کے بیان کو جگہ دیتے ہیں ، ورنہ ان کی ساری شاعری اس قسم کے بیانات سے خالی ہے ۔ اور ان کی انانیت کہیں پر بس نہیں کرتی بلکہ اس کے زیر اثر وہ بہت آگے جاتے ہیں ۔ وہ انہیں 'عشق' میں سر بھوڑنے سے باز رکھتی ہے اور اگر سر بھوڑنا ہی عشق میں ضروری ہو جائے تو پھر

وہ کسی ایک کے 'سنگ در' پر سر پھوڑنے کو ضروری خیال نہیں کرتے !

وفا کیسی ؟ کہاں کا عشق ؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا

تو بھر اے سنگ دل ! تیرا ہی سنگ آستان کیوں ہو ؟

اس شعر کے اندازِ بیان میں ان کی افانیت کے اثرات صاف نظر آتے

ہیں ۔ اور نہ صرف اس شعر میں بلکہ ان کے کلام میں جگہ جگہ ان کی افانیت اپنا اثر دکھائی ہے :

لو وہ ابھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے

یہ جانشا اگر لو لٹاتا نہ گھر کو میں

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی

میری وحشت تری شہرت ہی سہی

نماشاکر اے محو آئینہ داری

مجھے کس کشتا ہے ہم دیکھتے ہیں

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو چکا

رکھتا ہوں مجھ کو بے سبب آزار دیکھ کر

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں

سیک سرین کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

غرض یہ کہ غالب کی عشقیہ شاعری میں ان کی افانیت کے اثرات

خاصے گہرے نظر آتے ہیں ۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ نہ صرف عشق اور

شاعری میں بلکہ زندگی میں خود شناسی اور خود پرستی کو بڑی اہمیت

دیتے تھے ۔ ایک جگہ کہتے ہیں :

بازجہ اطفال ہے دلیا مرے آگے

ہوتا ہے شب و روز نماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگ ملیاں مرے نزدیک

اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

جز عام نہیں صورت عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہونے
گھسٹتا ہے جہیں خاک یہ دریا مرے آگے

غرض عشق میں اپنی ذات کی اہمیت کا احساس بھی ان کے یہاں ان
کی اسی خصوصیت نے پیدا کیا ہے ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عشق کا یہوم ان
کے دم سے قائم ہے ۔ معشوق ، اس کی ادائیں اور عشوے ، ناز اور غمزے
سب کچھ ان کی وجہ سے ہیں ۔ ان کے لیے ہیں ۔ ان کے بعد یہ سب کچھ
ختم ہو جائے گا ۔ یہ غزل ان کے اسی میلان کی صریح عکاسی کرتی ہے :

عشق غمزے کی کشاکش سے جھٹا ، میرے بعد

بارے ، آرام سے ہیں اہل جفا ، میرے بعد

منصب شیفکی کے کسوٹی قسابل نہ رہا

ہوئی معزولیٰ انداز و ادا ، میرے بعد

شمع بجتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے

شعلہٴ عشق سیاہ ہوش ہوا ، میرے بعد

خوں سے دل خاک میں احوال بتاں پر ، یعنی

ان کے ناخن ہوئے عجاج حنا ، میرے بعد

دو خور عرض نہیں ، جوہر بیداد کو جا

نکمہ ناز ہے سرمے سے خفا ، میرے بعد

ہے جنوں اہل جنوں کے لیے آغوش وداع

چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا ، میرے بعد

کون ہوتا ہے حریف بنے مرد الفکن عشق

ہے بکتر لب ساقی یہ صلا ، میرے بعد

غم سے مہتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی

کہ کرے تعزیت سہر و وفا ، میرے بعد

تھی نکمہ میری نہاں خانہٴ دل کی نقاب

بے خطر جتنے ہیں ازباب ریا ، میرے بعد

آئے ہے بے کسیؔ عشق یہ رونا غالب

کس کے گھر جانے کا سیلاب ہلا ، میرے بعد

اور عشق کی دنیا میں اپنی اہمیت کے اسی احساس نے غالب کے یہاں جذبہٴ رشک کو سب سے زیادہ بیدار کیا ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری کا ایک خاصہ حصہ عشق میں جذبہٴ رشک کی ترجمانی سے بھرا پڑا ہے۔ اردو شاعری میں جذبہٴ رشک کی ترجمانی یوں تو تقریباً ہر دور کے ہر شاعر کے یہاں نظر آتی ہے، لیکن اس کا انداز کچھ روایتی ہی سا رہا ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے ان میں اکثر جگہ ابتدائی کیفیت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن غالب کے یہاں یہ جذبہٴ رشک کی ترجمانی روایتی انداز میں نہیں ہے۔ بلکہ اس کی محرک ان کے کردار کی بعض بنیادی خصوصیات ہوتی ہیں۔ غالب کے یہاں خاندانی وجاہت کا جو شدید احساس تھا، اپنے آپ کو ہر اعتبار سے بلند رکھنے کی جو خواہش تھی اور جس کے نتیجے میں انانیت نے جنم لیا تھا، ان تمام باتوں کے اثرات ان پر یہ ہوتے تھے کہ وہ دنیا کی ہر چیز کو اپنے لیے سمجھتے تھے۔ ان کو یہ گوارا نہیں تھا کہ کوئی دوسرا بھی اس میں شریک ہو۔ چنانچہ معاملات حسن و عشق میں بھی ان کے یہاں یہی جذبہٴ کام کرتا تھا۔ ان معاملات میں ایک حد تک تو یہ جذبہٴ نفسیاتی حقیقت پر مبنی ہے۔ لیکن غالب کے یہاں آگے بڑھ کر یہ خود پسندی بلکہ خود غرضی کے حدود میں داخل ہو گیا ہے اور اس طرح اس نے ان کے یہاں کہیں کہیں ایک مرض کی صورت اختیار کر لیا ہے۔ لیکن غالب کے کردار اور اناد طبع کے اس منظر میں رشک کا یہ بیان حقیقت نظر آتا ہے۔ وہ صرف رقیب ہی پر رشک نہیں کرتے، خود معذوق اور اپنی ذات تک پر رشک کرنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں:

دیکھنا قسمت گم آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں آئے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرنے ہی والے ان کی کتنا نہیں کوئے

رشک کہتا ہے کہ اُس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے سہر کس کا آشنا

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

ہم نشینی رقیباں گرچہ ہے سامان رشک
لیکن اس سے ناگوارا تو ہے بد فاسی تری

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفت رشک
بلانے جان ہے ادا تیری اک جہاں کے لیے

نفرت کا گہاں گزروے ہے ، میں رشک سے گزرا
کیوں کر کہوں لو نام نہ اُن کا مرے آگے

ابھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کی ایک نار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر ، تھا جو راز داں اپنا

بس کہ وہ چشم و چراغ محفل اغیار ہے
چمکے چمکے جلنے ہیں جوں شمع ماتم خاند ہم

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا کلام
ہر چند ہر سبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو

یہ اور اسی قسم کے دوسرے اشعار ، اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ غالب کے یہاں معاملات عشق میں یہ رشک کتنی شدت اختیار کر گیا تھا ۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ رشک کے معاملات بھی بنیادی طور پر ان کے اس تصور عشق کی پیداوار ہیں ، جس کی بنیادیں لذت ہستی پر استوار تھیں اور جس کی تہ میں جنسی جذبے کا ہالہ تھا ۔

غالب کے تصور عشق کی نوعیت ، اس میں شبہ نہیں کہ جنسی ہے لیکن یہ جرات ، انشاء اور رنگین کے تصور عشق سے مختلف ہے ۔ غالب

کے یہاں یہ نظریہٴ عشق کہیں بھی ایک ذہنی تعین کی صورت اختیار نہیں کرتا۔ ابتدائ کے عناصر بھی اس میں پیدا نہیں ہوتے۔ وہ جرات کی طرح معاملہ بندی کے قائل نہیں ہیں۔ وہ جنسی معاملات کی ترجیحی ضرورت کرتے ہیں لیکن اس میں بڑی لطافت کا احساس ہوتا ہے اور لیے دہے رہنے والی کیفیت نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عشق و ہوس میں امتیاز کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک عشق و ہوس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ غالب عشق کے قائل ہیں اور ہوس کو بڑی چیز سمجھتے ہیں :

ہر ہوائہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آہروئے شیوہ اہل نظر گئی

اہل ہوس کی فتح ہے ، ترکہ نبرد عشق
جو پاؤں اٹھ گئے ، وہی اُن کے علم ہوئے

لزوج شعلہٴ خس یک نفس ہے
ہوس کو پاس فاموس وفا کیا

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ عشق و ہوس غالب کے نزدیک دو مختلف چیزیں ہیں۔ عشق کی سطح بلند ہے اور ہوس کی سطح پست۔ یہ دونوں کبھی ایک جگہ پر جمع نہیں ہو سکتے۔ ہوس اُن کے نزدیک عشق کی سوت ہے۔

یہ خیالات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ غالب کے تصور عشق میں ایک امتیازی شان تھی۔ اُس کی نوعیت جنسی ضرور ہے لیکن اس کے باوجود ہوس سے اُس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے پیش نظر کچھ اخلاقی اقدار ضرور ہیں ، جن کو وہ نظر انداز کرنا نہیں چاہتے۔

اس صورت حال ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ غالب کی شاعری میں عشق کے اس مادی اور جنسی تصور کی ترجیحی کے باوجود عشق اور اُس کی مختلف اور متنوع واردات و کیفیات کی رنگا رنگ تصویریں ملتی ہیں۔ عاشق جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے ، اُس کے دل پر جو کچھ گزرتی ہے ، جن معاملات سے اُسے دو چار ہونا پڑتا ہے ، جتنی منزلیں بھی راہ عشق میں اُسے طے کرنی پڑتی ہیں ، اُن سب کی ترجیحی غالب نے اپنی شاعری میں

بڑے ملتے سے کی ہے ۔ اور اس صورت حال نے اُن کی عشقیہ شاعری کو
عشقیہ معاملات اور واردات و کیفیات کا ایک نہایت ہی حسین اور دلاویز
مرقع بنا دیا ہے ۔ غالب نے عشق کے کسی پہلو کو چھوڑا نہیں ہے ،
ایک ایک جذبے اور ایک ایک کیفیت کی ترجمانی کی ہے :

جذبہؔ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
سینہؔ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

سادگی و ہرکاری ، بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

جانی ہے کوئی کشمکش اندوہ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ ونا سے چھوٹوں
وہ سم گھر مرے مرے یہ بھی راضی نہ ہوا

کم جانتے تھے ہم بھی غم عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے یہ غم روزگار تھا

غم فراق میں تکلیف میر گل مت دو
مجھے دماغ نہیں ، خندہ ہائے بے جا کا

رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتن گل ہائے ناز کا

وائے دیوانگیؔ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود ہشیاں کا ہشیاں ہونا

توڑے وعدے ہر جیسے ہم ، تو یہ جان چھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جائے ، اگر اعتبار ہوتا

کوئی میرے دل سے ہوجھے، ترے نیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے بار ہوتا
غم اگرچہ جان گسل ہے، یہ کہاں ہیں کہ دل ہے
غم عشق اگر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا

نوازش پائے جا دہکتا ہوں
شکایت پائے رنگیں کا گلا کیا

پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دل کم گشتہ، مسکرا، یاد آیا

نم سے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلا
اس میں کچھ شائبہ 'خوبی' تقدیر بھی تھا

گو میں رہا رہن سہ پائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

جے داد عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسد
جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا

درد دل لکھوں کیوں کر، جاؤں اُن کو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی، خاصہ غموں چکل اپنا

کایوں میں میری نعلی کو کھینچے پھرو کہ میں
جان دادہ ہوائے سر رہگزار تھا

تو اور آرائش خم کاکل
میں اور اندیشہ پائے دور و دراز

مر گیا پھوڑ کے سر غالب وحشی ہے ہے
بٹھنا اس کا وہ آکر ٹری دیوار کے پاس

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

ہم پر وفا ہے ترک وفا کا کہاں نہیں
اک چھوڑ ہے وگر نہ مراد امتحاں نہیں

راز معشوق نہ رسوا ہو جائے
ورنہ مر جائے میں کچھ بھول نہیں

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم چگر کو دیکھتے ہیں

جوتے غول آنکھوں سے بہتے دو کہ ہے شام لراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

وفا کہی ، کہاں کا عشق، جب سر بھوڑنا لہیرا
تو پھر اے سنگدل! تیرا ہی سنگ آستان کیوں ہو

شرم اک ادائے ناز ہے ، اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھنے ہیں کشاکش میں
کہیں میرے گریباں کو، کہیں جانائے کے دامن کو

خدا یا جذبہ دل کی مسکرتائیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھینچتا جائے ہے مجھ سے

عجز و نیاز ہے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچے

وہ شوخ اپنے حسن پہ مغرور ہے اسد
دکھلا کے اس کو آئینہ توڑا کرے کوئی

رہے اس شوخ سے آزرده ہم چندے تکلف سے
تکلف پر طرف تھا ایک انداز چنوں وہ بھی

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے ویاں دوش
صحرا میں اے خدا اکوئی دیوار بھی نہیں

مجھ سے مت کہہ، تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

کر کیا ناصح نے ہم کو قہر اچھا ہوں سہی
وہ جنوں عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

بیکاری، جنوں کو ہے سر پٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

روئے سے اے ندیم! ملالت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو دیدہ دل وا کرے کوئی

خون ہو کے جگر آنکھ سے لپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے پاں کہ ابھی کام بیت ہے

ان اشعار سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ غالب کی زندگی اور شخصیت میں عشق و عاشقی کا رنگ پوری طرح رچا ہوا تھا۔ اس راہ میں جو منزلیں آتی ہیں، وہ ان سب سے گذرے تھے۔ اس راہ کے مسافر کو جو تجربات بھی ہوتے ہیں، ان سب کا وہ گہرا احساس و شعور رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان اشعار میں ان تجربات کی تمام تفصیلات موجود ہیں اور ان میں سے ہر تجربہ انسانی نفسیات کے کسی نہ کسی پہلو کی تصویر پیش کرتا ہے۔ اس لیے اس کی بنیاد حقیقت و واقعیت پر استوار نظر آتی ہے اور اس میں انسانی اور انسانی رنگ و آہنگ کا احساس بھی ہوتا۔

غالب کی عشقیہ شاعری اس اعتبار سے اردو شاعری کی روایت میں ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے!

غالب کی شاعری
کا
جمالیاتی پہلو

غالب ایک عظیم شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں انسانی زندگی کے جذباتی معاملات کی بڑی ہی حسین مصوری ہے۔ ان معاملات کو انہوں نے فکری اور فلسفیانہ، لیکن انسانی زاویہٴ نظر سے دیکھا ہے۔ ان کے یہاں فلسفیانہ خیالات زندگی سے الگ نہیں ہیں۔ انہوں نے مابعد الطبیعیاتی، اخلاقی اور جہالتی معاملات کے اسرار و رموز کی بڑی خوبی سے نقاب کشائی کی ہے۔ لیکن ان سب کو زندگی سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا ہے۔ ان کی فکر ماورائی نہیں ہے۔ وہ اس پاس اور گرد و پیش کی زندگی سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ وہ انسان کی عظمت کے قائل ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے خیال میں وہ مجبور محض ہے اور اس کو کائنات کی کسی چیز پر کوئی اختیار حاصل نہیں۔ وہ محبت اور اخوت کے علم بردار ہیں۔ وہ موجد ہیں اور ترک رسوم ان کا مسلک ہے۔ ملتوں کے مل جل جانے کو وہ اجڑے ایمان سمجھتے ہیں۔ ان کے پاس انسانی زندگی کے اجتماعی پہلو کا گہرا شعور موجود ہے اور انہوں نے اپنی شاعری میں اس کے نشیب و فراز کی حقیقت سے بڑی ہی بھرپور تصویر کشی کی ہے۔ ان تمام پہلوؤں نے مل کر ان کی شاعری کو عظیم بنایا ہے لیکن ان پہلوؤں کو حسین اور دل آویز بنا کر پیش کرنے میں بھی وہ ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں اور اس صورت حال نے بھی ان کی شاعری کو عظمت سے ہم کنار کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ان کا بنیادی سبب تو یہ ہے کہ غالب کے یہاں ہر شاعرانہ خیال نے ایک تجربے کی صورت اختیار کی ہے۔ وہ محض قافیہ پرائی کی پیداوار

نہیں ہے۔ اس میں آورد کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اسی لیے اس میں ان کی پوری شخصیت کسی نہ کسی زاویے سے اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ یہ شخصیت بڑی چلو دار ہے۔ اس میں بڑی ہی رنگینی اور ہرکاری ہے۔ اس میں روایت کا رنگ رچا ہوا ہے۔ ماحول کے اثرات بھی اس پر بڑے گہرے ہیں۔ ان کی شخصیت کی یہ خصوصیات ان کے شاعرانہ تجربات میں بھی نمایاں نظر آتی ہیں۔ غالب پر فارسی کا اثر بہت گہرا ہے۔ وہ فارسی کی روایت میں پوری طرح رنگے ہوئے ہیں۔ یہ فارسی ہی کی روایت کا اثر ہے کہ ان کی شاعری میں جگہ جگہ گل کاریاں سی ملتی ہیں۔ فارسی کے مزاج کو انہوں نے اردو کے ساتھ کچھ اس طرح ہم آہنگ کیا ہے کہ اس میں بڑی ہی شاداب اور شگفتہ سی فضا پیدا ہو گئی ہے۔ ان کی شاعری میں ہر جگہ چمکناکٹ کا احساس ہوتا ہے۔ بڑی ہی تابندگی نظر آتی ہے۔ فارسی کی جو ان گنت ترکیبیں انہوں نے تراشی ہیں، ان کو دیکھ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جھاڑ فاقوس سے روشن ہیں یا جگہ جگہ پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی ہیں۔ بات یہ ہے کہ ان کی تراشی ہوئی فارسی کی یہ ان گنت ترکیبیں محض الفاظ کا مجموعہ نہیں ہیں۔ ان میں لسی رنگین و پرکار تہذیب کا لہو ہے، جس نے غالب کو پیدا کیا تھا اور جس کی رنگینی و ہرکاری ان کے ایک ایک انداز سے بھرتی ہے۔ یہ اشعار اس صورت حال کے صحیح ترجمان اور عکاس ہیں :

ہوائے سیر گل ، آئینہ ہے مہری قائل
کہ انداز بہ خون غلطیدن بسمل پسند آیا

رنگ شکستہ ، صبح چار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شکفتن گل ہائے ناز کا

ہیں بس کہ جوش بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشہ بساط ہے سر شیشہ باز کا

شب ہوئی بھر انجم رخسار کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بت گلے کا در کھلا

شب خار شوق ساقی رسیغز اندازہ تھا
ترا محیط بادہ صورت خدائہ، خمیازہ تھا

نوازش ہائے بے جا، دھکھٹا ہوں
شکیت ہائے رنگیں کا گلا کیا ؟

کم نہیں نازش ہم نامی چشم خوبان
تیرا ہمارا برا کیا ہے، گر اچھا نہ ہوا

ہے، نذر کرم تحفہ ہے شرم نارسائی کا
بہ خون لختیدہ صد رنگ دعویٰ نارسائی کا

وہی اک بات ہے جو پاں نفس، وان نکبت گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے سری رنگیں نوالی کا
نہ دے ناسے کو اتنا طول، غالب مختصر لکھ دے
کہ حسرت شمع ہوں عرض ستم ہائے جدائی کا

باغ میں مجھ کو نہ لے جا، ورنہ میرے حال پر
ہر گل تر ایک چشم خون فشاں ہو جائے گا

رہط یک شیرازہ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ لیکانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا

حافل، بہ وہم ناز خود آرا ہے، ورنہ بان
ہے شانہ، صبا نہیں، طرہ گیہ کا
جسے ہے جلوۂ گل، ذوق تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا
ثابت ہوا ہے گردن مینا بہ خون خلاق
لڑے ہے، موج سے ٹری رفتار دیکھ کر

محفلیں برہم کرے ہے گنجہ باز خیال
ہیں ورق گردانی' نیرنگ پتک بت خانہ ہم

لے گئی ساق کی غنوت ، قلم آشناس مری
موج مے کی آج رگہ، میٹا کی گردن میں نہیں

یاد نہیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آوائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

ہم کس بہشت شائل کی آمد آمد ہے ؟
کہ غیر جلوۂ گل رہگذر میں خاک نہیں

جب وہ جال دل قروز ، صورت سپر نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے پر منہ چھپائے کیوں

برمش طرز دلبری کیجیے کیا ؟ کہ بن کہیے
اس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

چشم خوباں خامشی میں بھی توا پرواز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دود شعلہ' آواز ہے

ڈھونڈے ہے اس مغنی آتش فلس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

جلوہ زار آتش دوزخ ہمارا دل سہی
لٹہ' شور قیامت کسی کی آب و گل میں ہے

دیکھو تو دل ٹرہی' انداز نقش ہا
موج خرام یار بھی کیا گل کٹر گئی

دل ہوائے خرام ناز سے بھر
محشرستان ہے فراری ہے

ساق بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطلوب بہ نغمہ رہزن تکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ پر گوشہٴ بساط
دایان باغیان و کف کل فروش ہے
لفظ خرام ساق و ذوق صدائے چنگ
یہ جنت نگاہ وہ فردوس گسوش ہے

مانگھے ہے بھر کسی کو لب بام پر ہوس
زلف سیاہ رخ بہ ہریشاں کیے ہوئے
چاہے ہے بھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرسے سے تیز دشنہٴ مڑکاں کیے ہوئے
اک ٹوبہاؤ ناز کو تہا کے ہے بھر نگاہ
چہرہٴ لہر و رخ سے گلستاں کیے ہوئے

یہ حقیقت ہے کہ غالب کی شاعری میں ابہام کا رنگ خاصا گہرا ہے۔ لیکن اس کا سبب صرف ان کی مشکل پسندی نہیں ہے۔ یہ رنگ تو ان کے تجربے کی تہ، در تہ کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس میں تو ان کے فکر کی گہرائی اپنے آپ کو رونما کرتی ہے۔ بعض لوگوں نے یہ کہہ دیا ہے کہ بیدل کے اثر سے انہوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں ایسے اشعار زیادہ کیے، جن میں ابہام کا چلو نمایاں ہے۔ اس میں کسی حد تک صداقت ضرور ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غالب نے ابہام کو پیدا کرنے میں صرف تقلید سے کام لیا ہے۔ دراصل یہ ان کا مزاج ہے اور اس کا منبع ان کے احساس کی شدت، جذبے کی پریچ کیفیت، ان کے شعور کی گہرائی اور فکر کی بلند پروازی ہے۔ بیدل کا اثر اس حد تک تو اس میں ہے کہ اس کی انسان دوستی کے نظریے سے متاثر ہو کر وہ انسان کی عظمت اور کائنات میں اس کی حیثیت پر غور و فکر کرنے لگے ہیں اور جب انہوں نے اس کا شاعرانہ اظہار کیا ہے تو ان کے یہاں ابہام کی خصوصیت نمایاں ہو گئی ہے۔ کیوں کہ اس ابہام کو انہوں نے اپنے حدود میں رکھا ہے۔ اس کی حدیں اشاریت سے ملی ہوئی ہیں اور ان کا یہ ابہام درحقیقت اشاریت ہی کا دوسرا روپ ہے۔ غالب چونکہ بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

اسی لیے انہوں نے اپنی باتیں اشاروں کتابوں میں کہی ہیں اور اس طرح بہت کم کہہ کر بہت کچھ مراد لیا ہے ۔ الہوں نے مشاہدہ حق کی گفتگو بادہ و ساغر میں اور ناز و غمزہ کی گفتگو دشتہ و خنجر میں کی ہے اور اس انداز نے ان کی شاعری میں حسن و جمال کا ایک نیا عالم پیدا کر دیا ہے ۔ یہ اشعار ان کے اس میلان فن کی صحیح نمائندگی کرتے ہیں :

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ ، والے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشتہ و خنجر کہے بغیر

بس کہ ہوں خائب اسیری میں بھی آتش زیر پا
سوئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

غصہ بھر لکا کھلنے ، آج ہم نے اپنا دل
خون کیا ہوا دیکھا ، گم کیا ہوا پایا

دل تا جگر کے ساحل درہائے خون ہے اب
اس رہگذر میں جلوہ گل آئے گرد تھا

دل گزرگاہ خیال مے و ساغر ہی سہی
گر نفسی جادہ سر منزل تقویٰ نہ ہوا

رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شکفتن گل پائے ناز کا

رگ سنگ سے ٹپکتا، وہ لہو کہ بہر نہ توہنا
جیسے علم سجدہ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

وہی اک بات ہے جو پاں نفسی، واں لکھت گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

حنائے ہائے خزاں ہے بہار اگر ہے میں
دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
بہر ترا وقت سفر یاد آیا

غافل یہ وہم ناؤ خود آرا ہے ورنہ یان
بے شائع صبا نہیں طسیرہ گیاہ کا

بھٹنے ہے جلوہ گل ، ذوق تماشا غالب ا
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

ہوں گرفتار الفت صبا
ورنہ باقی ہے طاقت پرواز

عاشقی صبر طلب اور تمنا ہے تاب
دل کا کیا رنگ کروں ؟ غوں جگر ہونے تک

ہک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمی بزم ہے اک وقص شرر ہونے تک

خزاں کیا ، فصل گل کہتے ہیں کس کو ، کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں ، نفس ہے اور ماتم ہال و ہر کا ہے

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شع ہے دلیل سحر ، سو خاموش ہے

غیر لیں غفل میں اویسے جام کے
ہم رہیں یوں تشم لب ہیقام کے

ہے موزن اک قلم غوں دیکھیے کیا ہو
آنا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا سرے آگے

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوت چمن و خوبی ادا کبھی

مدعا محو نمائشائے شکست دل ہے
آگینہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہے مجھ

غالب علامتوں اور اشاروں کے شاعر ہیں۔ انہوں نے روایتی علامتوں اور اشاروں سے بڑا کام لیا ہے۔ اور ان کو استعمال کر کے اپنی شاعری میں بڑی مافوس سی فضا پیدا کی ہے۔ انہوں نے گل، پلبل، قفس، آشیانہ، صیاد، گلچیں، شمع، پروانہ، محفل، مجلس، صحرا، جنوں، باغبان، گل فروش اور اس طرح کی بے شمار علامتیں استعمال کی ہیں اور ان کے ذریعے سے اپنے شاعرانہ تجربے کے نشیب و فراز کو واضح کیا ہے، اور اس طرح ان کے یہاں بڑی حسین اور دل آویز سی فضا پیدا ہوئی ہے لیکن انہوں نے اپنے آپ کو صرف انہیں علامتوں اور اشاروں تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ بعض نئی علامتوں اور اشاروں کی داغ بیل بھی ڈالی ہے۔ ان کے یہاں سحر، رات، زنجیر، آگ، دھواں، شعلہ، شرر اور اس قسم کی بے شمار علامتیں ملتی ہیں۔ ان اشاروں اور علامتوں کے ذریعے ان کی معنویت اپنے آپ کو اس طرح ظاہر کرتی ہے کہ اس میں حسن و جمال کی اقدار بھی رونما ہو جاتی ہیں۔ ان کا اثر براہ راست حواس پر ہوتا ہے اور یہ احساس جمال اور ذوق حسن کی تسکین کا سامان فراہم کرتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ غالب ظرف ٹنگٹائے غزل کے شکوہ سنج تھے اور اپنے بیان کے لیے کچھ اور وسعتوں کی تمنا رکھتے تھے۔ یہ وسعتیں ان کے لیے رمزیت اور ایمائیت نے فراہم کیں۔ غالب کی شاعری میں رمز و ایما کی فراوانی نظر آتی ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ غزل کے مزاج سے واقف ہیں اور اس کے جہانیاقی پہلو کا صحیح شعور رکھتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے غزل کے رمز و ایما کو بڑے سلیفے سے برتا ہے۔ اس کام میں علامتوں، اشاروں اور تلمیحوں نے ان کی بڑی مدد کی ہے۔ لیکن اس رمزیت اور ایمائیت کو انہوں نے اپنی شاعری میں صرف اسی طرح پیدا نہیں کیا ہے بلکہ کہیں ایک مخصوص لمحے نے اس کی تشکیل کی ہے، کہیں ایک مخصوص انداز بیان نے اس کا پیولا تیار کیا ہے، کہیں

بعض خاص تیروں نے اس کی عبارت تعبیر کی ہے اور اس طرح اس رمزیت اور ایمائیت نے ان کی شاعری میں جہالتی چلو کو ابھارا ہے ۔

غالب کی شاعری اپنی ایک شگفتہ اور شاداب فضا سے پہچانی جاتی ہے ۔ وہ غزل کے شاعریں اور انہوں نے غزل کی شاعری کے بنیادی مقتضیات کو پورا کیا ہے ۔ غزل کی ایک اہم خصوصیت سوز و گداز بھی ہے ، غالب کے یہاں غزل کا یہ سوز و گداز بھی موجود ہے لیکن اس سوز و گداز کے ساتھ ساتھ انہوں نے انسانی زندگی کے نشاطیہ چلو کو نمایاں کر کے اپنی شاعری میں بڑی شگفتگی اور شادابی پیدا کی ہے ۔ شوخی اور ظرافت ، طنز اور مزاح نے شگفتگی اور شادابی کے رنگ کو کچھ اور گہرا کر دیا ہے ۔ غالب زندگی کی مسرتوں کے شاعریں اور ان مسرتوں سے متعلق مختلف پہلوؤں کی لوجائی وہ بڑی خوبی سے کرتے ہیں ۔ اس لوجائی ہی کا یہ اثر ہے کہ ان کی شاعری میں جگہ جگہ رنگ و نور کے فوارے سے چھوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں اور حد نظر تک چاندنی سی چھٹکی پوئی دکھائی دیتی ہے ۔ غالب ایک رنگین اور ہرکار تہذیب کے علم بردار ہیں ۔ وہ اس تہذیب کی جہالتی اقدار کا گہرا شعور رکھتے ہیں ۔ انہیں ان اقدار کے ساتھ ایک جذباتی وابستگی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس تہذیب کی تمام رنگینی اور ہرکاری سمٹ کر ان کی شاعری میں آ گئی ہے ۔ اس تہذیب کی جہالتی اقدار کا عکس ان کی شاعری کے آئینے میں دکھائی دیتا ہے ۔ غالب کے مزاج میں ایک حساس مزاج بھی موجود تھا ۔ وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر دل کھول کر ہنس سکتے تھے ۔ انہیں ناسازگار حالات کا مذاق اڑانا بھی آتا تھا ۔ اسی لیے ان کے یہاں رونے اور منہ بسورنے کے بجائے مسکرائے اور ہنسنے کی فضا خاصی نمایاں نظر آتی ہے اور اس فضا نے بھی ان کی شاعری میں شگفتگی اور شادابی کے رنگ کو نمایاں کیا ہے ۔ غالب اس فضا کے بڑے ہی چابک دست مصور ہیں ۔

غالب
کی
تصویر کاری

انیسویں صدی میں ہندوستانی مسلمانوں کی ثقافتی روایت نے جو صورت اختیار کی تھی ، غالب کی شخصیت اس کی صحیح آئینہ داری کرتی ہے ۔ اس ثقافتی روایت میں باوجود انحطاط و زوال کے ، وہ جو ایک جولانی اور تباہی تھی ، اس کے اثرات غالب کی شخصیت میں بھی نظر آتے ہیں ۔ غالب کے یہاں غم کے باوجود زندہ رہنے کی جو خواہش ہے اور رواں دواں رہنے کی جو آرزو ہے ، وہ اسی ثقافتی روایت کا پرتو ہے۔ اور ان کی اس شخصیت کے اثرات ان کی شاعری میں بھی اپنی جھلک دکھاتے ہیں ۔ بلکہ شاید یہ کہنا بے جا نہیں کہ ان کی ساری شاعری اسی ثقافتی روایت اور اس کے زیر اثر تشکیل پانے والی ان کی شخصیت کی عکاسی کرتی ہے ۔ معنوی اور لفظی دونوں اعتبار سے ان کی شاعری اس ثقافتی روایت کی صحیح آئینہ دار ہے ۔ اس زمانے کے خارجی حالات ، داخلی تجربات ، ذہنی واردات اور جذباتی کیفیات۔ ان سب کا مجموعی امتزاج ان کی شاعری میں مختلف زاویوں سے اپنے آپ کو رونما کرتا ہے ۔

شاعری معنوی اور فنی دونوں اعتبار سے ، جیسا کہ بعض اہم نقادوں نے کہا ہے ، تصویروں اور پیکروں کے مجموعے کا نام ہے ۔ شاعر کا تجربہ تصویروں اور پیکروں سے عبارت ہے ۔ وہ جب ان تہہ در تہہ اور پیچیدہ تجربات کو ظاہر کرتا ہے ، تو اس کا اظہار ان تصویروں اور پیکروں کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ خاص طور پر شاعری کے فنی اور جمالیاتی پہلو میں تو یہ تصویر کاری اور پیکر کشی بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا پیولا شاعر کے ذاتی تجربات اور اجتماعی احساسات کے ہاتھوں تیار ہوتا ہے ۔

غالب کی شاعری میں جو اسجھری یا تصویرکاری اور بیکر تراشی ملتی ہے ، وہ بھی ان کے ذاتی تجربات اور اجتماعی احساسات کی صحیح آئینہ دار ہے اور اس میں ان کی شخصیت اور ماحول کی ایسی رنگا رنگ تصویریں نظر آتی ہیں، جو حقیقت سے بھرپور ہیں ۔

یہ وہ زمانہ تھا، جب زندگی پر اضطراب و زوال کے بادل منڈلا رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ثقافتی زندگی اس زمانے میں اپنے معراج کمال پر پہنچ گئی تھی۔ کئی سو سال میں مغلوں کی تہذیب نے ایک ایسی ثقافتی روایت کو پروان چڑھایا تھا ، جس کی اہمیت کا خیال اور عظمت کا احساس، افراد کے مزاجوں کا جزو بن گیا تھا ۔ اس اضطراب و زوال کے زمانے میں بھی اس احساس و خیال کے نقوش دھندلے نہیں ہوئے تھے، بلکہ اس عالم میں تو یہ احساس و خیال کچھ زیادہ ہی شدید ہو گیا تھا ۔ چنانچہ وہ رنگینی اور رعنائی، جو مغلوں کی تہذیبی اور ثقافتی روایت میں بنیادی حیثیت رکھتی تھی، اس کو اس زمانے کے افراد نے اپنے لیے معیار بنا لیا تھا ۔ شمشیر و سنان کو اولیت حاصل نہیں رہی تھی ۔ طاؤس و رہاب کا خیال زندگی پر سرخوشی بن کر چھا گیا تھا ۔ رامش و رنگ کی دنیا میں آباد نہیں ۔ رقص و سرور کی بزم آرائیوں نے جنت نکاح اور فردوس گوش بن جانے کے تمام سامان فراہم کر دیے تھے ۔

غالب کی تصویرکاری اور شاعرانہ بیکر تراشی میں بھی اس صورت حال کا اثر واضح طور پر نظر آتا ہے ۔ اُن کے ہاں بزم مئے، گردش پیرائے، ساغر، عقل رقص و سرود ، مغنی آتش لہس اور اس قبیل کی جو بے شمار تصویریں ملتی ہیں ، اس کی بھرک یہی صورت حال ہے ۔ یہ اشعار زندگی کی اس کیفیت کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں :

دل گزر نگہ خیال سے و ساغر ہی صحن
گر نفس جاہد " سر منزل تقویٰ نہ ہوا

ہیں بس کہ جوش باد سے شیشے اچھل رہے
پر گوشہ " بساط ہے سر شیشہ باز کا

نفس موج محبط ہے خودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا ؟

میں اندر بزم سے ہے ، یوں نشہ کام آؤں !
گر میں نے کی تھی توبہ ، ساقی کو کیا ہوا تھا؟

مے مئے کسی ہے طاقت آشوب آگئی؟
کہنجا ہے عجز حوصلہ نے خط ابلاغ کا

شب کہ وہ مجلس فروز خلوت لاسوس تھا
رشتہ بر شمع ، خار کسوت قالوس تھا

بر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
ہنٹی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

محلیں ہر دم کرے ہے گجھہ باز خیال
ہیں ورق گردانی نیرنگ یک بت خانہ ہم

ہم سے کہل جاؤ یہ وقت مئے ہرستی ، ایک دن
وہ ہم چھوڑیں گے ، رکھ کر عذر مستی ، ایک دن
فوض کی پیتے تھے مئے ، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لانے کی پہاری فائدہ مستی ، ایک دن

لے گئی ساقی کی غوث فلزم آشناس مری
سوج سے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

خالب چھٹی شراب ، ہر اب بھی کیسی کہیں
ہوتا ہوں روز اب و شب مایہتاب میں

جاں نزا ہے بادہ ، جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی ، گویا ، رگ جاں ہو گئیں

یاد نہیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیں
لیکن اب نفی و نکار طاق نسیاں ہو گئیں

جب مے کدہ چھٹا ، تو پھر اب کیا جگہ کی ٹید
مسجد ہو ، مدرسہ ہو ، کوئی خسانقاہ ہو

مے سے غرض نشاط ہے ، کس روساء کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

رندانِ درمے کدہ ، گستاخ ہیں زاہد !
زُہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں کے

میں نے کہا کہ : 'بزمِ ناز چاہیے غیر سے نہیں'
من کے ستم ظریف نے مجھ کو الہا دیا کہ : 'یوں ؟'

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیسے
بیشا رہا ، اگرچہ اشارے ہوا کیسے

گرچہ ہے کس کس ادا کی ہے ، ولیے یا ابنِ ہمد
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

یہوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے ؟

با شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط
دامانِ باغیان و کف کل فروش ہے
لطفِ خرام ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ ، وہ فردوسِ گوش ہے

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادِ نوش ہے ، بادِ بیانی

کہنے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دردِ تہہ جام بہت ہے

ڈھونڈے ہے اس سفنی آتشِ نفس کو جس
جس کی صدا ہو جلوةِ برق فنا مجھے

مے پرستانِ خم سے منہ سے لگانے ہیں بنی
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

ان اشعار میں غالب نے ، ساحر ، جام ، مینا ، خم ، جوش ، بادہ ،
 گوشہ ، سباط ، محفل ، شمع ، فانوس ، دامن باغبان ، کف گل فروش ، مغنی
 آتش نفس ، وغیرہ کی جو تصویریں بنائی ہیں اور پیکر تراشے ہیں ، ان کی
 جڑیں ان کی ثقافتی روایت میں دور تک پہنچی ہوئی ہیں ۔ اور یہی وجہ ہے
 کہ ان میں نہ صرف معنوی گہرائی کا پتہ چلتا ہے بلکہ صوری گہرائی کی
 بے وجہ مانوس اور دل موہ لینے والی فضا نظر آتی ہے ۔

غالب اس فضا کے شیدائی ہی نہیں ہیں ۔ یہ فضا تو ان کے مزاج اور
 شخصیت کا بنیادی جزو ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعرانہ تصویر کاری
 اور پیکر تراشی میں اس کا رنگ اتنا گہرا اور رچا ہوا نظر آتا ہے ۔ اس
 کا ایک سبب تو ، جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے ، یہ ہے کہ غالب
 نے اسی تہذیبی اور ثقافتی روایت کی آغوش میں آنکھ کھولی تھی اور اسی کے
 سامنے میں ان کی ذہنی ، جذباتی اور جالیاتی نشو و نما ہوئی تھی ۔ دوسرا سبب
 یہ ہے کہ سیاسی انحطاط اور معاشی معاشرتی زوال کے باعث اس تہذیبی اور
 ثقافتی روایت کی اہمیت کا احساس افراد میں شدید بے شدید تر ہو گیا تھا ۔
 غالب کے یہاں بھی یہی صورت حال ملتی ہے ۔ غالب کو چونکہ اس بات
 کا احساس تھا کہ یہ قدریں انحطاط و زوال کی وجہ سے آندھیوں کی زد پر
 ہیں ، اس لیے وہ انہیں غیر شعوری طور پر کچھ زیادہ ہی عزیز رکھتے تھے ۔
 یہی وجہ ہے کہ ان کا شاعرانہ تجربہ جب جالیاتی اظہار کی صورت
 اختیار کرتا ہے ، تو اس تہذیبی روایت کا رنگ ان تصویروں اور پیکروں
 میں بہت گہرا ہو جاتا ہے ۔

یہ تہذیبی روایت غالب کو بہت عزیز تھی اور ان کی شخصیت اسی
 سے عبارت تھی ۔ لیکن انہوں نے اس روایت کو شے ہوئے بھی دیکھا ہے ۔
 انہیں یہ روایت آندھیوں کی زد پر بھی نظر آتی ہے اور اس کو انہوں نے
 نہ صرف اپنی انفرادی زندگی بلکہ اس وقت کی اجتماعی زندگی کو بھی ایک
 بہت بڑا المیہ تصور کیا ہے ۔ معنوی اعتبار سے دیکھا جائے ، تو انہوں نے
 اس صورت حال پر خون کے آنسو پھائے ہیں اور فنی اعتبار سے اس کیفیت
 کے اظہار کے لیے ایسی تصویریں بنائی ہیں اور اس قسم کے پیکر تراشے ہیں ،
 جن میں آگ ، شرر ، شعلہ ، دھواں ، شمع ، بوق ، بجلی وغیرہ کے نمایاں پیکر
 نظر آتے ہیں ۔ غالب نے ان سب سے اپنے شاعرانہ اظہار و ابلاغ میں بڑا کام

لیا ہے ۔ ان اشعار میں دیکھیے ، کہ آگ اور اس کے متعلقات نے کیا کیا روپ اختیار کئے ہیں اور کہسی کہسی عجیب تصویریں بنائی ہیں :

اس کہ ہوں غالب ! اسپری میں بھی آتش زیر پا
ہوئے آتش دیدہ ہے ، حلقہ مری زنجیر کا

آشنگی نے نقش سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

دل مرا سوزِ نہاں سے بے بجاہا جل گیا
آتش خاموش کی مانند گویا ، جل گیا

ہوئے گل ، نالہ ، دل ، دود چراغ محفل
جو ٹری بزم سے نکلا ، سو پریشان نکلا

مری تعبیر میں مضمحل ہے اک صورتِ خراں کی
پیولا برقِ غمگین کا ہے ، خون گرم دہقان کا

خاموشی میں نہاں ، خون گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں ، میں بے زباں ، کورِ غریباں کا

سراپا رومنِ عشق و ناگزیرِ الفت ہستی
عبادتِ برق کی کرنا ہوں اور السوسِ حاصل کا

رگِ سنگ سے ٹپکتا ، وہ لہو کہ پھر نہ ٹھنکا
جیسے غم سمجھ رہے ہو ، یہ اگر شرار ہوتا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشہدِ تقریر بھی تھا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ ، درِ غورِ محفل نہیں رہا

شمع جلتی ہے تو اُس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلہٴ عشق سیہ پوش ہوا ، پیرے بعد

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر
 جلتا ہوں اپنی طاقت گفتار دیکھ کر
 آتش برست کہتے ہیں ، اہل جہاں بھجے
 سر گرم نالہ ہائے شرر یار دیکھ کر

بھجے اب دیکھ کر اپر شفق آلودہ ، یاد آیا
 کہ فرقت میں تری ، آتش برستی تھی گلستان بر

ہنگ نظر بیش نہیں فرصت ہستی ، غافل !
 گرمی بزم ہے اک رقص شرر ہوئے تک
 غم ہستی کا املا کس سے ہو جز مرگ علاج ؟
 شمع بر رنگ میں جلتی ہے ، سحر ہوئے تک

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو ، بیش از یکہ نفس
 برق سے کرتے ہیں روشن ، شمع ماتم خالہ ہم

اک شرر دل میں ہے ، اس سے کوئی گھبرائے گا کیا
 آگ مطلوب ہے ہم کو ، جو ہوا کہتے ہیں

رواق ہستی ہے ، عشق خانہ ویراں ساز ہے
 انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں بھجے
 خرمن جلے ، اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

فلس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر بدمم !
 گری ہے جس پہ کل بچلی ، وہ میرا آشیانہ کیوں ہو ؟

امن شمع کی طرح ہے ، جس کو کوئی بجھا دے
 میں بھی جلتے ہوؤں میں ، ہوں داغ نا تھامی

رحم کر ظالم کہ کیا بود چراغ کشتہ ہے
 نبض بیمار ونا ، دود چراغ کشتہ ہے

ساہم میرا مجھ سے مثل دود بھاگے ہے اسد !
 پاس مجھ آئی بجان کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

جلدوہ زار آتش دوزخ بہارا دل سہی
 فتنہ شور قیامت کس کی آب و گل میں ہے ؟

ظلمت کدلے میں میرے شب غم کا جوش ہے
 اک تمنع ہے دلیل سحر ، - و خموش ہے

بھر گرم قالہ پائے شرر بار ہے نفس
 مدت ہوتی ہے سیر چراغاں کیے ہوئے

ظاہر ہے کہ ان اشعار میں آگ ہی آگ ہے - جہاں آگ نہیں ہے وہاں آگ کا کوئی اور روپ ہے - یعنی شعلہ ہے ، شرر ہے ، دھواں ہے ، شمع ہے ، شمع کشتہ ہے ، برق ہے ، بجل ہے - غرض یہ کہ اس طرح کی بہت سے چیزیں جن سے غالب نے شاعرانہ پیکر تراشے ہیں لیکن ان کی معنویت محدود نہیں ہے - ان کے پردے میں تو غالب نے نہ جانے کیا کیا کچھ کہنے کی کوشش کی ہے - آتش زہر ہا ، موئے آتش دیدہ ، دود چراغ محفل ، سوز نہاں ، آتش خاموش ، برق خرمن ، خون گرم دبقان ، چراغ مرده ، برق ، شرار ، شمع کشتہ ، وغیرہ محض الفاظ کا مجموعہ نہیں ہیں - یہ تو باقاعدہ بنائی ہوئی تصویریں ہیں جن کو غالب کے شاعرانہ تجربے نے تخلیق کیا ہے اور یہ تصویریں زندگی سے بھرپور اور منہ سے بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں کیوں کہ ان میں غالب کے انفرادی اور اجتماعی تجربات کا لہر ہے -

یہ تصویریں غالب کی شاعری میں بہت عام ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے زندگی بھر خود اپنے آپ کو اور اپنے اس پاس اور گرد و پیش کی پوری زندگی کو آگ میں جلتا ہوا دیکھا ہے - انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ایک ایک چلو میں انہیں شعلے سے بھڑکنے نظر آتے ہیں اور ایک ایک گوشے سے دھواں سا اٹھتا ہوا دکھائی دیا ہے - اور اس صورت حال نے خود انہیں ایک شمع کشتہ اور چراغ مرده بنا دیا ہے - آگ اور اس کے متعلقات کی تصویروں کے ساتھ ساتھ غالب کی شاعری

میں خون اور خون کی سرخی کی تصویریں بھی نمایاں نظر آتی ہیں۔ ان تصویروں اور پیکروں کی تخلیق بھی غالب کی مخصوص ذہنی کیفیت نے کی ہے۔ غالب مزاج اور اُتاد طبع کے اعتبار سے رومانی تھے۔ مثالیت پسندی کا خیال اُن کی گھنٹی میں بڑا تھا۔ دنیا کی تمام نعمتوں سے بھی اُن کا مطمئن ہونا ناممکن تھا۔ اُن کی زندگی میں ہزاروں خواہشیں ایسی تھیں کہ ہر خواہش پر اُن کا دم ٹکنا تھا اور بے شمار ارمانوں کے نکلنے کے بعد بھی وہ جی سمجھتے تھے کہ اُن کے ارمان کم نکلتے ہیں۔ وہ طرزِ تپاک اہل دنیا کو دیکھ کر افسردگی کی آرزو کرتے تھے۔ زندگی کا ہر غش انہیں فریادی نظر آتا تھا اور اُن کی نظریں ہر پیکر تصویر کے پیرہن کو کاغذی دیکھتی تھیں۔ نا آلودگی ایسے شخص کا مقدر ہوتی ہے اور یہ سب کچھ رومانیت پسندی کا کرشمہ ہے۔ غالب کے مزاج میں اس رومانیت پسندی کا رنگ رجا ہوا تھا اور اس رومانیت پسندی کا یہ نتیجہ ہے کہ انہوں نے انسانی زندگی اور خصوصاً اپنے زمانے کی انسانی زندگی میں خون کے دریاؤں کو موجزن دیکھا ہے۔ خصوصاً اپنے آس پاس اور گرد و پیش کی زندگی تو انہیں سر سے پاؤں تک لہو لہان نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں بھی خون کی تصویریں اتنی نمایاں ہیں۔ ان اشعار میں اسی صورت حال کی ترجمانی ہے :

دل نا چکر کہ ساحل دریا نے خون ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل ، آگے گرد تھا

غنچہ بھر لگا کھانے ، آج ہم نے اپنا دل
خون کیا ہوا دیکھا ، گم کیا ہوا پایا

نہیں معلوم ، کس کس کا لہو پانی ہوا ہو گا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مڑگوں کا
مری تعبیر میں مضمحل ہے اک صورت خرابی کی
پھوللی برق خرمین کا ہے ، خون گرم دھقان کا

باغ میں مجھ کو نہ لے جا، ورنہ میرے حال پر
ہر گل تر ایک چشم خون لہان ، ہو جائے گا

دردِ دل لکھوں کب تک، جاؤں، اُن کو دکھلاؤں
 اُنکلیاں نکار اپنی، خامسہ لحدوں چکان اپنا

خون ہے دل خاک میں احوال بتاں ہر، یعنی
 اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا، سیرے بعد

ثابت ہوا ہے گردن مینا یہ خونِ خلق
 لرزے ہے موج سے تری رفتار دیکھ کر

ہے خون جگر جوش میں، دل کھول کے روتا
 ہونے جو کئی دہدہ خونِ نابہ فتائی اور

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں مَنائیں، اسد
 جانے ہیں سینہ پر خون کو زُفداں خانہ ہم

جوئے خون آنکھوں سے جنے دو کہ ہے شامِ فراق
 میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

نہ اتنا بشری ایخ جفا پر تازِ فرساؤ
 میرے دریائے بہتاں میں ہے اک موجِ خون، وہ بھی

عمر ہر چند کہ ہے برقِ خروار
 دل کے حوں کرنے کی فرصت ہی صبر

کارگاہِ ہستی میں، لالہ داغِ سامان ہے
 برقِ خرمینِ راحت، خونِ گرم دہقان ہے

خلشِ حمزہ خونِ ریز نہ ہوچہ
 دیکھ خونِ نابہ فشانِ مہری

ایسا ہے سر انگشتِ حنائی کا قصور
 دل میں نظر آتی تو ہے اک، بولد لہو کی

خون ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں ، اے مرگ !
 رہنے دے مجھے ہاں کہ ابھی کام بہت ہے

بلا سے گر مڑا یار تشنہ عوں ہے
 رکھوں کچھ اپنی بھی مرگان خون لاشاں کے لیے

غالب نے یہاں ساحل دریائے خون ، خون کیا ہوا دیکھا ، سر شک
 آلود ہوتا ، خون گرم دھپان ، چشم خون لاشاں ، خامہ خون چکل ، خون غلغلہ ،
 دیدہ خونتابہ لاشاں ، سینہ پر خون ، جوئے خون ، موج خون ، تشنہ خون
 اور مرگان خون لاشاں وغیرہ کی جو تصویریں بنائی ہیں ، ان میں خون کا
 رنگ بہت گہرا ہے ۔ ان اشعار میں انہوں نے جو پیکر تراشے ہیں ، ان
 میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بعض خون چکل حقائق کو پیش کیا
 ہے ۔ خون کی ان تصویروں نے ان کے شاعرانہ اظہار و ابلاغ میں شدت
 پیدا کی ہے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کا تاثر نسبتاً گہرا ہوتا ہے ۔ نامازگار
 حالات کے نتیجے میں غالب نے اپنی انفرادی زندگی اور اپنے زمانے کی
 اجتماعی زندگی ، دونوں میں دریائے خون کو موجزن دیکھا ہے ۔ اور اس کے
 ایک ایک پہلو سے انہیں جوئے خون بہتی ہوئی نظر آتی ہے ۔ یہی وجہ ہے
 کہ خون کا تصور ان کے احساس و شعور میں کچھ اس طرح رس بس گیا
 ہے کہ وہ جب بھی کوئی بات کرتے ہیں تو خون کا پیکر کسی نہ کسی
 روپ میں ان کے سامنے آجاتا ہے ۔ اور زندگی کے مختلف اور متنوع حقائق کے
 اظہار کے لیے اس سے کام لیتے ہیں ۔ غالب نے خون کی تصویروں سے
 شاعرانہ اظہار و ابلاغ میں جو کام لیا ہے ، وہ انہیں کے ساتھ مخصوص ہے
 اور اردو غزل کی روایت میں کہیں اور اس کی یہ صورت نظر نہیں آتی ۔

جہاں تک شاعرانہ فن کاری اور اس میں تصویر کاری اور پیکر تراشی
 کا تعلق ہے ، غالب نے اس میں بڑی حد تک روایت سے بغاوت کی ہے ۔
 اور اس طرح اردو غزل کی روایت کو بعض نئے تجربات سے آشنا کیا ہے ۔
 لیکن وہ اس روایت کو پوری طرح نظر انداز نہیں کر سکے ہیں ۔ انہوں
 نے غزل کی روایتی تصویروں اور پیکروں سے بھی اظہار و ابلاغ میں بڑا
 کام لیا ہے ۔ لیکن انہوں نے اپنے نئے احساس اور نئے شعور سے کام لے کر
 ان روایتی تصویروں اور پیکروں میں نیا خون دوڑا دیا ہے ۔ اور اس طرح

ان میں ایک نئی زندگی پیدا کی ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ ان کا بہت بڑا نئی کارنامہ ہے۔ انہوں نے غزل کے پورے قنٹی نظام کو اسی طرح برتنے کی کوشش کی ہے، جس طرح ان کے پیسروں نے اس کو برتا ہے۔ لیکن ان کے چار غزل کی روایت کا یہ پورا نظام زندگی اور جولاں سے ہمکنار نظر آتا ہے۔ اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اس میں زندگی کے احساس و شعور کا لہو ہے۔ یہ اشعار اس حقیقت کی وضاحت کرتے ہیں :

تہیے بغیر مر نہ سکا کوہکن ، اسد
سر گشتہ' خمار رسوم و قیود تھا

شور ہند ناصح نے ، زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی ہو چھے " تم نے کیا مزا پایا ؟"

احباب چارہ سازی' وحشت نہ کر سکے
زندہاں میں بھی خیال ، پایاں نورد آہا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر ، نقاب اس شوخ کے رخ پر کھلا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ اے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا ، کوئی غم گسار ہوتا

شوق پر رنگ ، رقیب سر و سامان نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

بغل میں غبر کی ، آپ آج سوئے ہیں کہیں ، ورنہ
سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا

محبت تھی چمن سے ، لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ سوج ہوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم سیرا

بقدر ظرف ہے ساق! خمار تشنہ کاسی بھی
جو تو دریائے سے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

در بہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا بھر گیا
 جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا
 کلیوں میں بیری نعش کو کھینچے بھرو کہ میں
 جاں دادہ ہوائے سر رہ گزار تھا

گرہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
 در و دیوار سے لپکے ہے بیاباں ہوتا
 عشرت قتل گہ لہل تمنا مت ہوچہ
 عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہوتا

مانع وحشت خراس ہائے لیلی کون ہے ؟
 خانہ مجنون صحرا گرد ، بے دروازہ تھا

حضرت ناصح گر آئیں ، دہدہ و دل فرش راہ
 کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا ؟
 آج واں تیغ و کفن بالدرہ ہوئے جاتا ہوں میں
 عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا ؟
 گر کیا ناصح نے ہم کو قید ، اچھا ! یوں سہی
 یہ جنوں عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا ؟
 خانہ زاد زلف ہیں ، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں ؟
 ہیں گرفتار و لا ، زندان سے گھبرائیں گے کیا ؟

کوئی میرے دل سے ہوچھوے ، نرے تبر نیم کش کو
 یہ خلش کہاں سے ہوتی ، جو جگر کے ہار ہوتا
 یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح ؟
 کوئی چارہ ساز ہوتا ، کوئی علم گیار ہوتا
 ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
 نہ کبھی جنازہ اٹھتا ، نہ کہیں سزار ہوتا

وہی اک بات ہے جو یاں نفس ، واں نکبت کل ہے
 چمن کا جلوہ ، باعث ہے مری رنگیں نوانی کا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو ؟
اک بھاشا ہوا ، گلا نہ ہوا

گھر ہارا ، جو نہ روئے بھی ، تو ویران ہوتا
بھر اگر بھر نہ ہوتا تو بیابان ہوتا
کسوف ویرانی سی ویرانی ہے !
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

ریشک کہتا ہے کہ 'اُس کا غیر سے اخلاص حیف'
عقل کہتی ہے کہ 'وہ بے سہر کسی کا آشنا'
رہط یک شیرازۂ وحشت ہیں اجڑائے ہمار
سبزہ بیکانہ ، صبا آوارہ ، گل نا آشنا
نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا مگر اُس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریبان پر
ہوں گرفتار اُلفت صیاد
ورنہ باقی ہے طاقت پرواز

مر گیا بھوڑ کے سر غالب وحشی ، ہے ، ہے ،
پیشہنا اُس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

آبرو کیا خاک، اُس گل کی جو گلشن میں نہیں
ہے گریبان رنگ پیراہن ، جو دامن میں نہیں

سانع دشت نور دی کسوف تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے ہاؤں میں ، زنجیر نہیں
قاصد کے آنے آئے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں ، جو وہ لکھیں گے جواب میں

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی بد کہ پتھر نہیں ہوں میں

وفا کیسی ، کہاں کا عشق ؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھرے سنگدل ! تیرا ہی سنگ آستان کیوں ہو؟
قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ، بعدم !
گری تھی جس پہ کل بیل ، وہ میرا آشیان کیوں ہو؟

مے عشرت کی خواہش ماقہ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک ، دو ، چار ، جام وازگون وہ بھی

خزاں کیا؟ فصل گل کہتے ہیں کوکس؟ کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قفس سے اور ماقہ ہال و ہر کا ہے

عشق مجھ کو نہیں ، وحشت ہی سہی
میری وحشت ، تری شہرت ہی سہی

اُڑی پھرے ہے خاک مری کوئے ہار میں
ہارے اب اے ہوا ! ہوس ہال و ہر کئی

اے ساکینان کوچہ دلدار ! دیکھنا
تم کو کہیں جو غالب آشفہ سر ملے

بہر چکر کھودنے لگا قلعہ
آمد فصل لالہ کاری ہے

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں ، مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے گریباں ، مجھ سے

قد و کیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں ، وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

نہیں ہمار کو فرصت ، نہ ہو ، ہمار تو ہے
طراوت چمن و محوی ہوا کہیں

اے عندلیب ! یک کف غس بہر آشیان
طوفان آمد آمد فصل بہار ہے

ان اشعار میں جو تصویریں غالب نے پیش کی ہیں ، وہ غزل اور تنزل کی روایت سے تعلق رکھتی ہیں اور ان تصویروں کو کئی سو سال تک فارسی اور اردو کے شاعروں نے اپنے اظہار و ابلاغ کے لیے استعمال کیا ہے ۔ شاہد یہی وجہ ہے کہ یہ تصویریں دوسرے شعراء کے جہاں کچھ فرسودہ سی نظر آتی ہیں لیکن غالب نے ان تصویروں میں ایک تازگی اور تازہ کاری پیدا کی ہے ۔ اسی لیے ان میں یہ نیا احساس اور نیا شعور جب جہالتی اظہار کا روپ اختیار کرتا ہے تو ان پرانی تصویروں میں بھی نئی زندگی پیدا کر کے انہیں جدت سے ہم کنار کر دیتا ہے ۔ ان اشعار میں فرہاد کوہکن ، محنوں صحرا گرد ، ناصح ، رفیب ، محبوب ، کوچہ یار ، بیابان ، زلداں ، زنجیر ، تیغ ، کفن ، دار و رحمن ، در و دیوار ، حید ، گلشن ، دام ، نفس ، آشیانہ ، بجلی ، بال و پر ، غنڈلیب ، فصل بہار وغیرہ کی جو تصویریں ہیں ، وہ اس حقیقت کو صاف طور پر واضح کرتی ہیں کہ ان میں ایک جدت اور اچھوتا پن ہے اور وہ ایک نئے احساس اور نئے شعور کی وجہ سے ایک نئی معنویت سے مالا مال ہیں ۔

یہ غالب کے فنی اجتہاد کی ساحری ہے کہ انہوں نے ان سب کو نیا رنگ دیا ہے اور ان کو نئے ساتھوں میں ڈھال دیا ہے ۔
غرض غالب کی شاعرانہ تصویر کاری اور ہیکر تراشی اردو غزل کی روایت میں ایک نئی شان سے جلوہ گر نظر آتی ہے ۔ ان کے نئے احساس و شعور اور نئے فکر و خیال نے غزل کی روایتی تصویروں میں نئی زندگی کی لہر دوڑائی ہے اور بعض ایسی تصویریں بھی بنائی ہیں اور ایسے ہیکروں کو بھی تراشا ہے ، جو اردو غزل کی روایت میں بالکل اچھوتے اور نئے ہیں ۔
غالب کا کہنا ہے کہ انہوں نے ان سب کو غزل کی روایت کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کر دیا ہے کہ ان کے جنسی اور نا مانوس ہونے کا احساس نہیں ہوتا اور اس کا سبب تجربے کی وہ صداقت اور اخلاقی مندی ہے ، جو غالب کی شاعری کی جان اور ان کی شاعرانہ فن کاری کا ایمان ہے !

غالب
کے
فنی اضافے

غالب کے فن کی تحلیل اور اس کے مختلف پہلوؤں کے تجزیے سے وہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے خالقِ جہاں اور ایک بہت بڑے فن کار تھے۔ انہوں نے فن کی اہمیت کو سمجھا تھا اور اس کے بنیادی اصولوں کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ ان اصولوں کو برتنا ان کے پیش نظر تھا۔ چنانچہ انہوں نے ان بنیادی اصولوں کو عملی طور پر بڑے سلیقے سے برنا ہے۔ وہ فن کی روایت کے پرستار تھے، لیکن اس روایت کو تجربے کے ساتھ ہم آہنگ کرنا بھی ان کے پیش نظر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں روایت اور تجربے کا ایک حسین اور متوازن امتزاج ملتا ہے۔ وہ حسن و جمال کے شہدائی تھے اور زندگی اور فن دونوں میں اس حسن کی تلاش و جستجو ان کے پیش نظر تھی۔ چنانچہ وہ اس حسن و جمال کی تلاش و جستجو میں سرگرداں رہے ہیں اور انہوں نے اس کی تخلیق کو بھی اپنا شعار بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں حسن و جمال کی تخلیق مختلف طریقوں سے ہوتی ہے اور وہ اس میں مختلف زاویوں سے اپنے آپ کو رونما کرتا ہے۔ وہ ایک تہذیب کی بددوار ہیں اور اس تہذیب کا جمال ان کے فن میں اپنی تمام رنگینیوں اور رعنائیوں کے ساتھ بے نقاب نظر آتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ غالب کے مزاج میں بغاوت کے عناصر پوری طرح موجود تھے اور طبیعت اور اقتدارِ طبع کے اعتبار سے وہ ایک انقلابی تھے۔ اس کی ایک بڑی وجہ ان کی رومانیت اور رومان پسندی بھی تھی۔ ہر رومانی مزاج فن کار اپنے ماضی سے مطمئن نہیں ہوتا۔ لہذا اسے مطالبہ پیدا کرنا بھی اس کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ وہ تو مستقبل میں حسین

دنیا ہی بسانا ہے اور ان دنیاؤں کو اپنے تغزل کے رنگوں سے سجاتا ہے ۔ وہ صرف سہانے خواب دیکھتا ہے اور انہیں خوانوں کے سہارے اس کی زندگی بسر ہوتی ہے ۔ غالب نے بھی اپنی رومانیت ہندی کی وجہ سے جہی سب کچھ کیا ہے ۔ وہ کسی چیز سے مطمئن نہیں ہونے خوب سے خوب تر کی تلاش میں انہوں نے زارگی اور فن کے ان گنت صحرائوں کی خاک جھانی ہے ۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انہوں نے ماضی اور حال سے اپنا رشتہ توڑا نہیں ہے ۔ انہوں نے روایت سے بغاوت ضرور کی ہے لیکن وہ روایت کے بعض پہلوؤں کی پرستش میں بھی پیش پیش رہے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ رومانیت اور رومان ہندی کے باوجود ، روایت کا رچاؤ اور اس کی رنگینی ان کے فن میں اپنی تمام تابانہوں کے ساتھ جلوہ گر ہے ۔ غالب کے فن کا یہ بڑا کمال ہے کہ اس میں روایت کے اثرات صحت ہندی کے ساتھ اپنے آپ کو روپما کرتے ہیں ۔

روایت کے اثرات میں جو چیز سب سے زیادہ اُن کے یہاں نمایاں نظر آتی ہے ، وہ فارسی شاعری کی روایت اور خاص طور پر اس روایت کے ان علم برداروں کے اثرات ہیں ، جن کی شاعری نے خود اس روایت کو رنگین اور ہرکار بنانے میں نمایاں حصہ لیا ہے ۔ ہیدل ، عرفی ، نظیری اور ظہوری کے اثرات ان کے فن میں بہت نمایاں ہیں ۔ ان شاعروں نے فارسی شاعری کی روایت کو جس رنگینی اور ہرکاری سے آشنا کیا ہے ، وہ مجموعی طور پر سمٹ کر غالب کے فن میں کچھ اس طرح -رہایت کر گئی ہے ، جیسے کسی صحت مند اور توانا جسم میں تازہ اور رخشاں لہو دوڑتا ہے ۔ غالب نے فارسی شاعری کی روایت سے رنگینی اور رچاؤ کی خصوصیات حاصل کی ہیں اور انہیں اردو شاعری کی فنی روایت کا جزو بنا دیا ہے ۔ ان سے قبل اردو شاعری میں معنوی اور صوری دونوں اعتبار سے وہ شگفتگی اور شادابی نہیں تھی ، جو ان کے ہاتھوں پیدا ہوئی ۔ غالب کے فن کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے اردو شاعری کی روایت کو ان خصوصیات سے آشنا کیا ۔

غالب کے فن میں ایک نشاطیہ رنگ اور طریہ آہنگ بھی خاصا نمایاں نظر آتا ہے ۔ بظاہر تو یہ رنگ و آہنگ ان کی شخصیت اور انشاد طبع کا ترجمان اور عکاس ہے ، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فارسی شاعری کی روایت کے اثرات بھی ان کے فن میں اس رنگ و آہنگ کو

نمایاں کرنے میں برابر کے شریک ہیں۔ غالب سے قبل اس رنگ و آہنگ کی روایت اردو شاعری میں موجود نہیں تھی۔ البتہ فارسی شاعری میں اس کا ایک سلسلہ ملتا ہے اور خاصی تعداد میں شاعر اس رجحان کے علم بردار نظر آتے ہیں۔ غالب کا فن اس رجحان سے متاثر ہوا ہے اور اس میں نبتا و طرب کی وہ جو ایک جاندن سی مسکراتی ہوئی نظر آتی ہے، اس کا سبب فارسی کی یہی روایت ہے، جس کو غالب نے اپنے فن میں کچھ اس طرح داخل کیا ہے کہ اس نے اردو شاعری کی دنیا میں بدل دی ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اردو شاعری کی روایت سے غالب کا کوئی رشتہ نہیں ہے اور یہ کہ صرف فارسی شاعری کی روایت ہی ان پر اثر انداز ہوئی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ غالب نے اردو شاعری کی روایت سے بھی اثر قبول کیا ہے اور یہ اثرات بھی ان کے فن میں اتنے روپ اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سب سے اہم بات جو اس سلسلے میں نظر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ انہوں نے فارسی اور اردو کی روایات کے باہمی امتزاج سے ایک تیسری روایت کو پیدا کیا ہے، جو ان کا ایک اہم فنی کارنامہ ہے۔ اس امتزاج نے ان کے فن میں نشاط اور الہم رنگ کی دھوپ چھاؤں کو جنم دیا ہے۔ غالب نے ان دونوں کو اس طرح ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ ان کے فن میں شعاع و شبم ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غالب کے فن میں روایت کے اثر سے شوخی کا چلو بھی نمایاں ہوا ہے۔ یہ شوخی ظاہر ہے کہ صرف غزل کے مزاج کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی، لیکن غالب کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس شوخی کو اور اس شوخی کے اثر سے پیدا ہونے والے ایک مزاحیہ اور طنزیہ انداز کو غزل کے مزاج میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کو غزل کے مزاج کا جزو بنا دیا ہے۔ اس شوخی اور طنز و مزاح کے عناصر، غزل کی روایت میں شیخ، واعظ اور زاہد کے بیان میں تو ملتے تھے لیکن حسن و عشق اور عاشق و معشوق کے معاشقات کے بیان میں یہ رنگ ذرا مشکل ہی سے نظر آتا تھا۔ غالب چلے شاعر ہیں، جنہوں نے ان معاشقات کے بیان میں بھی اس رنگ کو پیدا کر دکھایا۔ وہ اس طرح کہ غزل کی روایت میں عاشق اور معشوق کے معاشقات سے متعلق ایسے مضامین، جو فرسودہ ہو چکے تھے اور مضحکہ خیز معلوم ہوتے تھے، غالب نے ان کو اپنی غزل میں جگہ نو دی لیکن

اس طرح جیسے وہ ان کا خاکہ اُڑا رہے ہیں۔ غالب کے اس انداز سے جو شاعری پیدا ہوئی ہے، وہ بہ ذاتِ خود بھی اہم ہے۔ کہونکہ اس میں بڑی شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس انداز سے غزل کی روایت کو ایک نیا میدان ملا ہے اور اس میدان میں اس کو ایک اہم صنفِ سخن کی حیثیت سے اپنے جوہر دکھانے کے مواقع نصیب ہوئے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ غالب کے بعد آنے والے غزل کے فن کار غالب کے اس انداز فن کو پوری طرح برتنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ لیکن غالب نے انہیں وہ راستے ضرور دکھا دیے ہیں، جن پر چل کر غزل کی صنف اپنے آپ کو فنی اعتبار سے نئی وسعتوں سے ہم کنار کر سکتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ غالب نے روایت سے بہت استفادہ کیا ہے۔ اور اس کے اثر سے اپنے فن میں نہ صرف رنگینی اور رچاؤ کی خصوصیات پیدا کی ہیں بلکہ بعض ایسے پہلو بھی اس میں نمایاں ہو گئے ہیں، جن کی وجہ سے نہ صرف غالب کے فن میں بلکہ خود صنفِ غزل کے فن میں ایک نئے رنگ و آہنگ نے اپنی جگہ بنا لی ہے۔ لیکن غالب اس روایت کے پرستار نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے فن کو اس روایت کی لکیر کا فقیر نہیں بنایا ہے۔ وہ تو اس روایت کے بندھنوں کو توڑ کر اس کے حدود سے باہر بھی نکلے ہیں اور انہوں نے اپنے فن کو بعض نئے تجربات سے بھی آشنا کیا ہے۔ ان تجربات کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں توازن ہے اور ان کی جڑیں روایت کی زبیں میں پوری طرح پھوست ہیں۔ تجربہ جب روایت کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہوتا ہے، اسی وقت فن کی دنیا میں اُسے حیاتِ جاویداں ملتی ہے۔ غالب نے اپنے تجربے کو روایت کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ کیا ہے۔ اسی لیے اس کے فن میں اس کی ایک مستقل حیثیت نظر آتی ہے۔

بات یہ ہے کہ غالب نے اپنے فن میں تجربے کے یہ چراغ صرف تجربے ہی کی خاطر روشن نہیں کیے، ان کے پیچھے تو ان کے نئے احساسات اور نئے شعور کا ہاتھ ہے اور ان نئے احساسات و شعور کی وجہ سے، ان کے یہاں موضوعات و مضامین پیدا ہوئے ہیں، جن کے اظہار و ابلاغ کے لیے انہیں ان تجربات سے کام لینا پڑا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان تجربات میں اختراع کا رنگ نظر نہیں آتا اور صرف صناعتی کی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اپنی ایک بنیاد رکھتے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کو شاعر کے خیال،

مواد اور موضوع اور اس کے صحیح جاہلیاتی اظہار کے شعور نے پیدا کیا ہے۔ غالب نے بدلتے ہوئے حالات، نئے افکار و خیالات اور نئے جاہلیاتی تصورات سے ان تجربات کا خمیر اٹھایا ہے۔ اسی لیے ان کے ہاں ایک استواری نظر آتی ہے اور ایک موانست کا احساس ہوتا ہے۔

غالب کے ان تجربات کی جھلک سب سے پہلے تو ان کی شاعری کے وزن و آہنگ میں دکھائی دیتی ہے۔ غالب نے اپنے موضوعات کی مناسبت سے وزن و آہنگ کو استعمال کیا اور ان میں ایک مکمل ہم آہنگی پیدا کی۔ ان کی شاعری میں بحروں کا انتخاب، بعض خاص زمیوں کا استعمال، الفاظ کی مخصوص در و بست، ترکیبوں کی تراش ان سب میں تجرباتی مزاج اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ غالب نے یہ سب کچھ اپنے موضوع کے اظہار و ابلاغ کے لیے کیا ہے۔ غالب نے اپنے وزن و آہنگ میں جو شکستگی، شادابی اور بلند آہنگی پیدا کی، اپنی شاعری کو جس نغمگی اور موسیقیت سے روشناس کیا ہے، اس کی مثال اردو شاعری میں ان سے قبل نہیں ملتی۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے فن میں ترنم کے چشمے سے بہوث رہے ہیں اور نغموں کے دریا سے موجزن ہیں۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں اس صورت حال کو پیدا کر کے، اس تجربے کے صوتی آہنگ کو سامنے لا کر کھڑا کر دیتے ہیں، جس کی گہرائی کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے موضوع کی مکمل تصویر، مع ایک وسیع پس منظر کے، آنکھوں کے سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

وزن و آہنگ کے اس نئے تجربے کے ساتھ ساتھ، غالب نے اپنے فن میں علامتوں اور اشاروں کے استعمال کا بھی ایک اہم تجربہ کیا ہے۔ علامتوں اور اشاروں کا استعمال تو غالب سے قبل بھی اردو شاعری کی روایت میں عام تھا۔ خصوصیت کے ساتھ غزل کے فن میں اس کی ایک روایت موجود تھی لیکن غالب نے اس روایت کو کچھ اور بھی استوار کیا۔ انہوں نے غزل کی روایتی علامتوں اور اشاروں میں نیا خون زندگی دوڑایا اور اپنے وسیع اور ہمہ گیر موضوعات کو ان کے ذریعے سے ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح یہ روایتی علامات و اشارات نئی معنویت سے آشنا ہوئے اور ان کے دامن میں نئی وسعتیں پیدا ہوئیں۔ لیکن غالب اپنے

موضوعات کی گہرائی اور گیرائی کے پیش نظر اپنے اظہار و ابلاغ کو صرف ان علامتوں اور اشاروں ہی تک محدود نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں تو اپنے اظہار و ابلاغ کے لیے کچھ نئے اشاروں اور علامتوں کی ضرورت بھی تھی۔ چنانچہ انہوں نے نئی علامتوں اور اشاروں کو تخلیق بھی کیا۔ لیکن اس میں بھی ان کی صناعتی اور ایجاد پسندی کو دخل نہیں تھا۔ اس کا منبع بھی ان کے موضوعات کا اظہار و ابلاغ اور اس اظہار و ابلاغ کا جالباتی احساس و شعور تھا۔ اسی احساس و شعور کے زیر اثر، انہوں نے بعض ایسی علامتوں سے کام لیا، جو ان کی جذباتی اور ذہنی کیفیت کے ساتھ مناسبت رکھتی تھیں۔ غالب زمانے کے زخم خوردہ تھے۔ ان کی زندگی میں باوجود شگفتگی اور شادابی، تیزی اور تندی، جولانی اور طراری کے ایک سنگینے والی کیفیت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس صورت حالات کی مناسبت سے خون، آگ، دھواں اور شر وغیرہ کے نئے اشاروں اور علامتوں سے کام لیا اور ان کے ذریعے سے اپنے فن میں اظہار و ابلاغ کا ایک نیا عالم پیدا کیا۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ انہی اس ذہنی کیفیت کے باوجود وہ زندگی سے مایوس نہیں تھے۔ ان کی نگاہیں تو ایک نئی دنیا کے پیدا ہونے کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ چنانچہ اس صورت حال نے انہیں سحر، زنجیر، خواب، بیداری، ستارے، ماہتاب اور اسی طرح کے بہت سے اشاروں اور علامتوں کی تخلیق کی طرف راغب کیا اور ان علامتوں اور اشاروں میں ایسا جادو تھا کہ غالب کے بعد اردو شاعری میں ان کے استعمال کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور موجودہ دور میں جدید سے جدید اردو شاعروں نے ان سے اظہار و ابلاغ کے سلسلے میں بڑے بڑے کام لیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری کی دنیا ہی بدل گئی۔

یہ سب کچھ غالب کا فنی کارنامہ تھا۔ انہوں نے اردو شاعری میں علامت نگاری کو ایک اسلوب کی حیثیت سے مستقل حیثیت دی اور نہ صرف ابلاغ بلکہ جالباتی اظہار کے لیے بھی اس کو اس طرح استعمال کیا کہ اردو شاعری میں اس نے ایک رجحان کی حیثیت اختیار کر لی۔ اور غالب جالباتی اظہار کے لیے اس رجحان کو برتنے اور عام کرنے میں اس وجہ سے کامیاب ہوئے کہ وہ اس کی اہمیت کا گہرا شعور رکھتے تھے اور ان کے خیال میں ناز و غمزہ کی بات دشنہ و خنجر میں اور مشاہدہ حق کی گفتگو ہادہ و ساعر میں کرنا شاعر کے لیے ناگزیر ہے۔

غالب نے اپنے فن میں رمزیت اور ایمائیت کے ایک نئے انداز کو وجود میں لانے کا تجربہ بھی کیا ہے۔ غالب سے قبل اردو شاعری میں رمز و ایما کی روایت تو موجود تھی لیکن اس میں یہ بالکل نہیں تھا، جو ان کے ہاتھوں پیدا ہوا۔ وہ تہہ داری کی کیفیت نہیں تھی، جو ان کے ہاتھوں وجود میں آئی۔ غالب نے اپنے لکرو کی نسبت سے اس رمز و ایما کو زیادہ تہہ دار بلکہ کسی حد تک پیچ دار بنا دیا اور اس طرح اس کی حدیں ایہام سے جا ملیں۔ یہ ایہام آج کی شاعری کے لیے ایک اسلوب کی حیثیت رکھتا ہے۔ غالب نے آج سے سو سال قبل اس ایہام کو ایک اسلوب بنا دیا۔ لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ ایہام کو انہوں نے اپنے حدود میں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ایہام سے زیادہ اس کی لطافت کا احساس ہوتا ہے اور جو ایہام ان کے یہاں نظر آتا ہے، اس کو ایک لطیف ایہام کہنا چاہیے۔ یہ لطیف ایہام اس رمزیت اور ایمائیت ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے، جس کو غالب نے بڑی چابکدستی کے ساتھ اپنے فن میں برتا ہے۔ اس رمزیت، ایمائیت اور لطیف ایہام کی وجہ سے اردو شاعری کو ایک نیا اسلوب ملا۔ یہ اسلوب غالب کے ساتھ مخصوص ہے اور ان کا فن اس اسلوب ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ اس اسلوب نے انہیں اپنے زمانے میں بڑی حد تک اجنبی بنا دیا اور اسی لیے وہ اس زمانے میں عام نہ ہو سکا۔ شاید اس وجہ سے کہ غالب ایک عظیم شاعر اور فن کار کی حیثیت سے اپنے زمانے سے تقریباً سو سال قبل پیدا ہوئے۔ وہ اپنے زمانے میں شاعر فردا تھے۔ انہیں تو موجودہ دور میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔ ان کا احساس و شعور اور جہالتی اظہار، موجودہ دور سے مناسبت رکھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ موجودہ دور میں اس اسلوب نے تقریباً تمام جدید شاعروں کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی اور ان کے فن کا عام معیار بھی اسلوب قرار پایا۔ اس اعتبار سے غالب کی حیثیت ایک ایسے پہاڑی سلسلے کی ہے، جس کے دامن میں پرورش پانے والی ہر چیز اس کی مخصوص آب و ہوا سے متاثر ہوتی ہے۔

زبان و بیان کو غالب نے بہ ذات خود ایک فن بنا دیا ہے۔ زبان، اس میں شبہ نہیں، کہ اظہار کا ذریعہ ہے۔ لیکن ایک عظیم شاعر کے ہاتھ میں اس کی حیثیت ایک فن کی ہو جاتی ہے۔ ایک ایسا فن، جو اظہار و ابلاغ کے ساتھ حسن و جمال کے نور کو بکھیرتا ہے اور شاعری میں ایک

چراغوں کی سی کیفیت کو پیدا کر دیتا ہے۔ غالب نے زبان میں ایک اجتہادی شان پیدا کی ہے۔ اس کو رنگین اور ہرکار بنایا ہے۔ اس میں گل بوئے سے کھلائے ہیں۔ اس میں ایک عجب طرح کی جگمگاہٹ اور تابانی سی پیدا کی ہے۔ اس کو پیرے کی طرح قرعہ ہے۔ اس میں نئے رنگ بکھیرے ہیں۔ نئے پہلو پیدا کیے ہیں۔ الفاظ کو آسمان پر بکھیرے ہوئے ستاروں کی طرح یک جا کیا ہے۔ اس میں تزئین و آرائش نہیں ہے، فطرت کا حسن زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حسن کی فطرت اس میں قدم قدم پر اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ غالب نے زبان کی اصلاح نہیں کی ہے لیکن ایک نئی زبان کو پیدا کیا ہے۔ اس میں ادبی رنگ و آہنگ ہے اور اس کو صحیح معنوں میں شاعری کی زبان کہا جا سکتا ہے۔ غالب سے قبل شاعری کی زبان میں یہ ادبی رنگ و آہنگ کم تھا۔ وہ بولنے کی زبان سے زیادہ قریب تھی۔ فارسی کے اثرات غالب کی پیدا کی ہوئی زبان میں غالب ہیں لیکن ان اثرات کو پیدا کرنے میں ان کی کسی شعوری کوشش کو دخل نہیں تھا۔ فارسی تو ان کے مزاج کا جزو تھی۔ اس کا رنگ تو ان کی شخصیت میں رجا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی کا رنگ و آہنگ ان کی زبان میں اجنبی اور نا مانوس نہیں معلوم ہوتا۔ برخلاف اس کے وہ تو اس تہذیب کی تمام رنگینیوں اور رعنائیوں کو سامنے لا کر کھڑا کر دیتا ہے، جس نے غالب کو پیدا کیا تھا اور جس کی رنگینیاں اور رعنائیاں ان سے قبل کئی سو سال تک اس سر زمین پر رنگ بکھیرتی رہی تھیں۔

غالب نے اردو شاعری کو ایک ایسی زبان دی، جو صرف رنگین اور ہرکار ہی نہیں تھی۔ اس میں احساس کی شدت، جذبے کی صداقت، شعور کی گہرائی، فکر کی گیرائی اور نظریے کی پختگی کے مکمل اظہار و ابلاغ کی بڑی صلاحیتیں تھیں۔ غالب کی شاعری انہیں تمام عناصر سے عبارت تھی۔ چنانچہ یہی عناصر اس مخصوص زبان کی تخلیق کے محرک ہوئے، جو غالب کا ایک اجتہادی کارنامہ ہے۔ گذشتہ سو سال میں اردو کے ان تمام شاعروں کے چان بہ زبان اپنی جھلک دکھاتی ہے، جن کی شاعری میں احساس کی شدت، جذبے کی صداقت، شعور کی گہرائی، فکر کی گیرائی اور نظریے کی پختگی کا استزاج صحیح چالائی اظہار کا تقاضا کرتا ہے۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو غالب جدید شاعری اور اس کے مختلف نئی رجحانات اور جہالتی مہلانات کے بیش رو نظر آتے ہیں اور ان کے الٹی اور جہالتی اجتہاد کے اثرات کا رنگ و آہنگ نہ صرف جدید شاعروں کی شاعری ، بلکہ اعلیٰ درجے کے نثر نگاروں کی نثری تخلیقات میں بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے ۔

غرض غالب بڑے ہی چلو دار فن کار تھے ۔ اردو شاعری میں وہ ایک ادائے خاص سے نکتہ سرا ہوئے اور ان کا فن پاوان نکتہ دان کے لیے صلائے عام کا پیغام ثابت ہوا ۔ انہوں نے اپنے فن سے جہالتی اقدار کی نئی دنیا میں پیدا نہیں کیں ، ان اقدار کو موجودہ دور کے مزاج کا جزو بنا دیا ۔ چنانچہ موجودہ زمانے میں غالب کے فن کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ، وہ کسی دوسرے شاعر کے فن کو حاصل نہ ہو سکی ۔ دور جدید میں مختلف خیالات و نظریات اور مختلف اسالیب و انداز بیان و گھنے والے شاعروں اور ادیبوں کو جس طرح غالب کے فن نے متاثر کیا ہے ، شاید کسی دور میں کسی دوسرے فن کار نے اس طرح متاثر کیا ہو ۔

اس لیے شاید یہ کہنا بے جا نہیں کہ اردو شاعری کی روایت میں غالب کے فن کی حیثیت وہی ہے ، جو جہالتی اعتبار سے کسی ملک میں ایک سر بہ فلک چاڑ کی ہوتی ہے ۔

غالب
اور
آن کے خطوط

مفلوں کا دور آخر اگرچہ سیاسی ، ، معاشرتی اور معاشی اعتبار سے انحطاط و زوال کا زمانہ ہے لیکن اس کے باوجود دلی کی سر زمین پر ایک دلع پھر اس زمانے میں علم و ادب کی عقلیں جم جاتی ہیں ۔ میر و سودا جس دلی کو ناسازگار حالات کے باعث چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے ، اب اس نے ایک بار پھر غالب ، سمن ، ذوق ، ظفر اور شیفتہ کے نغموں سے اپنی عقلوں میں گرمی پیدا کر لی تھی ۔ علم و ادب کے جرجے بھی نظر آتے تھے ۔ بہت سے ہاکمالوں کا ان دنوں دلی میں مجمع تھا ۔ مولانا سید احمد بریلوی ، مولانا اسماعیل شہید ، مولانا فضل حق خیر آبادی ، نواب صدر الدین خان آزرہ ، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ اور امام بخش صہبائی وغیرہ نے علم و عمل کی ایک فضا بھی پیدا کر دی تھی ۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے میدانوں میں اس طرح کمال حاصل کیا کہ ہر ایک کی شخصیت میں اجتہادی شان نظر آتی ہے ۔ غالب بھی ان میں سے ایک تھے ۔ انہوں نے نہ صرف اردو شاعری کو نئے انداز سے آشنا کیا بلکہ اردو نثر کو بھی ایک نیا اسلوب دیا ۔ اس اعتبار سے وہ ہماری نظم و نثر دونوں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں ۔

غالب ۸ وجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو اکبر آباد میں پیدا ہوئے ۔ ان کا نام اسم اللہ بیگ خان اور عرف مرزا نوشہ تھا ۔ نجم الدولہ ، دبیر الملک ، نظام جنگ خطابات تھے ۔ انہوں نے جس خاندان میں آنکھ کھولی ، وہ ایک ترکوں کا مشہور خاندان تھا ۔ اس خاندان کا

ہمیشہ سپہ گری تھا اور وہ ہمیشہ سے جی کام کرتے آئے تھے۔ غالب نے خود ایک جگہ اس کا اظہار کیا ہے :

سو ہشت سے ہے ہمیشہ آباء سپہ گری

کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

لیکن عجیب اتفاق ہے کہ غالب سپہ گری اختیار نہ کر سکے اور شاعری ان کے لیے ذریعہ عزت بن گئی۔ البتہ سپہ گری کی جو پینادی خصوصیات ہوتی ہیں، وہ ہمیشہ غالب کے دم کے ساتھ رہیں۔

غالب کے دادا، محمد شاہ کے زمانے میں ہندوستان آئے اور لاہور میں معین الملک میر بستو کی ملازمت اختیار کی۔ لاہور سے وہ دلی گئے اور وہاں ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خان کی سرکار میں انہیں ایک معقول ملازمت مل گئی اور پھانسیو کا پرگنہ بطور جاگیر کے عطا ہوا۔ انہیں کی اولاد میں مرزا غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ خان عرف مرزا دولہا تھے۔ مرزا عبداللہ بیگ خان کی شادی خواجہ غلام حسین خان کھیدان کی بیٹی سے ہوئی اور ان کے دو بیٹے ہوئے۔ ایک تو مرزا احمد اللہ خان غالب، جنہوں نے فارسی اور اردو نظم و نثر میں نام پیدا کیا اور دوسرے مرزا یوسف خان، جو جوانی میں دہوانے ہو گئے اور اسی عالم دیوانگی میں ایام غدر میں ان کا انتقال ہو گیا۔

مرزا غالب ابھی گم سن ہی تھے کہ ان کے والد عبداللہ بیگ خان کا انتقال ہو گیا اور ان کے چچا نصر اللہ بیگ خان نے انہیں پالا۔ نصر اللہ بیگ خان مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد میں صوبہ دار تھے، لیکن بعد میں انہوں نے انگریزوں کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ۱۸۰۶ء میں ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ غالب اس وقت نو برس کے تھے۔

چچا کے انتقال کے بعد غالب کی پرورش ننھیال میں ہوئی۔ ان کی ننھیال خاصی فارغ البال تھی، اس لیے بچپن اور عتوان شباب میں غالب کو جو ماحول ملا، وہ امیرانہ ماحول تھا۔ اس ماحول کی جو خصوصیات ہوتی ہیں، غالب ان سے دو چار ہوتے اور اس کا اثر یہ ہوا کہ ان کی زندگی کا ابتدائی زمانہ رنگینوں اور سرمستیوں میں گزرا۔ اس زمانے کے متعلق غالب ایک جگہ خود لکھتے ہیں کہ: ”میں لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور اور عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا۔“ یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ امارت اور ریاست کے ماحول میں اس صورت حال کو پیدا ہونا ہی چاہیے تھا۔

کسی حد تک غالب کی بیٹی کو بھی اس میں دخل ہے ۔ پھر حال اس زمانے کے نقوش غالب کی شخصیت پر بڑے گہرے ہیں ۔ زندگی بھر ان کا اثر باقی رہا ہے ۔ بے فکری ، شراب نوشی ، پار ہاشی ، تعیش پسندی اور خود پرستی کی خصوصیات ان کی شخصیت میں اسی ماحول نے پیدا کی ہیں ۔ غالب کا بچپن اور عقوفان شباب اگرچہ لہو و لعب اور عیش و عشرت میں گذرا لیکن ان کی تعلیم کسی قدر باقاعدگی کے ساتھ ہوئی ۔ آگرے میں انھوں نے شیخ معظم سے ابتدائی تعلیم حاصل کی ۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ نظیر اکبر آبادی سے بھی انھیں تلمذ حاصل تھا ۔ ملا عبدالصمد سے بھی انھوں نے بہت کچھ حاصل کیا ۔ ملا عبدالصمد پارسی تھا اور اس کا اصلی نا پرمزد تھا لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد وہ عبدالصمد کے نام سے مشہور ہوا ۔ وہ ۱۸۱۰ ع میں سیاحت کی غرض سے آگرے آیا ۔ غالب دو سال اس کے ساتھ رہے اور انھوں نے اس سے بہت کچھ حاصل کیا ۔ اپنے خطوط میں غالب نے اس بات کی کئی جگہ وضاحت کی ہے ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ۔ جی وجہ ہے کہ ان کی علمی استعداد خاصی تھی ۔ وہ فارسی زبان سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے اور انھیں فارسی ادب کے مطالعے کا شوق تھا ۔ عربی کی استعداد اگرچہ فارسی کے برابر نہیں تھی لیکن پھر بھی اس کے متعلق خاصی معلومات رکھتے تھے ۔ اس کے علاوہ فلسفہ ، تصوف ، طب ، منطقی معانی و بیان سے بھی انھیں دلچسپی تھی ۔

سرزا غالب کی شخصیت میں ان کی شادی شدہ زندگی کو بھی خاصا دخل ہے ۔ ان کی شادی ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ ع میں الہی بخش خان معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے ہوئی ۔ اس وقت غالب کی عمر تیرہ سال تھی ۔ غالب نے اس نسبت کے بعد مستقل طور پر دلی میں سکونت اختیار کر لی ۔ دلی میں غالب کو ادب و شعر کا ماحول ملا ۔ نواب الہی بخش خان معروف خود اچھے شاعر تھے ۔ تصوف سے بھی انھیں دلچسپی تھی ۔ غالب پر ان کا اثر ہوا ۔ اس کے علاوہ دلی کے دوران قیام میں وہ مولانا فضل حق غیر آبادی کے زیر اثر بھی آئے ۔ مولانا فضل حق غیر آبادی اپنے زمانے کے مشہور عالم تھے اور شعر و سخن کا بھی نہایت سنہرا ذوق رکھتے تھے ۔ غالب پر ان کی شخصیت کا بھی اثر ہوا ، اور ان تمام اثرات نے مل کر

غالب کو بے راہ روی سے روکا اور ان کی شخصیت میں ایک سنبھلا ہوا انداز پیدا کیا ۔

دلی کے دوران قیام میں مالی مشکلات ہمیشہ غالب کے دم کے ساتھ رہیں ۔ پنشن بند ہوئی اور اس سلسلے میں انہیں کلکتے کا سفر کرنا پڑا ۔ ۱۸۲۲ع میں وہ دلی سے کلکتے روانہ ہوئے اور لکھنؤ میں سال بھر قیام کرنے کے بعد کان پور، بنارس، ہٹھ اور مرہٹہ آباد ہوئے، ہوئے ۱۸۲۸ع میں دلی واپس آئے ۔ جہاں تک پنشن کا تعلق ہے ، کلکتے کے سفر کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا ۔ کیوں کہ انہیں اس معاملے میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی لیکن اس سفر سے ایک فائدہ غالب کو ضرور ہوا وہ یہ کہ انہیں مختلف مقامات کو دیکھنے اور مختلف قسم کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا ، اور اس سے ان کی شخصیت میں وسعت نظر کی خصوصیت پیدا ہوئی ۔

غالب کی مالی حالت جب زیادہ خراب ہوئی تو انہوں نے ملازمت کرنے کی ٹھانی ۔ ۱۸۳۲ع میں دلی کالج میں تارسی کی مدرسے خالی ہوئی ۔ غالب بھی فیس میں سوار ہو کر اس سلسلے میں پرنسپل سے ملتے گئے ۔ لیکن کوئی ان کی پذیرائی کو نہیں آیا ۔ اس لیے کہ وہ ملازمت کے لیے آئے تھے ۔ مسٹر ٹامسن جو ان دنوں دلی کالج کے پرنسپل تھے ، انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ چونکہ مرزا غالب رسمی ملاقات کے لیے نہیں آئے، بلکہ ملازمت کے لیے آئے ہیں، اس لیے پذیرائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ مرزا غالب نے اس پر یہ کہا کہ : ”خیال تھا ملازمت سے عتذ و وقار میں اضافہ ہوگا ۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ جو وقار رہا سہا ہے، اس میں بھی کمی آجائے گی ۔ اس لیے اس ملازمت کو میرا دور ہی سے سلام ہے ۔“ اور یہ کہہ کر واپس چلے آئے ۔

اس کے بعد مالی مشکلات کا سلسلہ برابر جاری رہا ۔ اسی دوران میں مرزا غالب پر ایک بلائے ناگہانی بھی آئی ۔ یعنی وہ قمار بازی کے الزام میں گرفتار کر لیے گئے اور انہیں کچھ عرصے قید خانے میں رہنا پڑا ۔ جھوٹ کر آئے تو مالی حالت اور بھی خراب ہو گئی ۔ کل ہاسٹہ روپے مہینے کی پنشن میں گیا ہو سکتا تھا ۔

جب یہ مالی مشکلات اتنا کو پہنچ گئیں ، تو غالب کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہ رہا کہ وہ قلمی سے متعلق ہو جائیں ۔ چنانچہ

یہ تعلق انہوں نے پیدا کیا۔ لیکن ابتدا میں مستقل ملازمت اختیار نہیں کی۔ کاجے کاجے قصیدے پڑھ دیتے تھے اور وظیفہ انہیں ملتا تھا۔ ذوق کے انتقال کے بعد وہ بادشاہ کی غزلیں بھی بنانے لگے اور اس طرح باقاعدہ قلمی سے منسلک ہو گئے۔ غدر سے کچھ عرصہ قبل دربار رام پور سے بھی انہوں نے وابستگی پیدا کر لی تھی۔ اور وہاں سے بھی انہیں وظیفہ ملتا رہا۔ غدر کا ہنگامہ غالب کے سامنے ہوا۔ اس نے سارے نظام کو درہم برہم کر دیا۔ غالب اس زمانے میں اپنے مکان کے اندر مقید رہے۔ اس زمانے میں ان کا قیام اہلی مارون کے محلے میں تھا۔ جب ہنگامہ زیادہ بڑھا تو شریف خانی حکیموں کی حفاظت کے لیے مہاراجہ پٹالہ نے کچھ فوجی دستے بھیجا دیے۔ اور ان کی وجہ سے یہ محلہ بچ گیا۔ لیکن غالب کو سب کے ساتھ بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ ان کے بھائی مرزا یوسف کا انتقال بھی انہیں حالات میں ہوا۔ غالب نے غدر کے مفصل حالات اپنی کتاب 'دستنبو' میں لکھے ہیں۔

غدر کے بعد غالب کی پنشن بھی بند کر دی گئی۔ کیونکہ ان پر بھی انگریزوں کو شبہ تھا۔ لیکن ۱۸۵۹ء میں پھر پنشن جاری کر دی گئی۔ غدر کے بعد دربار رام پور سے ان کے تعلقات بہت بڑھ گئے اور وہاں ان کی آمد و رفت برابر جاری رہی۔ غالب نے وہاں کچھ عرصہ قیام بھی کیا۔ وظیفہ بھی وہاں سے ملتا رہا۔

غالب کی وفات ۱۸۶۹ء میں ہوئی۔

یہ حالات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ غالب کی زندگی ایک کشمکش کی کہانی ہے۔ زندگی ان کا ساتھ نہ دے سکی لیکن انہوں نے ہمیشہ زندگی کا ساتھ دیا۔ وہ زندگی کے حالات سے خوش نہیں تھے لیکن اسے بسر کرنا جانتے تھے۔ چنانچہ ان کی زندگی کے تمام حالات سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے زندگی اور اس کے بدلنے ہوئے حالات سے بڑی حد تک مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان حالات کو سمجھا بھی ہے اور ان کو سمجھ کر برتا بھی ہے۔ وہ زندگی کے گہرے پتائش تھے۔ اس کے ہر پہلو پر ان کی نظر گہرائی کے ساتھ پڑتی تھی اور وہ اس میں نئے پہلو نکالتے بھی تھے۔ ان کے مزاج میں گہرائی کے ساتھ جدت پسندی بھی شامل تھی۔ حرکت اور عمل کی خصوصیات بھی ان کی شخصیت میں

خاصی نمایاں تھیں۔ کسی چیز کا نہ ہونا انہیں اداس اور غمگین ضرور کر دیتا تھا لیکن وہ اس کے حاصل کرنے میں تھک کر نہیں بیٹھ جاتے تھے۔ اس کو حاصل کرنے کی دھن میں لگے رہتے تھے۔

غالب نے ایک امیرانہ ماحول میں پرورش پائی۔ اس لیے اس امیرانہ ماحول کی خصوصیات ان کی شخصیت میں بھی اپنی جواہر دکھائی ہیں۔ اس امیرانہ ماحول کے افراد میں برتری کا احساس تھا، جس کی حدیں خود پرستی سے جا ملتی ہیں۔ یہ احساس خود پرستی غالب کے جاں بھی نظر آتا ہے۔ انحطاط و زوال کے زمانے میں یہ احساس اس طبقے کے افراد میں کچھ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ یا ہوں کہنا چاہیے کہ افراد اس بڑھے ہوئے احساس کی نمائش زیادہ کرتے ہیں۔ غالب کے جاں بھی یہ صورت حال ملتی ہے۔ غالب کو اپنی خاندانی برتری کا گہرا احساس تھا۔ وہ بار بار اس کا اظہار کرتے ہیں لیکن یہ اظہار غالب سے بہت کچھ کراتا بھی ہے۔ وہ اس کی نمائش ہی نہیں کرتے، اس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے عمل بھی کرتے ہیں۔ یہی اس ماحول میں پرورش پانے کا ایک اچھا پہلو ہے۔ ورنہ اس ماحول سے انہیں بہت سی ایسی باتیں بھی ملی ہیں، جن کو کسی حال میں بھی مستحسن نہیں کہا جاسکتا۔

امیرانہ ماحول میں پرورش پانے کے باوجود یہ حرکت اور عمل کی خصوصیات، جو غالب کی شخصیت میں ملتی ہیں اور جن کا مظاہرہ برابر ان کی زندگی میں ہوتا رہا ہے، اس میں اس عام فضا کو بھی دخل ہے، جو ان دنوں ہندوستان اور خصوصاً دلی میں مولانا سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد نے پیدا کر دی تھی۔ غالب اس تحریک کے ساتھ نہیں تھے۔ وہ تو مولانا فضل حق غیر آبادی کے ہم مشرب اور ہم نوا تھے، جن کو مولانا سید احمد بریلوی سے نظریاتی اختلاف تھا۔ لیکن غیر شعوری طور پر یہ علم و عمل کی فضا ان پر اثر انداز ہوئی۔ ان کی شخصیت میں حرکت اور عمل کی جو خصوصیت ملتی ہے، وہ اسی اثر کا نتیجہ ہے۔

غالب کا زمانہ اگرچہ انحطاط و زوال کا زمانہ تھا لیکن یہ انحطاط و زوال میر و سودا کے زمانے کے انحطاط و زوال سے مختلف ہے۔ غالب کے زمانے میں انحطاطی کیفیت تھی لیکن الکرہڑوں کے حکمران ہو جانے سے افراتفری باقی نہیں رہی تھی۔ اب نسبتاً زیادہ تسلط تھا۔ اس صورت حال

نے اس زمانے کی دلی میں ایک علمی فضا بھی پیدا کر دی تھی۔ بڑے بڑے علماء اور شعراء ان دنوں دلی میں جمع تھے۔ علماء میں شاہ عبدالعزیز، شاہ امینعل شہید، مولانا سید احمد بریلوی اور مولانا فضل حق خیرآبادی نے ایک علمی ماحول پیدا کر دیا تھا۔ مومن، ذوق اور شہتہ وغیرہ نے شعر و ادب کی ایک فضا پیدا کی تھی۔ غالب اس علمی ماحول سے بھی متاثر ہوئے۔ علمی مسائل سے ان کی دلچسپی بڑھی اور مختلف علمی و ادبی مسائل پر گہرائی کے ساتھ غور کرنے کا شعور ان کے یہاں عام ہوا۔ انہوں نے ان معاملات میں اجتہادی شان پیدا کی۔ اجتہاد کے ساتھ جدت اور ایچ تو وجود میں آئی ہی چاہیے۔ چنانچہ غالب کے یہاں جدت اور ایچ اسی صورت حال کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔

علم و عمل کے اس ماحول نے غالب کی شخصیت میں شگفتگی اور جولانی کی خصوصیات کو بھی پیدا کیا ہے۔ اور اسی شگفتگی اور جولانی کا یہ اثر ہے کہ غالب کے یہاں لطیفہ سنجی بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کی بات بات میں لطف ملتا ہے۔ غالب فطرتاً ہی بذلہ سنج اور شگفتہ مزاج تھے۔ ماحول کی اس کیفیت نے اس بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی کو کچھ اور بھی نکھارا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی شخصیت میں اس شگفتگی اور جولانی کا رنگ رچا ہوا نظر آتا ہے۔

ادیب اور شاعر کی شخصیت اس کی تخلیقات میں پوری طرح بے نقاب ہوتی ہے۔ غالب پر بھی یہ کلمہ صادق آتا ہے۔ ان کی تصانیف ان کی شخصیت کی آئینہ دار ہیں۔ ہر جگہ اس شخصیت کی بنیادی خصوصیت کے اثرات ان کی نظم و نثر دونوں میں جھلکتے ہیں۔ نظم میں یہ اثر بالواسطہ طور پر نمایاں ہوتا ہے کیوں کہ غالب نے غزل کی صنف کو اپنایا۔ اور غزل کی صنف میں بات براہ راست نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے ان کی نثر میں ان کی شخصیت براہ راست اپنا اثر دکھاتی ہے۔ اس شخصیت کے نقوش ان کی نثر میں اس قدر نمایاں ہیں کہ ان کو سامنے رکھ کر ان کی زندگی کے حالات، ان کے اخلاق و عادات، ان کے افکار و خیالات کو بڑی خوبی سے ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

غالب کی اردو نثر اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ نثر ان خطوط پر مشتمل ہے، جو غالب نے وقتاً فوقتاً اپنے مختلف احباب کو لکھے۔

غالب کی زندگی کا ہر چلو اور ان کے مزاج کی ہر خصوصیت ان خطوط میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اعتبار سے یہ خطوط ان کی شاعری کے مقابلے میں بھی بلند مرتبہ ہیں۔ مولانا حالی نے ٹھیک لکھا ہے کہ : ”مرزا کی عام شہرت جس قدر ان کی اردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ، ویسی نظم اردو اور فارسی سے نہیں ہوئی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان خطوط میں غالب چلتے بھرتے ، ہنسنے بولتے ، ملتے جلتے ، شاگردوں کے کلام پر اصلاح دیتے ، علمی و ادبی بحثوں میں شریک ہوتے اور زمانے کو دیکھتے اور سمجھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ان خطوط کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

خطوط غالب کا پہلا مجموعہ ، ’عود ہندی‘ کے نام سے شائع ہوا۔ ان کے اردو خطوط کو جمع کرنے کا خیال سب سے پہلے ممتاز علی خان میرٹھی کو پیدا ہوا۔ چنانچہ انھوں نے چودھری عبدالغفور سرور اور خواجہ غلام غوث بے غیر کے توسط سے کچھ خطوط جمع کیے۔ ان کے ساتھ چند تقریظیں بھی جمع کیں اور ان سب کا مجموعہ ’عود ہندی‘ کے نام سے مطبع مجتہبی میرٹھ سے ۱۸۶۸ع میں شائع کر دیا۔ مرزا کے خطوط کا دوسرا مجموعہ ’اردو معلّیٰ‘ کے نام سے ۱۸۶۹ع میں شائع ہوا۔ یہ ’اردوئے معلّیٰ‘ کا پہلا حصہ تھا۔ ۱۸۹۹ع میں مولانا حالی کی فرمائش پر مطبع مجتہبی سے پہلا اور دوسرا حصہ یک جا کر کے شائع کیا گیا۔ ایک اور مجموعہ ’مکاتیب غالب‘ کے نام سے امتیاز علی خان صاحب عرشی ناظم کتب خانہ رام پور نے ۱۹۳۷ع میں شائع کیا۔ ’مکاتیب غالب‘ میں مرزا کے وہ خطوط ہیں، جو انھوں نے والیان رام پور کو لکھے تھے۔ مرزا کے خطوط کا ایک اور مجموعہ ’نادرات غالب‘ کے نام سے ۱۹۴۹ع میں بھی شائع ہوا ہے۔ اس میں آفاق حسین صاحب دہلوی نے وہ خطوط جمع کیے ہیں ، جو غالب نے منشی نبی بخش حنبر اکبر آبادی کے نام لکھے تھے۔ منشی سہیل پرشاد کو بھی غالب کے ان تمام خطوط کو یکجا کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ ان کی مراتب کی ہوئی چلی جلد ’خطوط غالب‘ کے نام سے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے شائع ہوئی۔ دوسری جلد شائع نہ ہو سکی۔

حالی کے خیال کے مطابق : ”مرزا غالب ۱۸۵۰ع تک ہمیشہ فارس میں خط و کتابت کرتے تھے۔ مگر سنہ مذکور میں جب کہ وہ تاریخ نویسی

کی غلبت پر مامور کیے گئے اور بعد ازاں ’سہر نیم روز‘ کے لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ اس وقت ان کو یہ ضرورت اُردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہوگی۔ وہ فارسی نثریں اور اکثر خطوط، جن میں قوت متعلیٰ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے، نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ پس جب ان کی بہت ’سہر نیم روز‘ کی ترتیب و انشاء میں مصروف تھی، ضرور ہے کہ اس وقت ان کو فارسی زبان میں خط و کتابت کرنی اور وہ بھی اپنی طرز خاص میں، شاق معلوم ہوتی ہوگی۔ اس لیے قیاس کہتا ہے کہ انہوں نے غالباً ۱۸۵۸ء کے بعد سے اُردو زبان میں خط لکھنے شروع کیے ہیں۔“ لیکن شیخ پد اکرام اور مولانا غلام رسول سہر کو اس سے اختلاف ہے۔ اکرام صاحب کا خیال ہے کہ: ”غالب کے خطوط کی نسبت عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ سب کے سب بے تکلف دوستانہ خطوط ہیں اور انہیں لکھتے وقت مرزا کو یہ سان گبان نہ تھا کہ کبھی ان کی اشاعت کی قوت آئے گی۔ نومبر ۱۸۵۸ء سے پہلے جو خطوط مرزا نے لکھے، ان کے بارے میں تو یہ خیال صحیح ہے لیکن بعد کے خطوط کے بارے میں نہیں۔“ اور اس سلسلے میں انہوں نے غالب کے اس خط کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھا تھا اور جس میں اس بات کی وضاحت کی تھی کہ: ”رقعات کے جیساے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سب خد نہ کرو۔ اور اگر تمہاری اس میں خوشی ہے، تو مجھ سے نہ بوجھو۔ تم کو اختیار ہے۔“ اکرام صاحب نے اس خط کی روشنی میں یہ خیال قائم کیا ہے کہ: ”اس کے بعد جو رقعات مرزا نے لکھے ہوں گے، ان کی اشاعت کو وہ ضرور ممکن الوقوع سمجھتے ہوں گے۔ اور اس وقت سے پہلے اور بعد کے خطوط میں فرق ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے پہلے کی نسبت بعد میں بہت زیادہ رقعات قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھے۔“

مولانا غلام رسول سہر نے مولانا حالی کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے: ”مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں اس لیے کہ اول ’سہر نیم روز‘ کوئی بڑی کتاب نہیں، جس کی ترتیب میں غالب کے بیشتر حصہ صرف ہوتا ہوگا۔ یہ کتاب انہوں نے کم از کم دو برس میں مرتب کی۔ موجودہ مطبوعہ صورت میں اس کے کل ۱۱۸ صفحے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ

باعبار اوسط وہ سال بہر میں زیادہ سے زیادہ چھن سالہ صفحات لکھتے رہے۔ اور یہ غالب جیسے قادر الکلام اور مشاق نثر نگار کے لیے کوئی بہت بڑا کام نہیں تھا، جس کی تکمیل کے سلسلے میں انہیں فارسی خط و کتابت ترک کرنی پڑی ہو۔ ہمارا خیال یہی ہے کہ غالب ۵۵۰ ع سے قبل اردو خط و کتابت کر چکے تھے لیکن چونکہ اس زمانے میں اردو نثر کو اہل علم چندان وقع نہیں سمجھتے تھے، اس لیے وہ خط محفوظ نہ رہ سکے۔ بعد میں جیسے جیسے اردو کا رواج بڑھتا گیا اور فارسی کا تداول کم ہوتا گیا، غالب فارسی کے بجائے زیادہ تر اردو میں خط لکھتے رہے۔“

ان میں سے کون سا خیال صحیح ہے، ہمیں اس سے بحث نہیں۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ غالب نے اردو میں خطوط لکھے اور ۵۰ ع کے بعد تو مستقل طور پر اردو خط و کتابت کی۔ لیکن ان خطوط کو چھپوانے کا خیال ان کے دل میں کبھی بھی پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ جن احباب نے ان کو چھاپنے کی کوشش کی، غالب نے انہیں منع کیا۔ منشی شیو نرائن پہلے شخص ہیں جنہوں نے غالب کے خطوط شائع کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں ان سے اجازت مانگی۔ اس کے جواب میں غالب نے لکھا :

”اردو خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں، یہ بھی زائد بات ہے، کوئی واقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم منہال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت پوری سخنوری کے متناقی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ اس کا چھاپنا میرے خلاف طبع ہے۔“

لیکن بعض دوسرے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعد میں وہ ان کو چھپوانے کے لیے تیار ہو گئے تھے اور جب انہیں یقین ہو گیا تھا کہ خطوط شائع ہوں گے تو وہ خطوط دل لگا کر اور قلم منہال کر لکھنے لگے تھے۔ لیکن اس خیال نے ان کے خطوط کو ان خصوصیات سے محروم نہیں رکھا جو انہیں خطوط میں پائی جاتی ہیں۔ یعنی بے تکلفی اور بے باکی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ غالب کی شخصیت میں دو رنگی نہیں تھی۔ ان کی شخصیت میں ایک خلوص تھا۔ ایک صداقت تھی، ایک بے تکلفی تھی، ایک بے باکی تھی، ایک برجستگی تھی۔ چنانچہ یہ خصوصیات ان خطوں میں بھی پائی جاتی ہیں، جو بھی ضرور تھے۔ لیکن جن کو لکھتے وقت یہ خیال ان کے پیش نظر تھا کہ وہ چھپیں گے ضرور !

غالب کے خطوط کی یہ بنیادی اور سب سے اہم خصوصیت ہے کہ ان میں بے پناہ غلوں اور بے اندازہ صداقت ہے۔ وہ ایک ایسے انسان کے قلم سے نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، جو کسی بات کو چھپا نہیں سکتا تھا۔ جس میں مبالغہ آرائی نام کو نہیں تھی۔ تکلف جسے چھو بھی نہیں گیا تھا۔ تصنع سے جس کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان خطوط میں ایک مانوس فضا ملتی ہے، ایک دلکش ماحول نظر آتا ہے اور غالب نے جو باتیں کی ہیں، وہ کسی نہ کسی نسبت سے ہمیں اپنی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ اپنے خیالات نظر آتے ہیں۔ ماحول کی جو تصویریں بھی پیش کی ہیں، وہ اپنی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ غالب جن لوگوں کو خطوط لکھتے ہیں، ان سے اس درجہ قریب ہو جاتے ہیں اور ان کی شخصیت میں اس درجہ گہول مل جاتے ہیں کہ ان کی یہ بات دلوں کو بہت بڑی ہے اور ہر شخص ان سے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ اس آئینے میں اسے اپنی صورت نظر آنے لگتی ہے۔

خطوط غالب کے موضوعات متنوع اور مختلف ہیں۔ ان خطوں میں ان کی شخصیت سے متعلق عام باتیں، وجود ہیں۔ پیدائش کے وقت سے لے کر وفات تک کے واقعات کا ان خطوں سے اندازہ ہوتا ہے۔ بچپن کے حالات، تعلیم و تربیت، شادی اور اس کے اثرات، احباب اور متعلقین، مالی الجھنیں اور پریشائیاں اور پھر اس سلسلے میں دور دراز علاقوں کا سفر، پنشن اور اس کی ساری تنصیل، دلی کی حالت، قید کا واقعہ، غدر اور اس کے مفصل حالات، ان تمام موضوعات پر ان خطوط سے روشنی پڑتی ہے۔ لیکن ان موضوعات کی صرف تفصیل ہی ان خطوط میں درج نہیں ہے، غالب نے ان سب پر روشنی ڈالنے ہوئے، اپنے ذہنی رجحان اور اتنا طبع کو بھی سامنے رکھا ہے۔ ہر چیز کے بارے میں وہ ایک صائب رائے رکھتے ہیں اور اسی کا اظہار ان خطوط سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی شخصیت اور ان کا نظریہٴ حیات، ان خطوط میں پوری طرح بے نقاب ہے۔

غالب کے ان خطوط سے اس زمانے کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی ماحول کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔ انیسویں صدی کی دلی میں لوگ کس طرح رہتے تھے؟ ان کے آداب اور طور طریقے کیا تھے؟ ان کی الجھنیں اور پریشائیاں کس قسم کی تھیں؟ پرانی روایات کے ساتھ ساتھ نئی روایات کا اثر معاشرت

ہر کس طرح چھانے لگا تھا ؟ افراد زندگی کے بارے میں کیا سوچتے تھے ؟ ماحول نے انہیں کس طرح اسپر کر لیا تھا ؟ مختلف طبقوں اور فرقوں کے تعلقات آپس میں کیسے تھے ؟ ان کا نظریہٴ حیات کیا تھا ؟ معاشی بد حالی اخلاق کو کس طرح بگاڑ رہی تھی ؟ — بے عملی نے کس طرح معاشرت میں گہر کر لیا تھا ؟ امراء اور شرفاء کی زندگی کس طرح وبال جان بن گئی تھی ؟ — لوگ کس طرح ایک دوسرے سے ملتے تھے ؟ درباروں کی حالت کیا تھی ؟ — درباروں نے زندگی کو کس طرح بگاڑا تھا ؟ مفلوک کی کمزوری اور انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار نے کیا صورت پیدا کی تھی ؟ سیاسی تبدیلیوں نے معاشی، معاشرتی زندگی کو کن واہوں پر لا کر کھڑا کر دیا تھا ؟ کون سے حالات اور افکار و خیالات زندگی کو نئے سانچوں میں ڈھال رہے تھے ؟ — کون سی علمی، ادبی اور سیاسی تحریکیں تھیں، جن کا اثر زندگی اور معاشرت پر ہو رہا تھا ؟ — کون سے ادبی مباحث تھے ، جن کا ان دنوں چرچا تھا ؟ — شاعرانہ ماحول کی کیا خصوصیات تھیں ؟ — کون کون سے شاعر تھے ، جن کا اثر ماحول قبول کر رہا تھا ؟ — یہ اور اسی طرح کے سینکڑوں معاملات و مسائل ہیں، جن کی صحیح تصویریں، غالب کے یہ خطوط پیش کرتے ہیں ۔

یہ خطوط جس انداز سے لکھے گئے ہیں ، اس کو بھی خاصی اہمیت حاصل ہے ۔ ان خطوط سے اردو میں خطوط نویسی کا ایک نیا معیار قائم ہوتا ہے اور ایک اچھوتے طرز کی ابتدا ہوتی ہے ۔ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ : ”مرزا کی اردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے ۔ نہ مرزا سے چلے کسی نے خط و کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا اور نہ ان کے بعد کسی سے پوری پوری تقلید ہو سکی ۔“ اور یہ خیال بالکل صحیح ہے ۔ کیونکہ جس وقت مرزا غالب نے یہ خطوط لکھے ہیں ، اس وقت عام طور پر فارسی میں خطوط لکھے جاتے تھے ۔ اردو بولنے کا رواج عام تھا لیکن لکھنے کی زبان فارسی تھی ۔ فارسی میں جو خطوط لکھے جاتے تھے ، وہ ”رقعات بیدل“ اور ”انشائے مادھو رام“ کو معیار بنا کر لکھے جاتے تھے ۔ اس لیے فارسی خطوط نویسی میں کسی نمایاں تبدیلی کی توقع کم تھی ۔ مرزا نے نہ صرف فارسی میں خطوط لکھنے کی روایت کو توڑا ، بلکہ اردو خطوط کو نئے اور نرالے انداز سے بھی آشنا کیا ۔ غالب کی بڑائی کا راز اس میں مضمر ہے ۔

غالب کے زمانے میں خطوط نویسی کا جو معیار تھا، اس میں القاب و آداب کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ خط کا ایک اچھا خاصا حصہ، القاب و آداب پر مشتمل ہوتا تھا۔ لیکن یہ بڑے بڑے اور لمبے لمبے القاب و آداب بے مقصد معلوم ہوتے تھے اور ان کو استعمال کرنے کے لیے خاصی عبارت آرائی کرنی پڑتی تھی۔ غالب نے اس کو چھوڑا اور ایک زیادہ نظری اور زیادہ حقیقی طریقہ اختیار کیا۔ بقول حالی : ”انہوں نے القاب و آداب کا پرانا اور فرسودہ طریقہ اور بہت سی باتیں جس کو مستوسلین نے لوازم نامہ نگاری میں سے قرار دے رکھا تھا مگر درحقیقت فضول اور دور از کار تھیں اڑا دیں۔ وہ خط کو کبھی میان، کبھی برخوردار، کبھی بھائی، کبھی مہاراج، کبھی کسی اور مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں۔ اس کے بعد مطلب لکھتے ہیں اور اکثر بغیر اس قسم کے الفاظ کے سرے ہی سے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔“ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انہوں نے اپنے خطوط سے ہکسر القاب و آداب کو خارج کر دیا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ وہ القاب کبھی کبھی استعمال ضرور کرتے ہیں لیکن وہاں جہاں ان کو استعمال کیے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔

غالب نے ان القاب و آداب کو مرتبے کی مناسبت سے استعمال کیا ہے۔ بلکہ یہی خیال القاب و آداب کے استعمال کرنے کا باعث بنا ہے۔ جب وہ اپنے سے بڑے کو خط لکھتے ہیں تو القاب و آداب ضرور استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً نوابان رام پور کے خطوط کو انہوں نے ہمیشہ ”حضرت ولی نعمت آئمہ رحمت سلامت“ سے شروع کیا ہے اور نواب میر غلام بابا خان کو ”جلیل العناقب عمیم الاحسان“ لکھ کر مخاطب کیا ہے۔ لیکن وسمے ان کا عام انداز یہی ہے کہ بغیر کسی القاب کے خط شروع کر دیتے ہیں۔ پھر حال اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالب نے روایتی القاب و آداب کے استعمال سے احتراز کیا اور جو القاب و آداب استعمال کیے، ان میں کچھ جدتیں پیدا کیں اور اسی وجہ سے ان کے القاب و آداب بذات خود بھی دلچسپ بن گئے۔

القاب و آداب کو زیادہ اہمیت نہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ غالب خط لکھنے کو بات کرنے کے مترادف سمجھتے تھے۔ چنانچہ کئی جگہ انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں : ”پیر و مرشد ! یہ

خط لکھتا نہیں ہے، باتیں کرتی ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ میں القاب و آداب نہیں لکھتا۔“ —ایک اور جگہ اسی خیال کا اظہار اس طرح کیا ہے : ”مرزا صاحب ! میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بڑا قلم باتیں کیا کھرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔ کیا تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھا لی ہے۔ اتنا تو کہو کہ یہ کیا بات تمہارے جی میں آئی ہے۔“ —اور یہ بات کرنے کا انداز انہوں نے اپنے خطوط میں شعوری طور پر پیدا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خطوط میں بات کرنے کی ایک فضا ملتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مکتوب الہ کے سامنے موجود ہے اور غالب اس کے سامنے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ یہ باتیں کرنے کی فضا غالب کے خطوط کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔

جدت اور ایچ گویا غالب کی گوشتی میں بڑی تھی۔ اس کا اظہار ان کے خطوط میں جگہ جگہ ہوتا ہے۔ خصوصاً خطوط شروع کرنے میں انہوں نے بڑی جدتوں سے کام لیا ہے۔ ہر خط کے آغاز میں ایک ڈرامائی کیفیت نظر آتی ہے بلکہ جہاں القاب و آداب نہیں ہوتا، اور جہاں وہ براہ راست مکتوب الہ کو مخاطب نہیں کرتے، وہاں یہ خصوصیت کچھ اور بھی نمایاں ہوتی ہے۔ مثلاً یوسف مرزا کے نام ایک خط کو اس طرح شروع کرتے ہیں : ”کوئی ہے ذرا یوسف مرزا کو بلائیو۔ لو صاحب وہ آئے۔ میان میں نے خط تم کو بھیجا ہے مگر تمہارے ایک سوال کا جواب رہ گیا ہے“ —اسی طرح میر مہدی کو ایک خط میں لکھنا چاہتے ہیں کہ میرن صاحب آئے اور ان سے یہ باتیں ہوئیں۔ اس کو اس طرح شروع کرتے ہیں : ”اے میرن صاحب ! السلام و علیکم۔ حضرت ! آداب، کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟ حضور میں کیا منع کرتا ہوں۔ مگر میں انہیں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں۔ پھر آپ کیوں تکلیف کریں۔ نہیں میرن صاحب ! اس کے خط کو آنے ہونے بہت دن ہوئے ہیں۔ وہ غفا ہوا ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے۔ حضرت ! وہ آپ کے فرزند ہیں، آپ سے کیا خفا ہوں گے۔ یہاں آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟ سبحان اللہ ! اے لو حضرت ! آ۔ خط نہیں لکھے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔

اچھا تم باز نہیں رکھتے مگر یہ کہو تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میری سہلی کو خط لکھوں۔ کیا عرض کروں؟ سچ لو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے۔ میں اب پنج شبہ کو رواتہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھنے کا۔ میں! بیشہ ہوش کی خبر لو۔ کھارے جانے نہ جانے سے بھنے کیا علاوہ۔ میں پوڑھا آدمی بھولا آدمی، کھاری باتوں میں آگیا اور آج تک اسے خط نہ لکھا۔ لاجول و لا قوۃ۔“ اور اس تمہید کے بعد جو باتیں لکھنی چاہتے ہیں لکھتے ہیں۔ اس خط کی اصل خوبی اس کے ڈرامائی انداز میں ہے۔ اس ڈرامائی انداز سے غالب کے خطوط بھرے پڑے ہیں۔

غالب کے مزاج میں بلا کی شوخی اور شگفتگی تھی۔ بات میں بات پیدا کرنا وہ خوب جانتے تھے۔ بلکہ بغیر شوخی اور شگفتگی کے وہ بات کر ہی نہیں سکتے تھے۔ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ: ”مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری تھی، جسے ستار کے تار میں سر بھرے ہوتے ہیں اور قوت متغیہ جو شاعری اور شرافت کی خلائی ہے، اس کو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی نسبت تھی، جو قوت پرواز کو طائر کے ساتھ۔“ یہ شوخی اور شگفتگی کی خصوصیات ان کے خطوط میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ لیکن ہر جگہ اس شوخی اور شگفتگی سے کوئی نہ کوئی نکتہ پیدا ہونا ہے اور اسی طرح ان کی یہ شوخی اور شگفتگی، ان کے خطوط میں لطیفہ سنجی کی خصوصیت پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن غالب کی بڑائی اس میں ہے کہ اس لطیفہ سنجی میں بھی وہ حفظ مراتب کا خیال رکھتے ہیں اور ان خطوط میں لطیفہ سنجی سے جو مزاح پیدا ہوتا ہے، اس میں بڑی لطافت ہوتی ہے۔ ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے ان کی لڑکی کو جو بچپن میں مرزا کے سامنے آتی تھی اور اب جوان ہو گئی ہے، اس طرح مخاطب کرتے ہیں:

”کیوں بھئی! اگر ہم کول آئے بھی تو تم کو کھوں کو دیکھیں گے؟“

کیا بھارے ملک میں بھتیجیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں؟“

ایک اور دوست کو رمضان کے بارے میں لکھا ہے:

”دھوپ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں۔ مگر روزے کو چھلانا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا۔ کبھی حلہ پی لیا۔ کبھی کوئی ٹکڑا

روٹی کا کھانا لیا۔ یہاں کے لوگ عجیب قسم کا فہم رکھتے ہیں۔ میں نو روزہ چلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ نو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز اور روزہ چلاتا اور بات ہے۔“

مرزا حاتم علی بیگ مہر کو ایک تعزیتی خط اس انداز میں لکھتے ہیں :

”مرزا صاحب ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ ہینسٹو برس کی عمر ہے۔ پچاس برس برس عاتم ولگ و یو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کاسل نے نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم سابع لبق و فخور نہیں، یہو کھاؤ مزے اڑاؤ۔ مگر یاد رہے کہ نصیری کی مکھی ہو، شہد کی مکھی نہ ہو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے کسی کے مرنے کا غم وہ کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک فشاں؟ کہاں کی مرثیہ خوانی؟ آزادی کا شکر چیا لاؤ۔ غم نہ کھاؤ، اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو نو چشماں جان نہ سہی مٹا جان سہی۔ میں جب پشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہو گئی اور ایک عصر ملا اور حور ملی افادت جاوداتی ہے۔ اور اسی نیک بخت کے ساتھ زندگی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجا مند کو آنا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائے گی وہی زمردیں کاغ اور وہی خوبلی کی ایک شاخ۔ چشم بد دور وہی ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ۔“

ایک اور خط میں اس موضوع پر یوں قلم اٹھاتے ہیں :

”عاشق کی نمود یہ ہے کہ بھنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی۔ تمھاری محبوبہ تمھارے سامنے مری۔ بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہونے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری۔ بھئی مغل مجھے بھی غضب ہونے ہیں جس پر مرتے ہیں، اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی زعم دوست کھائے ہونے مغفرت کرے۔“

ان خطوط میں جو شوخی اور شگفتگی ہے، وہ مزاح کو پیدا کرتی ہے، اور لطافت اس مزاح کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ

تقریب ناڑک موقع پر بھی وہ مزاح کو پیدا کرتے ہیں اور اس لطافت کو برقرار رکھتے ہیں۔ تعزیت کے ایسے ناڑک موضوع پر غلط لکھنے ہوئے بھی انہوں نے اپنے اس مخصوص رنگ کو قائم کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ خطوط دلوں میں گہر کر لیتے ہیں اور ان کا لطیف انداز ظرافت روح میں بالیدگی پیدا کرتا ہے۔

غالب کے فکر و خیال کی پرواز بہت اونچی تھی۔ وادی خیال کو مستانہ وار طے کرنا، ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ لیکن وہ زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے بھی تھے۔ اس کی گہرائیوں تک پہنچنا اور اصل حلیت کو معلوم کرنا، ان کی شخصیت کا جزو تھا۔ لیکن مشاہدہ حق کی گفتگو، وہ بادہ و ساغر کے بغیر نہیں کر سکتے تھے۔ یہ خصوصیت ان کے خطوط میں بھی نمایاں ہے۔ ان میں جگہ جگہ تخیل کی بلند پروازی نظر آتی ہے اور تخیل کی اس بلند پروازی کے سہارے وہ زندگی کے بنیادی حقائق تک پہنچتے ہیں۔ لیکن ان حقائق کو بادہ و ساغر کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ ایسے مقامات پر ان کے خطوط میں حد درجہ شاعرانہ انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اس خط کو دیکھئے جس میں انہوں نے اپنی زندگی کے مد و جزر کو پیش کیا ہے اور خانہ داری کے موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:

”سنو! عالم دو ہیں ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل۔
حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ہے، جو خود فرماتا ہے: ”المن الملک
اليوم“ اور پھر آپ ہی جواب دیتا ہے ”لله الواحد القہار۔“ ہر چند
قاعدہ عام یہ ہے کہ آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں۔
لیکن ہوں بھی ہوا کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا
دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ء میں روٹکری کے واسطے
بھیجا گیا (یعنی پیدا ہوا) بیرہ برس حوالات میں رہا۔ ساتویں رجب
۱۲۲۵ء کو میرے واسطے حکم دوام حبس (یعنی نکاح) صادر ہوا۔
ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا۔
اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔
برسوں کے بعد جب جیل خانے سے بھاگا، تین بلاد شرقیہ میں پھرتا
رہا۔ پایاں کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اس مجلس میں بٹھا دیا

جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے ، دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں ۔
 پاؤں بیڑی سے نکال ، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زنجیر دار ، مشقت مفری اور
 مشکل ہو گئی ۔ طاقت یک قلم زائل ہو گئی ، بے حیا ہوں ۔ سال گزشتہ
 بیڑی کو زاویہ زندان میں جھوڑا ، مع دونوں ہتھکڑیوں کے بٹھا گا ۔
 میرٹھ ، مراد آباد بولا ہوا ، رام پور پہنچا ۔ کچھ دن کم دو مہینے
 وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا ۔ اب عہد کیا کہ بھر نہ بھاگوں گا ۔
 بھاگوں کیا بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی ۔ حکم رہائی دیکھئے کہ
 کب صادر ہو ؟ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اس ماہ ذی الحجہ میں
 چھوٹ جاؤں ۔ پھر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے
 اور کبھی نہیں جاتا ۔ میں بھی بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو
 چلا جاؤں گا ۔“

یا پھر یہ خط جس میں اپنے آخری وقت کی حالت کا بیان اور زندگی
 کی بے ثباتی کا تذکرہ ہے :

”قاتلانی زور پر ہے ، پڑھائیے نے نکلا کر دیا ہے ۔ صغ ، کاہلی ،
 سستی ، گراں جانی ، رکاب میں پاؤں ہے ۔ باگ پر ہاتھ ہے ۔ بڑا سفر
 دور و دروازہ بھی ہے ۔ زاد راہ موجود نہیں ۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں
 اگر نا پرسیدہ بخش دیا تو غیر ۔ اگر باز پرس ہوئی تو سفر مقرر ہے اور
 ہاویہ زاویہ ہے۔“

اس سے یہ حلیت واضح ہوتی ہے کہ غالب کے تخیل کی پرواز بہت
 بلند تھی ، اور اس تخیل کی پرواز کے ذریعے ان کے انداز تکمیل نگاری کی
 خصوصیت بھی پیدا ہو جاتی تھی ۔ جیسے کہ ان خطوط میں موجود ہے اور
 یہ کہ وہ زندگی کا شعور رکھتے تھے ۔ زندگی کے بنیادی حقائق پر ان کی
 نظر رہتی تھی ۔ لیکن وہ اس کو بڑے ہی دلکش انداز میں پیش کرتے تھے ۔
 غالب کی زندگی کی تصویر اس بیان سے جب ابھر کر سامنے آتی ہے ، اس کی
 مثال کہیں اور نہیں مل سکتی ۔ غالب کو اس میں کمال حاصل تھا ۔ ان کے
 خطوط میں اکثر جگہ اس خصوصیت کے اثرات جھلکتے ہیں ۔ اور اسی کا
 اثر ہے کہ ان کے خطوط میں ایک رفعت ملتی ہے ۔ ایک گہرائی کا احساس
 ہوتا ہے اور ایک رچی ہوئی کیفیت نظر آتی ہے ۔

اردو نثر کی روایت میں غالب کے خطوط امتیازی حیثیت رکھتے ہیں ۔

ان خطوط نے اردو نثر کو ایک نیا انداز دیا ہے ، اس کو نئی راہیں دکھائی ہیں اور ان راہوں پر اس کو گامزن بھی کیا ہے ۔

غالب کے زمانے میں اردو نثر کا رواج عام نہیں تھا ۔ عام طور پر لکھنے کی زبان فارسی تھی ۔ اس لیے فارسی نثر کے اثرات ہر طرف چھائے ہوئے تھے ۔ اور جب کبھی کوئی اردو نثر لکھتا بھی تھا ، تو وہ فارسی نثر کی نقل ہوتی تھی ۔ مستجع ، مقلی اور ہر تکلف عبارت کا رواج عام تھا ۔ اگرچہ فورٹ ولیم کالج نے اردو میں سادہ اور آسان نثر کے اچھے نمونے پیش کیے تھے ، لیکن ابھی تک فارسی کا اثر اتنا گہرا تھا کہ آسان اور سادہ نثر اپنے اثرات کو عام نہیں کر سکتی تھی ۔ فورٹ ولیم کالج نے میر امن دہلوی ، مرثیہ علی السوس ، سید حیدر بخش حیدری ، خلیل علی خان اشک ، مرزا کاظم علی جوان اور یحییٰ نازانی جہاں وغیرہ کو ہلکا کیا ۔ لیکن ان کے اثرات ابھی تک محدود تھے ۔ بلکہ بعضوں نے تو اس آسان نثر کا مضحکہ اڑانا شروع کر دیا تھا اور ان پر ہتھیاں کستا شروع کر دی تھیں ۔ وجہ علی بیگ سرور کی 'فسانہ عجائب' اس کی ایک مثال ہے ۔ غرض یہ کہ غالب سے قبل اردو نثر میں قدامت اور جدت ، تصنع اور سادگی ، تکلف اور سلاست میں ایک کشمکش کا سلسلہ جاری تھا ۔ غالب نے اپنے خطوط لکھ کر سادگی اور سلاست کی تحریک کو سہارا دیا اور اسی کا یہ اثر ہے کہ اردو نثر میں اس تحریک نے ترقی کی ، یہ رجحان عام ہوا اور اس نے ایک مستقل روایت کی صورت اختیار کر لی ۔

خطوط غالب اردو نثر کے بہت اچھے نمونے پیش کرتے ہیں ۔ اس نثر میں سادگی اور سلاست ہے ۔ لیکن اس سادگی اور سلاست کے باوجود وہ ہرکار بھی ہے ، جو غالب کی شخصیت کا حصہ تھی ۔ غالب فارسی زبان کا وچا ہوا مذاق رکھتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی کے اثرات ان کی اردو نثر میں بھی نظر آتے ہیں ۔ لیکن فارسی کے یہ اثرات غالب کی اردو نثر کو بھی بوجھل نہیں بناتے ۔ برخلاف اس کے اس میں ایک رنگین اور ہرکار فضا کو پیدا کرتے ہیں ۔ اس فضا میں ایک ہانکپن اور طرحداری ملتی ہے ۔ غالب فارسی کی نئی نئی ترکیبیں تراشتے ہیں ۔ لیکن یہ ترکیبیں ناسانوس نہیں ہوتیں ۔ ان ترکیبوں میں ایک شان و شکوہ ہوتا ہے ۔ غالب کی نثر میں یہ شان و شکوہ ، یہ ہانکپن اور طرحداری موجود ہے ۔ لیکن یہ شعوری

کوشش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ فطری معلوم ہونا ہے ۔ ان کی نثر میں کہیں کہیں عبارت آرائی کی خصوصیت ملتی ضرور ہے، کیونکہ وہ کہیں کہیں مرصع نثر بھی لکھتے ہیں لیکن یہ خصوصیت موضوع سے ہم آہنگی کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے ۔ جہاں وہ شدت کے ساتھ کوئی بات کہنا چاہتے ہیں ، وہاں اس صورت حال کا وجود ہوتا ہے ۔ لیکن غالب کے خطوط میں ایسے مواقع کم ہی آتے ہیں ۔ البتہ ان کے قہیل کی بلند پروازی ، ان کی نثر میں ایک شاعرانہ انداز کو ضرور پیدا کرتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جگہ جگہ ان کی نثر میں ایسے مقامات آتے ہیں ، جن میں ایسی چولکا دہنے والی کیفیت ہوتی ہے جو اپنی رنگینی اور رعنائی کے باعث دلوں میں اثر جاتے ہیں ۔ غالب کی اردو نثر میں ایسا اسلوب نہیں ملتا جو محنت سے پیدا ہوتا ہے ۔ برخلاف اس کے ایک فطری روانی نظر آتی ہے ۔ ایک فطری پہاؤ کا احساس ہوتا ہے ۔ لیکن اس روانی اور پہاؤ میں پرشور کیفیت نہیں پائی جاتی ۔ بلکہ ایک نرمگی اور غنائی کیفیت کا احساس ہوتا ہے ۔ اور یہ سب چیزیں مل کر غالب کی اردو نثر کو ایک نئے اسلوب سے آشنا کرتی ہیں ۔ یہ اسلوب غالب ہی کے ساتھ مخصوص ہے ۔ ان سے قبل تو غیر اس کا وجود ہی نہیں تھا لیکن ان کے بعد بھی کوئی اسے اپنا فہ سکا ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی جگہ منفرد ہے ۔

اردو ادب میں غالب کے خطوط کی ایک نمایاں حیثیت ہے ۔ ان سے غالب کی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ اس ماحول کے تمام پہلوؤں کی تصویریں نظر آتی ہیں ، جس میں غالب نے پرورش پائی اور جس نے ان کے اسلوب کو پیدا کیا ۔ یہ اسلوب بھی ان خطوں میں اپنے شباب پر نظر آتا ہے ۔

غالب کے خطوط
کی
ادبی اہمیت

غالب ایک عظیم شاعر ہی نہیں تھے ، ایک نثر نگار کی حیثیت سے بھی ان کی عظمت مسلم ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے نثر کی طرف کسی باقاعدگی کے ساتھ توجہ نہیں کی ۔ یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کا بہت کم وقت اس پر صرف کیا ۔ لیکن اس کے باوجود نثر کی جو روایت انہوں نے قائم کی اور جو مخصوص لہجہ اس میں پیدا کیا ، وہ اپنی جگہ ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے ۔ اس میں غالب کی شاعری ہی کی طرح دل کشی اور دل آویزی نظر آتی ہے — اور اس دل کشی اور دل آویزی کو پیدا کرنے میں صرف فنی اور جمالیاتی پہلو ہی کا ہاتھ نہیں ہے — موضوع اور مواد کا پہلو بھی اس میں برابر کا شریک ہے — جس طرح ان کی شاعری میں ان پہلوؤں کا ایک حسین اور متوازن امتزاج ملتا ہے ، اسی طرح ان کی نثر میں بھی یہ دونوں پہلو ایک دوسرے کے ساتھ جگے ملتے ہوئے نظر آنے ہیں — اور یہی صورت حال اس کو دل کش اور دل آویز بناتی ہے ۔

اردو نثر میں غالب نے جو سرمایہ چھوڑا ہے ، وہ صرف ان کے خطوط پر مشتمل ہے — یہ خطوط بھی کسی منصوبے کے ماتحت نہیں لکھے گئے ہیں اور کوئی واضح ادبی نیرۂ بھی ان کی تخلیق کا باعث نہیں بنا ہے — وہ تو غیبی خطوط ہیں اور ان میں صرف یہی اور ذاتی باتیں دوسروں تک پہنچائی گئی ہیں — اس لیے بظاہر ان خطوط میں وہ خصوصیات پیدا نہیں ہو سکتی تھیں ، جن کی بدولت نثر میں ایک ادبی اسلوب رو نما ہوتا ہے — لیکن غالب کی عظیم اور پہلو دار ، رنگا رنگ اور ہرکار شخصیت نے

ان بھی خطوط میں ادبی اثر کی وہ شان پیدا کر دی ہے ، جس کی حیثیت اپنی جگہ منفرد ہے۔ یہ خطوط اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں ۔ ان میں جگہ جگہ ادبی تجربے کی بہت اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ اور اس تجربے کو غالب کے مخصوص مزاج نے پیدا کیا ہے۔ ان کے مزاج کی نمایاں ترین خصوصیت یہ تھی کہ وہ عام زندگی کی معمولی معمولی باتوں کو ادبی تجربے میں ڈھال دیتے تھے ۔ بات یہ ہے کہ غالب کی شخصیت صحیح معنوں میں ایک ادبی شخصیت تھی ۔ اس لیے ان کا احساس ہمیشہ ایک ادبی تجربے کا روپ اختیار کر لیتا تھا۔ اس کے لیے انہیں کوئی کاوش نہیں کرنی پڑی تھی۔ کسی قسم کا منصوبہ نہیں بنانا پڑتا تھا۔ ان کی ذہنی کیفیت ہی کچھ ایسی تھی کہ جو کچھ وہ محسوس کرتے اور سوچتے تھے ، اس کا اظہار کچھ اس طرح ہوتا تھا کہ اس میں ادبی تجربے کے تمام عناصر کی جھلک نظر آنے لگتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہ خطوط بھی ہونے کے باوجود ایک ادبی رنگ و آہنگ رکھتے ہیں۔ غالب کی ادبی شخصیت نے انہیں ادبی تخلیق کا اعلیٰ نمونہ بنا دیا ہے۔

یہ خطوط چونکہ بھی اور ذاتی ہیں اور انہیں اس احساس کے ساتھ نہیں لکھا گیا ہے کہ ان کا شمار ادبی تخلیق کے تحت ہو گا ۔ پڑھنے والے انہیں ادبی تخلیق کے معیاروں کو سامنے رکھ کر دیکھیں گے اور ان سے اثر کی روایت میں کوئی اضافہ ہو گا ، اس لیے ان میں تکلف اور تصنع کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے بڑی بے ساختگی اور برجستگی نظر آتی ہے۔ ان میں تو اس حسن کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں ، جو زندگی میں بغیر کسی کوشش اور کاوش کے از خود پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حسن میں انسان کی صناعی اور دست کاری شامل نہیں ہوتی۔ بلکہ فطرت کا ہاتھ اسے متواتر اور نکھارتا ہے اور زندگی خود اس کی مشاطگی میں پیش پیش رہتی ہے۔ غالب کے یہ خطوط ، اسی حسن کی دولت سے مالا مال ہیں۔ ان میں بڑی وسعت اور کشادگی ہے ۔ بڑی ہی شکستگی اور شادابی ہے ۔ بڑی ہی سادگی اور صفائی ہے ۔ بڑی ہی رنگینی اور ہرکاری ہے۔ یہ زندگی سے بھرپور ہیں۔ ان میں بڑی جولانی کا احساس ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں صناعی ٹام کو بھی نہیں ہے۔ ان کی تخلیق میں تو صرف فطرت کا ہاتھ ہے۔ یہ صرف خطوں کی

طرح لکھے گئے ہیں ، لیکن انہوں نے اعلیٰ درجے کی ادبی تخلیق کا روپ اختیار کر لیا ہے — اور اس طرح اردو کی ادبی نثر میں پہلی بار اچانے کا باعث بنے ہیں ۔

ان سے قبل نہ تو اردو میں خطوط ہی لکھے جاتے تھے اور نہ اس میں نثر لکھنے ہی کی کوئی عظیم روایت موجود تھی ۔ غالب کے خطوط سے ایک تو اردو میں خطوط نویسی کے فن کا آغاز ہوا اور دوسرے اردو میں باقاعدہ آسان اور سادہ ادبی نثر لکھنے کی ایک روایت قائم ہوئی — لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں ان تمام پہلوؤں کا نہایت حسین آئینہ نظر آتا ہے ، جو ادبی تخلیق کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں — موضوع اور مواد ، اسلوب اور فن ، دونوں اعتبار سے ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے — ادبی تخلیق مجموعی طور پر انہی دونوں پہلوؤں کے امتزاج کا نام ہے — انہی دونوں سے اس کی تشکیل ہوتی ہے — غالب کے خطوط میں انہی دونوں پہلوؤں نے مل کر ادبی تخلیق کا رنگ و آہنگ پیدا کیا ہے ۔

غالب کے ان خطوں کا سب سے اہم موضوع تو غالب کی رنگا رنگ اور پہلو دار شخصیت کے مختلف گوشوں کی ترجمانی اور عکاسی ہے — ان خطوں میں غالب نہ صرف چلتے پھرتے اور ہنسنے بولنے نظر آتے ہیں بلکہ جو کچھ انہوں نے محسوس کیا ہے ، جو کچھ ان پر بیٹھتا ہے ، جو کچھ وہ — جتنے رہے ہیں ، جن معاملات پر انہوں نے غور کیا ہے ، جو نتائج نکالے ہیں اور جن خیالات و نظریات کی توضیح و تشریح کی ہے ، ان سب کی تفصیل و جزئیات ان خطوں میں موجود ہے — یہ گویا غالب کی انفرادی داخلی زندگی اور ان کے آس پاس کی اجتماعی خارجی زندگی کے قشرب و فراز کے مرقعے ہیں — غالب نے زندگی کے ان تمام پہلوؤں کو شدت کے ساتھ محسوس کر کے پیش کیا ہے — اس لیے ان میں جذبے کی اخلاص مندی نظر آتی ہے اور ساتھ ہی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو دیکھنے اور جاننے کا شعور بھی کار فرما دکھائی دیتا ہے — پھر ان میں اس بات کی وضاحت بھی موجود ہے کہ غالب نے زندگی کے ان پہلوؤں کو کس زاویہ نظر سے دیکھا اور ان پر اس کے کیا اثرات ہوئے — اس کے علاوہ غالب کی جو دلچسپیاں تھیں ، ان کا جو مذاق تھا ، جو معیار انہیں عزیز تھے ، جن

قدروں کی ان کے نزدیک اہمیت تھی ، ان سب کی تفصیل بھی ان خطوں میں جگہ جگہ مل جاتی ہے۔ غالب نے ان خطوں میں اپنا ذکر کیا ہے۔ اپنے عزیزوں ، رشتے داروں اور دوستوں کی زندگیوں کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی ہے۔ اپنے زمانے کی عام سیاسی اور معاشرتی ، معاشی اور اقتصادی اور ثقافتی زندگی کے مختلف معاملات و مسائل کو پیش کیا ہے۔ ان میں انسان اور اس کی جذباتی زندگی کے ان گنت پہلوؤں کی تصویر کشی بھی ہے ۔ اس کی مسرتوں اور شادمانیوں ، محرومیوں اور ناکامیوں کا بیان بھی جگہ جگہ ملتا ہے۔ ایسے ہی مقامات پر ان خطوط میں اتفاقیات کا رنگ و آہنگ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ باتیں جو غالب نے صرف اپنے اور اپنے بعض عزیزوں اور دوستوں کے بارے میں کہی ہیں ، ان کا اطلاقی تمام انسانوں پر ہو سکتا ہے۔ اسی لیے ان کی یہ باتیں ہر انسان کو اپنی باتیں باتیں معلوم ہوتی ہیں اور وہ اس آئینے میں اپنی ہی صورت دیکھتا ہے ۔

ایک خط غالب نے چودھری عبدالغفور کو لکھا ہے ، جس میں اپنی زندگی کے نشیب و فراز کی وضاحت کی ہے اور اپنی پریشانی اور زبانوں حالی کا نقشہ کھینچا ہے لیکن اس میں اس زمانے کی اجتماعی زندگی کی زبانوں حالی کی تفصیل نسبتاً زیادہ نمایاں ہوتی ہے ۔ لکھتے ہیں :

میں باج برص کا تھا کہ میرا باپ مرا ۔ نو برس کا تھا کہ چچا مرا ۔ اس کی جاگیر کے عوض میرے اور میرے شرکاء کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خان دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے ، انہوں نے نہ دیے ، مگر تین سال ۔ اس میں سے خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپے سال ، میں نے سرکار انگریزی میں یہ غین ظاہر کیا ۔ کول بروک صاحب چادر ریڈیڈنٹ دہلی اور اسٹرنلنگ صاحب چادر سکریٹری گورنمنٹ متفق ہوئے ، میرا حق دلانے پر ۔ ریڈنٹ معزول ہوئے ۔ سکریٹری گورنمنٹ ناکام مر گئے ۔ بعد ایک زمانے کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپے ماہانہ مقرر کیا ۔ ان کے ولی عہد نے چار سو روپے سال دیے ۔ ولی عہد اس ققرر کے دو برس بعد مر گئے ، واجد علی شاہ کی سرکار سے یہ صلہ مدح گستری ، باج سو روپے سال مقرر ہوئے ۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ چلے ، یعنی اگرچہ ابھی تک جینے ہیں مگر سلطنت جاتی

رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی ۔ دلی کی سلطنت کچھ
سلطنت جان تھی ، سات برس بچہ کو روٹی دے کر بگڑی ۔
ایسے طالع مری کش اور محسن سوز کھان پیدا ہوئے ہیں ۔ اب جو
میں والی دکن کی طرف رجوع کروں ، یاد رہے کہ متوسط یا تو
مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا ۔ اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے
تو کوشش اس کی خائن ہو جائے گی اور والی شہر بچہ کو کچھ نہ
دے گا اور ایماناً اس نے یہ سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی
اور ملک میں گدھے کے پل بھر جائیں گے۔ اے خداوند ، بندہ
پرور! — یہ سب باتیں وقوعی اور واقعی ہیں ۔“

ایک اور خط میں یوسف مرزا کو اپنا حال لکھا ہے ۔ اس سے بھی

اس زمانے کی عام معاشی افراطی بر روشنی بڑی ہے۔ لکھتے ہیں :
”میری جان ! خدا تیرا نگہبان — جالتے ہو کہ علی کا بندہ ہوں
— اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا — اس وقت کلو کے
پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں ۔ اس کے بعد نہ کہیں سے قرض
کی امید ہے اور نہ کوئی چیز رہن و بیع کے قابل ہے — اگر وام پور
سے کچھ آیا تو خیر ، ورنہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔“

غالب کے بیشتر خطوط کا یہی انداز ہے۔ بظاہر ان میں انہوں نے
اپنا رونا رویا ہے لیکن ان میں سلطنتوں کے مٹنے کا ذکر بھی ہے ۔ شاہان
وقت کے معزول ہونے کا بیان بھی ہے ۔ جاگیروں کے ختم ہونے کی تفصیل
بھی ہے۔ ان سب باتوں کو پیش کر کے غالب نے در حقیقت اس زمانے
کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اس تمام افراطی اور انتشار کو پیش کیا
ہے ، جس کے محرک یہ حالات تھے۔ یہ خطوط صرف غالب ہی کا نہیں ،
اس پورے دور کا مرثیہ ہیں ، کیوں کہ اس وقت صرف غالب ہی ان حالات
سے دو چار نہیں تھے۔ ساری زندگی کا یہی حال تھا۔ غالب کے سر سے
یہاں جو موج خوں گزرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ، وہ ان کے زمانے میں
ہر انسان کے سر سے گزر رہی تھی۔ غرض ان خطوط میں گہرے سماجی
شعور کے ساتھ وہ آفاقیت بھی نظر آتی ہے ، جس کو ایک انسانی زاویہ نظر
ہی پیدا کر سکتا ہے۔ غالب انسانی زندگی کے بہت بڑے نباض اور
اس کے مختلف پہلوؤں کے بہت بڑے مزاج دان تھے۔ ان کے پاس

ذہن تھا۔ وہ محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ سوچ بھی سکتے تھے۔ اسی لیے ان خطوط میں ایک ذہن بھی ملتا ہے۔ غالب کی بڑائی اس میں ہے کہ انہوں نے اس ذہنی اور فکری پہلو کو احساس اور جذبے کے ساتھ کچھ اس طرح ہم آہنگ کیا ہے کہ ان میں ادبی موضوع کی شان پیدا ہو گئی ہے۔

یہ خطوط جالیانی اور فنی اعتبار سے بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں نہ صرف خطوط نویسی کے فن کا ایک نیا اور اچھوتا انداز ملتا ہے، بلکہ ادبی نثر کی بھی ان میں ایک نئی صورت شکل نظر آتی ہے۔ یہ خطوط سیدھے سادے انداز میں لکھے گئے ہیں۔ اسی لیے ان میں ایک اچھوتا فن نظر آتا ہے۔ غالب کے سامنے صرف فارسی خطوط نویسی کی روایت تھی اور اس میں تکلف اور تصنع کا پہلو غالب تھا۔ وہ بندھے لکھے اصولوں کے ماتحت لکھے جاتے تھے۔ ان کے القاب و آداب تک معین تھے۔ غلط لکھنے والے کے لیے ان کا توڑنا یا ان حدود سے باہر نکلنا مشکل تھا۔ عبارت آرائی کو اس روایت میں حسن سمجھا جاتا تھا۔ صناعی کو لوگ اس کا زیور خیال کرتے تھے اور ایک عام تصور یہ تھا کہ اس سے حسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ غالب نے اس روایت سے بغاوت کی اور سب سے پہلے سیدھے سادے انداز میں خطوط لکھنے کی داغ بیل ڈالی۔ القاب و آداب تک کو انہوں نے خیر باد کہہ دیا۔ عبارت آرائی ختم کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے خطوط میں سادگی کا حسن پیدا ہو گیا۔ یہ حسن تکلف سے بری ہے اور اس قبائے گل میں گل بوٹا نہیں ہے۔ لیکن اس سادگی کے خیال نے غالب کے احساس و فکر میں آزادی کا احساس پیدا کیا ہے اور ان کے تخیل کو جولانیاں دکھانے کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ اسی لیے ان خطوط میں ایسی گل کاریاں نظر آتی ہیں، جن کو احساس اور تخیل کے موفقم نے بنایا ہے۔ ان میں بڑی شکستگی اور شادابی ہے۔ یہ زندگی سے بھرپور ہیں اور ان میں بڑی ہی رنگینی اور رعنائی کا احساس ہوتا ہے۔ ان میں جگہ جگہ لڑلہائی شان بھی ملتی ہے لیکن یہ لڑلہائی شان صرف مکالمہ نگاری ہی کے ہاتھوں پیدا نہیں ہوتی۔ غالب کا حسیاتی مزاج اس پہلو کو ان خطوط میں پیدا کرتا ہے۔ ویسے مکالمہ نگاری بذاتِ خود ان خطوط کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

اور اس چلو نے انہیں زندگی سے زیادہ قریب کیا ہے اور ان میں جولانی کی لہر ڈوڑائی ہے۔۔۔۔۔ غالب نے ان خطوط میں آسان اور سادہ ادبی نثر لکھنے کا ایک اہم اور قابل قدر تجربہ کیا ہے۔۔۔۔۔ اس نثر میں سادگی اور صفا ہے۔۔۔۔۔ روانی اور جھاڑ ہے۔۔۔۔۔ اس میں مجموعی طور پر بڑی شگفتگی اور شادابی کا احساس ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اس میں سادگی کا حسن بھی ہے اور حسن کی سادگی بھی۔۔۔۔۔ لیکن اس کے باوجود یہ رنگین اور پرکار نظر آتی ہے۔۔۔۔۔ یہ کوشش اور کاوش کی پیداوار نہیں ہے۔۔۔۔۔ اسی لیے اس میں کاریگری کا چلو نمایاں نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ اس کی تشکیل تو خیال اور موضوع کے ہاتھوں ہوئی ہے۔۔۔۔۔ اسی لیے اس میں فطرت کا حسن نظر آتا ہے۔۔۔۔۔ اور حسن کی فطرت بھی ۔

غالب ایک عظیم ادبی شخصیت کے مالک تھے۔۔۔۔۔ یہ خطوط ان کی اسی ادبی شخصیت کا آئینہ ہیں اور ان میں اس شخصیت کے غد و خال اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ، بے نقاب نظر آتے ہیں۔۔۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی شاعری کی طرح، ان کی ادبی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے اور غالب کو ایک عظیم ادبی شخصیت بنانے میں ان کا بھی بڑا ہاتھ ہے ۔

غالب

کا

ایک اہم خط

نامہ غالب

’نامہ‘ غالب‘ اگرچہ غالب کا ایک طویل خط ہے لیکن اسے موضوع کے اعتبار سے ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ خط غالب نے ۱۸۶۵ء میں مرزا رحیم بیگ کے نام لکھا اور دلی کے مطبع پھدی میں اس کے تین سو نسخے اسے خرچ پر چھپوا کر احباب کو تقسیم کئے۔ یہ ’نامہ‘ غالب‘ کا پہلا ایڈیشن تھا۔ اس کے آخر میں مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے :

’الحمد لله کہ نحم الدولہ ، اسد اللہ خان ، غالب کا خط موسومہ مرزا رحیم بخش صاحب کا مطبع پھدی مرزا خان میں بیچ گنیمت دہلی اندرون کوچہ‘ چلہ گذر فیض حد چھاؤنی کے اہتمام عبدالرزاق بیگ سے چھپا ، ۱۸۶۵ء‘۔

اس ایڈیشن میں کل سولہ صفحے تھے۔ اس وقت اس کی اشاعت بھی محدود رہی۔ یہ عام اس وقت ہوا جب ۱۸۶۹ء میں اس کا متن ’اودہ اخبار‘ میں بالائے سطح شائع ہوا۔ پہلی قسط ۱۰ اکتوبر ۱۸۶۹ء کے اخبار میں اور دوسری قسط ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۹ء کے اخبار میں شائع ہوئی۔ بعد میں اس کو ’عود ہندی‘ میں شامل کر لیا گیا اور ’عود ہندی‘ میں شامل ہونے کی وجہ سے لوگ اس کو ایک مستقل تصنیف کی حیثیت سے فراموش کر بیٹھے۔ اس مجموعے میں یہ خط دب کر رہ گیا اور لوگ اس کی اہمیت سے

۱۔ غالب : ’نامہ‘ غالب (پہلا ایڈیشن) : صفحہ ۱۶

۲۔ غلام رسول سہر : خطوط غالب : صفحہ ۶۱۳

سے خبر ہو گئے۔ حالانکہ جہاں تک اس کے موضوع کا تعلق ہے، یہ خط اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے غالب کی شخصیت کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور ان کے کچھ خیالات و نظریات کی وضاحت بھی ہوتی ہے۔

در اصل یہ خط 'برہان قاطع' اور 'قاطع برہان' کے قضیے کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ غالب کی زندگی کے آخری ایام میں اس قضیے نے بڑی اہمیت اختیار کر لی تھی اور اس سلسلے میں کئی کتابیں چھپ کر شائع ہوئی تھیں۔ غالب کا 'قاطع برہان' لکھنا گویا بیڑوں کے چھتے گھو چھیڑنا تھا۔ یہ کتاب انہوں نے 'برہان قاطع' کی رد میں لکھی تھی اور اس میں اس کے مؤلف محمد حسین دکنی پر اعتراضات کیے تھے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۶۲ء میں مطبع نول کشور سے شائع ہوا تھا۔ اس کے شائع ہونے کے بعد غالب پر مختلف لوگوں نے اعتراضات کیے اور ان کو کتابی صورت میں شائع کیا۔ بقول غالب: "قاطع برہان کا لکھنا کیا ہوا گویا باسی کڑھی میں ابال آیا۔ لکھنا کیا تھا کہ سهام ملائت کا ہدف ہو اسعقدان 'برہان قاطع' پر چھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کر آٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ غرض خاما ہنگامہ برپا ہوا اور اس کے نتیجے میں کئی کتابیں چھپ کر منظر عام پر آئیں۔ ان میں 'عمری قاطع برہان'، 'قاطع برہان'، 'مؤید برہان'، 'قاطع القاطع' وغیرہ خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں۔

'عمری قاطع برہان' منشی سعادت علی دہلوی نے لکھی۔ یہ کتاب ۱۸۶۳ء میں مطبع احمدی شاہدرہ میں چھپی۔ 'مؤید برہان' مولوی احمد علی مدرس مدرّسہ عالیہ کلکتہ کی تالیف ہے اور یہ کلکتہ کے مظہر العجائب پریس میں ۱۸۶۶ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔ 'قاطع القاطع' مولوی محمد اسین نے لکھی۔ یہ ۱۸۶۶ء میں مطبع مصطفائی میں چھپی تھی۔ اس میں ۲۶۸ صفحات تھے۔ 'قاطع برہان' مولوی رحیم بیگ کی تصنیف تھی، جو ۱۸۶۵ء میں مطبع ہاشمی میں چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ یہ تمام کتابیں 'برہان قاطع' کی

۱۔ سید پرشاد 'برہان قاطع' اور 'قاطع برہان' کا قضیہ: (علی گڑھ میگزین غالب نمبر: صفحہ ۱۲۱)

حاجت میں لکھی گئی تھیں۔ اور ان میں غالب کے اعتراضات کے جواب دے گئے تھے۔

جب یہ کتابیں شائع ہوئیں، تو غالب اور ان کے اعیان کی طرف سے بھی ان کا جواب دیا گیا۔ اور اس کے نتیجے میں 'لطائف غیبی'، 'دافع ہذیان'، 'سوالات عبدالکریم'، 'معرق قاطع برہان'، 'تیغ تیز'، 'شمشیر تیز تر'، 'ہنگامہ دل آشوب'، 'مؤید برہان'، 'نامہ غالب' وغیرہ منظر عام پر آئیں۔

'لطائف غیبی' ۳۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب دہلی کے اکمل المطابع میں ۱۸۶۵ء میں چھپی۔ اس میں منشی سعادت علی کی کتاب 'معرق قاطع برہان' کے جواب دے گئے ہیں۔ یہ کتاب میان داد خان سیاح کی تصنیف ہے۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کتاب خود غالب نے لکھی تھی اور میان داد خان سیاح کے نام سے اس کو چھپوایا تھا۔ اگر غالب نے خود یہ کتاب نہیں لکھی تو کم از کم ان کے اشارے سے ضرور لکھی گئی ہے اور انہوں نے اس کا سواد بھی سجا کیا ہے۔ 'دافع ہذیان' مولوی یحییٰ علی کی تصنیف ہے اور ۱۸۶۵ء میں اکمل المطابع سے چھپ کر شائع ہوئی۔ اس میں کل ۲۸ صفحات ہیں۔ 'سوالات عبدالکریم' ایک طالب علم کی تصنیف ہے۔ اس میں سترہ سوالات ہیں جو 'معرق قاطع برہان' کی تردید میں ہیں۔ یہ کتاب ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ 'تیغ تیز'، 'مؤید برہان' کے جواب میں ہے۔ یہ کتاب ۱۸۶۶ء میں اکمل المطابع دہلی سے شائع ہوئی۔ اس میں کل ۳۵ صفحات ہیں 'شمشیر تیز تر' مولوی نبی بخشی کے مدلیع نبوی کلکتہ میں ۱۸۶۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں 'تیغ تیز' کا جواب دیا گیا ہے۔ صفحات ۱۸۲ صفحات ہے۔ 'نامہ غالب' خود غالب کی تصنیف ہے، اور جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے، یہ کتاب انہوں نے خود مطبع چندی میں چھپوائی تھی۔ غالب، میان داد خان سیاح کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

'نامہ غالب' صاحب مطبع نے اپنی بکری کے واسطے نہیں چھاپی

۱۔ سہیلی پرشاد : 'برہان قاطع' اور 'قاطع برہان' کا مقدمہ : (علی گڑھ

مہکڑی، غالب میمر : صفحہ ۱۳۲

جو میں مول لے کر بھیجوں اور تم سے اس کی رقم مانگ لوں۔ میں نے آپ تین سو جلدیں چھپوائیں۔ دور و نزدیک ہانک دیں۔ آج یک شنبہ ہے۔ ہارسل روانہ نہ ہوگا جتنے یہ نسخے اب میرے پاس باقی ہیں، کل تمہیں بھیج دوں گا۔“

’برہان قاطع‘ اور ’قاطع برہان‘ کے قضیے سے متعلق موافقت اور مخالفت میں جو کتابیں شائع ہوئیں، ان کی تفصیل اس حقیقت کو واضح کرے گی کہ اس قضیے نے اس وقت کے ادبی ماحول میں اچھا خاصا ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ غالب کو اس ہنگامے سے گہری دلچسپی تھی، اور وہ اپنی ضمنی کے باوجود، اس ہنگامے میں پیش پیش تھے۔ ان کے بعض خطوں سے اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اس قضیے سے کتنی دلچسپی تھی اور وہ ان مطبوعات کو کتنی اہمیت دیتے تھے، جو اس کے متعلق شائع ہوئی تھیں، لکھتے ہیں :

”صاحب ! یہ تم نے پانچ روپے کے ٹکٹ کیوں بھیجے؟ میں نہ کتب فروش، نہ دلال۔ یہ حرکت مجھے پسند نہ آئی۔ اور تم نے برا کیا۔ حضرت ! سولہ جلدیں ’لطفائف غیبی‘ کی بھیج کر، اس کے پان سات دن کے بعد بیس ’نامہ‘ غالب‘ کا ہارسل ارسال کیا ہے۔ ’لطفائف‘ کی رسید تم نے بھیج دی۔ یقین ہے کہ ’نامہ‘ غالب‘ کا ہارسل بھی پہنچ جائے گا۔“

(خط بہ نام میان داد خان سیاح)

’آہا ہا ہا ! ’عرق قاطع‘ کا تمہارے پاس پہنچنا :

کلے کہ خواستم ز خدا شد مستمر

میں اس خرافات کا جواب کیا لکھتا۔ مگر ہاں سچن فہم دوستوں کو غصہ آ گیا۔ ایک صاحب نے فارسی عبارت میں اس کے عیوب ظاہر کیے۔ دو طالب علموں نے اردو زبان میں دو رسالے جدا جدا لکھے دانا ہو اور منصف ہو۔ ’عرق‘ کو دیکھ کر جانو گے کہ مؤلف اس کا احسن ہے اور جب وہ احسن ’دافع ہنہان‘ و ’سوالات عبدالکریم‘ اور

”لطائف غیبی“ کو پڑھ کر متنبہ نہ ہوا اور ”عرق“ کو دھو نہ ڈالا تو معلوم ہوا کہ اے حیا بھی ہے۔ ”دافع ہذیان“ ”سوالات“ ”لطائف غیبی“ تینوں نسخے ایک ہارسل میں اس خط کے ساتھ روانہ ہوئے ہیں۔ یہی ہے کہ یہ تندیخ و تاخیر ایک دو روز نظر انور سے گزریں گے“ (خط بہ نام منشی حبیب اللہ خان)

”مہاجب! میں بعین عنایت الہی کثیر الاحباب ہوں۔ ایک دوست نے کلکتہ سے مجھے اطلاع دی ہے کہ مولوی احمد علی مدرس مدرسہ کلکتہ نے ایک رسالہ لکھا ہے۔ نام اس کا ’مؤید برہان‘ ہے۔ اس رسالہ میں دافع کیے ہیں تیرے وہ اعتراض جو تو نے دکنی پر کیے ہیں اور تحریر پر کچھ اعتراضات وارد کیے ہیں اور اہل مدرسہ اور شعرائے کلکتہ نے تقریبات اور تازیانی بڑی دھوم سے لکھی ہیں۔ بس بیانی! میں نے اتنے علم پر ایک قطعہ لکھ کر چھپوایا اور کئی ورق اس دوست کو اور دو چار جلدیں ’درفش کاویانی‘ علاوہ اوراق مذکور بھیج دیے۔ اسی زمانے میں تین چار ورق، خوب یاد ہے کہ ’درفش‘ کی جلد میں رکھ کر تم کو بھیجے ہیں۔ یا تو مجھ کو غلط یاد ہے یا تم نے ’درفش‘ کو کھول کر دیکھا نہیں۔ وہ اوراق مع ’درفش‘ زینت طاق نمایاں ہیں۔ وہ ورق اس لفافے میں مکتور بھیجتا ہوں۔ تم بھی دیکھو اور صاحب زادہ بھی دیکھے اور یہ جانے کہ فی الحال نظم فارسی میں ہے اور بس۔“

(خط بہ نام منشی حبیب اللہ خان)

”پیر و مرشد! آداب، غلط نامہ، ’قاطع برہان‘ کو بھیجے ہوئے ہیں اور آپ کی خیر و عنایت مولوی حافظ عزیزالدین کی زبانی سنے ہوئے دو دن ہوئے تھے کہ کل آپ کا نوازش نامہ پہنچا۔ ’قاطع برہان‘ کے پہنچنے سے اطلاع پائی۔ معتقدان ’برہان قاطع‘ برجھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کے آٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور ہنوز دو اعتراض مجھ تک پہنچے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ’قاطع برہان‘ غلط ہے، یعنی ترکوب خلاف قاعدہ ہے۔

کلام قطع کیا جاتا ہے۔ برہان قطع نہیں ہو سکتی ہے۔ لو صاحب !
 'برہان قاطع' صحیح اور 'قاطع برہان' غلط مگر برہان قطع کی فاعل
 ہو سکتی ہے اور قطع کا فعل آپ نہیں قبول کرتی۔ 'قاطع برہان' میں
 جو برہان کا لفظ ہے، یہ محض 'برہان قاطع' ہے۔ 'برہان قاطع' کے رد
 کو قطع کر سجدہ 'قاطع برہان' نام رکھا گیا تو کیا گناہ ہوا؟^{۹۹}
 (خط یہ نام انوار الدولہ شفیق)

ظاہر ہے کہ اس قضیے کی نوعیت علمی، ادبی اور لسانی تھی غالب
 کو ان تینوں پہلوؤں سے گہرا لگاؤ تھا، اس لگاؤ نے ان سے "نامہ" غالب،
 لکھوائی۔ ان کی یہ کتاب اگرچہ مختصر ہے لیکن اس اعتبار سے اہم ہے کہ
 اس کو پڑھ کر اس ادبی بحث کی ایک تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔
 "نامہ" غالب، جیسا کہ اس سے قبل بھی لکھا جا چکا ہے، مولوی
 رحیم بیگ کی کتاب 'سامع برہان' کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ مولوی
 رحیم بیگ کا وطن تو دلی تھا لیکن ان کے والد مرزا پیر بیگ دلی کو
 چھوڑ کر سردھندہ میں آباد ہو گئے تھے۔ مرزا رحیم بیگ کی ولادت سردھندہ
 میں ہوئی لیکن ان کی تعلیم و تربیت میرٹھ میں ہوئی۔ حکیم بو علی سے
 انہوں نے مختلف علوم حاصل کئے۔ شاعری کا شوق تھا۔ مولوی محمد بخش
 نادان کے شاگرد ہوئے۔ چلے شرر تھکے تھا، بعد میں رحیم بخش
 اختیار کیا۔ حکیم احسن اللہ خاں کی فرمائش پر انہوں نے "قصص الانبیاء"
 کو نظم کا جامہ پہنایا تھا۔ "دعوتِ حاتم" کے نام سے ایک مثنوی کہی
 لکھی تھی۔ ہندو معنی تھا، میرٹھ میں لڑکوں کو پڑھاتے تھے۔ 'سامع برہان'
 لکھ کر 'قاطع برہان' کے قضیے میں انہوں نے یہی شرکت کی۔ غالب نے
 "نامہ" غالب میں تو ان کے متعلق سب سے پہلے اختصار نہیں کیا لیکن اپنے
 ایک اور خط میں ان کے متعلق خاصے سبب الفاظ استعمال کئے ہیں۔
 میان داد خاں سیاح کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

"وہ جو ایک کتاب کا تم نے ذکر لکھا ہے، وہ ایک لڑکے پڑھانے

۱۔ غلام رسول مہر : خطوط غالب : صفحہ ۲۹۵

۲۔ ایضاً صفحہ ۳۱۴

والے ملائے مکتب کا خط ہے ۔ رحیم بیگ اس کا نام ، میرٹھ کا رہنے والا ، کئی برس سے اندھا ہو گیا ہے ۔ باوجود نا بینائی کے احمدی بھی ہے ۔ اس کی تحریر میں نے دیکھی ۔ تم کو بھی بھیجوں گا ۔ مگر ایک بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ اس میں بیشتر وہ باتیں ہیں ، جن کو ’لطائف غیبی‘ میں رد کر چکے ہو ۔ یہ ہر حال اس کے جواب کی فکر نہ کرنا“ ۔

غالب کے اس لب و لہجہ سے صاف ظاہر ہے ۔ کہ مرزا رحیم بیگ پر ان کو غصہ تھا اور وہ ان سے ناراض تھے ۔ اس عبارت کے ایک ایک لفظ سے غصہ لپکتا ہے ۔

اگرچہ غالب کے خیال کے مطابق مرزا رحیم بیگ کے اعترافات کے جواب ’لطائف غیبی‘ میں دیے جا چکے تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے ان کی ’ساطع برہان‘ کے جواب میں ’نامہ‘ غالب‘ لکھا ۔ لیکن اس میں اور ’لطائف غیبی‘ کے انداز اور لب و لہجہ میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔ ’لطائف غیبی‘ کے انداز میں سنجیدگی کم ہے بلکہ کہیں کہیں تو اس کی حدیں ہنکڑاؤں سے جا ملتے ہیں ۔ لیکن ’نامہ غالب‘ کا انداز اور لب و لہجہ شروع سے آخر تک سنجیدہ ہے اور اس میں ایک عالمانہ شان پائی جاتی ہے ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ’لطائف غیبی‘ غالب کے ایک شاگرد کے نام سے شائع ہوئی ہے ۔ اس میں انہیں غیر سنجیدہ لب و لہجہ اختیار کرنے کی پوری آزادی تھی ۔ لیکن ’نامہ غالب‘ چونکہ خود ان کے نام سے شائع ہوئی ، اس لیے ظاہر ہے کہ وہ اس میں غیر سنجیدہ لہجہ اختیار نہیں کر سکتے تھے ۔ بعض لکھنے والوں کا خیال ہے کہ ’لطائف غیبی‘ غالب نے خود لکھ کر میان داد خان سیاح کے نام سے چھپوائی تھی ۔ ہو سکتا ہے اس میں پوری طرح صداقت نہ ہو ۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انہوں نے اس میں خاصی دلچسپی لی تھی ۔ بلکہ چھپنے سے قبل اس کو بہ غور دیکھا تھا اور چھپنے کے بعد بھی اس کی تصحیح کی تھی ۔ میان داد خان سیاح کو لکھتے ہیں: ’معادیت و اقبال نشان ، سیف الحق منشی میان داد خان سیاح کو فقیر غالب کی دعا پہنچے ۔ خط میں آپ نے بت سے مطالب لکھے مگر ایسے کتابوں کے دو پارسلوں کی رسید نہیں لکھی ۔ یہ ایک پارسل جو بعد دو پارسلوں کے بھیجا گیا ہے ، اس میں وہی ’لطائف غیبی‘

ہے ، جس کو میں نے اپنے مطالعے میں رکھ کر صحیح کیا ہے ۔ اس کے بھیجنے سے یہ مدعا ہے کہ تم ان ایس رسالوں کو اس کے مطابق صحیح کر لو اور اگر چھوٹے صاحب نے رکھ لیا ہے تو ان سے مستعار لے کر اپنی سب کتابیں صحیح کر لو ، اور وہ نسخہ ان کی نذر کر دو ۔

صاحب ! میں نے اپنے صرف زر سے 'لطائف غیبی' کی جلدیں نہیں چھپوائیں ۔ مالک مطبع نے اپنی بکری کو چھاپیں ۔ بیس میں نے مول لیں ، تیس تم کو دلوا دیں ۔ بس یہاں ضیاء الدین نے لیں ۔ دس مصطفیٰ خان صاحب نے ہیں ۔ باقی کا حال مجھے معلوم نہیں ۔“

بہر حال 'لطائف غیبی' اگر غالب نے نہیں لکھی ، تو ان کے ایما پر ضرور لکھی گئی اور انہوں نے اس کی تیاروی میں خاصا حصہ لیا ۔ اس کا انداز اور لب و لہجہ مترجمہ ذیل اقتباسات سے صاف ظاہر ہے :

”اہل نظر قاطع‘ و ‘مغرق‘ کو جب باہم دیکھیں گے تو قاطع‘ کی عبارتیں موتی کی لڑیاں نظر آئیں گی۔ اور ‘مغرق‘ کی تشریں ماس کی ہڈیاں نظر آئیں گی۔ ہمارے منشی صاحب از روئے علم و فن منشی نہیں ہیں۔ از روئے پیشہ و حرمت منشی ہیں۔ جیسے منشی بھیروں فاتح اور منشی گیتداسل۔ اسے صاحب فہم و انصاف! عبارت ‘مغرق قاطع برہان‘ کو دیکھنا چاہیے۔ غلط بحث ، اطلاق مبہل ، سوہ ترکیب ، تباہی روز مرہ ، غلطی فہم۔ اس سے مجھے کچھ کام نہیں۔ بھلا حامیان مفلوج الدین کی نثر اور کسی ہوگی۔ خالصاً یہ بتاؤ کہ یہ منظرہ ہے یا بھٹکڑ۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہچچڑا تالیاں بجا بجا کر گالیاں دیتا ہے۔ یا ایک سڑی کو کسی نے چھڑ دیا ہے۔ وہ نحش بک رہا ہے۔“

ظاہراً صاحب تب مغرق نے یہ بحث بحران کے دن لکھی ہے کہ بے تکلف و بے مبالغہ سراسر ہڈیاں ہے۔ منشی جی خود نہ سمجھتے ہوں گے کہ میں کیا بک رہا ہوں۔ آیات و احادیث عبارت میں درج

۱۔ مسر : خطوط غالب : صفحہ ۴۴۹

۲۔ لطائف غیبی (علی گڑھ میگزین غالب) صفحہ ۱۲۴

کہے ہیں۔ حالانکہ ان کے اندراج کا نہ موقع نہ محل، نہ فائدہ۔
معہذا عبارت بھونڈی۔ روز مرہ فارسی نصیب اعدا۔ روابط ایسے
مفقود، جیسے گدھے کے سر سے سینک۔ ایک فقرے کا مفہوم، دوسرے
فقرے کے نفیض“۔

ظاہر ہے کہ اس انداز اور لب و لہجہ میں سنجیدگی نہیں ہے اور
اس میں وہ خاص طرز بھی مفقود ہے، جو علمی مباحث کے لیے ضروری
ہوتا ہے۔ اسی لیے ”لطائف غیبی“ اپنے علمی نکات کے باوجود مجموعی
طور پر علمی انداز سے عاری ہے۔

”نامہ“ غالب“ اس کے برخلاف ہر لحاظ سے ایک عالمانہ تصنیف ہے
اور اس میں شروع سے آخر تک ایک عالمانہ سنجیدگی کی لہر سی دوڑی
ہوئی نظر آتی ہے۔ اس میں معاندانہ انداز نہیں ہے۔ برخلاف اس کے
دوستانہ انداز میں چند نکاتوں کی وضاحت ہے۔ چنانچہ اس کا آغاز اسی طرح
ہوتا ہے :

جنست مشفق مکرسی مرزا رحیم یک صاحب نور اللہ علیہ بالاسرار و
عینہ بالانوار سطنے چند گشتہ می شود :

نہ دو منطلق پارسی و ذری
بہیں ہندی“ سادہ و سرسری

جس طرح توحید میں حق ماسوائے اللہ دستور ہے، مجھ کو تحریر میں
حلف زوائد منظور ہے۔ عزم مقابلہ نہیں، قصد مجاہدہ نہیں، سر تا سر
دوستانہ حکایت ہے۔ خانے میں ایک شکایت ہے۔ شکوۂ درد مندانہ
سیوہ ادب نہیں۔ معہذا درد دل مراد ہے۔ کوئی بات جواب طالب
نہیں۔ احسان مند ہوں آپ کا کہ آپ نے منشی سعادت علی کی طرح
آدھا نام میرا نہ لکھا۔ ان تے حسن ظن کے مطابق مجھ کو معشوق
میرے استاد کا نہ لکھا، اور اگر ایک جگہ یہ الفاظ کہ بہ قول
غالب، باکدام خرم در چوال شدہ ام، ہم کہے، یا اور چار جگہ
کلمہ“ توہین رقم کہے، میں نے اپنے لطیف طبع اور حسن عقیدت سے
چلے فقرے کا مفہوم ہوں اپنے دلشین کیا کہ حضرت نے محمد حسین

دکنی جامع برہان کے موافق میرے قول کے خرمس پلین کیا باد خرمس در جوال شدن ، عبارت ہے صحبت ہے ۔ خواہی مدافعت کے واسطے ہو خواہی محبت ہے ۔ مجھ کو اس کا قرب بہ سبیل آویزش ہے ، تم کو اس کا قرب از روئے آمیزش ہے ۔ دوسرے فقرے کے یہ معنی لہرائے بلکہ بے تکلف میرے ضمیر میں آئے کہ خرمس کو مدد دینے سے کوفت حاصل ہوئی اور وہ کوفت باعث درد دل ہوئی ۔ شدید درد میں آدمی چیختا ہے ۔ چلاتا ہے ، ہائے وائے کرتا ہے ، غل جھاتا ہے ۔ جیسا کہ سعدی 'ہوستان' کی اس حکایت میں، جس کا پہلا مصرع یہ ہے : فرماتا ہے :

شے زہت فکرت ہمی سو غم
کہ ناچار فریاد خیزد ز درد

اس عبارت میں تلخی نہیں ہے بلکہ شفقت کے ساتھ شائستگی کے انداز میں اپنی بات کہنے کی کوشش ہے ۔ یہاں غالب نے بڑے سلیقے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور بڑے منطقی انداز میں اپنے نظریات کی وضاحت کی ہے ۔

اس کے بعد غالب نے اس نقطے کو واضح کیا ہے کہ دینی معاملات اور ادبی و لسانی مسائل دونوں میں اختلاف ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیے ۔ بلکہ یہ اختلاف ہمیشہ ہوتا رہا ہے ۔ اس لیے اگر انہوں نے 'برہان قاطع' کی غلطیوں پر قلم اٹھایا تو کون سا گناہ کیا ۔ اس خیال کی وضاحت غالب نے کیسے سیدھے لیکن دل کش انداز میں کی ہے ۔ لکھتے ہیں :

”جناب مرزا صاحب ! کیا تم نہیں جانتے ؟ بے شبہ جانتے ہو گے کہ اکابر امت کو امور دینی میں کیا کیا منازعیں باہم واقع ہوئی ہیں کہ نوبت یہ تکلیف یک دگر پہنچی ہے ۔ اگر فن لغت میں ایک شخص دوسرے شخص کا معتقد نہ ہوا ۔ یہاں تک کہ اس کی تحقیق بھی کی تو اور مدعیان علم و عقل اس مسکین کے جگر تشنہ خون کیوں ہو جائیں ۔ اور جب تک اس کا نقش ہستی صفحہ دہر سے نہ مٹائیں ، آرام نہ پائیں ۔ ظلم تو یہ ہے کہ جو کچھ میں نے

’قاطع برہان‘ میں لکھا ہے نہ اس کو سمجھتے ہیں اور جو کچھ آپ لکھتے ہیں، نہ اس کے معنی سمجھتے ہیں۔ ’سوال دیگر جواب دیگر‘ پر مدار ہے۔ خارج از بحث اقوال کی تکرار ہے۔ ’برہان قاطع‘ والے کی محبت سے دل بے قرار ہے۔ فرط غیظ و غضب سے بدن رعشہ دار ہے۔ منشی سعادت علی نہ ناظم ہے، نہ نثار ہے۔ یہ موجب اس مصرع کے :

مقتضائے طبیعتی این است

ناچار تم کو معرض تحریر میں شامل چاہیے، نہ سطن پروری و جانب داری میں توکل چاہیے۔ یہ حسب اختلاف طبائع مانو یا نہ مانو مگر پہلے یہ تو جانو کہ غالب سوختہ اختر کا فرہنگ نویسوں کے باب میں عقیدہ کیا ہے۔“
اور پھر فارسی کے فرہنگ نویسوں کے بارے میں اپنے خیالات کی وضاحت اس طرح کی ہے :

”اگرچہ ’قاطع برہان‘ میں جا بجا لکھتا آیا ہوں، مگر اب ہندی کی چندی کر کے لکھتا ہوں کہ یہ عقیدہ میرا ہے کہ فرہنگ لکھنے والے جتنے گزرے ہیں، سب ہندی نژاد ہیں۔ ہاں علم صرف و نحو عربی میں بقدر تحصیل مسلم اور استاد ہیں۔ علم صرف و نحو کی کتب درس موجود ہیں، جس نے چاہا، اس نے استاد سے ان کتب کو پڑھ لیا ہے۔ فارسی کے جو فرہنگ ان حضرات نے لکھے ہیں، مطالب منفردہ کسی اصول پر منضبط کیے ہیں اور اس کا علم کسی استاد سے حاصل کیا ہے؟ آخر مقاصد صرف و نحو عربی بھی تو صرف مطالعہ کتب سے نہیں نکلتے ہیں۔ پہلے تعلیم و تعلم ہے، پھر کتب قواعد کے جا بجا حوالے ہیں۔ قواعد فارسی کا رسالہ اہل زبان میں سے کسی نے لکھا ہے اور ان ہوس بیشہ فرہنگ لکھنے والوں نے وہ رسالہ کسی فاضل عجم سے پڑھا ہے۔

شیدائے ہندی میکروی نے حاجی محمد جان قدسی علیہ الرحمۃ کے ایک شعر پر اعتراض کیا ہے۔ مرزا جلا لائے طباطبائی علیہ الرحمۃ

نے شیدا کو خط لکھا ہے ۔ سر آغاز خط کا ایک قطعہ ، جس میں 'صحرا' و 'درویا' قافیہ اور برساندہ ردیف ہے ۔ شعر اخیر کا مصرع ثانی یاد رہ گیا ہے :

یعنی یہ سہا دہو مٹوی برساندہ

خلاصہ مضمون خط یہ کہ تو صاحب زبان نہیں ہے ۔ زبان دان ہے ۔ یعنی مسئلہ اور کلمہ ایسی اہل ایران ہے ۔ حاجی ہد جان کے کلام کو سند پکڑ ۔ تجھے کس نے کہا ہے کہ اُس سے لڑ ؟ کیا تو نے سنا نہیں جو عرفی اور فیضی میں گفتگو ہوئی ہے اور وہ تین الدولہ شیخ ابوالفضل کے رو برو ہوئی ہے ۔ لغات فارسی اور ترکیب الفاظ میر کلام تھا ۔ مولانا جمال الدین عرفی رحمہ اللہ علیہ نے کہا کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اور نطق آشنا ہوا ہوں ، اپنے گھر کی بڑھی بوڑھیوں سے لغت فارسی اور ترکیبیں سنا رہا ہوں ۔ فیضی بولا کہ جو کچھ تم نے اپنے گھر کی بڑھیوں سے سیکھا ہے ، وہ ہم نے خاقانی اور انوری سے اخذ کیا ہے ۔ حضرت عرفی نے فرمایا کہ 'تقصیر معاف ، خاقانی ، انوری کا ماخذ بھی تو منطق گھر کی پیروزالوں کا ہے ۔ ہائے سبز کہاں سے لاؤں کہ یہ حال قزو بند کے صاحب کمالوں کا ہے ۔ قیاس مع الفارق کی بہار دیکھو ۔ مجتہد تقی زماں کا اعتبار دیکھو ۔ مانا کہ عرفی تحصیل علوم عربیہ میں اُن سے کم تر ہے ۔ صاحب زبان اور ایرانی ہونے میں برابر ہے ۔ کیا عرفی کیا ازری کیا خاقانی ، ایک شیرازی ، ایک خاوری ، ایک سروانی ۔ اگر مجھ سے کوئی کہے کہ غالب تیرا بھی مولد ہندوستان ہے ۔ سیری طرف سے جواب یہ ہے کہ ہند ہندی مولد اور پارسی زبان ہے :

ہر چہ از دستگاہ یارس بہ بقا بردند

تا بنالم ہم ازاں جملہ زبانم دردند

زبان دانی فارسی سیری ازلی دستگاہ اور یہ عطیہ خاص منجانب اللہ ہے ۔ فارسی زبان کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا ہے ۔ عشق کا کمال میں نے استاد سے حاصل کیا ہے ۔ ہند کے شاعروں میں اچھے اچھے خوش گو اور معنی مآب ہیں ۔ لیکن یہ کون احسن کہے گا کہ یہ لوگ دعوائے زبان دانی کے باب ہیں ؟ رہے فرہنگ لکھنے والے ، خدا ان کے بیج

ہے نکالے۔ اشعار قسما آگے دھر لیے اور اپنے قیاس کے مطابق چل دیے۔ وہ بھی نہ کوئی ہم قدم، نہ کوئی ہمراہ بلکہ سو بسو پراگندہ و تباہ۔ رہنا ہو تو راہ بتائے، استاد ہو تو شعر کے معنی سمجھائے۔ نہ آپ شیرازی نہ استاد اصفہانی، زبے رگ گردن، خیمے دعوائے زبان دانی میرا یہ قول خاص ہے نہ عام ہے۔ مجموعہ فرہنگ نگاروں کے غنقی ہونے میں کلام ہے۔ یہ کیا بات ہے کہ 'جامع برہان' کا ساغذ فرہنگ رشیدی و جہانگیری ہے۔ عبدالرشید کی کیا شبخی اور میان انجیو کی کیا پیری ہے؟ قطب شاہ و جہانگیر کے عہد میں ہونا اگر منشاء ترقی ہے، تو بے چارہ جعفر زلی بھی فرخ سیری ہے۔"

جہاں غالب نے مدلل اور منطقی انداز میں ادبی مباحث کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور اس میں عام طور پر غاصت جس صورت حال کو پیدا کرتی ہے، اس کا شکوہ کیا ہے۔ اور اس طرح اپنے زمانے کے غیر صحت مندانہ رویے پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے خیال میں 'قاطع برہان' میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کو لوگ سمجھے نہیں اور بغیر سمجھے ہوئے صرف اس وجہ سے ان پر اعتراضات کی بوجھار کرتے ہیں کہ انہیں 'برہان ناطع' کے مؤلف محمد حسین دکنی سے جذباتی لگاؤ ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے فرہنگ نگاروں کے بارے میں جو اصولی باتیں کہی ہیں، وہ بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان خیالات میں دراصل ایک شاعر اور ایک تخلیقی فنکار کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ غالب نے جہاں اپنا اور اپنی ناریسی دانی کا ذکر بھی اختصار کے ساتھ کیا ہے لیکن اس میں تعلی نام کو نہیں۔ بلکہ انہوں نے اس سلسلے میں جو کچھ کیا ہے، وہ اظہار حقیقت ہے اور اس سے ان کی باتوں میں وزن پیدا ہوتا ہے۔

غالب فرہنگ نویسوں سے بعض بنیادی اختلافات رکھتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے ان کو درخور اعتنا نہیں سمجھا ہے۔ ان کے حلق ہونے میں انہیں کلام ہے۔ کیونکہ وہ اپنے قیاس کے مطابق چلتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قیاس کو تحقیق کی بنیاد نہیں سمجھا جا سکتا۔ خاص طور پر محمد حسین

دکنی جامع 'برہان قاطع' کو مرزا رحم بیگ اور دوسرے لکھنے والوں نے جن دلائل کو پیش کر کے ایک بلند پایہ فرہنگ نویسی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اس سے انہوں نے اختلاف کیا ہے۔

اس سلسلے میں آگے چل کر غالب نے فرہنگ نویسوں کے بارے میں ایک بڑے بڑے کی بات کہی ہے۔ لکھتے ہیں :

”ایک لطیفہ لکھتا ہوں۔ اگر غفا نہ ہو جاؤ گے تو حظ اٹھاؤ گے۔

جننی فرہنگیں اور فرہنگ طراز ہیں ، یہ سب کتابیں اور سب جامع مانند ہباز ہیں تو بتو اور لباس در لباس ، وہم در وہم اور قیاس در قیاس ۔ ہباز کے جھلکے جس قدر اُتارتے جاؤ گے ، چھلکوں کا ڈھیر لگ جائے گا ، بغز نہ ہاؤ گے۔ فرہنگ لکھنے والوں کے پردے کھولتے جاؤ ، لباس ہی لباس دیکھو گے، شخص معدوم۔ فرہنگوں کی ورق گردانی

کرتے رہو ، ورق ہی ورق نظر آئیے گے ، معنی سوہوم ۔“

اس لطیفے کا مقصد در اصل اس خیال کی وضاحت ہے کہ لغت لکھنے والوں کے پاس ایک عام خیال کے مطابق ذہن اور تخیل نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا ایسی ہے تو وہ اس سے کام نہیں لیتے ، بلکہ لغت نویسی کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ اس سے کام لے ہی نہیں سکتے۔ چنانچہ آگے چل کر اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں :

”ظرافت پر مدار تحقیق نہیں ہے ۔ آپ کے خاطر نشین کرتا ہوں

جو میرے دل نشین ہے۔ فرہنگ نویسوں کا قیاس، معنی لغات میں نہ سراسر غلط ہے ۔ البتہ کمتر صحیح اور بیشتر غلط ہے ۔ خصوصاً دکنی تو عجیب جانتا ہے ، لغو ہے ، ہوج ہے ، ہاگل ہے ، دیوانہ ہے ، وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ پائے اصلی کیا ہے اور پائے زائد کیا ۔ حیران ہوں کہ اس کی جانب داری میں فائدہ کیا ہے؟ خدا جانتا ہے کہ میں یک رنگ ہوں ۔ مگر دکنی کے جالب داروں میں چو رنگ ہوں ۔ مجھے جو چاہو کہو ۔ اوروں سے تم کیوں لڑتے ہو؟“

۱۔ نامہ غالب (پہلا ایڈیشن) : صفحہ ۴۰۰ ۔ ۵

۲۔ ایضاً : صفحہ ۵

غالب نے یہاں اپنے مؤلف 'برہان قاطع' کے لیے سخت الفاظ ضرور استعمال کیے ہیں لیکن ایسا کر کے انہوں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کی لغت نویسی دوسرے لغت نویسوں کے مقابلے میں ادنیٰ درجے کی ہے اور وہ اُس کے اس انداز سے اختلاف رکھتے ہیں۔ 'نامہ غالب' میں صرف یہی ایک مقام ایسا ہے، جہاں غالب اپنے حدود سے باہر نکل گئے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہیں غصہ آ گیا ہے۔ آگے چل کر جہاں الفاظ کی بحث کی ہے اور 'برہان قاطع' کے مؤلف کی غلطیاں نکالی ہیں، وہاں بھی کچھ اسی قسم کا لب و لہجہ پیدا ہو گیا ہے لیکن۔ اس قسم کے مباحث میں اس صورت حال کا پیدا ہونا ایسا کچھ عجیب نہیں۔

'نامہ غالب' اس اعتبار سے بھی اہست رکھتی ہے کہ اس میں غالب نے اپنی انانیت کے باوجود ایک جگہ اپنے سمو کا اعتراف کیا ہے اور اُن سے جو غلطیاں ہوئی ہیں، اُن کو تسلیم کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"مجھے غالب آگندہ گوش ہے۔ کسی کی نہیں سنتا۔ اسی آپ کے مقرر کیے ہوئے قاعدے کے مطابق، یہ حلف کہتا ہوں کہ تم نے 'قاطع برہان' و 'دافع پٹھان' و 'لطائف غیبی' کو ہرگز نہیں دیکھا 'اویزہ' و 'انسوس' کے بیان میں مجھ سے وہ سمو ہوا کہ مجھے اس کا اقرار اور میرا دوست میاں داد خان شرمسار ہے، جو کچھ اس مصنف نے اس باب میں لکھا، وہ قول فیصل اور کافی ہے۔ مائیں یا نہ مائیں ناظرین کو اختیار ہے"

اور اس سے بھی بڑی بات یہ کہ ان تمام اعترافات اور کئے شکوکوں کے باوجود آخر میں دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ اور عشق و محبت، جو اُن کا مسلک ہے، اُس کی وضاحت کی ہے۔ چنانچہ اپنی اس تصنیف کو ان جملوں پر ختم کیا ہے :

"میں اب قطع کلام کرتا ہوں اور آپ کو یہ کمال تعظیم سلام کرتا ہوں۔ پیچر کی تحفہ کو مستلم رکھتے ہوئے۔ تم جانو اور سید ابراہ۔ خاقتی پر بہتان کرتے ہو۔ تم جانو اور وہ میدان معنی کا شہ سوار۔

مجھ کو جس قدر تم نے لکھا ہے یا کوئی اور لکھ دیا ہے ۔ اگرچہ وہ سب لغو اور جھوٹ ہے ، معقول اور راست نہیں ، لیکن واللہ مجھ کو عرصہٴ عشر میں اس کی باز خواست نہیں :

ز یمن عشق بہ کونین صلح کل کردیم
تو خصم باغ و زما دوستی سمائیا کن

غرض ”نامہ“ غالب، ”برہان قاطع“ اور ”قاطع برہان“ کے قضیے سے متعلق غالب کی سب سے اہم تصنیف ہے ۔ اختصار کے باوجود یہ ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے ۔ غالب نے اس میں بعض اہم ادبی و لسانی مباحث کو چھیڑا ہے اور اس طرح ان موضوعات سے متعلق اپنے بعض بنیادی خیالات و نظریات کی وضاحت کی ہے ۔ اس کا انداز اور لب و لہجہ عالمانہ منجیدگی کے ساتھ ہم آہنگ ہے ۔ لیکن اس کے باوجود غالب کی ذہانت اور ان کی شخصیت کی پہلو دار کمالیت نے اس میں جگہ جگہ وہ رنگ و آہنگ بھی پیدا کر دیا ہے ، جو ایک شہنیر جوہر دار میں ہوتا ہے ۔

غالب
کے
اہم نقاد

غالب اردو کے اہم شاعر تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے زمانے میں ان کی اہمیت کو صحیح طور پر محسوس نہیں کیا گیا۔ شاہد اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے فن کے لیے ایک نئی دنیا پیدا کرنا چاہتے تھے اور جو راسخ انہوں نے اپنے لیے بنائے تھے، ان کی لغت اس زمانے کے المراد کے لیے نا مانوس تھی اور وہ اس کے ساتھ مطابقت پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ غالب کو ان کے زمانے میں سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی اور ان کی شاعری کی تحسین کا حق ادا نہیں کیا گیا۔ ان کے زمانے کے بعض تذکرہ نگاروں نے ان کی شاعری کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے یہ اندازہ ہونا ہے کہ وہ نہ صرف ان کی پہلو دار شاعری کو سمجھنے تھے بلکہ ان کی شاعری کے اس انداز کو اہمیت دیتے تھے۔ چنانچہ نواب مصطفیٰ خاں شیخ، اعظم الدولہ سرور، مرزا قادر بخش شاہ اور آگے چل کر محمد حسین آزاد نے اپنے اپنے تذکروں میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچتی ہے کہ غالب کے فن نے اپنے ہم عصروں کے دلوں میں ایک چمک بٹائی تھی اور وہ اس کی اندازہ دانی کے لیے ذہنی طور پر تیار تھے۔ ان تذکروں کا انداز ظاہر ہے کہ روایتی ہے۔ اس لیے ان میں غالب پر بیسی جن تنقیدی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، وہ بھی اس خاص انداز میں کیا گیا ہے، جو تذکروں کے ساتھ مخصوص تھا۔ مجموعی طور پر ان تذکروں میں جو تنقیدی رائیں دی گئی ہیں، ان میں اختصار کے ساتھ اسی خیال کا اظہار کیا گیا ہے کہ غالب اپنے زمانے کے اہم شاعر تھے۔ ان کا کلام معنویت سے بھرپور تھا۔ وہ نئے نئے خیالات کو

اپنی شاعری میں پیش کرتے تھے اور ان کے پیش کرنے کا انداز بھی نیا تھا۔ ان کے ہاں تخیل کی فراوانی تھی اور وہ اس تخیل سے اپنی شاعری کو رنگین و پرکار بناتے تھے۔ فارسی شاعری کی روایت کے اثرات ان پر بڑے گہرے ہیں اور انہوں نے اس روایت سے بہت استفادہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تذکروں سے کسی تفصیل یا تجرباتی انداز کی توقع نامناسب ہے کیونکہ ہر حال یہ تذکرے ہیں؛ تنقید کی کتابیں نہیں ہیں۔ پھر بھی ان میں سے شیفہ کو غالب کا ایک اہم نفاذ کہا جا سکتا ہے کیونکہ انہوں نے اختصار کے ساتھ جو کچھ غالب کے بارے میں کہا ہے، اس میں ان کے کلام کی مزاج دانی کا صحیح شعور اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ شیفہ نے جو خیالات پیش کیے ہیں، ان کو باقاعدہ تنقید کے تحت نہیں رکھا جا سکتا۔

غالب کے متعلق باقاعدہ تنقید کا آغاز توحالی سے ہوتا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ غالب کے انتقال کے بعد، حالی نے جو مرثیہ لکھا ہے، اس میں بھی بعض اہم تنقیدی اشارے ملتے ہیں اور غالب کی شاعرانہ اور فن کارانہ شخصیت کی صحیح تصویر سامنے آتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ حالی کا یہ مرثیہ تو ان کا ایک شعری کارنامہ ہے، تنقیدی کارنامہ نہیں۔ حالی کا تنقیدی کارنامہ تو "یادگار غالب" ہے جس میں انہوں نے غالب کی زندگی اور شخصیت کی زندگی سے بھرپور اور بڑی ہی دلائل و تصویروں کے ساتھ ہی ان کی شاعری اور اثر نگاری دونوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اس جائزے میں جو تنقیدی خیالات پیش کیے گئے ہیں، ان کی بنیاد گہرے تنقیدی شعور پر استوار ہے۔

حالی نے اس تنقیدی جائزے میں غالب کے ماحول اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ان کے فن کی اندازہ دانی کی ہے۔ حالی کی تنقید کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ غالب اپنے حالات کی پیداوار تھے۔ ان پر بعض شخصیتوں نے گہرا اثر ڈالا تھا جیسا کہ ان کے جہاں ابتدائی زمانے میں فارسی کا اثر نمایاں ہوا اور مشکل پسندی ان کے کلام کی سب سے اہم خصوصیت بن گئی۔ اس سلسلے میں حالی نے ملا عبدالعبد کا ذکر کیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ غالب نے ابتدا میں فارسی کے گہرے اثرات قبول کیے ہیں اور اس سلسلے میں عبدالعبد

کی شخصیت نے غالب پر نمایاں اثر ڈالا ہے۔ بھر حالات کے زیر اثر غالب نے اپنا راستہ الگ بنانے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں بھی فارسی کا سہارا لیا۔ ان سے قبل اردو شاعری کی روایت میں سادگی کو معیار تصور کیا جاتا تھا۔ غالب اس راستے سے ہٹے اور انہوں نے سادگی کی بجائے مشکل ہندی کو اپنا معیار بنا لیا۔ حالی نے غالب کے اس انداز کو کچھ پسند نہیں کیا، بلکہ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ یہ ناموائست اور اجنبیت جو ان کے کلام میں ظاہر ہوئی، اس کو مستحسن قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن بھر اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ ”ان کے اس قسم کے اشعار کو مہمل کہو یا بے معنی لیکن اس میں شک نہیں کہ مرزا نے نہایت جانگزیلی پور جگر کاوی سے سراہام دیے ہوں گے“ اس صورت حال کے عوامل اور محرکات کا ذکر کرتے ہوئے حالی نے اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ غالب کا یہاں اور عشوان شباب کا زمانہ کچھ اس طرح گذرا کہ ان کے ہاں آزادی، جنت ہندی اور مطلق العنانی کے رجحانات پیدا ہو گئے اور اس کی جھلک ان کے فن میں بھی نمایاں ہوئی۔ حالی نے لکھا ہے :

”آغاز شباب میں جب سر پر کوئی مری نہ ہو تو دولت و آسودگی کے سوا کوئی چیز خانہ بر انداز نہیں ہو سکتی۔ مرزا کی نوجوانی کے ساتھ اس آسودگی نے وہ کام کیا، جو آگ بارود کے ساتھ کرتی ہے۔ جس آزادی اور مطلق العنانی میں مرزا کی جوانی گذری ہے، اس کی کیفیت کا خود انہیں کے الفاظ سے اندازہ ہو سکتا ہے۔“ دراصل حالی اس قسم کے بیانات سے یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ غالب کی شخصیت کا یہ رنگ ان کی زندگی اور فن دونوں میں ہمیشہ کسی نہ کسی زاویے سے اثر انداز ہوتا رہا اور اس نے وقت کے ساتھ ساتھ مختلف صورتیں اختیار کیں۔ ان میں سے ایک صورت جس میں مشکل ہندی، آزاد روی اور مطلق العنانی بھی تھی، جس کے زیر اثر انہوں نے ایک نیا راستہ بنانے کی کوشش کی اور اپنے فن کو اس پر کاسزن کرنے کی ارادہ کیا۔

حالی نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ غالب کا یہ انداز اپنے زمانے میں اس وجہ سے مقبول نہ ہو سکا کہ اس وقت میر، سودا، درد، جبرائیل اور مصطفیٰ وغیرہ کے شعری انداز کو عام طور پر پسند کیا جاتا تھا اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں سادگی اور سلاست تھی اور اس

”جب میر و سودا اور ان کے متبعین کے کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اُکنا جاتا ہے اور اس کے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں ہمیں ایک دوسرا آدمی دکھائی دیتا ہے اور جیسی طرح کہ ایک خشتی کے سیاح سمندر میں یا ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جا کر ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت مشاہدہ کرتا ہے ، اسی طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی ماں نظر آتا ہے ۔“ اس کیفیت کو حالی نے کلام غالب کے مختلف مضامین اور ان کے بطن کرنے کے انداز میں دیکھا ہے اور مثالیں دے کر ان کی وضاحت کی ہے ۔ غالب نے اخلاق معاملات ، انسانی فطرت ، انسان کی بڑائی ، عشق و عاشقی اور تصوف وغیرہ پر جو اشعار کہے ہیں ، ان کو سامنے رکھ کر حالی اپنے اس تنقیدی خیال کو صحیح ثابت کرتے ہیں ۔

حالی کے خیال میں غالب کے کلام کی دوسری اہم خصوصیت وہ ہے جس کو ہم آج کی تنقیدی اصطلاح میں رمزیت ، ایمائیت یا لطیف لہام کہتے ہیں اور جس کو موجودہ دور میں بڑی اہمیت دی جاتی ہے ۔ حالی کے تنقیدی شعور نے غالب کی شاعری کے اس پہلو کو اس طرح واضح کیا ہے کہ ان کی شاعری کے انداز کی صحیح کیفیت آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے ۔ اس سلسلے میں حالی لکھتے ہیں : ”مرزا نے استعارہ و کنایہ اور تلمیح و تشبیہ کی طرف بہت کم توجہ کی ہے ۔ رشتے میں بھی نسبتاً اپنے فارسی کلام سے کم استعمال نہیں کیا اور شعراء نے استعارے کو صرف محاورات اردو میں بلا شبہ استعمال کیا ہے ، لیکن استعارے کی قصد سے نہیں بلکہ محاورہ بندی کے شوق میں استعارے بلا قصد ان کے قلم سے ٹپک پڑے ۔“ اور پھر حالی نے اپنے اس تنقیدی خیال کو بہت سی مثالوں سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ۔

غالب کے کلام کی تیسری خصوصیت حالی کی نظر میں شوخی اور طرائف ہے ۔ یہ شوخی اور طرائف واقعی غالب کی غزل کی بہت نمایاں خصوصیت ہے ۔ اس کی وجہ سے ان کے کلام میں چاندنی کی مسکراہٹ کا سا ساں نظر آتا ہے اور شگفتگی اور شادابی کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی دکھائی دیتی ہے ۔ اگرچہ یہ صورت حال تغزل کی صحیح کیفیت کے منافی ہے ، کیوں کہ عام طور پر اردو غزل کی روایت میں العبد اور حزیلہ العاذل کو

تغزل کے لیے ضروری قرار دیا جاتا ہے ، لیکن غالب نے اس روایت سے انحراف کیا اور اپنی شوخی اور ظرافت سے اس میں نئی زندگی پیدا کی ۔ حالی لکھتے ہیں ”کیا نظم میں اور کیا نثر میں باوجود سنجیدگی و متانت کے شوخی و ظرافت ہے جس سے غالب کا کلام پہچانا جاتا ہے ۔“ حالی نے اس پر تفصیلی بحث نہیں کی ۔ صرف اس کی طرف اشارہ کیا ہے ۔

حالی نے غالب کے کلام کی چوتھی خصوصیت کے تحت اس بات کو واضح کیا ہے کہ غالب کے کلام میں تہہ در تہہ معنویت موجود ہے اور وہ اشاروں اور کنایوں میں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بڑی ہی بلیغ باتیں کرتے ہیں ۔ بلکہ اس میں ایک معنویت نظر آتی ہے ، لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو اس کی تہہ میں معنویت کا دوسرا پہلو بھی نظر آتا ہے ۔ حالی نے اس کو ماہر الامتیاز کہا ہے اور لکھا ہے کہ ”ان کے اکثر اشعار کا بیان پہلو دار ہے اور بادی النظر میں اس سے کچھ اور معنی واضح ہوتے ہیں لیکن غور کرنے کے بعد اس میں ایک دوسرے معنی انتہائی لطیف پیدا ہوتے ہیں، جن سے وہ لوگ جو ظاہری معنوں پر کفایت کر لیتے ہیں ، لطف نہیں اٹھاتے“ حالی کا یہ تنقیدی خیال اپنی جگہ بالکل درست ہے اور انہوں نے غالب کے کلام سے جو مثالیں اس خیال کو واضح کرنے کے لیے پیش کی ہیں، وہ ان کے تنقیدی خیال کو پوری طرح واضح کر دیتی ہیں۔ پھر حالی نے فارسی شاعری کی روایت کو سامنے رکھ کر غالب کی شاعری کے اسے پہاؤں کا پوری طرح تجزیہ کیا ہے ۔ اس تجزیے سے کلام غالب کے بہت سے نئے پہلو آنکھوں کے سامنے آتے ہیں ۔

اس میں شبہ نہیں کہ حالی کی تنقید غالب کا انداز بڑی حد تک تشریحی ہے اور انہوں نے مختلف تنقیدی خیالات کے تحت غالب کے اشعار کا مطلب اس طرح لکھا ہے کہ اس میں کلام غالب کی تشریح کا ما انداز پیدا ہو جاتا ہے ۔ لیکن حالی ایسا کرنے کے لیے مجبور تھے ۔ کیوں کہ تنقید لکھتے وقت ان کے پیش نظر یہ خیال تھا کہ غالب کے اس کلام کو جو رمز و ایما کا حامل ، پہلو دار اور کسی حد تک مبہم ہے، اس کی توضیح و تشریح کی جائے تاکہ اس کے شعری محاسن پوری طرح واضح ہو سکیں ۔ حالی اس میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں اور انہوں نے اس تشریح و توضیح

کے پردے میں غالب کے متعلق جو تنقیدی باتیں کہی ہیں ، وہ اپنے اندر گہرائی رکھتی ہیں ۔

حالی کی انداز اور تنقید ، اس اعتبار سے نئی ہے کہ اس میں کلام غالب کے بعض ایسے پہلوؤں کا سراغ لگایا گیا ہے ، جو ان کے فن میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں ۔ حالی نے شخصی اور اجتماعی حالات کو عوامل و محرکات قرار دے کر، غالب کی شاعری کے ان پہلوؤں کی وضاحت کی ہے ۔ اس لیے ان کے اس انداز تنقید میں گہرائی کا احساس ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ غالب کے کلام پر ان کی تنقید آج بھی اہمیت رکھتی ہے ۔

حالی کے بعد اردو تنقید میں ایک رومانی رجحان کی ابتدا ہوتی ہے ۔ دراصل یہ رومانی رجحان سرسید کی اس ادبی تحریک کا رد عمل تھا، جس میں افادیت کو خاص طور پر اہمیت دی گئی تھی ۔ حالی اس افادی رجحان کی ترجمانی کرتے ہیں ۔ اسی لیے جو تنقید انہوں نے غالب کے کلام پر کی ہے ، اس میں بھی جگہ جگہ اس افادی رجحان کی جھلکیاں نظر آتی ہیں ۔ لیکن ان کے بعد غالب کی تنقید میں بعض ایسے لوگ بھی سامنے آتے ہیں ، جو اس رومانی رجحان کے تحت غالب کا تنقیدی مطالعہ کرتے ہیں ، جو اس افادی رجحان کے رد عمل کے طور پر پیدا ہوا تھا ۔

ڈاکٹر عبدالرحمن بنوری اس رجحان کے سب سے بڑے علم بردار ہیں اور ان کی کتاب ”محاسن کلام غالب“ ان کے اس تنقیدی نقطہ نظر کی صحیح طور پر عکاسی کرتی ہے ۔ بنوری نے اپنے اس تنقیدی مطالعے کا آغاز ہی اس طرح کیا ہے :

”ہندوستان کی انسانی کتابیں دو ہیں ، مقدس وید اور دیوان غالب ۔ لوح سے نکت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے ، جو یہاں حاضر نہیں ۔ کون سا نغمہ ہے ، جو اس زندگی کے تاروں میں بردار یا پوشیدہ نہیں ہے ؟“ ان چند جملوں سے ان کی اس کتاب کا مجموعی انداز پوری طرح نمایاں ہو جاتا ہے ۔ آگے چل کر انہوں نے اس کتاب میں اس خیال کی تفسیر پیش کی ہے اور مختلف زاویوں سے کلام غالب کی اہمیت کا اندازہ لگایا ہے ۔ ایک جگہ لکھتے ہیں : ”غالب نے بزم ہستی میں جو قانون خیال روشن کیا ہے ، کون سا پیکر تصویر ہے ، جو اس کاغذی پیرہن پر منازل زیست قطع کرتا ہوا نظر

نہیں آتا؟“ بنوری در حقیقت اس کتاب میں یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ غالب کا کلام انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے اور اس کی بے شمار چھپی ہوئی حقیقتوں کی نقاب کشائی اس کا خاص میدان ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے غالب کا مقابلہ اٹانوی شاعر گوئیے سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ ”دنیا میں اگر کسی شاعر سے غالب کا مقابلہ ہو سکتا ہے، تو وہ شعراء المانیہ کا سر تاج گوئیے ہے۔ غالب اور گوئیے دونوں کی حیثیت انسانی تصور کی آخری حدود کا پتہ دیتی ہے۔ شاعری کا دونوں پر خاتمہ ہو گیا ہے۔ عینی اور جدید خیالات، حقیقت اور عجاز، قدرت اور حیات کی کثرت، ان کے دماغوں میں وحلت میں منتقل ہو کر وجود پاتی ہے۔ دونوں اقلیم سخن کے شہنشاہ ہیں۔ تہذیب، تمدن، تعلیم و تربیت، فطرت کوئی زندگی کا ایسا پہلو نہیں، جس پر دونوں کا اثر نہیں پڑا ہو۔“ بنوری نے ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر غالب کی شخصیت اور شاعری کا پتہ اچھا جائزہ لیا ہے۔ اس جائزے میں زیادہ زور اس بات پر ہے کہ غالب زندگی کے شاعر ہیں اور انہوں نے اس کے مختلف پہلوؤں پر بڑی ہی فکری گہرائی اور جالیائی نزاکت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ بنوری کا مزاج خود بھی فلسفیانہ تھا اس لیے غالب کی شاعری کے فلسفیانہ پہلوؤں پر ان کی نظر بہت گہری پڑی۔ اور ان کا یہ تنقیدی جائزہ در حقیقت کلام غالب کی ایک فلسفیانہ تحلیل ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے گوئیے کے علاوہ بعض دوسرے مغربی شاعروں اور مفکروں سے ان کا مقابلہ اور موازنہ کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ: ”غالب کا فلسفہ ہینوزا، ہیگل، برکلی اور نٹشے سے ملتا ہے۔“ ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ: ”سرزا غالب کا فلسفہ حیات ابن رشد سے مساوی ہے۔ اندلسی فلسفی نے بیان کیا ہے کہ مادہ ہمیشہ ہیولا کا محتاج ہے۔ بے صورت مادے کا تصور ناممکن ہے۔“ غالب کے ہاں بھی انہوں نے جی صورت دیکھی ہے۔ اس کے علاوہ ڈارون، برگسٹن، ہیگل، کانت اور بعض دوسرے مغربی فلسفیوں سے بھی انہوں نے غالب کے فلسفے کا مقابلہ کیا ہے۔ ان کے تنقیدی مطالعے کا یہ حصہ، جس میں ان فلسفیوں سے غالب کا مقابلہ کیا گیا ہے، بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ ان میں وہ معلومات کا خزانہ ہی فراہم نہیں کرتے، اس معلومات کو غالب کے فکر و فلسفہ کے ساتھ اس طرح ملاتے ہیں کہ اس کے صحیح حد و خال آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ جی بنوری کا سب سے بڑا تنقیدی کارنامہ ہے۔

پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ انہوں نے غالب کی شاعری کے انسانی اور تہذیبی پہلوؤں پر خاص طور پر توجہ کی ہے اور ایسی قدروں کو ان کی شاعری میں تلاش کیا ہے، جو برد و معاشرہ دونوں کے لیے خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتی ہیں۔ ان پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے غالب کے تصوف کو خاص طور پر اپنے پیش نظر رکھا ہے، اس کا بڑا ہی عالمانہ تجزیہ کیا ہے اور یہ نتائج نکالے ہیں کہ غالب کے تصوف سے دلچسپی در حقیقت انسانی زندگی کو سمجھنے اور اس کو برتنے اور بسر کرنے کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ چنانچہ بیجنوری نے غالب کو ایک فلسفی ثابت کیا ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ غالب ایک صوفی صافی سے کہیں زیادہ نصوف کے فلسفی ہیں۔ بیجنوری لکھتے ہیں: ”خالق غالب کے دل کا ایک آلہ ہے، جس میں مظہر الہی اور مناظر قدرت کا جلوہ موجود ہے۔ اس کی زبان ترجمان حقیقت ہے۔ اس کے ہرکار تخیل کا دائرہ امکان سے ہم کنار ہے۔ عالم کون و فساد میں ایک ذرے کی جنبش بھی، اس کے حلقہٴ غور سے باہر ہے۔ غالب فلسفی ہیں، جو شاعری کا جامہ زیب تن کیے ہوئے ہیں۔“ بیجنوری نے اس سلسلے میں وحدت الوجود کے تصور پر بڑی دلچسپ بحث کی ہے۔

غالب کی انسان دوستی پر بھی بیجنوری نے ایک نئے زاویے سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ”سرزا غالب کی عبادت گاہ عرش و کرسی کے سامنے میں ہے۔ وہ تسبیح جس پر وہ اساتذہ الثناء کا وظیفہ پڑھتے ہیں، صد ہزار دانہ ہے اور وہ دانے اجرام فلکی اور اجسام سماوی ہیں۔ کعبہ اور تیغ کلیسا اور کیش اس رفیع بارگاہ سے ہکساں نظر آتی ہیں۔ جہاں عوام و خواص کا مقبب منہی ہو جاتا ہے، سرزا کے مذہب کا آغاز ہوتا ہے۔“ اس کا مطلب یہی ہے کہ بیجنوری نے غالب کے ہاں انسانیت کی آواز سنی ہے اور مختلف عقائد نے انسانوں کے ذہنوں میں جو گہروں سے بنا رکھے ہیں اور جن کی آواز سے اختلافات کا بیج بویا گیا ہے، اس کو صحیح طور پر محسوس کیا ہے اور اس کی روشنی میں غالب کے کلام کی تنقید کی ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، بیجنوری کا مزاج رومانیت پسندی کی طرف مائل ہے۔ اس رومانیت پسندی نے غالب کی شاعری اور شخصیت کے بعض نئے گوشے ان کی آنکھوں کے سامنے بے نقاب کیے ہیں۔ کیونکہ غالب خود

ایک رومانی مزاج شاعر ہیں اور ان کو سمجھنے کے لیے ایک رومانی مزاج نقاد کی ضرورت ہے۔ بجنوری کا تخیل کلام غالب کے بعض بالکل نئے پہلوؤں تک پہنچا ہے اور اس نے بعض ایسے نکتوں تک رسائی حاصل کی ہے جن تک کسی اور کا پہنچنا مشکل ہے۔ مثلاً ایک ہتے کی بات بجنوری نے غالب کے بارے میں یہ کہی ہے کہ غالب کو مناظر فطرت سے کہیں زیادہ شہروں کے ہر شور کیفیت اور اس کی رنگا رنگی سے دلچسپی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ”غالب کے مشاہدات کنار دریا، دامن کوہ، لب جو سے بہت کم متعلق ہیں۔ مرزا کا جی لب دریا، خاموش مرغزاروں سے زیادہ شہروں کے ہر شور کوچوں میں لگتا ہے۔ جہاں زندگی شعاع منتشر کی طرح ہفت رنگہ جلوہ دکھاتی ہے۔“ یہ ایک اہم تنقیدی نکتہ ہے کیونکہ غالب کی ساری شاعری تہذیب و تمدن کی ان رنگینیوں اور تابانیوں کی ترجمانی کرتی ہے، جس کو وہ عزیز رکھتے ہیں۔ ان کی دنیا بڑی حد تک ایک تہذیبی روایت تک محدود معلوم ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس دائرے سے باہر نکل کر زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر نظر نہیں ڈالتے، ایسا نہیں ہے۔ اس کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو اسی زاویے سے دیکھتے ہیں اور یہی ان کا معیار ہے۔ دراصل بجنوری یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ ایک تہذیبی روایت کی پیداوار تھے اور یہ تہذیبی روایت شہر کے ایوانوں اور شہستانوں ہی میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ غالب نے اس کی صحیح مصوری کی ہے۔ بجنوری کا تنقیدی نقطہ نظر غالب کی شاعری کے جہالباقی پہلوؤں کی طرف بھی جاتی ہے اور وہ اس کی تصویرکاری، کلام کی پہلو دار کیفیت، الفاظ کی حسین تراش اور رمز و ایما کی خصوصیت کا بھی تنقیدی جائزہ لیتے ہیں۔ بجنوری نے اس سلسلے میں غالب کے تخیل کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور ان تمام پہلوؤں کو اس تخیل کے تابع بنایا ہے۔

ظاہر ہے کہ بجنوری کی تنقیدی نظر کلام غالب کے تمام پہلوؤں پر پڑی ہے اور وہ اس کا صحیح جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی تنقید میں ایک عالمانہ انداز ہے لیکن اس عالمانہ انداز کے ساتھ ایک ناثراتی رنگ و آہنگ بھی اس میں نمایاں نظر آتا ہے۔ ان سے کسی مربوط قسم کے تجزیے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس وجہ سے کہ وہ طبیعت کے اعتبار

یہ ایک روسائی مزاج نقاد ہیں۔ لیکن خیال کے توسط سے حقائق تک رسائی ان کا اہم تنقیدی کارنامہ ہے۔ اور اس اعتبار سے ان کا تنقیدی جائزہ ناثراتی اور روسائی ہونے کے باوجود اپنے اندر گہرائی رکھتا ہے۔

حالی اور بجنوری نے غالب کے تنقیدی مطالعے کا ایک ماحول پیدا کر دیا، جس کے نتیجے میں غالب کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہاؤں کو سمجھنے کی ایک فضا پیدا ہوئی۔ حالی اور بجنوری نے غالب کی تنقیدی تحسین اور تعارف کے پہلو کو خاص طور پر اپنے پیش نظر رکھا تھا اور غالباً یہ اس صورت حال کا قطری ردعمل تھا جو غالب کو اپنے زمانے میں پیش آتی تھی۔ یعنی غالب کے تنقیدی مطالعے کی طرف جیسی توجہ ہوئی جاچکے تھی، وہ ان کے زمانے میں نہیں کی گئی تھی۔ اس خلاف کو حالی اور بجنوری نے بر کیا۔ اور ان کی پلودار شخصیت اور وسیع اور ہمہ گیر شاعری کا جائزہ لیا۔ اس مقصد سے کہ ان کی پلودار شخصیت اور شاعری کی اہمیت کا اندازہ ہو۔

لیکن حالی اور بجنوری نے جس انداز میں غالب کی شخصیت اور شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا، اس کا ردعمل بھی ہوا اور بعض مغربی نعلم یافتہ ایسے بھی سامنے آئے جنہوں نے مغربی اصول تنقید کی روشنی میں ان کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس ردعمل میں مغرب کی بڑائی اور برتری کا وہ احساس یقیناً موجود تھا، جو ایک زمانے میں ہمارے زندگی میں داخل ہو گیا تھا۔ خود حالی اور خاص طور پر بجنوری کے ہاں اس کے اثرات ملتے ہیں۔ لیکن بجنوری نے مغرب کو سامنے رکھ کر غالب کی عظمت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کے بعد ڈاکٹر عبداللطیف نے غالب کا جو مطالعہ پیش کیا ہے، اس میں سختی سے مغربی تنقید کے اصولوں کو سامنے رکھ کر غالب کی شخصیت اور شاعری کا جائزہ لیا ہے اور تعریف و تحسین کی بجائے ان کی شخصیت اور شاعری کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی تنقید میں کبھی کبھیں تھوڑی سی اتہا پسندی بھی پیدا ہو جاتی ہے اور غالب کا تنقیدی جائزہ پوری طرح مکمل نہیں ہو پاتا۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ڈاکٹر عبداللطیف نے جو مختصر سی کتاب غالب کے بارے میں لکھی ہے، وہ ان کی دقت نظر پر دلالت

کرتی ہے اور اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شعر و شاعری کو سمجھنے کا گہرا شعور رکھتی ہیں اور اس کے بنیادی اصولوں کو سامنے رکھ کر اپنے شاعروں کا جائزہ لینے کی صلاحیت ان کے اندر بدرجہ اتم موجود ہے ۔

ڈاکٹر لطیف نے اپنی کتاب ”غالب“ میں حالی اور پشوری کی تنقید کا ذکر کر کے ، غالب کے مطالعے کی طرف توجہ کی اور کلام غالب اور اس کے تاریخی پس منظر ، غالب کے مطالعے کے بنیادی مسائل ، غالب کا نظریہٴ حیات ، غالب کی شاعرانہ عظمت اور غالب کی شاعری کے ایسے اہم موضوعات پر بحث اچھی بحث کی ہے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ کہیں کہیں ان کا لہجہ سخت ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں غالب کی بعض خوبیوں پوری طرح واضح نہیں ہوتیں ۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اس لہجے کی وجہ سے غالب کی شاعری کے وہ پہلو جو درحقیقت ان کو اہم بناتے ہیں ، وہ پس منظر میں جا بڑے ہیں ۔ مثلاً ڈاکٹر لطیف کا بنیادی خیال یہ ہے کہ غالب کی شاعری میں احساس اور جذبے سے زیادہ ذہن اور شعور ملتا ہے ۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے لیکن جس طرح انہوں نے اس موضوع پر بحث کی ہے ، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذہن و شعور شاید شاعری کے لیے ضروری نہیں ۔ غالب ان کے نزدیک اسی وجہ سے اہم شاعری نہیں ہیں کہ انہوں نے غیر ضروری چیزوں کو اپنی شاعری کی بنیاد بنایا ۔ لیکن ڈاکٹر لطیف اس حقیقت کو قراؤش کر دیتے ہیں کہ شاعری ذہن و شعور ہی سے عظیم بنتی ہے ۔ غالب کا کمال یہی ہے کہ انہوں نے اس ذہن و شعور کو اپنے ان گہرائی کے سانچے میں ڈھالا ہے ، جو صحیح شاعری کے لیے ضروری ہوتے ہیں ۔ غالب کے ہاں فکری پہلو نمایاں ہے اور وہ انسان زندگی کے بنیادی معاملات و مسائل کو فکری زاویہٴ نظر سے اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں ۔ انسان ، اس کے مختلف جذبات ، حیات و کائنات اور اس کا پورا نظام ان کی شاعری کے خاص موضوعات ہیں ۔ ان سب کو پیش کرنے میں ان کے ہاں فکری اور فلسفیانہ پہلو یقیناً غالب ہیں لیکن یہ تمام موضوعات غالب کے ہاں ان کے شاعرانہ تجربے کا جزو معلوم ہوتے ہیں ، اور اسی میں ان کی بڑائی ہے ۔

ڈاکٹر لطیف نے غالب کی یہی زندگی ، ان کے معاشرتی اور تہذیبی

ماحول ، اس زمانے کے مختلف واقعات و حادثات کو خاص طور پر اپنے پیش نظر رکھا ہے ۔ اس طرح ان کا یہ تنقیدی جائزہ سماجی اور عمرانی حیثیت اختیار کر لیتا ہے ۔ لیکن ان کی طبیعت کی انتہا پسندی ، ان کے اس جائزے کو پوری طرح سماجی اور عمرانی تنقید کا اچھا نمونہ نہیں بناتی ۔

کلام غالب کو ڈاکٹر لطیف نے تین حصوں میں تقسیم کر کے دیکھا ہے ۔ ایک تو ان کے کلام کا وہ حصہ ہے ، جو ان کے خیال میں ذہنی مشق کا نتیجہ ہے اور جس میں وہی بلند پروازیاں ہیں جو غزل گو شاعروں کے ہاں عام طور پر پائی جاتی ہیں ۔ دوسرا وہ حصہ ہے ، جن میں بیشتر اشعار غالب کے احساسات کے ترجمان ہیں ، لیکن جو ڈاکٹر عبداللطیف کے خیال میں شاعر کے ذہن کے لیے نیم محسوس تھے۔ ان اشعار میں غالب کا مخصوص نظریہٴ حیات نظر آتا ہے ۔ لیکن یہاں بھی ڈاکٹر لطیف نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ وہ روایتی الفاظ اور ترکیبوں کے پردے میں اپنے خیالات و نظریات کی وضاحت کرتے ہیں ۔ تیسرے حصے میں ایسے اشعار ہیں ، جن میں شاعر کے تجربے مکمل ہیں اور وہ پوری طرح محسوس کر کے بعض موضوعات کو پیش کرتے ہیں ۔ اس تیسرے حصے میں صنعت گری نہیں ہے اور اس میں گہرے شخصی اثرات کا رنگ و آہنگ نظر آتا ہے ۔

ڈاکٹر لطیف نے غالب کے کلام کے ان تینوں چلوؤں کو تنقیدی عمل کے سلسلے میں اپنے پیش نظر رکھا ہے ۔ اس کے بعد ڈاکٹر لطیف نے غالب کی شاعری کے فلسفیانہ چلو پر بحث کی ہے اور بعض الفاظ کو نقل کر کے ایک ایسے لہجے میں تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے کہ اس سے خود ان کے بنیادی خیال کی نفی ہو جاتی ہے۔ اور وہ بنیادی خیال یہ ہے کہ غالب کی شاعری میں ذہن و شعور ساٹا ہے اور فلسفیانہ رنگ و آہنگ ان کے ہاں بہت نمایاں ہے ۔ مثلاً ان کا یہ لہجہ ”ذیل کے اشعار بہت سے معصوم دماغوں میں ہیجان پیدا کرتے ہیں ۔ پھر ایک شور اٹھے گا کہ جہاں نہ صرف فلسفہ بلکہ ایک عظیم فلسفہ موجود ہے ، جو فلسفے کی تاریخ میں اب تک کسی پر روشن نہیں ہوا تھا ۔ لیکن کیا واقعی ان اشعار میں فلسفہ یا کوئی نئی چیز ہے یا پھر ان کا یہ فکر بتلاؤں اس شعر میں کوئی سا فلسفہ ہے“ یا پھر یہ انداز کہ ”کیا اس میں کوئی نئی بات پائی جاتی ہے؟“ حالانکہ جن اشعار کو سامنے

رکھ کر انہوں نے اس قسم کے قمرے لکھے ہیں ان میں گہرے فلسفیانہ نکتے موجود ہیں مثلاً یہ اشعار :

ہے برے سرحد ادراک سے اپنا سجود
قبلاہ کو اہل نظر قبلاہ تا کہنے ہیں

منظر ایک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکان اپنا

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستی "اشیا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگ سلیمان مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

ڈاکٹر لطیف کا خیال یہ ہے کہ غالب کو وہ ہم آہنگی کبھی حاصل نہیں ہوئی ، جو شاعرانہ تجربے کی بنیاد ہے اور جو عظیم شاعر کے لیے ضروری ہے ۔ انہوں نے بعض مثالوں کو سامنے رکھ کر اس پر بحث کی ہے ۔ لیکن ان کے ان خیالات سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا ۔ کیونکہ ان کے اندر تضاد ہے ۔ ایک طرف تو وہ غالب کو ذہن و شعور کا شاعر کہتے ہیں اور یہ لکھتے ہیں کہ غالب نے عظمت کبھی حاصل نہیں کی ۔ اس کے لیے خود غالب ہی مورد الزام ہے ۔ عظمت اس میں موجود تھی لیکن اس نے اپنی خود سری اور زندگی کے تنگ زاویہ ' نظر سے اس عظمت کو کچھ ڈالا ۔ اس کی بے اطمینانی خود اس بات کی مظہر ہے کہ وہ دنیا کو سمجھنے ، زندگی کو برتنے اور کائنات کی محدود چیزوں کو تازے کی قابلیت میں رکھتا تھا " ۔ ان خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور غالب کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ایسی باتیں کہیں جاسکتی ہیں ، جن سے غالب کی عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور جن سے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ وہ زندگی کو سمجھنے اور کائنات کو دیکھنے کا گہرا شعور رکھتے تھے ۔ اور یہ کہ انہوں نے اپنے آپ کو صرف اپنی ذات تک محدود نہیں کیا تھا بلکہ اپنے آپ سے باہر نکل کر زندگی اور کائنات کے عظیم مظاہر کو دیکھنے کی کوشش بھی کی تھی ۔ ڈاکٹر لطیف

نے یہ نتیجہ نکالا بھی ہے کہ غالب نے ایک منتشر زاویے کے سائے میں منتشر زندگی بسر کی اور ہمارے لیے ایسی شاعری چھوڑی ، جو خود ہم آپنکی سے معرّاً ہے جس کا شمار مشاہیر عالم میں نہیں ہو سکتا ۔ اس خیال کو خود وقت نے غلط ثابت کر دیا ہے ۔ غالب کا شمار اس وقت ، ایک شاعر کی حیثیت سے ، مشاہیر عالم میں ہوتا ہے اور ہر زاویہ خیال رکھنے والا نقاد اس بات پر متفق ہے کہ ان کی شاعری ہم آپنکی سے معرّاً نہیں ہے ۔ اس میں گہرا احساس اور جذبہ پایا جاتا ہے اور ذہن و فکر کی بھی بہت اچھی مثالیں ملتی ہیں ۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی شاعری فی اعتبار سے ایک نہایت ہی حسین نگار خانہ ہے اور ان کا فن ان کے موضوع کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے ۔

حالی ، جسنوری اور لطیف کی تنقیدوں سے غالب کے تنقیدی مطالعے کا ایک ماحول پیدا ہوا اور کئی اہم نقاد اردو تنقید میں ایسے سامنے آئے جنہوں نے غالب کی شاعری اور ان کے فن کے اہم پہلوؤں کو نئے زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی ۔ اس سلسلے میں شیخ ہد اکرام خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں ۔ ان کی کتاب 'غالب نامہ' جو بعد میں 'آثار غالب' ، 'ارمغان غالب' اور 'حکیم فرزانہ' کے نام سے بھی شائع ہوئی اگرچہ پوری طرح تنقیدی کتاب نہیں ہے لیکن اس میں جگہ جگہ تنقید کے بعض اچھے نمونے نظر آتے ہیں ۔ اکرام صاحب کا رجحان اس کتاب میں تحقیق کی طرف بھی معلوم ہوتا ہے ، اور انہوں نے تحقیق اور تنقید دونوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی کوشش کی ہے ۔ ان کے اس انداز تنقید سے غالب کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور ان کے تنقیدی مطالعے کے لیے نئے امکانات سامنے آتے ہیں ۔

اکرام صاحب نے غالب کی شاعری کا جائزہ لیا ہے اور اس سلسلے میں ان کے لغزل اور عشقیہ کیفیت پر اچھی بحث کی ہے ۔ وہ غالب کو نفسیات محبت کا شاعر قرار دیتے ہیں اور اس نفسیات محبت کی نرجاتی میں جو مختلف مقامات آتے ہیں ، ان کو سامنے رکھ کر غالب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ اس سلسلے میں انہوں نے غالب کی بھی زندگی اور ذاتی معاملات کا بھی جگہ جگہ ذکر کیا ہے ۔ اس سے ان کے بنیادی نقطہ نظر اور انداز تنقید دونوں کی وضاحت ہوتی ہے ۔ دراصل وہ

اسی اس منظر میں غالب کی شاعری اور اس کے بنیادی غد و خال کو دیکھتے ہیں۔ اسی لیے ان کے سامنے بعض ایسی تصویریں آتی ہیں، جو غالب کے دوسرے نقادوں کے سامنے نہیں آئیں۔ مثلاً غالب کی محبت اور غالب کی عشقہ شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں: ”غالب کی جوانی جس طرح حسن برسنی میں بسر ہوئی ہے، اس کا اندازہ کئی شہادتوں سے ہو سکتا ہے“ اور پھر مثالیں دے کر اس واقعے کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ”صحت مند محبت نہ وفور جذبات ہے نہ فقط دل لگی بلکہ اس میں دونوں چیزیں ہوتی ہیں۔ غالب کی سلیم خیالی کی داد دینی چاہیے کہ ان کی محبت میں دونوں اجزاء موجود ہیں۔“ روایتی طرز کی رومانوی شاعری بھی ہے اور محبت کو ایک سمجھنے کے حق میں جو موثر اظہار خیال انہوں نے حاتم علی سہر کے خط میں کیا ہے، اس کی مثال بھی اردو ادب میں نہیں ملتی لیکن بہارا خیال ہے کہ ان کا بنیادی نقطہ نظر رومانوی تھا اور دل لگی کے مضامین ان کے کلام میں اسی لیے آتے ہیں کہ ان کے متوازن تحت الشعور کو یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ وفور جذبات سے حسن تناسب جانا رہے۔“ اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اکرام صاحب نے غالب کی شاعری کو نفسیاتی اس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں: ”غالب کی سلیم خیالی قابل داد ہے لیکن معاشرے کے جو آئین تھے، ان کے تحت ایک ذکی الحس شاعر کے لیے صبر و قرار حاصل کرنا آسان نہیں تھا۔ بدقسمتی سے اپنے گھر میں انہیں وہ دل بستگی میسر نہیں تھی، جو ایک سے وابستہ کر کے دوسری تمام الجھنوں سے نجات دے دیتی۔ انہوں نے جو گہری محبت کی، اس کا سلسلہ موت نے منقطع کر دیا۔ اب معاشرہ جو کچھ انہیں پیش کرتا تھا، وہ یا تو روایتی شاعرانہ مشرق رومانیت تھی یا محض دل لگی۔ غالب کی زندگی میں یہ دونوں چیزیں موجود تھیں اور دونوں میں ذہنی کشمکش کا سامنا تھا۔ اب ان کی محبت ایک طوفان تھی۔ جس سے وہ پہلی فرصت میں گلوخلاصی کرانا چاہتے تھے۔ یہ کشمکش تھی جس کی وجہ سے انہیں نوازش خانہ کی صورت میں بھی بے قراری رہنی تھی۔“ اس بیان سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اکرام صاحب کا رجحان تنقید کے نفسیاتی دبستان کی طرف ہے اور

انہوں نے غالب کی عشقیہ شاعری کو دیکھتے ہوئے اسی زاویہٴ نظر کو اپنے پیش نظر رکھا ہے۔

اکرام صاحب نے مجموعی طور پر غالب کا بہت اچھا تنقیدی مطالعہ اپنی کتاب میں پیش کیا ہے۔ اور پرچند کہ بعض جگہ اس مطالعے کی کڑیاں بہت مربوط نظر نہیں آتیں لیکن جسے جسے انہوں نے، جو تنقیدی خیالات غالب کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر ظاہر کیے ہیں، وہ مطالعہٴ غالب کے سلسلے میں بعض نئے راستوں کو بتانے اور نئی منزلوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد سے ۵۰ء تک کا زمانہ ایسا ہے، جب غالب کے تنقیدی مطالعے میں اعتدال اور توازن پیدا ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال اکرام صاحب کی تنقید بھی ہے، جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اکرام صاحب کی توجہ تمام تر تنقید کی طرف نہیں ہے۔ وہ تحقیق کی طرف بھی اپنا رجحان ظاہر کرتے ہیں اور غالب پر انہوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا مقصد بھی بنیادی طور پر تحقیق ہے۔ اس تحقیق کو بنیاد بنا کر انہوں نے غالب کی زندگی، شخصیت اور کلام پر بحث کی ہے۔ ضمنی طور پر اس میں تنقیدی پہلو بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ اکرام صاحب کے ساتھ ساتھ اسی زمانے میں ایسے لکھنے والوں نے بھی غالب پر تنقیدی مضامین لکھے، جن کا میدان بنیادی طور پر تنقید تھا۔ ان میں پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر حمید احمد خان، پروفیسر کلیم الدین احمد، پروفیسر احتشام حسین، خورشید اسلام ممتاز حسین، آفتاب احمد خاں اور جہ حسن وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں، ان لکھنے والوں کے ہاں غالب کا مطالعہ مختلف تنقیدی زاویہٴ نظر سے ہوا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر ان سب نے غالب کے تنقیدی مطالعے کو بہت آگے بڑھایا ہے اور اس میں نئے امکانات کو تلاش کیا ہے۔

رشید صاحب نے کئی مضمون غالب کے بارے میں لکھے ہیں اور اس میں ان کا مخصوص تنقیدی اسلوب پر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔ رشید صاحب کے ہاں تنقید کے تاثراتی، تاریخی اور تہذیبی رجحانات کا ایک نہایت ہی حسین امتزاج موجود ہے۔ غالب کے مطالعے میں بھی ان کا یہی انداز تنقید اپنی جہلک دکھاتا ہے۔ اور اس انداز سے، اس میں شبہ نہیں

کہ غالب کو سمجھنے کا ایک نیا راستہ ملتا ہے۔ رشید صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں: ”مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا ہے تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا۔ غالب، اردو اور تاج محل۔ یہ ہندوستان کی تہذیبی پیداوار ہیں اور ہندوستان کے سوا کہیں اور ظہور نہیں پا سکتے تھے۔ ان تینوں میں ہندوستان کے صوری اور معنوی امتیازات چھلکتے ہیں۔“ ظاہر ہے کہ اس بیان میں تاثراتی انداز بھی ہے۔ قاری اور تہذیبی شعور بھی۔ رشید صاحب نے ان چند جملوں میں غالب کو ایک تہذیب کا ترجمان اور ایک تہذیب کی جاہلیانہ انداز کا عکاس ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنے مخصوص تنقیدی اسلوب سے اس کو پوری طرح ثابت کر دکھایا ہے۔

اس میں بہ نہیں کہ رشید صاحب کا انداز تنقید بڑی حد تک تاثراتی ہے لیکن ان کا تہذیبی اور معاشرتی شعور انہیں کہیں کہیں ایسی باتیں کرنے پر بھی مجبور کرتا ہے، جن میں تجزیاتی رنگ و آہنگ کی چھلک بھی نظر آ جاتی ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں:

”اوہ ”فارسی“ کے بڑے دلدادہ تھے۔ فارسی کے اپنے ذوق و زبان پر بھروسہ اور فخر کرتے تھے۔ لیکن ان کا مزاج جتنا توراتی تھا اتنا ایرانی نہ تھا۔ جس طرح ان کی شاعری مسلم ہے۔ اسی طرح ان کی ”سہ گری“ بھی مسلم ہے۔ ان کی شاعری کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات آسانی سے دریافت کی جا سکتی کہ شاعری میں ان کا موضوع کچھ ہی ہوا ان کا لہجہ اور سوز سہمیائہ بولتا تھا۔ اکثر باغیانہ! یہی نہیں کہ وہ ہار نہیں مانتے نہ خدا سے، نہ حریفوں سے، نہ زمانے سے بلکہ ہمیشہ ان سے نبرد آزما ہونے پر آمادہ رہتے تھے۔ ان میں سے کہیں ہار مانتے بھی تھے تو کچھ اس طرح کہ جیت غالب ہی کی معلوم ہوتی تھی! اب یہاں ان کے اردو فارسی کے کلام کی کون اوراقی گردانی کرے اور ثبوت میں بے شمار اشعار نقل کرے۔ البتہ غالب کے طالب علم کے لیے یہ ایک اچھا اور مفید مسئلہ ہوگا۔

”غالب کو بدل سے عقیدت تھی۔ غالب کے کلام میں ایسے اشعار کافی تعداد میں مل جائیں گے، جہاں یہ معلوم ہوگا کہ انہوں نے

بیدل کو سامنے رکھ کر یا بیدل سے متاثر ہو کر شعر کہتے ہیں ۔
 بیدل غالب سے زیادہ مشکل پسند ہیں ۔ لیکن میرے نزدیک
 غالب ، بیدل سے یوں ممتاز ہیں کہ وہ بیدل کی مانند اپنی تخیل یا
 فکر میں کھوئے نہیں جاتے ۔ غالب کہیں ہوں ، ان کا باؤں زمین
 ہی پر رہتا ہے ۔ کسی حال میں وہ ہم سے جدا ہونایا جدا رہتا
 گوارا نہیں کرتے ۔ غالب کی ارضیت میں ماورائیت اور ماورائیت
 میں ارضیت ملتی ہے ، جس سے ان کے کلام میں دل آویزی اور رفعت
 پیدا ہو گئی ہے ۔ بیدل نے شاعری کے سب سے موئے اصول کو نظر
 انداز کر دیا کہ شاعری حقیقت کی آسان اور دل کش ترجمانی ہے
 نہ یہ کہ آسان اور دل کش کو بھی درد سر بنا کر پیش کیا
 جائے ۔“

ان اعتبارات سے ، واضح ہو جاتا ہے کہ رشید صاحب کا رجحان
 تاثراتی ہونے کے باوجود تجزیے کی طرف ہے ، اس تجربے میں وہ معاشرت ،
 تہذیب ، تاریخ ، ادب و شعر کے مختلف رجحانات ، ان سب کو اپنے یسٹ نظر
 رکھتے ہیں اور ان کی روشنی میں غالب کی شخصیت اور شاعری کا
 جائزہ لیتے ہیں ۔ اگرچہ ان کے اس تجربے میں تفصیل نہیں ہے لیکن ہر حال
 وہ اس اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ غالب کا ایک تجزیاتی مطالعہ
 ہے ۔

رشید صاحب کے ساتھ ساتھ پروفیسر آل احمد سرور نے بھی غالب پر
 چند بہت اچھے تنقیدی مطالعے لکھے ہیں ۔ سرور صاحب پر رشید صاحب
 کے اسلوب اور انداز تنقید دونوں کے اثرات موجود ہیں لیکن جہاں تک
 تنقید کا تعلق ہے ، سرور صاحب کے ہاں رشید صاحب کے مقابلے میں زیادہ
 باقاعدگی اور زیادہ گہرائی اور تجربے میں تفصیل کا ہتہ چلتا ہے ۔ اس کا
 سبب شاید یہ ہے کہ سرور صاحب بنیادی طور پر تنقید ہی کو اپنا میدان
 سمجھتے ہیں ۔ اس لیے تنقیدی معاملات کی طرف انہوں نے زیادہ باقاعدگی
 سے توجہ کی ہے ۔ ان کی تنقید میں تاثراتی انداز نہیں ہے ۔ ایسے اسلوب میں
 ایک رنگینی اور ہرکاری ہے ، جو ان کے رومانی مزاج کو ظاہر کرتی ہے ۔
 اس سے سرور صاحب کی تنقید میں بڑا ہی فن کارانہ انداز پیدا ہو گیا ہے
 اور وہ ہر جگہ بہت ہی دل نشیں اور دل آویز نظر آتی ہے ۔ اس کو پڑھ کر

ایک مسرت کا احساس بھی ہوتا ہے اور ساتھ ہی تنقیدی حقائق بھی دل نشیں ہوتے ہیں۔ سرور صاحب اردو میں واحد نقاد ہیں جو تنقید میں رس اور رعنائی پیدا کرنے میں پیش پیش رہے ہیں۔ غالب پر جو تنقیدیں انہوں نے لکھی ہیں، ان میں بھی وہی رس اور رعنائی کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔

لیکن سرور صاحب کا یہ انداز تنقید در حقیقت ان کے گہرے تہذیبی شعور کی پیداوار ہے۔ انہوں نے غالب کو بھی اسی تہذیبی پس منظر میں دیکھا ہے اور ان کی شاعری کو اس تہذیب کی مختلف صورتوں اور کیفیتوں کا آئینہ دار ثابت کیا ہے۔ ان کے مندرجہ ذیل تنقیدی خیالات غالب کے تنقیدی مطالعے میں ہمیشہ اہم تصور کیے جائیں گے :

”ابتدائی دور کو چھوڑ کر، جب ان کی زود رنجی ان کی بے نیازی پر اکثر فتح پا جاتی ہے، غالب کے ہاں زندگی کا ایک طرح کا فلسفیانہ احساس ملتا ہے، جس میں ریخ و راحت دونوں کے لیے گنجائش ہی نہیں بلکہ طلب بھی ملتی ہے، جیسے وہ اس کے قائل ہوں کہ ہنگامے ہی سے گہر کی روشنی کے تمام پہلو ظہور پاتے ہیں اور زندگی کے ثبوت ہم پہنچاتے ہیں۔ نیز یہ کہ زندگی سے بیزار یا پریشان ہونا اتنی ہی بہت خیالی اور ذوق ہستی ہے، جتنا کہ اس پر ہنس سکتے اور ہنگامے میں جمیعت خاطر دیکھ سکتے اور ہالینے کی صلاحیت پیدا کرنا، ایک اعلیٰ اور قابل عمل نظریہٴ حیات ہے۔ یہی احساس ہے، جس نے رد و قبح، کرختگی اور دل شکستگی کی تنگ و تاریک اور بھٹاک گلیوں سے نکال کر انہیں ان کی شاعری کے فلسفیانہ توازن اور بے نیازانہ خوش طبعی کی شاہراہ پر لا ڈالا ہے۔“

اس اقتباس سے سرور صاحب کی انداز تنقید کی پوری طرح وضاحت ہو جاتی ہے۔ ان کی تنقید میں تجزیے کا عنصر غالب ہے اور تجربہ کرتے ہوئے ان کی نظر ان عوامل اور محرکات کی تہ تک پہنچتی ہے، جو غالب کی شخصیت اور شاعری کو بنانے میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ سرور صاحب کے تنقیدی انداز میں ایک شگفتگی اور شادابی نظر آتی ہے، جو ان کے تخلیقی اور فن کارانہ مزاج کا نتیجہ ہے۔ سرور صاحب غالب کے بلند پایہ نقاد ہیں کیوں کہ ان کے مزاج کو سمجھنے میں جس

تخلیقی مزاج کا ہونا ضروری ہے ، وہ خصوصیت سرور صاحب کے مزاج میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے اور ان کے مضامین اس وجہ سے اردو تنقید میں غالب کے بہترین تنقیدی مطالعے تسلیم کیے جاتے ہیں ۔

سرور صاحب کے ساتھ ساتھ بعض ایسے نقاد بھی غالب کے مطالعے میں پیش پیش نظر آتے ہیں ، جن کا زاویہٴ نظر ترقی پسندانہ ہے ۔ ان نقادوں میں سب سے زیادہ نمایاں قام پرویسر سید احتشام حسین کا ہے ۔

احتشام صاحب نے غالب کے بارے میں بعض بڑے ہی اہم تنقیدی مضامین لکھے ہیں اور ان مضامین میں غالب کی شخصیت کے عوامل اور ان کی شاعری اور فن کے محرکات کو عموماً زاویہٴ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے ۔ ان کے مضامین میں 'غالب کی بت شکنی' اور 'غالب کا تفکر' اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں ۔ ان مضامین میں انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ غالب اپنے زمانے کی پیداوار اور ایک عظیم تہذیبی روایت کے علم بردار ہونے کے باوجود اپنے زمانے کے باغی تھے اور یہ بغاوت ان کے فکر اور فن دونوں میں نمایاں نظر آتی ہے ۔ احتشام صاحب نے غالب کے مطالعے میں اس پورے تہذیبی ، معاشرتی اور معاشی پس منظر کو اپنے سامنے رکھا ہے ، جو غالب کے زمانے میں موجود تھا اور ان کو انہی تمام حالات کی پیداوار ثابت کیا ہے ۔ غالب کے مطالعے کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

’غالب کے مطالعے کے سلسلے میں چند نظریاتی مباحث پر غور کرنا نہ صرف مفید ہوگا بلکہ ضروری بھی ہے کہوں کہ غالب اٹھویں صدی کے اس ہندوستان میں پیدا ہوئے ، جو مخصوص روایات کا حامل تھا ۔ خاص طرح کا طبقاتی نظام رکھتا تھا ۔ تاریخ ، مذہب اور فلسفے میں پوری طرح اس زمانے کی جھلک نہ تھی ، جو اس وقت کے معاشی اور معاشرتی انحطاط نے پیدا کی تھی ۔ بلکہ کچھ عقیدے روایت بن کر طرز فکر پر اثر انداز ہو رہے تھے ۔ یہ عقیدے اس زوال اور انحطاط کے زمانے میں پیدا نہیں ہوئے تھے ، جو غالب کا تھا بلکہ دوسرے تاریخی حالات اور مختلف نظام معاشرت نے انہیں جنم دیا تھا ۔ صدیوں نے ان میں طرح طرح کے خیالات و افکار کی آمیزش کی تھی ۔ مختلف مذہبی اور فلسفیانہ تصورات ایک دوسرے میں پیوست ہوئے تھے ،

رد و قدح کی بہت سی منزلیں آتی تھیں اور کوئی ایسا نظریہ حیات اس وقت موجود نہیں تھا ، جو کسی ایک مذہب ، طبقہ ، گروہ یا مکتب خیال سے وابستہ کیا جا سکے ۔ ان حالات میں ایک روایت پرست شاعر یا ادیب کے لئے تو یہ ممکن ہے کہ وہ کسی مخصوص عقیدے کا سہارا لے کر اپنا رشتہ اس سے جوڑے اور بدلتی ہوئی زندگی سے پیدا ہونے والے سوالات سے منہ موڑ کر گزر جائے ۔ لیکن غالب کے لئے یہ خیال درست نہ ہو گا ۔ ان کے شعور کا مطالعہ اسی وجہ سے پیچیدگی پیدا کرنا ہے اور آسانی سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ چونکہ جاگیردار یا فوجی جماعت سے تعلق رکھتے تھے اور مسلمان تھے ، اس لئے ان کے اندکھ و خیالات وہی ہوں گے ، جو اس گروہ اور مذہب سے تعلق رکھنے والوں کے ہوا کرتے ہیں ۔ تنقید اور تجزیہ کا یہ میکانیکی طریقہ صحیح نتائج تک پہنچانی نہیں کر سکتا ۔“

اس اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ احتشام صاحب غالب کو عصرانی بلکہ مارکسی زاویہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے غالب کا مطالعہ صرف انفرادی نفسیات کی روشنی میں کیا ہے ، ان سے احتشام صاحب نے اختلاف کیا ہے ۔ کیونکہ ان کے خیال میں :
 ”نفسیات خود خارجی عوامل کا نتیجہ ہے اور زبردست سے زبردست انفرادیت بھی مثبت یا منفی شکل میں ایک سماجی بنیاد رکھتی ہے ۔ نفسیاتی کیفیت خارجی حالات سے باہر کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتی ۔ اس لئے پند اکرام کا غالب کی ساری تحریک اور کامیابی کو محض احساس کمتری کا نتیجہ قرار دینا ، نہ تو غالب کے شعور کا صحیح تجزیہ ہے اور نہ اصول تنقید ہی کے لحاظ سے درست ہے ۔“

احتشام صاحب نے غالب کی زندگی کے تمام واقعات کو سامنے رکھ کر تجزیاتی انداز میں ان کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں کا سراغ لگایا ہے اور بعض ایسے حقائق کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے ، جو ایک صحیح مارکسی نقاد ہی کر سکتا ہے ۔

پروفیسر حمید احمد خان نے غالب کی بھی زندگی ، شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بعض بہت ہی قابل قدر مضامین لکھے ہیں ۔ ان

مضامین سے غالب کی شخصیت اور شاعری کے بعض نئے پہلوؤں کی نشان دہی ہوتی ہے۔ انہوں نے بعض ایسے لوگوں سے جنہوں نے غالب کو دیکھا تھا، کچھ ایسی معلومات فراہم کی ہیں اور ان معلومات سے استفادہ کر کے ان کی شخصیت کا مطالعہ اس طرح کیا ہے کہ اس سے غالب کو سمجھنے کے بعض نئے راستے ملتے ہیں۔ غالب کی شاعری میں حسن اور عشق کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور ان کے بہت سے خیالات و تصورات انہیں کے گرد گھومتے ہیں۔ حمید احمد خان صاحب نے ان دونوں پہلوؤں پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور ان کے حواصل اور محرکات کا سراغ لگایا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے برعظیم کے مسلمانوں کی تہذیبی روایت کے ذوق جہاں اور فکری پہلوؤں کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے اور انہیں کی روشنی میں غالب کے تصورات حسن و عشق کو دیکھنے کی کوشش کی ہے لکھتے ہیں:

”غالب کے کلام میں اجتہاد کے پہلو یہ پہلو روایت کی پاسداری سے جو شغف ہے، وہ عشق، شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ غزل کے عاشق محنوں سے لے کر پروانے لگ اور روایتی معشوق لیلیٰ سے لے کر شمع عقل تک، سبھی یہاں موجود ہیں۔ ان اشعار کا پس منظر مغلیہ دور کی وہ معاشرت ہے، جو غالب کے معاصرین کے کلام میں بھی جھلکتی ہے۔ اس سے استفسار کہ غالب کے کلام میں اس سے زیادہ وسعت اور وضاحت مہیا ہوئی ہے لیکن یہ درجے کا فرق ہے، کیفیت کا نہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ معاشرتی پس منظر کے لحاظ سے غالب اور اس کے ہم عصر شعراء میں ایک بنیادی اشتراک ہے۔ اس مشترک کیفیت کے ہوتے ہوئے بھی، غالب کی شاعری میں حسن و عشق کا ایک الگ مقام ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ شاعر کی اپنی شخصیت اور اس کی شخصیت کے عکس نے حصہ ”کلام کو بھی ایک دوسری سطح پر پہنچا دیا ہے۔“

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ حمید احمد خان صاحب غالب کی شاعری کو ایک تہذیبی پس منظر میں دیکھتے ہیں اور ان کو اس روایت کا علم بردار سمجھتے ہیں، جو اس برعظیم کے مسلمانوں کی عظیم تہذیبی روایت

تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے غالب کو ایسے ماحول میں بھی دیکھا ہے، جو انیسویں صدی کی دلی میں موجود تھا۔ اس ماحول میں جو اجتہاد کی کیفیت تھی، اس کی جھلک انہیں غالب کی اس انفرادیت میں بھی نظر آتی ہے جو ان کا طرہ امتیاز ہے۔

حمید احمد خان صاحب نے غالب کے تنقیدی مطالعے میں اردو کے بعض دوسرے شاعروں کو بھی اپنے سامنے رکھا ہے۔ مثلاً میر حسن، جرأت یا ذوق وغیرہ کو سامنے رکھ کر انہوں نے غالب کے تصورات حسن و عشق پر تنقیدی بحث کی ہے اور اس طرح غالب کی انفرادیت کے نقوش کو زیادہ ابھارا ہے۔ اس کے علاوہ غالب کی زندگی کے لمبی حالات اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ذہنی رجحانات اور جذباتی میلانات کو بھی انہوں نے غالب کے تنقیدی مطالعے کی بنیاد بنایا ہے اور ان کی فارسی اور اردو شاعری دونوں کو سامنے رکھ کر اپنے بنیادی تنقیدی خیالات کی وضاحت کی ہے۔ ان تمام بحثوں میں حمید احمد خان صاحب اپنی تنقیدی بصیرت کا اظہار کرتے ہیں اور جگہ جگہ ان کے ہاں انسانی نفسیات کو سمجھنے اور اس کی روشنی میں شعر و شاعری کو دیکھنے کا رجحان ملتا ہے لیکن انسانی نفسیات کی باتیں کرتے ہوئے وہ صرف اپنے آپ کو نفسیات تک ہی محدود نہیں رکھتے بلکہ اس نفسیات کو بھی ایک تہذیبی روایات اور ماحول کے اثرات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید زیادہ متوازن اور جان دار نظر آتی ہے اور اس سے غالب کی شاعری کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔
(نامکام)

مطالعہء غالب
کے
سوسال

گزشتہ سو سال میں غالب کی شخصیت اور شاعری کا تنقیدی مطالعہ مختلف لکھنے والوں نے مختلف زاویہ ہائے نظر سے ، مختلف انداز میں کیا ہے ، اور مختلف نتائج نکالے ہیں ۔ یہاں ان مختلف لکھنے والوں کے کچھ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں تاکہ یہ اندازہ ہو کہ گزشتہ ایک صدی میں اس تنقیدی مطالعے نے کیا کیا صورتیں اختیار کی ہیں ۔ اس میں کون کون سے رجحانات پیدا ہوئے ہیں اور اس نے کس کس طرح غالب کی شخصیت اور شاعری کے خد و خال کو نمایاں کر کے پیش کیا ہے ۔

ان اقتباسات کے متعلق کوئی بات اپنی طرف سے جان کر نہیں کہی گئی ہے ۔ کیونکہ ان کو پیش کرنے کا مقصد تنقید نہیں ہے ، صرف ان تنقیدی خیالات کو ہک جا کرنا ہے ، جو غالب کے متعلق مختلف لکھنے والوں نے مختلف اوقات میں پیش کیے ہیں ۔ اس خیال سے کہ گزشتہ سو سال میں غالب کا جو تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے ، اس کی صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے آ سکے ۔

”امید فخلص ، امید اللہ خان نام ، عرف میرزا نوشہ ۔

آیا و اجداد کا وطن صبرفتہ تھا ۔ مستقر الخلائک اکبر آباد میں پیدا ہوئے ۔ قابل ، یار ہاش اور درد مند جوان ہیں ۔ بسر اوقات ہمیشہ خوش معاشی سے رہی ہے ۔ خاطر میں ریختہ گوئی کا ذوق ممکن ہے ۔ لخمہائے عشق مجاز سینے میں موجود اور تربیت یافتہ غم کدہ لیاڑ ۔ فن سخن سنجی میں میرزا عبدالقادر بدیل علیہ الرحمة کے محاوروں کا اتباع کرتے ہیں

اور ریختہ، محاورات فارسی میں موزوں کرتے ہیں۔ بالجملہ اپنی طرز کے موجد ہیں اور واقع کے ساتھ یک جہتی کا رابطہ مستحکم رکھتے ہیں۔ ان کے اکثر اشعار نازک مضامین کے ساتھ زمین سنگلاخ میں موزوں ہوتے ہیں۔ بیش از بیش خیال بندی کا رویہ بیشاد خاطر ہوتا ہے۔^{۴۲}

نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور: عمدۃ منتخبہ تذکرہ سرور اردو ترجمہ ۱۸۳۱ء

مرزا نوشہ کے نام سے مشہور ہیں۔ بڑے معزز خاندان اور ہرآنے رئیسوں کے گھرانے سے ہیں۔ اکبر آباد لہ کے قیام سے سر بلند تھا۔ اب دارالسلطنت شاہجہان آباد آپ کے قیام کی بدولت رشک اصفہان و شیراز ہے۔ چمن معانی کے طوطی بلند پرواز، اور کاشن رنگین یانی کے بلبیل نغمہ برداز۔ آپ کی بلند خیالی کے مقابلے میں بلند آسمان ہستی زمین ہے اور ان کی گہرائی فکر کے سامنے فاروق کرسی نشین معلوم ہوتا ہے۔ ان کا شاہین غزل سوائے عفا کے کسی کا شکار نہیں کرتا اور فرس طبیعت میدان فلک کے علاوہ جولائی نہیں دکھاتا۔ اگر آج کل قیمتی سرمائے کی تلاش مقصود ہو تو ان ہی کی دکان میں ملے گا۔ ایک مدت سے دائرۂ شعر و شاعری میں قدم ہے۔ شروع شروع میں اپنی دشوار پسند طبیعت کی بنا پر مرزا عبدالقادر بدلی کے رنگ میں دقت آفرینیاں کیں۔ آخر میں آکر یہ رنگ چھوڑا اور دوسرا پسندیدہ رخ اختیار کیا۔ اپنے دیوان کو بعد تکمیل و ترتیب کے نظر انداز کر دیا اور اس میں سے بہت سے اشعار کو نکال دیا اور تھوڑا حصہ انتخاب کیا ہے۔ بہت عرصے سے ریختہ کی طرف توجہ نہیں کی ہے۔ فارسی زبان میں بہت قدرت رکھتے ہیں۔ ان کا مرتبہ بڑے استادوں سے کم نہیں ہے۔ ان کی غزل مثل ظہیری ہوتی ہے اور ان کا قصیدہ مثل عرفی کے قصیدے کے بہت دل پسند ہوتا ہے۔ شعر کے مضامین کو پورے طور پر سمجھتے ہیں اور تمام نکات اور لطافتوں کی تہ کو پہنچ جاتے ہیں اور یہ وہ فضیلت ہے۔ جو صرف چند اہل سخن کو حاصل ہے۔ اگر نکتہ رس ہو تو یہ بات سمجھو گے کہ اگرچہ اچھا کہنے والے کم یاب ہیں لیکن شعر فہمی کا ملکہ رکھنے والے اس سے بھی کم ہیں۔ کیا کہنا اس شخص کا جس

کو یہ دونوں باتیں حاصل ہوں۔ مگر ایسے لوگ کم دکھائی دیتے ہیں۔ اگرچہ ان سے ملاقات صرف کبھی کبھی ہوتی ہے، لیکن حقیقی تعلق مستحکم ہے۔“

(نواب ہد مصطفیٰ خان شیفتہ گلشن بے غار اردو ترجمہ)

”اسد تخلص، اسم شریف ان کا نواب اسد اللہ خان بہادر معروف بہ مرزا نوشہ خاندان ضعیف اور رئیسائے قدیم، اکبر آباد نیک بنیاد کے مدت سے وارد شاہ جہان آباد خجستہ نہاد کے ہیں۔ ادیب لیب اس مرتبے کے ہیں کہ سبحان ابن وائل مقابل اوج بلند خیالی ان کے حقیض چہل کا مبتلا، مشہور سخن فہم و سخن دان۔ اس ہاں پر مثنوی و کعب باوجود بلند لہجے کے مانند بھوی گھٹنوں چلنے والوں کے۔ ان کے حضور اشعار عائدانہ اور مضامین آزادانہ جملت وہ دیوان نظیری، رجز بے باکانہ اور نثر بے پروایانہ اس کی رشک وہ عبارت ظہوری۔ خوان یفا اس کے سے انوری ایک ادنیٰ ذلہ رہا، خاقانی بیاروب کشی مستعد سر و ہائے فیض سے کہوں کر لوگ فیض کو نہ پہنچے جب کہ وہ اس کے ایک ادنیٰ شاگرد سے فیض کو پہنچا۔ صاحب دیوان و تصانیف ہے۔ مگر مدت سے فکر ریختہ گوئی زبان اردو کا ترک کیا۔ مگر ایک دیوان چھوٹا سا قریب پانچ جزو کے تصانیف نواب مدوح سے نظر عاجز ہے گزرا۔ اسی سے یہ چند اشعار بطور یادگار مندرج گلدستہ ہذا کے کیے گئے۔ مگر چونکہ نواب مدوح حالت صبا سے آج تک شوق زبان فارسی کا رکھتے ہیں اور اشعار فارسی میں غالب تخلص لکھتے ہیں۔ چنانکہ ایک دیوان چالیس جزو کا زبان مذکور میں شاعر مدوح کا قالب طبع میں آچکا ہے۔ اس لیے اب نثر اشعار اردو کا نہیں کرتے۔“

(مولوی کریم الدین : گلدستہ نازنیاں : ۸۳۵ ع)

یہ (مراد دیوان غالب) فکر کے قدسی خاندان کی سروسہ حسہ ہے، جو سر بلند کر کے اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔ لا اہالیانہ الدار میں غرام کرنے والی ایک پردہ دار ہے، جس نے چہرے سے مفع اٹھا دیا ہے اور پردہ دری کے انداز میں دامن کمر تک لے آئی ہے۔ یہ

یوسف ثانی ہے اور حور نژاد معانی اس میں دوش بدوش دکھائی دیتے ہیں ۔
 یہ ایسا نرگس زاو ہے ، جس کے چلوے کو دیکھ کر لوگ ہوش باغیہ اور
 حیرت زدہ ہو جاتے ہیں ۔ یا آپ اسے دور تک بھلا ہوا ایک نفس ویشی
 کھڑا سمجھیں ، موتوں سے مزین ، جسے آسمان پر ستارے آگے ہوتے ہوں ۔
 ایسا عمل ہے ، جو ملک بھر کے شہروں کے لیے رونق کا موجب ہے اور
 جو چین کے سینکڑوں نگار خانوں کی شان و شوکت کو ملہامیٹ کرنے
 والا ہے ، یا اسے روشن چراغ کہا جائے ، جس کے ارد گرد ذہین اور طباع
 لوگ پروانوں کی طرح طواف کرتے ہیں ۔ ہاں یہ آسمان سے اُترا ہوا ہیکل
 ہے ، جو فرشتوں کے لیے حرز بازو کا کام دیتا ہے ۔ اب آپ کہہ اُٹھیں گے
 یہ حضرت میکائیل جیسا پاک سیرت موکل ہے ، جس نے ایک فراخ فرش
 جہاں دیا ہے اور شعر و سخن کے گرسنہ چمنوں کو صلائے عام دی ہے ۔
 بیت اللہ کی طرح ایک مقدس معبد ہے ، جس کی کلید فہم درست کے ہاتھ میں
 دے دی گئی ہے اور اس کے دروازے نے مزائفہ کے احرام بندوں کے
 دل کو کشادگی عطا کی ہے ۔ یا اسے منات خیال کیجئے ، جو زائر بندگان خیال
 اور جبین سانی کرنے والوں کے لیے ایک صنم کدہ ہے ۔ ہاں یا بھر یہ
 ارتنگ ہے ، جو بدیع و غریب نقوش کی نمائش کر رہا ہے ، جسے دیکھ کر
 مانی و ارژنگ انظار عجز کے طور پر اپنی پشت دست زمین پر رگڑتے ہیں ۔
 ان اوراق کے ایک ایک صفحہ کو وہ مقدس پڑھنے والا برہمن سمجھتے ۔
 اس کتاب کا ہر ورق ایک موبد ہے ۔ ایک جہاں نما آئینہ خانہ ، ایک مصفا
 مقام ، جس میں مریم کردار پردہ نشین خیموں میں بیٹھے ہوئے ہیں ۔ اس میں
 ایسے شوخ چشم بھی ہیں ، جو شاہدان بازاری سے بھی زیادہ پردہ دری کرتے
 ہیں ۔ یہاں بھی دست بھی ملیں گے ، جو تونکر دل ہیں اور ایسے آزاد فطرت
 لوگ بھی نظر آئیں گے ، جو پا درگی ہیں ۔ اپنے آپ پر شیدا عشاق طینت ،
 حسین دل رکھنے والے سادہ پیکر ، زہرہ فن ، ہاروت پیشہ ماہ جیسی ، بابل میں
 مسکن رکھنے والے ، سر تا پا گویا آلود ہریرو ، یہ سب جہاں دکھائی دیتے
 ہیں ۔ یہاں آپ کو قنزم آشام سمندر (آتشیں کیڑے) بھی ملیں گے اور آگ سے
 بھرا ہوا سینہ رکھنے والے ٹھنک بھی ۔ بڑے بختہ مغز محبوب ، جن کا مغز
 بختہ ہے تو پوست لطیف ۔ مست بادہ آشام ، از خود رفتہ لیکن دامن شکیانی
 ہاتھ میں لیے ہوئے ۔ ہندی صنم مگر ہارسوں کی خوب رکھنے والے ،

دہلی نژاد لیکن استہان والوں کی طرح ہر درد - ہاں ہاں امید و بیم کی کیفیت دل میں لے کر میں کہتا ہوں کہ جو کچھ میں نے پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ تحریر کیا ہے، بالیقین اردو زبان کے اُس منتخب اردو دیوان کے متعلق ہے، جو اعجاز مسیحائی رکھنے والی کلک کا پاکیزہ ترشح ہے اور اس قلم کو چلانے والا عقل کے لیے تراڑوے عدل ہے اور بصیرت کے لیے اضطراب ہے، جس سے وہ اجرام فلکی کے احکام معلوم کرتی ہے۔ اے جوہر آئینہ، آفرینش، معیار نقد گرامائی اور بلند ہانگی کے نردبان کا معراج کہہ دے تو بجا ہے۔ قی الواقعہ یہ شاعر گرامی منزلت قلعرو معنی بروہی پر متصرف ہے، سخنوری کی ولایت کا فرمان روا ہے، نو آئین نگاری کے جہان کا مالک ہے۔ تازہ گشتاری کے جہان کا سالار، سخن گستری کے وجود کو حیات نو بخشنے والا، دیدہ وری کی آنکھ کو بینائی بخشنے والا، جس کی وجہ سے قلم کی شان و شوکت بلند ہوئی اور دوات کے خانوادے کا چراغ روشن ہوا۔ وہ آہٹ اللہ جس نے دوسرے شاعروں کی شہرت کو منسوخ کر دیا۔ ہاں ہاں وہی جو سرخیل انجمن نکتہ دانان ہے۔“

سر سید احمد خاں : آثار الصنادید : ۸۷۷ء (اردو ترجمہ)

غالب تخلص۔ شیر نیستان سخنوری، ہمیشہ معنی بروہی، یکم تاز عرصہ، کہل، یگانہ، کشور الفضال، سیاح زمین سخن دانائے نوادر فن، زبدۂ کملائے جہان، مرزا احمد اللہ خان معروف بہ مرزا نوشہ سلمہ الرحمن۔ سخن منج بے مثل و نظیر اور صاحب طرز دل پلیر ہے۔ خاصہ گوہر بار ہے اقلیم سخن میں لوائے جہانگیری بلند کیا ہے اور ہوسف معنی کو اس بجوم بے کیزی میں زلیخا متشان مصر سخن کی نظر میں ارجعند کیا ہے۔ فضائل اگر اس قدوۃ افاضل کی ذات پر تکیہ نہ کرنے، فضیلت نہ رکھنے اور کجالات اگر اس زبدۂ کملا سے مدد نہ لیتے، عالم کی تکمیل کا سبب نہ ہوتے۔ سیاحتی رقوم اس کی رنگینی معنی سے ہم شکل طاؤس، صنفہ قرطاس اس کے فروغ مضامین سے ہم رنگ فانوس۔ برق طور اگر اس کی تجانی معنی کے مقابل ہوتی، سرمہ ہو جاتی۔ شمع این اگر اس کے شعلہ فکر کے سامنے آتی، فروغ نہ پاتی۔ ایوان سخن اس کے فکر معاری سے آسمان کے ساتھ ہم رفعت، بنائے کلام اس کی طبیعت کی مدد سے قاف

کے ساتھ ہم متانت - وصف بزم میں رفتار فلم رقص غائبہ کے برابر ، بیان بزم میں سرور غائبہ نعرۂ شیر سے بہتر - فکر اگرچہ حوصلہ بہمت کے لائق جہاد کرے ، فضائے لامکان مرحلہ مقصود کے رو برو دیدہ سور سے تنگ نظر آئے۔ خیال اگر اندازۂ قدرت کے موافق بلندی پر جائے ، خزائن تحت العرش کو اس جائے کاہ رفیع سے گنج قارون سے پست تر ہو جائے۔ سخن کی فراوانی اور ہجوم معانی اور متانت تراکیب اور رشاقہ اسالیب اور شوخی اتارات اور جسی عبارات - گاہ اجمال کی رعایت سے آفتاب کو لباس ذرہ میں جلوہ دینا اور گاہ تفصیل کے اقتضا سے تخم کو نہال کی صورت میں نشو و نما بخشنا - جدائی کو فصل اور ملاقات کو وصل کے قبیل سے ٹھہرا کر مباحث سخن میں بلاغت کے ساتھ ادا اور حسو و زواید سے بزم کلام میں مثل صحبت زیاد اجتناب کرنا - اور اسی طرح اور باتیں جو لوازم سخن اور مقتضیات فن سے ہیں ، جیسے اس ناظم کشور کراں میں مشاہدہ ہوتی ہیں ، کم کسی میں دیکھی گئیں - آیات رختہ ، عمارت رختہ ، دقائق فارسی جواہر قدس کا رختہ - ہر چند اشعار رختہ حد حصر سے خارج اور اندازۂ شاعر سے افزوں تھے - لیکن از بس کہ کمر ہار اور دہان دلدار کا مضمون زیب اشعار ہوتا ہے ، انہیں مضامین کی رعایت سے اختصار کو پسند کیا اور چند بیتیں دلیروں کے لب کے مانند نقطہ انتخاب کے خال سے مزین کر کے ایک دیوان مختصر مرتب کیا - اور مجموعہ فارسی کا نو دیوان عشر سے بھی زیادہ اور پر شوغا اور آیات بلند صدا سے مملو اور مسحون ہے ۔“

(مرزا قادر بخش صابر : گلستان سخن : ۱۸۵۵ء)

فخر عرفی و غیرت طالب میرزا نوشہ اسد اللہ خان المحاطب
یہ نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ بہادر - التماسیاب کی نسل سے تھے -
اکبر آباد میں مولد تھا اور دہلی مسکن - لفظ ”غریب“ تاریخ ولادت ہے -
وفات ۱۰۲۸ھ میں واقع ہوئی - ”ہنج آہنگ“ ، ”دستنبو“ ، ”سمر نیم روز“ اور
”قاطع برہان“ ان کی تالیفات میں سے ہیں - فارسی زبان میں بھی ایک دیوان
رکھتے ہیں - آیات کا مجموعہ ۱۰۲۴ھ ہے - اول اول مرزا یدل کی روش
اختیار کی - آخر الامر بڑا پسندیدہ انداز ایجاد کیا - اپنے دیوان رختہ میں

سے بہت سے اشعار نکال دیے ہیں اور قلیل تعداد میں انتخاب کر لیے ہیں۔ چلے اسد فاضل کرتے تھے، جو غزلیات کے بعض مقاطعوں میں اب بھی موجود ہے۔ چاس سال ان کی مدت مشق ہے۔ فارسی گوئی میں ان کا ہایہ فعل شاعرانہ سے کم نہیں اور ریختہ کی حالت بھی یہ ہے کہ اگر ان کا کوئی ہم مرتبہ ہے تو لالیں۔ اگر حدیثہ، فطیمہ کے لیے نوبہار ہیں تو عرصہ قمر میں بھی مردکار ہیں۔ جمیع اصناف سخن پر جو قدرت الہیہ حاصل ہے، بیان سے باہر ہے۔ کیا ہر شخص نہیں جانتا کہ بعض سخنور اپنی توجہ صرف غزل کی طرف معطوف رکھتے ہیں اور غزل کے بغیر اور کچھ نہیں کہہ سکتے اور بعض کا راس الہال تو صرف قصیدہ ہونا ہے اور قصیدے کے علاوہ اور کسی صنف سخن میں ان کی کوئی چیز قابل توجہ نہیں ہوتی۔ علوی ہذا القیاس لیکن غالب ایسا سخنور ہے کہ اگر زمین غزل کہہ دیکھا جائے تو اسے اس نے آسمان پر پہنچا دیا اور اگر مثنوی کا میدان ہے تو اس کا ہا۔ مال شدہ۔ قصیدے میں وہ عرفی کے ہم پایہ ہیں اور ان کی غزل نظیری کی طرح گراںمایہ ہے۔ اور یہ بات بڑی تعجب انگیز ہے کہ جس وادی میں قدم رکھتے تھے، سرعت تمام سے اسے طے کر لیتے تھے اور اس کے باوجود فروغ مضامین، چستی ترکیب، شوکت الفاظ، رنگینی معنی، متانت بیان اور شستگی زبان کے اوصاف جو کم از شعراء کو بالقوہ میسر تھے، انہیں بالفعل عطا ہوئے تھے۔ دوسرے شعراء کے سلسلے میں جو مبالغہ کہا جا سکتا ہے۔ وہ غالب کے معاملے میں حقیقت ہے۔ انصاف ہمیشہ بالائے طاعت ہوا کرتا ہے۔ اگر الفضل المتقہین کے مطابق میں اسے اساتذہ قدیم کے ہم سر نہیں کہتا تو دیوالہ بھی نہیں کہ ان سے اسے بہت تر کہوں۔ غالب کمال سخنوری کے ساتھ، کمال سخن فہمی بھی رکھتے تھے اور جوسا کہ چاہتے شعر سے خوب لطف حاصل کرتے تھے۔ حضرت شیفہ لکھتے ہیں: ”وہ مضامین شعری کو کما حقہ سمجھتے تھے اور شعر کے تمام نکات اور لطائف تک رسائی حاصل کر لیتے تھے“ اور یہ ایسی فضیلت ہے جو صرف بعض اہل سخن کے لیے مخصوص ہے۔

(سید نور الحسن خان: طور کاظم: ۱۸۷۸ء، اردو ترجمہ)

اسد اللہ خان مرزا نوشہ خلف مرزا عبداللہ بیگ خان عرف مرزا دولہا : قوم ان کی ایک ہے۔ اقوام ترک جد اعلیٰ ان کے ماوراء النہر سے ہندوستان

میں آئے اور نواب لہف خاں کے عہد میں منصب دار شاہی رہے۔ جب ریاست مغلیہ پر ہم ہوئی، ملازم مہاراجہ جیسور ہوئے اور ہود د باخی شہر آگرہ میں اختیار کی۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں ان کے والد ماجد غلام حسین خاں کھیدان متوطن شہر آگرہ کے جہاں منسوب ہوئے اور مرزا نوشہ وہیں پیدا ہوئے اور تان سن شعور وہیں مشغول تحصیل کتب درسیہ عربی و فارسی رہے۔ ابتدا میں شیخ معظم ناسی ایک معلم سے کچھ تعلیم پائی، پھر ابھک ایرانی آتش پرست سیاح ہے، جس کا نام آتش پرستی میں اورمزد اور بعد قبول اسلام عبدالصمد تھا، تلمذ ہوا۔ دو برس وہ ان کے مکان پر مقیم رہا اور زبان فارسی سیکھائی۔ جب سن کمیز کو پہنچے مرزا الہی بخش خاں معروف دیپلومی کے جہاں منسوب ہوئے اور شہر دہلی میں توطن اختیار کیا۔ معلومات ان کی زبان فارسی میں کاشمیری و رابعۃ الجنار آشکار ہے، نثر و نظم اردو کی چار دانگ ہندوستان میں پکار ہے۔ تالیفات و تصنیفات کے نام جہاں لکھے جاتے ہیں؛ فارسی میں کلیات جس میں غزلیں ردیف وار ہیں اور قطعات اور قصائد اور رباعیات اور مشوہاں سب قسم کے اشعار ہیں۔ "قادر نامہ" جو خالی باری کی طرز پر موزوں کیا ہے۔ "سہر نیم روز" اور "ماہ نیم ماہ" یہ نثر میں دو تاریخی ہیں۔ تاریخ اول میں شاہ تیمور سے پہلوں تک حال لکھا ہے اور تاریخ ثانی میں عہد جلال الدین اکبر بادشاہ سے جہاد شاہ کے عہد تک احوال ضبط کیا ہے۔ "مستنبو" جس میں غدر کے واقعات ہیں۔ "قاطع برہان" جس میں "برہان قاطع" کی بعض لغات پر غدشات ہیں۔ "ہنج آہنگ" اس میں فارسی زبان کی مشآت ہیں۔ اردو میں ایک دہوان اور "اردوئے معلیٰ" اور "عود ہندی" ان دونوں میں اردو زبان کے خطوط ہیں۔ العاصل مرزا صاحب کی طباعی اور ذکاوت ان کے نتائج افکار سے پیدا ہے۔ بات سے بات پیدا کرتا تمام کلام سے ہوتا ہے۔

(منشی امیر احمد امیر مینائی: انتخاب یادگار: ۱۸۷۹ء)

مرزا صاحب کو اصلی شوق فارسی کی نظم و نثر کا تھا اور اسی کمال کو اپنا فخر سمجھتے تھے، لیکن چونکہ تصانیف ان کی اردو میں بھی چھپی ہیں اور جس طرح امرا و روسائے اکبر آباد میں علو خاندان سے نامی اور میرزائے فارسی ہیں، اسی طرح "اردوئے معلیٰ" کے مالک ہیں۔ اس لیے واجب ہوا کہ ان کا ذکر اس تذکرے میں ضرور کیا جائے۔

اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے نام کی تاثیر سے مضامین و معانی کے پیشے کے شیر تھے ۔ دو باتیں ان کے انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں ۔ اول ، کہ معنی آفرینی اور تازک خیالی ان کا شیوہ خاص تھا ، دوسرے چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اور اس سے انہیں طبعی تعلق تھا ، اس لیے اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دے جاتے تھے کہ بول چال میں اس طرح بولتے نہیں ، لیکن جو شعر صاف صاف نکل گئے ہیں ، وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں رکھتے ۔

ان کے خطوں کی طرز عبارت بھی ایک خاص قسم کی ہے کہ ظرافت کے چٹکنے اور لطافت کی شوخیاں اس میں خوب ادا ہو سکتی ہیں ۔ یہ الہی کا ایجاد تھا کہ آپ مزالے لیا اور اوروں کو لطف دے گئے ، دوسرے کا کام نہیں ۔ اگر کوئی چاہے کہ ایک تاریخی حال یا اخلاقی خیال یا علمی مطالب یا دنیا کے معاملات خاص میں مراسلے لکھے تو اس انداز میں ممکن نہیں ۔
(مولانا محمد حسین آزاد : آب حیات : ۸۸۰ ع)

یہ وہ خوش مذاق شطص گزرا ہے ، جس نے ہندوستان کی فارسی شاعری اور اردو نثر کو تجدید کا خلعت عطا کیا ۔ میرے نزدیک ہندوستان کے کلام فارسی پر ولاتی فارسی کا بقیں چار شطصوں کے کلام پر ہوا ۔ اول اسیر خسرو ، دوم حسین دہلوی ، سوم مرزا بدل ، چہارم غالب ۔ اگرچہ ناصر علی سرہندی اور مرزا جان جاناں مظہر اور غنی کشمیری اور غنیمت اور خان آرزو اور آزاد ہنگرامی اور میر اسامی ہنگرامی اور امام بخش صاحبانی اور شاہ الفت حسین فریاد یہ سب کے سب خوش گووار اور شاعر بے بدل تھے مگر جامہٴ ایجاد ، جو خداداد ہے انہیں چاروں کی راست قامت پر راست آیا اور ان چاروں کے سوا جن کے نام فاسی لکھے گئے ہیں ، ان پر بھی نغز گفتاری کا خاتمہ ہوا۔ گو ان کے سوا اور بھی شعرائے فارسی ہندوستان میں ہوئے ہیں مگر ان لوگوں کی خوبیوں کو نہیں پاتے اور یہ لوگ ان چاروں کی شہرت ایجاد نہیں حاصل کر سکتے ۔ یہ تو خدا کی دین ہے ۔

ہندوستان کی فارسی شاعری کا کہ شمس الدین قدیر دہلوی کے وقت سے ایک طرز خاص سلامت اسیر شروع ہوا تھا ، رنگ ہی بدل دیا اور بڑی

ہمت کر کے فارسی کو پھر ولایت کی کمری پر بٹھایا۔ ان کے کلام سے ظاہر ہے۔

اُردو نظم بھی ایک طور خاص کی کہیں۔ اس میں بھی ایجاد خاص ہے۔ آخر میر تقی کا رنگ بالکل اتار لیا۔ اوائل میں حضرت نے ناسخ کی ایجاد پر توجہ فرمائی اور فارسی گوئی کی عیادت سے اس کو بلند کر دیا یعنی نہ ناسخ کی ضرورت ہی نہ دہلی کی۔ دقت ہندی کے ساتھ ترکیب و بندش فارسی زیادہ کر دی یہاں تک کہ سوائے لعل کے کوئی لفظ ہندی اکثر شعروں میں نہیں آیا۔

اُردو نثر میں بوری واقعہ نگاری کا ایجاد انہیں کا ہے، ورنہ اس سے پہلے مرصع اور مسجع شعر واقع نثر لکھی جاتی تھی۔ ’اُردوئے معلو‘ انہیں جو اہر پورے خطوط کا مخزن ہے، جس میں اس نئی ایجاد کا رنگ ہے۔ (سید فرزند احمد صفیر بلگرامی : تذکرۃ جلوۃ خضر : ۸۸۳ ع)

مرزا نے کل رعا کے دیباچے میں لکھا ہے کہ میں نے اول اُردو زبان میں شعر کہنا شروع کیا تھا، اس لیے ہم بھی پہلے اُن کے اُردو دیوان کا ذکر کرتے ہیں۔ جس روش پر مرزا نے ابتدا میں اُردو شعر کہنا شروع کیا تھا، طبع نظر اس کے کہ اس زمانے کا کلام خود بہارے پاس موجود ہے، اُس روش کا اندازہ اس حکایت سے بخوبی ہوتا ہے۔ خود مرزا کی زبانی سنا گیا ہے کہ میر تقی نے جو مرزا کے ہم وطن تھے، اُن کے لڑکپن کے اشعار سن کر یہ کہا تھا : ”کہ اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اُس نے اس کو سیدھے واسطے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جانے کا ورنہ محال دیکھنے لگے گا۔“

مرزا کے ابتدائی اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو طبیعت کی مناسبت سے اور زیادہ تر ملا عبدالصمد کی تعلیم کے سبب فارسی کا رنگ ابتدا ہی میں مرزا کے بول چال اور اُن کی قوت متخیلہ پر چڑھ گیا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر ذکی الطبع لڑکے ابتداء میں سیدھے مادے اشعار کی نسبت مشکل اور پیچیدہ اشعار کو جو بغیر غور و فکر کے آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے، زیادہ شوق سے دیکھنے اور بڑھتے ہیں، مرزا نے لڑکپن میں بیدل کا کلام زیادہ دیکھا تھا، چنانچہ جو

روشن مرزا بیدل نے فارسی زبان میں اختراع کی تھی، اسی روش پر مرزا نے اردو میں چلنا اختیار کیا تھا، جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں :

مارو بیدل میں رختہ لکھتا

اسہ اللہ خان قسیامت ہے

مرزا کے حق میں جو پیش گوئی میر تقی نے کی تھی، اس کی دونوں شقیں ان کے حق میں پوری ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ مرزا اول اول ایسے رستے پر بڑے لگے تھے کہ اگر استقامت طبع اور سلامت ذہن اور بعض صحیح مذاق دوستوں کی روک ٹوک اور نکتہ چینی ہم عصروں کی خردہ گیری اور طعن و طعریض سد راہ نہ ہوتی تو وہ شدہ شدہ منزل مقصود سے بہت دور جا پڑتے۔ سنا گیا ہے کہ اہل دہلی شاعروں میں، جہاں مرزا بھی ہوتے تھے، تعریضاً ایسے غزلیں لکھ کر لاتے تھے، جو الفاظ و ترکیبوں کے لحاظ سے تو بہت پر شوکت و شان دار معلوم ہوتی تھیں، مگر معنی ندارد، گویا مرزا پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ آپ کا کلام ایسا ہونا ہے۔

مرزا نے اس قسم کی نکتہ چینیوں پر اردو اور فارسی دیوان میں جا بجا اشارہ کیا ہے۔ اردو میں ایک جگہ کہتے ہیں :

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی

ایک اور اردو غزل کا مطلع ہے :

گر خاموشی سے فائدہ اٹھائے حال ہے

غوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

مرزا کے ابتدائی کلام کو سہل و بے معنی کہو یا اس کو اردو زبان کے دائرے سے خارج سمجھو، مگر اس میں شک نہیں کہ اس سے ان کی ارجحیتی اور غیر معمولی آہج کا خاطر خواہ سراغ ملتا ہے اور یہی ان کی تپڑھی ترجمانی چاہی ان کی بلند فطرت اور غیر معمولی قابلیت و استعداد پر شہادت دیتی ہیں۔ معمولی قابلیت و استعداد کے لوگوں کی معراج یہ ہے کہ جس ہنگ ڈنڈی پر انکی لہریڑوں کا کلمہ چلا جاتا ہے، اسی پر آنکھیں بند کر کے گلے کے بیچھے بیچھے ہو لیں اور لیک سے ادھر ادھر آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں۔ جو ہنر یا ہوشہ اختیار کریں اس میں انکوں کی چال ڈھال سے

سر سو تجاوز نہ کریں اور ان کے قلبی قدم پر قدم رکھتے چلے جائیں ۔ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے ایسا نہیں کرتے ، بلکہ دوسرے رستے پر چلنا ان کی قدرت سے باہر ہوتا ہے ۔

برخلاف اس کے جن کی طبیعت میں ارجنٹائی اور غیر معمولی اوج کا مادہ ہوتا ہے ، وہ اپنے میں ایک ایسی چیز ہاتے ہیں ، جو انکوں کی ہیروی پر ان کو مجبور نہیں ہونے دیتی ۔ ان کو قوم کی شاہ راہ کے سوا بہت سی راہیں ہر طرف کھلی نظر آتی ہیں ۔ وہ جس عام روش پر اپنے ہم فنوں کو چلتا دیکھتے ہیں ، اس پر چلنے سے ان کی طبیعت ابا کرتی ہے ۔ یہ ممکن ہے کہ جو طریق غیر مسلوک وہ اختیار کریں ، وہ منزل مقصود تک پہنچانے والا نہ ہو ، مگر یہ ممکن نہیں کہ جب تک وہ دائیں بائیں چل بھر کر طبیعت کی جولالیاں نہ دیکھ لیں اور تھک کر چور نہ ہو جائیں ، عام راہ گیروں کی طرح آنکھیں بند کر کے شارع عام پر پڑ جائیں ۔

مرزا کی طبیعت اسی قسم کی واقع ہوئی تھی ۔ وہ عام روش پر چلنے سے ہمیشہ ناک چڑھاتے تھے ۔ وہ سخت شرکا کے سبب خود شاعری سے نفرت ظاہر کرتے تھے ، عاسیانہ خیالات اور محاورات سے جہاں تک ہو سکتا تھا ، اجتناب کرتے تھے ۔

مرزا کے اردو کلام میں جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ، غزل کے سوا کوئی صنف شہار کے قابل نہیں ہے ۔ مرزا کی موجودہ غزلیات گو بہ مقابلہ بعض شعراء کے تعداد میں کمسی ہی قلیل ہوں ، لیکن جس قدر منتخب اور برگزیدہ اشعار مرزا کی غزلیات میں موجود ہیں ، وہ تعداد میں کسی بڑے سے بڑے دیوان کے انتظامی اشعار سے کم نہیں ہیں اور جس قدر بلند اور عالی خیال مرزا کے ریختہ میں سے نکلیں گے ، اس قدر کسی ریختہ کے کلام میں نکلنے کی توقع نہیں ہے ؛ البتہ ہم کو مرزا کے عمدہ اشعار کے جانچنے کے لیے ایک جداگانہ معیار مقرر کرنا پڑے گا ۔ امید ہے کہ اہل الصاف تسلیم کریں گے ۔

میر و سودا اور ان کے مقلدین نے اپنی غزل کی بنیاد اس بات پر رکھی ہے کہ جو عاشقانہ مضامین صدیوں اور قرونوں سے اولاً فارسی اور اس کے بعد اردو غزل میں ہندھتے چلے آئے ہیں ، وہی مضامین بہ تبدیل الفاظ اور بہ تغیر اسالیب بیان عامہ ، اہل زبان کی معمولی بول چال اور

روز مرہ میں ادا کیے جاتیں ، چنانچہ میر سے لے کر ذوق ، تک چنے ستیور غزل گو مرزا کے سوا اہل زبان میں گزرتے ہیں ، ان کی غزل میں ایسے مضامین بہت ہی کم نکلیں گے ، جو اس حدود دائرے سے خارج ہوں ۔ ان کی بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو مضمون پہلے متعدد طور پر بندہ چکا ہے ، وہی مضمون ایسے بلیغ اسلوب میں ادا کیا جائے کہ تمام اگلی ہندشوں سے سبقت لے جائے ۔ برخلاف اس کے مرزا نے اپنی غزل کی عبارت دوسری بنیاد پر قائم کی ہے ۔ ان کی غزل میں زیادہ تر ایسے اجنبیے مضامین پائے جاتے ہیں ، جن کو اور شعراء کی فکر نے بالکل مسم نہیں کیا اور معمولی مضامین ایسے طریقے میں ادا کیے گئے ہیں ، جو سب سے ترالا ہے اور ان میں ایسی نراکتیں رکھی گئی ہیں ، جن سے اکثر اساتذہ تاسلام خالی معلوم ہوتا ہے ۔

خلاصہ یہ ہے کہ ، اور لوگوں نے اول سے آخر تک قوم کی شاہ راہ سے مر سو اطراف نہیں کیا اور جس چال سے کہ اگلوں نے طے کی تھی ، اسی چال سے تمام راستہ طے کیا ہے ۔ مرزا نے اول شاہ راہ کا رخ چھوڑ دوسرے رخ چلنا اختیار کیا اور جب راہ کی مشکلات نے مجبور کیا تو ان کو بھی آخر اسی رخ پر چلنا پڑا ، مگر جس لیک پر قافلہ جا رہا تھا ، اس کے سوا ایک اور لیک اسی کے متوازی اپنے لیے نکالی اور جس چال پر اور لوگ چل رہے تھے ، اس چال کو چھوڑ کر دوسری چال اختیار کی ؛ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب میر و سودا اور ان کے مقلدین کے کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھنے دیکھنے ہی اکٹا جاتا ہے اور اس کے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں ، تو اس میں ہم کو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے اور جس طرح کہ ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں یا ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جا کر ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت مشاہدہ کرتا ہے ، اسی طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی سماں نظر آتا ہے ۔“

(مولانا الطاف حسین حالی : یادگار غالب : ۱۹۶۶ء)

”غالب فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے نام آور شاعر ہیں ۔ ان کی فارسی کی غزل سرائی کی نسبت اظہار خیالات ہو چکا ہے ۔ اب ان کی اردو

کی غزل سرائی کی کیفیت عرض کرنے کو ہے ۔ غالب اُن شاعروں میں ہیں ، جو ہر صنف شاعری سے مناسبت رکھتے تھے مگر یہاں اُن کی اردو کی غزل سرائی زہرِ بھٹ ہے ۔ حضرت نے ذوق ، مومن ، ناسخ ، آتش اُن استادوں کے زمانے دیکھے اور اُن سب اساتذہ کے بعد رحلت فرمائی ۔ ذوق سے شاعرانہ سایہ بھی ظہور میں آیا ، مگر مومن سے کیا طور حضرت کا رہا ، فقیر کو نہیں معلوم ۔ ناسخ سے لطف مراسلات حاصل تھا ۔ آتش کے ساتھ موافقت یا مخالفت کی کوئی بات علمِ راقم میں نہیں ہے ۔ اردو کی غزل سرائی کے اعتبار سے مرزا نوشہ بہت قابلِ توجہ شاعر ہیں ۔ اپنی غزل سرائی کی نسبت حضرت فرماتے تھے کہ : ”غزل کوئی کی ابتدا تھی کہ ناسخ مرحوم کا دیوان دہلی میں پہلے چل پہنچا ۔ شیخ کی سخن سنجی کی تمام شہر میں دھوم مچ گئی ۔ میں نے اور مومن نے اُن کا متبع ہونا چاہا ۔ ہم لوگوں نے شیخ مرحوم کے رنگ میں مشقِ کلام کرنا شروع کیا ، مگر شیخ کا رنگ ہم لوگوں میں نہ آیا ۔ مومن مشق کے بعد ویسے ہو گئے جیسا کہ اُن کا رنگ دیکھا جاتا ہے اور ہم میر کے رنگ میں در آئے ۔“ اس جگہ پر یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ مومن اور غالب کے عجز اور تتبع کا سبب اور کچھ نہ تھا ، الا یہ کہ دونوں شاعران نامی اقتادِ طبیعت سے داخلی شاعری کے برتنے کی قابلیت رکھتے تھے ۔ پس ناسخ کی شاعری جو محض خارجی رنگ رکھتی ہے ، کیوں کہ اُن کی خلقِ صلاحیت کے ساتھ موافق پڑی ۔ ہر حال غالب کا یہ فرمایا کہ ہم میر کے رنگ میں در آئے ، واقعات کے بہت بعد نہیں ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کی غزل سرائی میں میر کی جھلک نمایاں ہے ۔ لارہب وارداتِ قلبیہ اور امورِ ذہنیہ کے مضامین غالب قریب قریب میر صاحب کی ہر قافیہ کی ساتھ باندھ جاتے ہیں ۔ مگر حالت یہ ہے کہ اُن کے مختصر دیوان میں بہت کم شعر ہیں ، جو میر صاحب کی سادگی کلام کا لطف دکھاتے ہیں ۔ زیادہ حصہ اُن کے کلام کا استعارات سے بھرا ہوا ہے ۔ اضافتوں کی وہ بھرمار ہے کہ بعض وقت جی گھبرا اُٹھتا ہے کہ الہی اضافتوں کا سلسلہ کب ختم ہو گا ۔ الفاظِ فارسی کی وہ کثرت دیکھی جاتی ہے کہ یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے اشعار زیرِ نظر ہیں یا فارسی کے ۔ ان باتوں کے علاوہ کبھی کبھی اخلاقی مضامین کا وہ عالم دکھائی دیتا ہے کہ ادراک اپنے فعل میں قاصر ہونے لگتا ہے ۔ بلاشبہ اُن کے ایسے

کلام کوئی لطف غزلت نہیں رکھتے۔ اگر ان کے دیوان کا کوئی انتخاب جدید کیا جائے تو لازم ہے کہ ایسے ایسے مغلّی اشعار خارج از دیوان کر دیے جائیں۔ لیکن ان معائب سے گزر کر اگر اس یکتائے روزگار کے کلام کو انصاف کی نگاہ سے دیکھیں تو پھر حسن کی کوئی انتہا بھی نظر نہیں آتی۔ واقعی جو سوز، گداز، خستگی، درد، برستگی، تشریت، بلند پروازی، فزک خیالی، مکت، متانت، جلالت، تہذیب، شوخی غالب کے کلام میں ہے، باستانائے درد و میر کسی استاد کے کلام میں نہیں پائی ہے۔ تشریت تو ایسے غضب کی ہے کہ میر صاحب کے کلام میں بھی اس سے زیادہ نہ ہو گی۔ ہر تاثیر کا کیا کہنا، دل بے اختیار چلا اٹھتا ہے کہ غزل سرائی اسے کہتے ہیں۔ شوخی کا وہ عالم ہے کہ طبیعت بے چین ہوتی جاتی ہے۔ عالی مذاق روح کو عالم بالا کی سیر دکھاتی ہے۔ واردات قلبیہ کے مضامین کی خوبی جذباتی معاملات کے تماشے پیش نظر کر دیتی ہے اور مختصر یہ ہے کہ حضرت کے کبالات گوناگوں کا وہی قائل نہ ہو گا، جسے قلبی نعمتوں سے لطرت نے محروم رکھا ہے۔“

(سید امداد امام اثر: کاشف الحقائق معروف بہ ہارستان سخن: ۱۸۹۷ء)

”... غالب کی غیر معمولی شاعری بلاشبہ اس سے زیادہ شہرت کی حق دار ہے، جو اسے اب تک نصیب ہو چکی ہے اور یورپ کو بھی یہ جاننا باقی ہے کہ کچھ عرصہ پہلے ۱۸۶۹ء میں ایک ایسے شخص نے انتقال کیا، جس کے قصیدے انوری اور خاقانی کے ہم بلد ہیں۔ جس کی غزلیں عرفی اور طالب کی غزلوں سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ جس کی رباعیاں عمر خیام کی رباعیوں کے برابر رکھنے کے قابل ہیں اور جس کی نثر ابوالفضل اور ظہوری کی نثر سے زیادہ شان دار ہے۔“

آخر ہمارے شاعر (غالب) کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں؟ اس کی نثر اور شاعری، خودنوشت - واقع عمری کے ایسے ٹکڑے ہیں، جن سے ہمیں اس کی زندگی کے بارے میں بصیرت حاصل ہوتی ہے، جو سراسر بیزاری اور شدید کشمکش کی زندگی تھی۔ جہاں تک اس کے معاصرین کا تعلق ہے، ان کی زندگی تکلیف دہ بے اعتنائی کی زندگی تھی اور جہاں تک اس کے دوستوں کا تعلق ہے، ان کی امداد میں کم اتفاق کا جذبہ کار فرما تھا۔ غالب لازماً

خود شناسی کا شاعر ہے۔ وہ زندگی اور زندگی کے جملہ پہلوؤں کا گیت گاتا ہے۔ وہ ہادہ ارغوانی اور جام کے گیت گاتا ہے۔ وہ اپنے دل کو اپنے قارئین کے سامنے چیر کر رکھ دیتا ہے۔ اور خود اپنی زندگی کی تلمیحوں، اپنی قسمت کی کوتاہیوں، اپنی مراب نما امیدوں (جو کبھی پوری نہیں ہوتیں)، اپنی عذاب میں ڈالنے والی فلاکتوں، اپنی ناکام کوششوں، اپنے شبہات، جن میں کبھی کبھی خدا تعالیٰ کی نیکی اور انصاف پسندی کے مسرت بخش اعتقاد کی جھلک نمایاں ہو جاتی ہے، اپنی شاعری کے لافانی ہونے پر ناقابل تسخیر اعتقاد کے لغے گاٹا ہے۔ الغرض اس کی نثر اور شاعری اس کے مختلف اور تغیر پذیر حالات کی یاد دہا رہی ہیں۔ اس میں کبھی ہر مسرت توقع کی کدھت پائی جاتی ہے اور کبھی ایسی نیرنگی کی، جس کی تہاہ نہیں ملتی۔

غالب اعلیٰ درجے کا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجہ کا نثر بھی ہے۔ وہ ہمارے دور کا سب سے بڑا نثر نگار ہے، اتنا بڑا کہ اس کا کوئی مد مقابل نہیں۔ اس کی دل فریب لطافت، اس کی مسرت بخش سادگی، اس کی نکتہ ستیجی اور ظرافت، اس کی دل کش روانی، اس کا ہلکا پھلکا انداز بیان، اس کی بے ساختگی اور دل ربائی، یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ ان سے بہت لمے جانے والا تو کیا حریف بھی پیدا نہیں ہوا۔ یہ مبالغہ آسیر تعریف نہیں ہے بلکہ وہ ممتاز رائے ہے، جو اس کے ممتاز سوانح نگار حالی بانی ہی نے قائم کی ہے۔ اس کے علاوہ غالب کے کلام کا ایک اور پہلو ہے جس پر ہم جاں اظہار خیال کر سکتے ہیں۔ اس کے خیالات نہایت بلند، دقیق اور نازک ہیں اور وہ اتنے ہی خودرو ہیں، جتنے کہ وہ الفاظ حسین ہیں، جن میں ان کو ادا کیا گیا ہے۔ اس کے اردو اور فارسی دیوان ادبی جواہرات ہیں، دودھیا پنھر، یاقوت رسانی اور نیلم، سب ایک مرکب کی صورت میں پیش کیے گئے ہیں۔“

(اصلاح الدین خدابخش: Ghalib: An Appreciation) : (۱۹۱۶ء) اردو ترجمہ
از ضیاء الدین احمد برنی، ماہ نو، کراچی : فروری ۱۹۵۷ء)

”فلسفہ کے نام سے گھبراہٹیں نہیں۔ فلسفہ موٹے موٹے نامانوس لغات کا معمم ثقیل و مغلی اصطلاحات کا نام نہیں، فلسفہ نام ہے، خود شناسی

کا ، زندہ ہے خدا شناسی کا ۔ ہم کون ہیں ؟ کیا ہیں ؟ ہمارے گرد و پیش کیا ہے ؟ ہمارے جذبات کیا ہیں ؟ عادات و اطوار کیا ہیں ؟ خدا کیا ہے ؟ ماسوا کیا ہے ؟ بس جس روزمرہ کے مسئلے ہیں ، جن سے ہم کو ، آپ کو ، سب کو دو چار ہونا پڑتا ہے ، کبھی جان کر ، اور کبھی اللہ انہیں عقلی اصول پر ایک خاص نظام کے ماتحت ترتیب دے لیجے اور لیجے آپ فلسفی ہو گئے ۔ پھر غالب غریب ، کائنات اور ہیگل کے کینٹے کے تو انسان تھے بھی نہیں ۔ ایک خوش باش ، زندہ دل ، خوش فکر ، طبیعت دار آدمی ۔ باتیں کرتے تو ذرا گہری ، نظر سطح کی نہیں ، عمق کی عادی ۔ چھلکے پر پڑ کر بھسل جانے والی نہیں ، مغز تک پہنچ جانے کی خوگر ۔ سوجھ بوجھ غضب کی ۔ اپنے ان حکیمانہ تجربوں اور عارفانہ مشاہدوں کو ادا کرنے ، تو کبھی بیماری نثر میں ، کبھی دل آویز نظم میں ۔ کبھی شعر کا ساز بانہ میں اٹھا لیتے ، کبھی نثر کے مائیکروفون کو منہ لگا لیتے ۔ شہرت شاعری کی زیادہ ہو گئی ، ورنہ تحقیق کی زبان سے روایت یہ سننے میں آتی ہے کہ نظم و نثر دونوں کے ماہر تھے ، مالک تھے ، بادشاہ تھے ۔ نثر لکھنے بیٹھے تو قلم میں یہ قدرت کہ جب چاہا روتوں کو ہنسا دیا ۔ جب چاہا ہنستوں کو رلا دیا ۔ شعر کہنے پر آئے تو زبان میں یہ اثر کہ سننے والوں کو لٹا دیا ، سر جھائے دلوں کو کھلا دیا ! فطرت بشری کے راز دار ہی جو ٹھہرے اور حکمت و معرفت کے شیدائی ۔ معنویت کے بول لطافت و ظرافت کے سروں میں الایتے ۔ ابھی آہ کا رنگ جا دیا ، ابھی واہ کا نقش بٹھا دیا ۔ یہی ان کی حکمت ، یہی ان کا فلسفہ ، یہی ان کی شاعری کا پیام ، یہی ان کی زندگی کا کارنامہ ۔“

(مولانا عبدالجبار دریا آبادی : ادیب ، الہ آباد : ۱۹۷۳ء)

”ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں ، مقدس وید اور دیوان غالب ۔ لوح سے کمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں ، لیکن کیا ہے ، جو یہاں حاضر نہیں ، کون سا نغمہ ہے ، جو اس کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے ۔ شاعری کو اکثر شعرا نے اپنی اپنی حد نگاہ کے مطابق حقیقت اور مجاز ، جذبہ اور وجدان ، ذہن اور تخیل کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے ، مگر یہ تقسیم خود ان کی نا رسی کی دلیل ہے ۔ شاعری انکشاف حیات

ہے جس طرح زندگی اپنی نمود میں محدود نہیں، شاعری بھی اپنے اظہار میں
لا تعین ہے۔

جمال الہی پر شے میں رونما ہوتا ہے۔ آفرینش کی قدرت جو
صفات باری میں سے ہے، شاعر کو بھی اِزانی کی کٹی ہے۔ جہاں ملائکہ
کارخانہٴ ایزدی میں پوشیدہ حسن آفرینی میں مصروف ہیں، شاعر یہ کام
علی الاعلان کرتا ہے۔

اس لحاظ سے مرزا کو ایک رب النوع تسلیم کرنا لازم آتا ہے۔
غالب نے بزم ہستی میں جو قانون خیال روشن کیا ہے، کون سا
”پیکر تصویر“ ہے، جو اس کے ”کاغذی پیراہن“ پر منازل زیست قطع کرتا
ہوا نظر نہیں آتا۔

۔۔۔ مرزا غالب کے الفاظ لعل و جوہر سے بھی گراں ہیں۔ مرزا غالب
اس بات سے خوب واقف ہیں کہ مترادفات کو محض مؤلفات لغت نے
طلبہ کی سہولت کی غرض سے وضع کر لیا ہے، ورنہ ایک معنی کے
دو الفاظ کسی زبان میں نہیں ہیں۔ نوام مجھے کتنے ہی ہم صورت ہوں،
ان کو ایک دوسرے کی عارضی غیر حاضری میں بھی ایک سمجھنا فاش غلطی
ہے۔ مرزا الفاظ کے نازک سے نازک فرق کو خوب جانتے ہیں۔ وہ ادیبان
فرانس کی طرح عقیدہ (Most Proper) کے پابند اور قابل ہیں۔ دیوان کے
مطالعے سے معلوم ہو گا کہ مرزا نے ایک لفظ جہاں تک ہو سکا ہے، دوبارہ
استعمال نہیں کیا۔ اس کی وجہ صحیان وائل کی طرح یہ نہیں ہے کہ وہ
کسی لفظ کی تکرار نہیں کرتے بلکہ یہ ہے کہ وہ کسی خیال کا اعادہ
نہیں کرتے۔

جہاں مرزا نے الفاظ میں نادر اور شستہ تصرفات سے کام لیا ہے،
وہیں تشبیہات اور استعارات میں بھی عام پابندی سے گریز کیا ہے۔
تشبیہات اور استعارات کی بنیاد قیاس پر قائم ہے۔ تشبیہ یا استعارے کا
پہلا کام معنی آفرینی ہے۔ کسی امر کو کتنا ہی واضح بیان کیا جائے،
ذہن مفہوم کے پانے سے قاصر رہتا ہے لیکن ایک مشابہ مثال کام دے
جاتی ہے۔ بہت سے دشوار اور غریب اشعار حل نہیں ہوتے لیکن ایک
مقابل شعر فوراً مضمون کو آگاہ بنا دیتا ہے۔ تشبیہ یا استعارے کا دوسرا

کام حسن آفرینی ہے۔ تشبیہات اور استعارات تصویر نظام کے دو قلموں الوان ہیں، جن کی آمیزش بغیر تصویر اکثر تکمیل حیات کو نہیں پہنچتی اور بے رنگ رہ جاتی ہے۔ تشبیہ یا استعارے کا تیسرا کام اختصار اور بلاغت پیدا کرنا ہے۔ جو بات دو لفظوں میں ادا ہو جاتی ہے، دوسری طرح دو سطروں میں بیان نہیں ہو سکتی۔

مرزا غالب کی چشم بینا قدرت کو تمام نقاط نگاہ سے دیکھتی ہے اور ہر نظر میں ایک نیا جلوہ ہوتا ہے۔ جو شعرا قدرت کے ترجمان ہیں، ان میں سے اکثر سعدی اور وردزورتھ (Wordsworth) کی طرح قدرت سے نمائشائے بہار و خزاں، باغ و راع، کمسار و آبشار مراد لیتے ہیں۔ غالب کے مشاہدات کنار دریا، دامن کوه، لب جو سے بہت کم متعلق ہیں۔ مرزا کا جی لب دریا، خاموش مرغزاروں سے زیادہ شہروں کے ہر شور و کوچوں میں لگتا ہے، جہاں زندگی شعاع مشترک کی طرح ہفت رنگ جلوہ دکھاتی ہے۔ مرزا کے نزدیک دلی کی گلیوں کی رونق یا ویرانی، خوش وقتی یا السردگی، شورش یا خاموشی خود ان کے اپنے احساسات کی خارجی تصویریں ہیں۔ جو صورتیں ادھر ادھر رواں دواں نظر آتی ہیں، وہ مرزا کے نزدیک ان کے اپنے خیالات کے مجسمات ہیں۔ ان کو القا کے لیے سرو و چنار کو شب و سہا، لب آب، صحبت یار میں یا شاعر و نئے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اگر کسی اپنی ہوئی عبارت پر نصب شدہ جر ثقیل کا آہنی حلقہ بھی رسی میں آویزاں دیکھتے ہیں تو ان کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا سیمرخ اپنا جنگل آسمان سے تارے ٹوڑنے کے لیے دراز کر رہا ہے۔ جن مظاہر قدرت کو مرزا دیکھتے ہیں اور شعرا یا تو ان کو عام خیال کر کے ان پر غور ہی نہیں کرتے یا ان میں اس درجہ شعریٹ نہیں پاتے کہ ان کی کیفیت کو اپنے کلام میں بیان کریں اور اگر کرتے ہیں تو کلیات نہیں ہوتے۔“

(ڈاکٹر عبدالرحمن یحیوی : مقدمہ دیوان غالب جدید المعروف

بہ نسخہ حیدرہ مرثیہ مفتی محمد انوار الحق : ۱۹۱۹ء)

”کلام غالب کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ ظاہر ہو گا کہ اس کا اصلی رنگ ذہنی اور دماغی ہے۔ زندگی بھر شاعر کی یہ آرزو رہی کہ

وہ فکر و اظہار میں اچھوتا معلوم ہو اور ایک لحاظ سے اس کا یہ مقصد بورا بھی ہوا ، لیکن اس سے اس کی شاعری ماری گئی ۔ اس کے اردو کلام میں شاعری سے زیادہ فن بلکہ صنعت گری نمایاں ہے اور احساس سے زیادہ فکر و تخیل یا خیال آرائی کے آثار پائے جاتے ہیں ۔ جہاں احساس کے نشان پائے بھی جاتے ہیں ، وہاں عقل کا رنگ جڑھانے کی محسوس کوشش ظاہر ہوتی جاتی ہے ۔ حال کی اردو تنقیدوں نے غالب کو عجیب و غریب قوتوں سے مالا مال کر دیا ۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے شاعرانہ لطف کی خاطر وہ تمام کائنات کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے ۔

”لوح سے سمت تک شکل سے سو منہجے ہیں لیکن کیا ہے ، جو جہاں حاضر نہیں ہے ۔ کون سا نفس ہے ، جو اس ساز زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے ۔“

یہ چیز وہ رہ کر لٹا میں گونجتی رہتی ہے ۔

یہاں دیوان سو اس کی کہانی سیدھی سادی ہے ۔ ہر زمانے میں عزل گو شعرا نے شیخ و برہمن کی بے بہتیاں آڑائیں ، صوفیوں اور فلسفیوں کی شان اختیار کی ، ملک پر شکایتوں کے تیر برمائے ، اپنی شاعرانہ برتری کے گیت گائے ، عاشق کا سوا لگ بھرا ، شاعر کے دور چلانے اور اسی قسم کے بہت سے محاشے کیے ۔ غالب نے اس ہمال راستے سے کچھ زیادہ کنارہ کشی نہیں کی ۔ وہی پرانے موضوع اس کو اپنی شاعرانہ جولانی کے لیے ہاتھ آئے ۔ البتہ ان پر اس نے عقل کے نئے پردے ڈال دیے ۔ اگر اس نے کوئی نئی زمین تلاش بھی کی ، تو وہ پاس و حرماں کی زمین تھی ۔ نئی زمین تلاش کرنے سے ہماری یہ مراد ہے کہ حرماں نصیبی کے پرانے موضوع نے اس کی اندرونی طبعیتانی سے ایک شخصی رنگ اختیار کر لیا ۔ یہ وہ مقام ہے ، جہاں وہ الگ کھڑا ہوا نظر آتا ہے اور ایک ایسے شخص کی تصویر پیش کرتا ہے ، جو زندگی کے مادی چلو سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے ، لیکن حالات اور دنیاوی خواہشات پر مسلط ہونے والی دیویاں اس کی راہ میں حائل ہیں ۔

کلام غالب تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ پہلا حصہ ان اشعار پر مشتمل ہو سکتا ہے ، جو رسمی طرز میں علانیہ ذہنی مشق کا نتیجہ ہیں ۔ یہی وہ بلند پروازیاں ہیں ، جو غزل گوئی کا میدان چیتے کی

خاطر شاعر نے دکھائیں اور جن کا ذکر حالی نے 'ہادگار غالب' میں کیا ہے۔ یہاں شاعر غزل گوئی کے وہی پورے ڈگر سے گزرتا نظر آتا ہے۔ وہ کبھی بھبتیاں اڑانے میں مصروف ہے، تو کبھی عاشق کے روپ میں جلوہ گر ہے۔ کبھی صوفی بنتا ہے اور کبھی فلسفی۔ غرض کبھی کبھی ہے اور کبھی کبھی۔ لیکن چونکہ وہ جدت طرازی پر تلا ہوا ہے، اس لیے اپنے ہر رسمی پہلوئے سخن پر عقلی قیہ اوڑھا دیتا ہے۔

کلام غالب کی منبولیت کی سب سے بڑی وجہ اس کا حیرت انگیز انواع، جسے ڈاکٹر عبدالرحمن نے نہایت نفیس طریقے سے بیان کیا ہے: "الوح سے نکت مشکلی سے سو صفحے ہیں۔ لیکن کیا ہے، جو یہاں حاضر نہیں۔ کون سا نغمہ ہے جو اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں۔" مرزا کی شاعری بیشتر عشق و محبت کا بیان ہے۔ لیکن منطق آئے تو اس کے لیے یہاں دلائل و براہین ہیں۔ شکستہ طبع لوگوں کے لیے شوخی اور ظرافت اور انسانی فطرت کی داستان سنا ہو تو یہاں وہ اپنے کی باتیں ملیں گی، جن کا لطف جوں جوں چشم نصیرت کھلتی جاتے گی، بڑھتا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ دیوان غالب میں ہر شخص اپنی تصویر دیکھتا ہے اور لطف اٹھاتا ہے۔

لیکن ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ اس ساڑ میں نغموں کی فراوانی اور ہر نغمے کی دل آویزی کی وجہ یہ ہے کہ کلام غالب سنی سنائی باتوں کا بیان نہیں، بلکہ قلب غالب کے مشاہدات کا آئینہ ہے۔ اس رباب پر دست قدرت نے ایک ایک کر کے سارے سر بچائے ہیں اور دیوان غالب انہی سروں کی جدائے باز گشت ہے:

زخمہ بر تارِ رگ جان میزوم

کس چہ داند یا چہ دستاں میزوم

(شیخ محمد اکرام: غالب نامہ: ۱۹۳۶ء)

غالب کے اردو اور فارسی کلام میں حسن و عشق کو ایک نمایاں جگہ حاصل ہے۔ تعداد کے لحاظ سے پورے کلام میں اس مضمون کے اشعار آدھے تو نہیں مگر ایک تہائی کے قریب ضرور ہوں گے۔ ان اشعار میں وہی انواع، جدت طرازی اور نکتہ آفرینی نظر آتی ہے، جو دیوان اور کلیات

کے دوسرے مضامین کا امتیاز خاص ہے۔ اگر مرزا غالب اپنے کلام کا صرف یہی حصہ چھوڑ جائے تو بھی اُن کا شمار دنیا کے بڑے شاعروں میں ہوتا۔ ان اشعار میں محض رنگا رنگ طلبات کے بند دروازے ہی نہیں کھلتے، ان میں شاعری کی ایک نئی دنیا کا انکشاف ہے۔ اس دنیا کی آب و ہوا ہر طبیعت کو سازگار نہیں ہے اور نہ ہو سکتی تھی، لیکن اس کی وسعت اور بوقلمونی کا یہ عالم ہے کہ ہر موقع کی مناسبت سے دل کشا مناظر بکثرت ملتے ہیں۔ انسانی لطرت کے نامحدود پہلو جذبہٴ عشق کے ماتحت جس جس طرح سنوئے، بگڑتے، بگھلتے اور ڈھلتے ہیں، اُس کی ترجمانی میں شاعر نے اپنا تمام جوش تخیل اور پورا زور قلم صرف کیا ہے۔

غالب کے کلام میں اجتہاد کے پہلو بہ پہلو روایت کی پاس داری ہے جو شغف ہے، وہ عشقہ شاعری میں بھی قائم نظر آتا ہے۔ غزل کے روایتی عاشق، مجنوں سے لے کر ہروائے تک اور روایتی معشوق، لیلیٰ سے لے کر شمع محفل تک، سبھی یہاں موجود ہیں۔ ان اشعار کا پس منظر مغلیہ دور کی وہی معاشرت ہے، جو غالب کے معاصرین کے کلام میں بھی جھلکتی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے بیان میں اسے زیادہ وسعت، شدت اور وضاحت میسر ہوئی ہے۔ لیکن یہ درجے کا فرق ہے، کیفیت کا نہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ معاشرتی پس منظر کے لحاظ سے غالب اور اُس کے ہم عصر شعرا میں ایک بنیادی اشتراک ہے۔ اس مشترک کیفیت کے ہونے ہوئے بھی غالب کی شاعری میں حسن و عشق کا ایک الگ مقام ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ شاعری کی اپنی شخصیت کی یکسانی نے اس حصہٴ کلام کو بھی ایک بالکل دوسری سطح پر پہنچا دیا ہے۔

غالب کا پانچواں انسانیت کی نقیض پر ہے اور یہ نقیض آج بھی اُسی طرح چلتی ہے، جس طرح سو برس، پانچ سو برس، ایک ہزار برس پہلے چلتی تھی۔ عشق گلیوں سے نکل کر محل سراؤں میں پہنچ جائے تو صرف اس کا خول بدل جاتا ہے، مغز نہیں بدلتا۔ غالب کی شاعری میں عشق کا جو ڈراما ہمیں ملتا ہے، اُس کا پس منظر چھوٹے چھوٹے اشاروں، چھپے چھپے کتابوں کی روشنی میں بتدریج واضح ہونے لگتا ہے اور بالآخر گزری ہوئی صدیوں کا وہ ناموجود ماحول اس طرح زندہ ہو جاتا ہے کہ مغلیہ ہندوستان کی زندگی کے عیش و نشاط اور لطافت و کثافت کا پورا ڈراما ہمارے سامنے

آ جانا ہے ۔ شاعری تاریخ نہیں ہوتی لیکن غالب کا کلام اسلامی ہندوستان کی سماجی اور روحانی تاریخ کا خلاصہ ہے ۔ جس کا جی چاہے آج بھی غالب کے اشعار کے بین السطور میں اس پرانی زندگی کو ایک بار پھر زندہ دیکھ لے ۔ یا اس ہمہ ایک بنیادی حقیقت کی بھی بھولنی چاہیے اور وہ یہ کہ گو غالب کی شاعری میں عہد مغلیہ کے رسم و رواج نے انسان کا چہرہ اپنے مخصوص آب و رنگ سے چمکایا ہے لیکن ان اشعار میں اس چہرے کا پیدائشی نور آج بھی اسی طرح قائم ہے ، جس طرح ایک سو برس پہلے تھا ۔“

(پروفیسر محمد احمد خاں ؛ بہاؤں ، لاہور ؛ جنوری ؛ فروری ۱۹۴۹ء)

”مجھ سے اگر یہ پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف یہ ابن نام لوں گا ؛ غالب ، اردو اور ناچ محل ۔ یہ ہندوستان کی تہذیبی پیداوار ہیں اور سوا ہندوستان کے کہیں اور ظہور نہیں پا سکتے تھے ۔ ان تینوں میں ہندوستان کی صوری اور معنوی امتیازات جھلکتے ہیں ۔ غالب نے طویل عمریائی اور اس زمانے میں طویل عمر پائی ، جو دم بہ دم متہدم اور متغیر ہو رہا تھا ۔ وہ میر نہ تھے کہ عہد کے حادثات اور خود اپنے حادثات سے تمام عمر جانبر نہ ہوتے ۔ وہ ذوق نہ تھے کہ شاعری کے دھڑے سے جدا نہ ہو سکے ۔ وہ سوسن نہ تھے کہ حباب ہر لفتی بنائے رہے ۔ وہ ظفر نہ تھے کہ سلطنت ہاتھ سے نہ جاتی تو شاید شاعری میں کوئی جگہ پیدا نہ کر سکتے ۔ ظاہر ہے ، غالب صرف شاعر نہ رہے ہوں گے ، بہت کچھ اور بھی رہے ہوں گے ۔“

وہ ہر چیز کے بڑے دلدادہ تھے ، فارسی کے اپنے ذوق و زبان پر بھروسہ اور بغیر کرتے تھے ۔ آگرہ سے دلی آئے تو دلی کے شاعروں اور زبان دانوں سے ٹکر ہوئی ۔ کلکتہ پہنچے تو فارسی دانوں سے پرغاش چھڑی سیاسی داروگر کی زد میں آئے ۔ خاندان کے نواسی مقامات میں الجھے رہے ۔ ایک سلسلے میں جیل خانے کی مصیبت اور رسوائی جھیلی ۔ کلکتہ میں مغرب سے آنے والی طرح طرح کی ہواؤں سے سابقہ رہا ۔ غدر میں لٹے ، تنگ دستی نے سرتے دم تک ساتھ نہ چھوڑا ۔ انگریزوں کی خدمات میں معروضات پیش کیے اور قصیدے گزرائے ، والیان ریاست کے حضور میں گڑ گڑائے ، ان قدروں کو مسبار ہوتے دیکھا ، جن کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے ، لیکن نہ وہ میر بنے ، نہ فانی ، نہ پاس چنگیزی وہ تمام حوادث کو :

مرے دریائے بے تابی میں ہے اک موجِ خوں وہ ادبی
کہہ کر بقول حالی حیوانِ ظریف (سمِ ظریف) ہیں رہے ۔ سمِ ظریف ہونا
اور رہنا امتیاز ہے ، جو غالب کے زمانے میں غالب کے سوا اور کہیں نظر
نہیں آتا ۔

غالب نے غزل کو تہذیب کا درجہ دیا ۔ جس سے آج ہمارے اچھے
اچھے شاعر کو مفر نہیں ۔ غزل اب اتنی صنفِ کلام نہ رہی جتنی وہ اردو
کی تاثیر اور تقریر بن گئی ہے ۔ غالب نے نظم و نثر دونوں کو دلیری بھی
دی اور دلیری بھی ۔ غزل کی تقدیر غالب ہی نے متعین کی اور اس کو
ایک ایسی فضا دی ، جہاں اردو کے تمام نمکناک شعری و شاعری کو
ہرگ و بار لانے کے سامان اور سہولتیں فراہم ہیں ۔ ”

(پروفیسر رشید احمد صدیقی : کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا
(علی گڑھ میگزین غالب مجلہ : ۱۹۵۹)

میں اردو میں غالب کی شخصیت کو جلی پھر پور اور جاندار
ادبی شخصیت کہنا ہوں ، جس کا ہر پہلو ہمارے اُچے دلچسپی اور لطف
کا سامان رکھتا ہے ۔ ان کی روایت انہیں تجربات و کیفیات کی
نئی نئی فضاؤں میں لے جاتی ہے ۔ اور ان کا تنقیدی شعور اس میں کلاسیکل
خط و نظم پیدا کر دیتا ہے ۔ ان کی انانیت میں انفرادیت کی جہازیں ہیں ۔
اور برنارڈ شا کی انانیت کی طرح کیف و انبساط کا سامان ۔ ان کی شاعری
میں فکر کا گہرا سرمایہ ہے ، جو شاعرانہ لطافتوں کے ساتھ سمویا گیا ہے ۔
وہ ادب کی روایات سے یکسر باغی نہ ہوئے ہوئے بھی ان کے پابند نہیں
ہیں ۔ وہ زندگی کے تجربات میں کوئی وحدت تو نہ پیدا کر سکے ، کوئی
فلسفہ زندگی تو پیش نہ کر سکے ، مگر ان کا فلسفیانہ اور حکیمانہ مزاج ہمیں
زندگی کو سمجھنے اور اس کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے ۔ وہ ادب
کو ہمارے یہاں پہلے مرتبہ زندگی میں ایک بڑا مقام دیتے ہیں اور اس طرح
زندگی کی ایک اہم خدمت انجام دیتے ہیں ۔ وہ گہرے اور ہلکے ، ہر قسم
کے نقش تیار کر سکتے ہیں ۔ ان میں دیو زادوں کی وسعت خیال اور جوہریوں
کی سس مینا کاری دونوں مل جاتے ہیں ۔ ان کی شاعری ، ہمیں زندگی میں
آسودگی ، اطمینان و سکون ، قنوطیت ، انتعالت کی طرف نہیں لے جاتی ۔

ایک لطیف ذہنی خلش ، ایک بے چینی ، ایک تجسس ، ایک آزاد اندازِ نظر کی طرف مائل کرنے ہے ۔ ان خطوط میں ہمیں فنِ کاری کی وہ جرأت و صداقت مائی ہے ، جو اپنے سامنے سے ہر حجاب کو اتارنے کے لیے تیار رہتی ہے ۔ جو ایسی ہی نظر آنا چاہتی ہے ، جیسی وہ ہے ۔

یسویں صدی کی اردو نثر و نظم میں غالب کے اشارات سے کسے کسے نقش و نگار بنائے گئے ہیں ، ان کے اجمال کی کسی کسی تفصیلات ملتی ہیں ، نثر و نظم دونوں میں گہرائی کے لیے لوگ اب بھی غالب کے کسی قدر نمونہ احسان ہیں ، اس کے متعلق زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں غالب اب بھی ہمارے شریکِ غالب ہیں ۔

(آل احمد سرور : علی گڑھ میگزین ، غالب نمبر : ۱۹۴۹ء)

”ادب و شعر میں مرزا کی رفعت و برتری اب کسی شرح کا محتاج نہیں رہی۔ جامعیت ان کی نمایاں ترین خصوصیت ہے ۔ بے خائبہ“ مبالغہ ہندوستان نے اسیر خسرو کے بعد ان جیسا جامع شخص پیدا نہیں کیا ۔ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے یگانہ شاعر تھے ۔ حافظ اور نظیری کی طرح محض غزل اور قصیدے ہی میں نہیں بلکہ تمام اصنافِ سخن میں ان کی رفعتِ مراتب سب کے نزدیک مسلم ہے ۔ غزل ، قصیدہ ، رباعی ، مثنوی ، ترکیبِ بند ، ترجیع بند ، قطعہ ، مرثیہ ، نوحہ و غیرہ کوئی صنفِ نظم نہیں ، جس میں ان کا ہایہ یکساں بلند اور مختلف اصناف کے مشاہیر اساتذہ کے برابر نہ ہو ۔ اردو نظم میں اگرچہ ان کا کلام نہوڑا ہے لیکن جتنا ہے ہر لحاظ سے اردو زبان کا گراں بہا ترین سرمایہ ہے ۔ بھر مرزا فارسی نثر کے یگانہ ادیب تھے ۔ فارسی کالیات نثر میں ہر رنگ اور ہر انداز کی تہیں موجود ہیں ۔ ابوالفضل کا سرمایہ ”شہرت صرف نثر نگاری تھا ۔ مرزا نثر میں اس سے بچھے نہیں اور نثر نگاری ان کے کمالاتِ فطری کی بہارِ آفرینی کا محض ایک کرشمہ ہے ۔ اردو نثر میں ان کے صرف مکالمے ہیں یا چند تقریظیں اور دیباچے ۔ لیکن حسنِ کلام ، لطفِ بیان ، روانی و السجام ، بے ساختگی اور دل آویزی میں نثر کا ایسا جلیل الشان مجموعہ نہیں مل سکتا ۔

(مولانا غلام رسول مہر : خطوطِ غالب : ۱۹۵۱ء)

”جب بھی غالب کی شاعری کا ذکر آتا ہے تو ہماری نظر سب سے پہلے یا تو ان کے کلام کی آفاقیت پر جاتی ہے ، جہاں وہ پوری انسانیت کے ترجمان ہیں یا پھر ان کے کلام کے ایسے حصوں پر ، جہاں انہوں نے انسان کے عنصری جذبات کی ترجمانی کی ہے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ غالب کی وسیع النظری اور نفسیاتی ژرف بینی دونوں ہی لائق مدح و داد ہیں اور ان کی بنائے دوام کے ضامن ۔ لیکن ناوقتیکہ ہم ان کے کلام کی تاریخی اہمیت کو نہ جانیں ، یا یہ کہ انہیں ایک مخصوص تاریخی تہذیبی ماحول میں لکھ کر نہ دیکھیں ، اس کا خطرہ باقی رہتا ہے کہ کہیں ہماری وہ تحسین ، تحسین فاشناس بن کر نہ رہ جائے کیوں کہ کسی بھی شاعر کے کلام کی عمومیت اور آفاقیت اپنی قوم اور تاریخ زندہ اور ہم عصر تاریخ سے بے نیاز ہونے میں نہیں بلکہ اس سے دست و گریباں ہونے ، اس کی کشمکش کو سمجھنے اور پھر اسے عالمی تہذیب کے ارتقائی رجحانات سے نسبت دینے میں ہے ۔“

(ممتاز حسین : غالب ایک تہذیبی قوت)

”محض نفسیاتی مطالعہ غالب کے شعور کی بنیادوں تک پہنچنے میں پوری طرح مدد نہیں دیتا ، اس سے اس وقت مدد مل سکتی ہے ، جب غالب کے ماحول کا مطالعہ صحیح ہو ۔ ان خارجی عوامل کا صحیح یا تقریباً صحیح تجزیہ کر لیا گیا ہو ، جو نجی پسند ذہن کے انفرادی ، اجتماعی اور طبقاتی شعور کی تشکیل کرتے ہیں ۔

۔۔۔ غالب نے نظام و نثر میں جو کچھ لکھا ہے ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی معلومات محض کتابی نہیں ہیں ، بلکہ اپنی ذہانت اور ذاتی تجربہ کی وجہ سے وہ تصورات سے آگے جاتا چاہتے تھے ۔ نئی باتوں کو سمجھنا اور نئی اہمیتوں سے دلچسپی لینا چاہتے تھے ۔ چنانچہ جب ان کی آخری عمر میں دہلی سوسائٹی قائم ہوئی تو اپنی ضعیفی اور معذوری کے باوجود ، انہوں نے اس سے دلچسپی لی اور کوشش کی کہ لاہور کی اہمیتوں کے متعلق معلومات فراہم کریں ۔ وہ اخبارات پڑھتے اور دنیا کی خبروں سے باخبر رہنا چاہتے تھے ۔ اسی وجہ سے وہ اس بات سے واقف تھے کہ اگر

ہے عمل کی زندگی ختم ہو جائے تو کچھ نہ کچھ ہو رہے گا ۔ دنیا امکانات سے بھری ہوئی ہے ۔“

(پروفیسر سید اعشام حسین : غالب کا تفکر ،
تنقید اور عملی تنقید : ۱۹۵۵)

”اردو میں غالب کی آواز پہلی آواز ہے ، جو دل و دماغ دونوں کو مخاطب کرتی ہے ، چونکاتی ہے ، غالب کے اشعار احساس اور فکر دونوں کو چھیڑنے ہیں اور دونوں کو آسودہ کرتے ہیں ۔ غالب کو اردو کا پہلا مفکر شاعر کہنا غلط نہ ہوگا ۔ اس کے کلام کے مطالعے سے ہم کو یہ سبق ملتا ہے کہ انسان کی زندگی میں جذبات یا جذباتی سپردی ہی سب کچھ نہیں ۔ بلکہ ہم کو بہت کے ساتھ اپنے تمام خارجی حادثات و حالات اور ذہنی کوائف و واردات کا جائزہ لینا چاہیے اور ان کی اصلیت پر عارفانہ عبور حاصل کرنا چاہیے ۔“

(پروفیسر مجنوں گورکھ پوری : دیوان غالب اور ادور لجزل : ۱۹۵۶)

”مرزا (غالب) کی مقبولیت زیادہ از ریختہ کے مرہون بنت ہے ۔ اس کلام کی مقدار بہت کم ہے ۔ لیکن کسی شاعر کا مرادہ مقدار کلام سے معین نہیں ہوتا ۔ بلکہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کے منتخب اشعار کسی درجے کے ہیں ۔ اس دیوان میں کثرت سے تبدیلیت کے رنگ کے معانی اشعار موجود ہیں اور کثرت سے ایسے اشعار بھی ہیں ، جو روایتی عاشقانہ شاعری اور اور قالمہ پرائی کے سوا کوئی اور حیثیت نہیں رکھتے ۔ لیکن جابجا ناہاپ سوتی بکھرے ہوئے ہیں ، جن کو جمع کیا جائے تو انکسار و تاثرات کا ایک گنجینہ بن جاتا ہے ۔“

یہ کہنا مشکل ہے کہ غالب کا کوئی خاص فلسفہ بھی تھا ۔ ہاں یہ دیکھ سکتے ہیں کہ کسی قسم کے فلسفیانہ انکار کا اس کے کلام میں غلبہ نظر آتا ہے ۔ اس نے خود کوئی خاص فلسفہ پیدا نہیں کیا ۔ البتہ جو فلسفیانہ نظریات دنیا میں موجود تھے اور جن سے وہ آشنا تھا ، ان میں سے توحید وجودی یا وحدت وجود کا فلسفہ اس کو کسی قدر قرین قیاس اور دل نشین

معلوم ہوتا ہے کہ اردو اور فارسی کلام میں اس نے اس لہجہ رنگ کے مضمون کو سو ڈھنگ سے باندھا ہے۔“
(ڈاکٹر خلیفہ عبدالحمید : افکار غالب : ۱۹۵۶ء)

”غالب کی غزل میں ایک عیش دوست مگر سخت کوش امیر زادے کی تصویر ہمیں ملتی ہے، جسے زندگی سے محبت ہے۔ یہ امیر زادہ عیش دوست ہونے کے باوجود خوش مذاق بھی ہے۔ مگر اس کوچے میں وہ اعلیٰ پسند ہے اور عظمت کا دلدادہ ہے۔ رند مشرب ہے مگر وضع و دستور کو قید کی حد تک نباہتا جانتا ہے۔ اس کی ہر بات میں ذہانت اور ذہن کی شوخی پائی جاتی ہے۔ وہ زندگی سے گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ زندگی کا جو رخ ہو، اس سے گہرا شغف رکھتا ہے۔ خوشی سے بھی اور غم سے بھی۔ کیونکہ دونوں زندگی کے دو رخ ہیں۔“
(ڈاکٹر سید عید اللہ : ۱۹۵۸ء)

”اردو شاعری کی تاریخ میں غالب کو جو مقام حاصل ہے، اس کی عظمتوں کا اعتراف کرنا اور اس کی شاعری کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا ہمارے گزشتہ تقریباً پون صدی کے تنقیدی شعور کی ایک مسلسل کوشش رہی ہے۔ برائے دور کے شعرا میں، غالب وہ تنہا شاعر ہے، جو اس تمام عرصے میں ہمارے نقادوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا ہے اور وہ اچھے عموماً اردو کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے رہے ہیں۔ اردو تنقید کا جدید ترین دور شاید اس رائے سے اتفاق نہیں کرے گا کہ وہ ہمیں خود غالب کے الفاظ میں یہ یاد کرائے کی کوشش میں ہے :

کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

بلکہ اسے یہ اصرار بھی ہو گا کہ میر غالب سے بڑا شاعر ہے۔ لی الحال اس بحث سے قطع نظر کچھ اصل بات مجھے صرف یہ کہنی ہے کہ غالب ہماری ادبی تاریخ میں سب سے زیادہ زندہ شاعر ہے اور اس سے شاید میر کے پیروکاروں کو بھی انکار نہ ہو گا۔ میر کے علاوہ سودا، درد، آتش، سومن، الیس، اقبال یہ سب اردو کے بڑے شاعر سمجھے جاتے ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی اس صورت میں زندہ نہیں ہے، جس صورت میں غالب غالب ہمارے دل و دماغ اور ادبی شعور پر آج بھی حاوی ہے اور ہمارے ادب و شعر

میں کئی لحاظ سے جتنا جاگزا نظر آتا ہے ، غالب ہماری ادبی تاریخ میں ایک نئے دور اور ایک نئی روایت کا خالق اور پیشوا ہے ۔ اس کے بعد ہمارے ہاں مختلف سیاسی ، سماجی اور فکری اثرات کے ساتھ جو ادبی شعور پیدا ہوا ہے ، اس کی ترتیب اور تعبیر میں غالب ایک بڑے اہم عنصر کی حیثیت رکھتا ہے اور اگر آج یہ شعور مختلف رنگ بدلتا ہوا کیا ہے کیا ہو گیا ہے ، مگر وہ امتیازی خصوصیات ، جو اردو شاعری میں غالب کے ساتھ مشہور میں آئی تھیں ، آج بھی قائم ہیں بلکہ نئی نئی ادبی تحریکات کی پشت پناہ ہیں ۔“

(آفتاب احمد : اردو شاعری میں غالب کی اہمیت : ۱۹۵۸ء)

”غالب کا آرٹ روایتی میں لیکن اپنی حدود کے اندر اپنی آپ مثال ہے ۔ میر کے آرٹ میں گہرائی ہے اور شاید جہاں تک گہرائی کا تعلق ہے کوئی دوسرا شاعر میر سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے ۔ غالب کے آرٹ میں گہرائی نہیں اس میں وسعت ہے ، تنوع ہے ۔ ایسی وسعت ، جس کا گمان بھی شاید میر کو نہ تھا ۔ یوں کہنے کو میر کے ضخیم دیوانوں میں بھی ہر طرح کے اشعار ملتے ہیں ۔ یہ ظاہر تنوع ہے ، وسعت ہے لیکن میر کے کامیاب شعروں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ میر کی دنیا محدود قسم کی ہے ، جس میں اتنا گہرائی ہے لیکن وسعت کچھ زیادہ نہیں ۔ یہی وسعت غالب کے آرٹ کی نمایاں خوبی ہے ۔ غالب کا حلقہٴ دام خیال بہت وسیع ہے ۔ اس جال میں سبھی کچھ سمٹ آئے ہیں ، اس لیے وہ تنگ نہیں ، جو میر کے اشعار میں ملتی ہے ۔

غالب کے آرٹ کا اصلی کارنامہ یہ ہے کہ اس میں غزل خصوصاً شعر مفرد کی تنگ کو وسعت میں تبدیل کرنے کی کامیاب کوشش کی ۔ دو مصرعوں کی کیا بساط ہے ، اس میں گنجائش بہت کم ہے ، کسی چیز کو ہرے طور پر بیان کرنا نا ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے ، غالب نے اس مشکل کو آسان کرنے میں دوسرے شاعروں کے مقابلے میں زیادہ کامیابی حاصل کی ہے ۔ غالب کا قول ہے کہ ہر کام کا آسان ہونا دشوار ہے ۔ اسی طرح ایک شعر کا نظم بن جانا دشوار ہی نہیں نا ممکن ما ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ آدمی کا انسان ہونا میسر ہو یا نہ ہو ، غالب کے اشعار کو نظمیت میسر ہے ۔

غالب کوشش کرتے ہیں کہ ایک شعر میں مختلف خیالات ، جذبات یا ایک ہی خیال ایک جذبے کے مختلف پہلوؤں کو سمیٹ لائیں۔ اس ارادے میں جامعیت کے ساتھ تو کامیابی ممکن نہیں لیکن وہ ایک ترکیب استعمال کرتے ہیں، جس سے مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ چند خیالات تو پوری طرح ایک شعر میں نظم نہیں ہو سکتے لیکن غالب ایک بات کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ دوسری باتوں کی طرف توجہ جا پڑتی ہے اور شعر بڑھ کر ذہن ان باتوں کی جستجو میں لگ جاتا ہے۔ گویا عکسستان خیال کا دروازہ کھل جاتا ہے اور غالب کا شعر اس دروازے کی کلید ہے۔ اگر آپ دریا کے کنارے کھڑے ہو کر دریا کا نظارہ کیجیے تو ممکن ہے دریا کی سطح پر آپ کو بالکل سکون نظر آئے، پھر پتھر کا ٹکڑا اٹھا کر پھینک مارے تو سطح دریا پر ایک لہر نمودار ہو گی ، یہ لہر دوسری لہروں کو بیدار کرے گی، لہروں کا دائرہ بڑھتا جائے گا، ایک بہنور کی سی کیفیت نمایاں ہوگی اور لہریں پھیلتے پھیلتے نظروں سے غالب ہو جائیں گی۔ غالب کے اشعار دریائے۔ غنیش میں اسی قسم کی لہریں پیدا کرتے ہیں۔“

(کام الدین احمد : غالب کا آرٹ : ۱۹۵۸ء)

”غالب سے پہلے اردو شاعری کے پاس جذبات تھے ، احساسات تھے ، زبان و بیان کے کرشمے تھے۔ لیکن وہ حسین و شوخ ذہانت نہیں تھی جو بکر الفاظ میں روح پھونک دیتی ہے۔ یہ میرزا کا عطیہ ہے اور اس پر اردو جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ وہ اپنے قدیم سرمائے سے واقف تھے۔ لیکن اس کی ہر رسم اور قید کے پابند نہیں تھے۔ اسی لیے ان کی شاعری افسون و فسانہ نہیں ہے۔ اس میں نفس گرم کی آمیزش ہے ، خون جگر کی نمود ہے۔ انہوں نے ہمیں نئے نئے خیالات دیے ، ان کے ادا کرنے کا ایک نیا اسلوب دیا اور سوچنے کے لیے حکیمانہ انداز اور جانچنے کے لیے تنقیدی شعور۔ اس میں بدل قلم کی شکستگی ہے، اس کا ہر معنی اختصار ہے، اس کا ترکانہ بانگ نہیں ہے۔ یہ اسلوب حال اور مستقبل دونوں کے لیے اہم ہے۔“

(ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی : ۱۹۵۹ء)

”غالب کی فن کاری میں ہمیں جدت و سوز ، تخیل کی پرواز ، ادراک کی قوت وجدان کا حسن ، امید و نا امیدی کی کشمکش ، درد و گداز ، مزاح و طنز اور جدت کی تازہ خیالی و تازہ کاری کے جلوے ملتے ہیں ۔ اس کے یہاں واقفیت کا حسن بھی ہے اور مثالیت کا جلال بھی ۔ وہ ایک طرف اگر مصوری اور ٹھوس بت گری کرتا ہے ، تو دوسری جانب اشاریت اور ایمائیت سے بھی کام لیتا ہے ۔ غالب کی شاعری کے کامیاب حصے میں لطافت ، گہرائی ، بلندی اور وسعت پائی جاتی ہے ۔ ان سب خصوصیات کی ترکیب سے غالب کے فن کی انفرادیت کی تشکیل ہوئی ہے ۔ غالب کی ازلی تشنگی ، خودی کے احترام کا جذبہ ، اس کی روح ہفاوت و مہنائے انقلاب اور اس کی بھرپور شوخی اس کے آئینہ انفرادیت کو جلا دیتی ہے ۔ تن اور شخصیت کا رشتہ اتنا سادہ نہیں ۔ فنی شخصیت اور سماجی شخصیت میں یکسانیت بھی ہو سکتی ہے اور مخالفت بھی ۔ کبھی فن میں زندگی کی حسرتیں ، کوتاہیاں اپنا انتقام بھی لیتی ہیں ۔ آرٹ کبھی تو آرٹسٹ کی سماجی شخصیت کا ارتقا اور تکملہ ہوتا ہے اور کبھی حرجانہ ، چور دروازہ یا فن کار کی زندگی کے ترازو کا دوسرا ہلا ۔ غالب کی سماجی شخصیت سے ہم اس کی فنی شخصیت کو جا بہ جا مختلف پا سکتے ہیں ۔ علم النفس کے ذریعے اس کی توجہ بھی کی جا سکتی ہے ۔“

(پروفیسر اختر اورینٹل : غالب کی فن کاری : ۱۹۵۹ء)

”غالب کی شاعری اپنے وقتی اہام ، دقت بیان اور قواعد زبان کے نادر استعمال کی وجہ سے چونکتی اور متغیر کرتی ہے ۔ غالب کی شکل پسندی ، براؤننگ اور ٹی ۔ ایس ۔ ایلٹ کی طرح ہے جس پر قابو پا کر ہمیں ایک قسم کی ذہنی مسرت حاصل ہوتی ہے ۔ جس طرح ہمیں ان شاعروں کی باریک بینیوں ، فکر اور تخیل تک رسائی حاصل کر کے ایک ذہنی طہارت اور خوش محسوس ہوتی ہے ، بالکل اسی طرح غالب کے تخیل کی اچانک پروازوں ، یا ان کی مضمون آفرینیوں اور متبالغہ آرائیوں کی تہہ سے بھی حاصل ہوتی ہے ، شاید ہی کسی شاعر کی فکر کو ان بلندیوں اور جذبے کی ان گہرائیوں تک رسائی حاصل ہوئی ہو جو غالب کی دسترس میں تھیں ۔ انہوں نے جس باریک بینی اور تجزیاتی ادراک سے شعر کہے ہیں ، اس تک

خیال کی رسائی محال ہے ۔ اس کا تعلق ، بعد الطبیعیات کی قلمرو سے ہے ۔ وہ اپنی ذہنی تحقیق ہستی کے ساتھ ساتھ انسانی تجربے کے صوفیانہ ، مادی اور فلسفیانہ پہلوؤں سے وہ ایک خیالی عمل بزمی اور تالیف میں کامیاب ہو جاتے ہیں ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اوروں کے مقابلے میں وہ زیادہ مشکل شاعر ہیں اور اسی لیے ان کے ہم عصروں نے انہیں سہل اور مبہم گو کہہ کر مطعون کیا ۔ لیکن بالآخر وقت کے تغیر اور ان کے جدید قارئین کی عام ذہنی ترقی اور ورزش خیالی نے غالب کے اس دعوے کو درست ثابت کر دیا، جو انہوں نے خود اپنی شاعری کے بارے میں کیا تھا کیونکہ کوئی شاعر فکر یا انداز بیان کی عظمت کے اعتبار سے ان کا ہم سر نہیں ہے ۔“

(پروفیسر احمد علی ۱۹۶۶ء)

”غالب بلاشبہ اس دور کے سب سے بڑے محزل گو ہیں ، وہ اپنے اردو مجموعے کو بے رنگ قرار دیتے ہیں اور اپنے ہر ستاروں کو اپنے فارسی کلام کے مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا مختصر اردو دیوان اردو شاعری کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے جس میں چلی مرتبہ محزل کے عام ہلکے ہلکے مضامین یا تصوف کے متعارف مسائل اور موضوعات کی جگہ دقت خیال اور فکر انگیز مضامین کی دعوت دی گئی ہے ۔

غالب اصطلاحی معنوں میں فلسفی یا مفکر یا حکیم نہ تھے لیکن ان کی افتاد طبع اور اسلوب بیان دونوں میں فلسفے کی دقت نظر ، تحلیل و تجزیہ اور اسی کے مناسب اسلوب بیان ملتا ہے ۔ پھر زندگی کے بارے میں ان کا خاص طرح کا مزاج اور ایک خاص رجحان اور افتاد طبع ہے ، جسے ان کا فلسفہ کہہ سکتے ہیں ۔ ان کے تحلیل کی بلند پروازی محض شاعرانہ نہیں حکیمانہ بھی ہے ۔“

(ڈاکٹر ابوالیث صدیقی ۱۹۶۶ء)

”غالب اردو شاعری میں ایک نادر مظہر ہیں ۔ ان کی انفرادیت اور عظمت اتنے متضاد پہلوؤں میں اجاگر ہوئی ہے کہ ان سب کا احاطہ کسی

ایک شخص کے لیے ایک مضمون کی حدود براط میں کرنا مشکل ہے۔ فکر و سخن کی محفل میں ان کا مقام اور منصب سب سے الگ ہی نہیں، سب سے نمایاں اور بلند بھی ہے۔ غالب کی شاعری کا موضوع ان کے شدید ذاتی تاثرات میں ان کی امتیازی خصوصیت ان کا تفکر ہے، یعنی ان تاثرات پر ان کے بے چین اور عمیق ذہن کا رد عمل۔ غالب کا تجربہ حقیقی اور غیر منفعل معلوم ہوتا ہے اور اس میں گونا گوں کیفیات کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ اس تجربے کی تجسیم کے دوران ان کی شخصیت کے تمام پر اسرار گوشوں میں نفوذ باہمی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ غالب کے یہاں تفکر ان تمام تجربوں کا اظہار ہے، جو ذہن اور روح کی کہرائیوں میں جنب ہو کر ابھرے ہیں۔ اس فکر کی قدر و قیمت کا تعین ان تجربات کے تجزیے پر منحصر ہے۔ حسرت بھی اچھے اور داہنیر شاعر ہیں۔ ان کے یہاں بھی جذبات کی بوقلمونی اور فراوانی ملتی ہے مگر برنز (Burns) کی طرح وہ خالص تجربے سے آگے نہیں بڑھتے۔ ان کی شاعری صرف احساسات کو آہنگ عطا کرتی اور انہیں آسودگی بخشتی ہے اور اس اعتبار سے کیٹس (Kents) کی نہایت ابتدائی دور کی شاعری ہی تک پہنچ کر رہ جاتی ہے۔ غالب کے یہاں رنگا رنگی اور فراوانی سے زیادہ ثنوت، پیچیدگی اور تنوع اہم ہیں۔ ان کے یہاں جذبات کی تندی اور ذہن کی برقی رفتاری بہ تک وقت ملتی ہیں۔ ان کی شاعری میں عقل کا عنصر تمام دوسرے عناصر پر ولایت رکھتا ہے۔“

(املوب احمد انصاری : ادب اور تنقید : ۱۹۶۸ء)

غالب اُردو شاعری میں ایک نئی داخلیت کا تصور لے کر داخل ہوئے۔ یہ داخلیت نہ میر کی طرح محدود تھی، نہ میر درد کی طرح متصوفانہ۔ اس کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ مجلسی بلکہ کائناتی شعور بھی اس کے لیے اجنبی نہیں۔ اپنی شخصیت اور صداقت کو بھولے بغیر غالب نے شاعری میں فکر و کردار کو راہ دی۔ ان کے نزدیک خیال و جذبہ کے درمیان کوئی خلیج حائل نہیں۔ فکر و تاثر، احساس اور ادراک ایک ہی کل کے مختلف اجزاء ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفیانہ آہنگ کے باوجود غالب شاعری کے حسن اور جمالیاتی نکھار سے غافل نہیں رہے۔

(ڈاکٹر محمد حسن : لروغ اُردو، لکھنؤ، غالب مہر : دسمبر، ۱۹۶۸ء)

کتابیات

تصانیف غالب (اردو)

دیوان غالب

- طبع اول ، مطبع سید العطایع دہلی ، ۱۸۳۱ ع
 طبع دوم ، مطبع دارالسلام ، دہلی ، ۱۸۳۷ ع
 طبع سوم ، مطبع احمدی ، دہلی ، ۱۸۶۱ ع
 طبع چہارم ، مطبع نظامی ، کانپور ، ۱۸۶۲ ع
 طبع پنجم ، مطبع مفید خلائق ، آگرہ ، ۱۸۶۳ ع

چند قابل ذکر اشاعتیں :

۱۔ دیوان غالب جدید ، نسخہ "حمید" ، مفید عام اشیم پریس ، آگرہ ،

۱۹۲۱ ع

۲۔ دیوان غالب ، ڈاکٹر ذاکر حسین ، برلن ، جرمنی ، ۱۹۲۵ ع

۳۔ مرقع غالب ، عبدالرحمان چغتائی ، لاہور ، ۱۹۲۸ ع

۴۔ نقش چغتائی ، لاہور ، ۱۹۳۵ ع

۵۔ دیوان غالب ، تاج الہدیش ، لاہور ، ۱۹۳۸ ع

۶۔ دیوان غالب ، مالک رام ، آزاد کتاب گھر ، دہلی ، ۱۹۵۷ ع

۷۔ دیوان غالب ، نسخہ "عرشی" ، النجمن ترقی اردو ہند ، علی گڑھ ،

۱۹۵۸ ع

۸۔ دیوان غالب ہندی ، علی سردار جعفری ، ہندوستانی بک ٹرسٹ ،

بمبئی ، ۱۹۵۸ ع

۹۔ دیوان غالب ، (عکسی) غلام رسول سہرا ، شیخ غلام علی اینڈ سنز

لاہور ، ۱۹۶۷ ع

۱۰۔ دیوان غالب ، صدی الہدیش ، اردو سرکیز ، لاہور ، ۱۹۶۹ ع

۱۱۔ دیوان غالب ، مصور ، صادقین ، ادارہ یادگار غالب ، گجراتی ،

۱۹۶۹ ع

۶۱۔ دیوان غالب ، مولانا حامد علی خاں ، مجلس یادگار غالب ،
پنجاب یونیورسٹی ، لاہور ، ۱۹۶۹ ع

خطوط

- ۱۔ عود ہندی ، طبع اول ، مطبع مجنبتی ، میرٹھ ، ۱۸۶۸ ع
- عود ہندی ، طبع اول ، مطبع ٹرائٹی ، دہلی ، ۱۸۷۸ ع
- عود ہندی ، طبع اول ، مطبع نول کشور ، کان پور ، ۱۸۷۸ ع
- عود ہندی ، طبع اول ، مدرسۃ العلوم ، علی گڑھ ، ۱۹۱۰ ع
- عود ہندی ، طبع اول ، مطبع نول کشور ، کان پور ، ۱۹۱۳ ع
- عود ہندی ، طبع اول ، مطبع مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ ، ۱۹۲۷ ع
- عود ہندی ، طبع اول ، مجلس ترقی ادب ، لاہور ، ۱۹۶۵ ع
- ۲۔ اردو سے معلیٰ ، طبع اول ، اکمل المطابع ، دہلی ، ۱۸۶۹ ع
- اردو سے معلیٰ ، طبع اول ، مطبع اردو کاتڈ ، کلکتہ ، ۱۸۸۳ ع
- اردو سے معلیٰ ، طبع اول ، مطبع اکمل المطابع ، دہلی ، ۱۸۹۱ ع
- اردو سے معلیٰ ، طبع اول ، مطبع مجنبتی ، دہلی ، ۱۸۹۹ ع
- اردو سے معلیٰ ، طبع اول ، مطبع فاروقی ، دہلی ، ۱۹۱۰ ع
- اردو سے معلیٰ ، طبع اول ، مطبع کریمی ، لاہور ، ۱۹۲۲ ع
- اردو سے معلیٰ ، طبع اول ، رفقاء عام اسٹیم پریس ، لاہور ، ۱۹۲۷ ع
- اردو سے معلیٰ ، طبع اول ، مجلس ترقی ادب ، لاہور ، ۱۹۶۹ ع
- ۳۔ ادبی خطوط غالب ، مرزا محمد عسکری ، لکھنؤ ، ۱۹۲۹ ع
- ۴۔ مکاتیب غالب ، امتیاز علی خاں عرشی ، مطبع قیام ، بمبئی ،
۱۹۳۷ ع
- ۵۔ خطوط غالب (۱) سہیش پرشاد ، ہندستانی اکیڈمی ، الہ آباد ،
۱۹۳۱ ع
- ۶۔ نادرات غالب ، آفاق حسین دہلوی ، کراچی ، ۱۹۳۹ ع
- ۷۔ خطوط غالب ، مولانا غلام رسول سہر ، ۱۹۵۱ ع
- ۸۔ انتخاب خطوط غالب ، ڈاکٹر عبادت پریلوئی/مشفق انصاری ،
کراچی ، ۱۹۵۲ ع

- ۹۔ خطوط غالب ، مالک رام ، علی گڑھ ، ۱۹۶۳ ع
 ۱۰۔ خطوط غالب (مکمل) غلام رسول مہر ، لاہور ، ۱۹۶۶ ع

تصانیف غالب (فارسی)

- ۱۔ دیوان فارسی ، طبع اول ، مطبع دارالسلام ، دہلی ، ۱۹۳۵ ع
 ۲۔ کلیات غالب ، طبع اول ، مطبع نول کشور ، لکھنؤ ، ۱۸۶۳ ع
 کلیات غالب ، طبع اول ، مطبع نول کشور ، لکھنؤ ، ۱۸۷۲ ع
 کلیات غالب ، طبع اول ، مطبع نول کشور ، لکھنؤ ، ۱۸۹۳ ع
 کلیات غالب ، طبع اول ، شیخ مبارک علی اینڈ سنز ، لاہور ،
 ۱۹۶۵ ع
 کلیات غالب ، طبع اول ، مجلس ترقی ادب ، لاہور ، ۱۹۶۷ ع
 کلیات غالب ، طبع اول ، مجلس یادگار غالب ، لاہور ، ۱۹۶۹ ع
 ۳۔ سید جین ، طبع اول مطبع ہدی ، دہلی ، ۱۸۵۷ ع
 سید جین ، طبع دوم ، مکتبہ جامعہ ، دہلی ، ۱۹۳۸ ع
 سید جین ، طبع جدید ، مجلس یادگار غالب ، لاہور ، ۱۹۶۹ ع
 ۴۔ باغ دو در ، طبع اول ، اورینٹل کالج میگزین ، لاہور ، اگست
 ۱۹۶۰-۶۱ ع
 باغ دو در ، طبع دوم : پنجاب یونیورسٹی لاہور ، جولائی ، ۱۹۶۸ ع
 ۵۔ مثنوی دعا صباح ، طبع اول ، مطبع نول کشور ، لکھنؤ ، ۱۸۶۸ ع
 ۶۔ مثنوی ایرگھر بار ، مطبع اکمل المطابع ، دہلی ، ۱۸۶۳ ع
 ۷۔ پنج آہنگ ، طبع اول ، مطبع سلطانی ، دہلی ، ۱۸۳۹ ع
 پنج آہنگ ، طبع دوم ، مطبع دارالسلام ، دہلی ، ۱۸۵۳ ع
 پنج آہنگ ، طبع جدید ، مجلس یادگار غالب ، لاہور ، ۱۹۶۹ ع
 ۸۔ مہر نیمروز ، طبع اول ، مطبع قعر المطابع ، دہلی ، ۱۸۵۳ ع
 مہر نیمروز ، طبع اول ، مطبع نول کشور ، لکھنؤ ، ۱۹۱۵ ع
 مہر نیمروز ، طبع اول ، شیخ مبارک علی اینڈ سنز ، لاہور ،
 ۱۹۲۵ ع
 مہر نیمروز ، طبع اول ، مجلس یادگار غالب ، لاہور ، ۱۹۶۹ ع

۹۔ دستنبو ، طبع اول ، مطبع مفید خلایق ، آگرہ ، ۱۸۵۸ع
دستنبو ، طبع دوم ، مطبع انجمن ترقی سوسائٹی ، روہیل کھنڈ ، بریلی ،
۱۸۶۵ع

دستنبو ، طبع سوم ، روہیل کھنڈ ، بریلی ، ۱۸۷۱ع
دستنبو ، طبع جدید ، مجلس یادگار غالب ، لاہور ، ۱۹۶۹ع

۱۰۔ کلیات نثر غالب ، طبع اول ، مطبع نول کشور ، لکھنؤ ، ۱۸۶۸ع

۱۱۔ نکات و رفعات غالب ، طبع اول ، مطبع سراجی ، دہلی ، ۱۸۶۷ع

۱۲۔ قادر نامہ غالب ، طبع اول ، مطبع سلطانی ، دہلی ، ۱۸۵۶ع

قادر نامہ غالب ، طبع دوم ، مجلس پریس ، دہلی ، ۱۸۶۳ع

قادر نامہ غالب ، طبع سوم ، مطبع مداری لال ، لاہور ، ۱۸۷۳ع

قادر نامہ غالب ، طبع جدید ، مکتبہ نیا راہی ، کراچی ، ۱۹۵۹ع

۱۳۔ قاطع برہان ، طبع اول ، مطبع نول کشور ، لکھنؤ ، ۱۸۶۲ع

۱۴۔ لطائف غیبی ، طبع اول ، اکمل المطابع ، دہلی ، ۱۸۶۳ع

۱۵۔ درفش کاویانی ، طبع اول ، اکمل المطابع ، دہلی ، ۱۸۶۵ع

۱۶۔ نامہ غالب ، طبع اول ، مطبع ہندی ، دہلی ، ۱۸۶۵ع

۱۷۔ سوالات عبدالکرم ، طبع اول ، اکمل المطابع ، دہلی ، ۱۸۶۵ع

۱۸۔ قطعہ غالب ، طبع اول ، اکمل المطابع ، دہلی ، ۱۹۶۶ع

۱۹۔ تیغ تیز ، طبع اول ، اکمل المطابع ، دہلی ، ۱۸۶۷ع

۲۰۔ انتخاب غالب ، امتیاز علی خاں عرش ، رام پور ، ۱۹۳۲ع

۲۱۔ متفرقات غالب ، مسعود حسن رضوی ادیب ، ہندوستانی پریس ،
رام پور ، ۱۹۳۷ع

۲۲۔ مائثر غالب ، قاضی عبدالودود ، علی گڑھ میگزین ، ۱۹۳۸-۳۹ع

۲۳۔ غالب کی نادر تحریریں ، ڈاکٹر خلیق انجم ، مکتبہ شاہراہ ، دہلی ،
۱۹۶۱ع

۲۴۔ مجموعہ نثر غالب اردو ، خلیل الرحمن داؤدی ، مجلس ترقی ادب ،
لاہور ، ۱۹۶۷ع

غالب پر اہم تصانیف :

۱۔ یادگار غالب ، حالی ، ناسی پریس ، کان پور ، ۱۸۹۷ع

- ۲۔ حیات غالب ، سید محمد مرزا موج ، ننگرستان پریس لکھنؤ ، ۱۸۹۹ع
- ۳۔ غالب نام آورم ، نادم متیابوری ، سرفراز پریس ، لکھنؤ ، ۱۹۰۲ع
- ۴۔ مقام غالب ، محمد موسیٰ خاں کلیم ، ادارہ نئی تحریریں ، پشاور ، ۱۹۲۵ع
- ۵۔ غالب ، ڈاکٹر سید عبداللطیف ، جام باغ ، حیدر آباد دکن ، ۱۹۲۸ع
- ۶۔ مومن و غالب ، معجز مسعودانی ، نظامی پریس ، فیض آباد ، ۱۹۳۱ع
- ۷۔ غالب شکن ، یگانہ چنگیزی ، آرمی پریس ، آگرہ ، ۱۳۵۰ع
- ۸۔ غالب نامہ ، طبع اول ، شیخ محمد اکرام ، مرکز کائنات پریس لاہور ، ۱۹۳۶ع
- ۹۔ قتیل اور غالب ، سید امداد علی الوری ، مکتبہ جامعہ ، دہلی ، ۱۹۳۹ع
- ۱۰۔ سرگزشت غالب ، ڈاکٹر محی الدین قادری زور ، مکتبہ ابراہیمہ ، حیدر آباد ، ۱۹۳۹ع
- ۱۱۔ اشک و رشک غالب ، سید ظہیر الدین احمد دہلوی ، ایجوکیشنل پریس ، علی گڑھ ، ۱۹۴۱ع
- ۱۲۔ غالب ، طبع چہارم مولانا غلام رسول سہر ، شیخ مبارک علی ، لاہور ، ۱۹۴۳ع
- ۱۳۔ لڑہنگ غالب ، امتیاز علی خان عرشی ، آزاد کتاب گھر ، دہلی ، ۱۹۴۷ع
- ۱۴۔ احوال غالب ، ڈاکٹر مختار الدین آرزو ، انجمن ترقی ادب ، ہند ، علی گڑھ ، ۱۹۵۲ع
- ۱۵۔ انکار غالب ، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ، مکتبہ معین الادب ، لاہور ، ۱۹۵۴ع
- ۱۶۔ نقد غالب ، ڈاکٹر مختار الدین آرزو ، انجمن ، علی گڑھ ، ۱۹۵۵ع
- ۱۷۔ تلامذہ غالب ، مرکز تصنیف و تالیف ، نکودر ، ۱۹۵۷ع
- ۱۸۔ محاسن کلام غالب ، طبع پنجم ، بینوری ، انجمن ترقی اردو ، ہند ، علی گڑھ ، ۱۹۵۸ع

- ۱۔ غالب ، ڈاکٹر غورخیدالاسلام ، انجمن ، ہند ، علی گڑھ ، ۱۹۶۰ع
- ۲۔ فکر غالب ، برٹھوی چندر ، پیام وطن پریس ، دہلی ، ۱۹۶۰ع
- ۳۔ غالب - فکر و فن ، ڈاکٹر شوکت سبزواری ، طبع جدید ، انجمن ، ترقی اردو پاکستان کراچی ، ۱۹۶۱ع
- ۴۔ ذکر غالب ، طبع چہارم ، مالک رام سکتیہ جامعہ ، دہلی ، ۱۹۶۳ع
- ۵۔ غالب شناسی (۱) ڈاکٹر ظ۔ انصاری ، سائیتھ ٹرسٹ بمبئی ، ۱۹۶۵ع
- ۶۔ غالب کے کلام میں الحاق عناصر ، نادم سینا پوری ،
- ادارۃ فروغ اردو لکھنؤ ، ۱۹۶۵ع
- ۷۔ مرزا غالب کی شوخیاں ، عبدالباری آسی ، سکتیہ دین و ادب ،
- ۱۹۶۵ع
- ۸۔ جہان غالب ، کوثر چاند پوری ، مکتبہ کائنات ، لاہور ، ۱۹۶۶ع
- ۹۔ تجزیہ کلام غالب ، سید رفیع الدین بلخی ، اکیڈمی آف ایجوکیشنل
- ریسرچ ، کراچی ، ۱۹۶۶ع
- ۱۰۔ غالب شاعر امروز و فردا ، ڈاکٹر فرمان فتح پوری ، کتابیات ،
- لاہور ، ۱۹۶۹ع
- ۱۱۔ فلسفہ کلام غالب ، طبع جدید ، ڈاکٹر شوکت سبزواری ، انجمن ،
- کراچی ، ۱۹۶۹ع
- ۱۲۔ حکیم نوازہ شیخ محمد اکرم - فیروز سنر ، لاہور ، ۱۹۵۵ع
- ۱۳۔ مقام غالب ، عبدالصمد صارم ، ادارۃ علمیہ دہنی رام روڈ ، لاہور ،
- ۱۹۶۸ع

شرحیں :

- ۱۔ شوکت میرٹھی ، حل کلیات اردو غالب ، شوکت المطابع ،
- میرٹھ ، ۱۸۹۹ع
- ۲۔ حسرت موہانی ، شرح دیوان غالب ، مطبوعہ علی گڑھ ، ۱۹۰۶ع
- ۳۔ سہا مجددی ، مطالبہ غالب ، شیخ مبارک علی ، لاہور ، سن
- ۴۔ سہ خود دہلوی ، مرآۃ الغائب ، محبوب المطابع دہلی ، ۱۹۲۳ع
- ۵۔ عبدالباری آسی ، مکمل شرح کلام غالب ، صدیق بک ڈپو ،
- لکھنؤ ، ۱۹۳۱ع
- ۶۔ آغا محمد باقر ، بیان غالب ، شیخ مبارک علی ، لاہور ، ۱۹۳۹ع
- ۷۔ جوش ملیح آبادی ، شرح دیوان غالب ، قصر اردو ، دہلی ، ۱۹۵۰ع
- ۸۔ اثر لکھنوی ، مطالعہ غالب ، دانش محل ، لکھنؤ ، ۱۹۵۲ع

- ۹۔ ڈاکٹر قاضی سمیع الدین ، مطالب الغالب ، پبلشرز یونائیٹڈ ، لاہور ، ۱۹۵۲ء
- ۱۰۔ عبدالحکیم نشتر ، روح غالب ، تاج بک ڈپو ، لاہور ، ۱۹۵۳ء
- ۱۱۔ نظم طباطبائی ، شرح دیوان غالب ، طبع چہارم ، انوارالمطالع ، لکھنؤ
- ۱۲۔ یوسف سلیم چشتی ، شرح دیوان غالب ، عشرت پبلشنگ ہاؤس ، لاہور ، ۱۹۵۹ء
- ۱۳۔ وجاہت علی شاہدپوری ، نشاط غالب ، انوار بک ڈپو ، لکھنؤ ، ۱۹۶۱ء
- ۱۴۔ نیاز فتح پوری ، مشکلات غالب ، ادارۃ نگار ، کراچی ، ۱۹۶۲ء
- ۱۵۔ شادان بلگرامی ، روح المطالب ، شیخ مبارک علی ، لاہور ، ۱۹۶۷ء
- ۱۶۔ غلام رسول مہر ، نوائے سروش ، شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور ، ۱۹۶۹ء
- ۱۷۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ، روح غالب ، گلوب پبلشرز ، لاہور ، ۱۹۶۹ء

مقالات :

- ۱۔ سر سید احمد خان ، غالب اور ان کے معاصرین ، آثار الصداقہ ، طبع اول ، ۱۸۳۶ء
- ۲۔ مرزا قربان علی بیگ سالک ، غالب مرحوم ، اودھ اغیار لکھنؤ ، ۱۶ مارچ ، ۱۸۶۹ء
- ۳۔ حسرت موہانی ، کلام غالب ، اردو سے معلیٰ ، علی گڑھ ، یکم نومبر ، ۱۹۲۳ء
- ۴۔ مرزا یاس لکھنوی ، غالب کی شاعری پر تنقید ، خیال ، ہابوڑ ، ۱۹۱۵ء
- ۵۔ ہاشمی فرید آبادی ، غالب کا فلسفہ ، اردو ، اورنگ آباد ، اکتوبر ، ۱۹۲۵ء
- ۶۔ عابد علی عابد ، غالب کی فارسی شاعری ، جامعہ ، دہلی ، ستمبر تا دسمبر ، ۱۹۳۲ء
- ۷۔ سید وقار عظیم ، غالب کے خطوط اور ان کی احباب پرستی ، ساقی ، دہلی ، جنوری ، ۱۹۳۳ء

- ۸۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ، غالب کا تصور حسن و عشق ، ادبی دنیا ، لاہور ، جنوری ، ۱۹۳۶ع
- ۹۔ عبدالخالک آرومی، غالب کی اخلاقی کمزوریاں، نگار، لکھنؤ، مارچ، ۱۹۳۹ع
- ۱۰۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ، غالب کی قدر ، ہاہوں ، لاہور ، اکتوبر، ۱۹۳۹ع
- ۱۱۔ جاں نثار اختر ، غالب کا مسلک ، علی گڑھ میگزین ، مارچ ، ۱۹۳۱ع
- ۱۲۔ آل احمد سرور ، اردو ، دہلی ، اپریل ، ۱۹۳۱ع
- ۱۳۔ اختر اورینوی ، غالب کا فن اور اس کا نفسیاتی پس منظر ، اردو ، دہلی ، جولائی، ۱۹۳۱ع
- ۱۴۔ حفیظ سید، غالب کی شاعری میں واقعات کا ہر تو، زمانہ ، کانپور، مارچ ، ۱۹۳۵ع
- ۱۵۔ فراق گورکھپوری ، غالب کی شاعری میں محبوب کا تصور ، زمانہ ، کانپور ، اپریل ، ۱۹۳۵ع
- ۱۶۔ آفتاب احمد ، غالب کی عشقیہ شاعری ، دہلی، فروری، ۱۹۳۶ع
- ۱۷۔ حمید احمد خان ، غالب کی خالکی زندگی کی ایک جھلک ، آج کل ، دہلی ، ۱۵ فروری، ۱۹۳۷ع
- ۱۸۔ آل احمد سرور ، غالب کی عظمت ، علی گڑھ میگزین، غالب تبسم، ۱۹۳۹ع
- ۱۹۔ حمید احمد خان ، مکاتیب غالب ، ادبی دنیا ، دسمبر، ۱۹۳۹ع
- ۲۰۔ حمید احمد خان ، غالب کی شاعری میں حسن و عشق ، ہاہوں ، جنوری فروری ، ۱۹۳۹ع
- ۲۱۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری ، غالب کی شخصیت ، نگار ، لکھنؤ ، غالب تبسم ، ۱۹۳۹ع
- ۲۲۔ امتیاز علی خان عرشی ، غالب کی شعر گوئی اور ان کے دواوین ، علی گڑھ میگزین ، ۱۹۳۹ع
- ۲۳۔ پروفیسر عبدالقادر سرور ، غالب کی اخلاقی شاعری ، نوائے ادب، بمبئی ، جنوری ، ۱۹۵۰ع

- ۲۳۔ حمید احمد خان، غالب کا کلکتہ، ماہ نو، کراچی، فروری، ۱۹۵۰ء
- ۲۴۔ ارتضیٰ حسین، غالب کی طنزیات، نیا دور، کراچی، اپریل، ۱۹۵۰ء
- ۲۵۔ احتشام حسین، غالب کا تفکر، اردو ادب، علی گڑھ، جولائی، ۱۹۵۰ء
- ۲۶۔ دلشاد کلانچوی، غالب کے خطوط، ہایوں، لاہور، ستمبر، ۱۹۵۰ء
- ۲۷۔ ممتاز حسین، غالب کا نظریہ شعر، نقوش، لاہور، دسمبر، ۱۹۵۰ء
- ۲۸۔ ہمیش پرشاد، غالب کے ایام میں نظام ڈاک، نوائے ادب، بمبئی، جنوری، ۱۹۵۱ء
- ۳۔ آل احمد سرور، غالب کا ذہنی ارتقاء، اردو ادب، علی گڑھ، جولائی اگست، ۱۹۵۲ء
- ۳۱۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری، غالب محقق کی حیثیت ہے، اردو ادب، علی گڑھ، جولائی اگست، ۱۹۵۲ء
- ۳۲۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، کلام غالب میں استفہام، نگار، لکھنؤ، مئی، ۱۹۵۲ء
- ۳۳۔ پنٹ وناترہہ کیفی، غالب اور اردو خطوط نویسی، آج کل، دہلی، ستمبر، ۱۹۵۲ء
- ۳۴۔ نذیر احمد، غالب اور ظہوری، اردو ادب، علی گڑھ، جولائی، ۱۹۵۲ء
- ۳۵۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو، مرزا غالب کی تصویریں، احوال غالب، علی گڑھ، جون، ۱۹۵۳ء
- ۳۶۔ غلام رسول سہر، مرزا غالب نقاد کی حیثیت ہے، نگار، لکھنؤ، اپریل، ۱۹۵۳ء
- ۳۷۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان، غالب کے جہاں تخیل اور جذبے کی ہم آویزی، ماہ نو، کراچی، مئی، ۱۹۵۳ء
- ۳۸۔ محمد حسن عسکری، میر و غالب اور تاریخی حقیقتیں، اردو ادب، علی گڑھ، اکتوبر، ۱۹۵۳ء
- ۳۹۔ ڈاکٹر مختار الدین آرزو، غالب کی تاریخ گوئی، ادبی دنیا، لاہور، مارچ، ۱۹۵۵ء

۲۔ ڈاکٹر ابوالہیث صدیقی ، نقش ہائے رنگ رنگ ، ماہ نو، کراچی ،

نومبر، ۱۹۵۵ء

۳۔ آل احمد سرور ، غالب اپنی شخصیت کے آئینے میں، ادب لطیف،

لاہور ، جولائی ، ۱۹۵۵ء

۴۔ اسلوب احمد انصاری ، غالب کی شاعری کے بنیادی عناصر ،

مآلنامہ ادب لطیف ، لاہور ، ۱۹۵۵ء

۵۔ رشید احمد صدیقی ، غالب صاحب طرز اشعار پرداز ، فروغ اردو

لکھنؤ ، جون ، ۱۹۵۵ء

۶۔ آفتاب زیری علیگ ، غالب ایک مطالعہ ، فروغ اردو، لکھنؤ ،

جون ، ۱۹۵۵ء

۷۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ، غالب اور اقبال ، نگارہ لکھنؤ ، دسمبر ،

۱۹۵۵ء

۸۔ حامد حسن قادری ، افکار غالب ، اردو، کراچی ، اکتوبر، ۱۹۵۵ء

۹۔ ڈاکٹر سید عیدائق ، غالب بخش رو اقبال ، ماہ نو ، کراچی ،

اگست ، ۱۹۵۵ء

۱۰۔ آفتاب احمد، غالب کے اردو قصیدے ، نیا دور، لکھنؤ ، جون،

۱۹۵۶ء

۱۱۔ احتشام حسین ، ذوق و غالب ، فروغ اردو ، لکھنؤ ،

جنوری فروری ، ۱۸۵۶ء

۱۲۔ اختر اورینوی ، غالب کی فن کاری ، نقد غالب ، علی گڑھ ،

۱۹۵۶ء

۱۳۔ ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی ، غالب اور عصر جدید ، نقد غالب،

علی گڑھ ، ۱۹۵۶ء

۱۴۔ رشید احمد صدیقی ، کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائی کیا ، نقد غالب ،

علی گڑھ ، ۱۹۵۶ء

۱۵۔ قاضی عبدالودود ، غالب بحیثیت محقق ، نقد غالب ، علی گڑھ ،

۱۹۵۶ء

۱۶۔ مالک رام ، مرزا غالب ، نقد غالب ، علی گڑھ ، ۱۹۵۶ء

- ۵۵۔ ڈاکٹر محمد حسن ، غالب کے چند اہم نقاد ، آج کل ، دہلی ،
 ۱۹۵۶ع
- ۵۶۔ ڈاکٹر سید عیاد اللہ ، غالب معتقد میر ، نقد غالب ، علی گڑھ ،
 ۱۹۵۶ع
- ۵۷۔ آل احمد سرور ، غالب اور اس کے نقاد ، جامعہ ، دہلی ، دسمبر ،
 ۱۹۵۷ع
- ۵۸۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ، کلام غالب کا طنزیہ پہلو ، نگار ، لکھنؤ ،
 اکتوبر ، ۱۹۵۷ع
- ۵۹۔ ڈاکٹر محمد حسن ، ہندوستانی شاعری میں غالب کا مرتبہ ، تحریک ،
 دہلی ، اگست ، ۱۹۵۷ع
- ۶۰۔ علی محمد شمعہ ، غالب کی شاعری ، نقوش ، لاہور ، جون ، ۱۹۵۸ع
- ۶۱۔ ڈاکٹر مسیح الزمان ، غالب ، آج کل ، دہلی ، فروری ، ۱۹۵۸ع
- ۶۲۔ ڈاکٹر عبدالستار ، غالب کا تصور غم ، علی گڑھ میگزین ،
 ۱۹۵۹ع
- ۶۳۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر ، غالب کا فلسفہ ، نگار ، لکھنؤ ، جون ، ۱۹۵۹ع
- ۶۴۔ ڈاکٹر تارا چند ، غالب کے بیان میں تصوف اور فلسفہٴ وحدانیت کا
 امتزاج ، جہانستان ، دہلی ، جون ، ۱۹۶۰ع
- ۶۵۔ ڈاکٹر خلیق الہیم ، غالب کی قیام گاہیں ، اردو سے معلیٰ ، دہلی ،
 فروری ، ۱۹۶۰ع
- ۶۶۔ مالک رام ، گل رعنا ، نگار ، لکھنؤ ، جولائی ، ۱۹۶۰ع
- ۶۷۔ پروفیسر جمیع اللہ قریشی ، غالب کی انفرادی ، لائمہ صحرا ،
 چاول لکڑ ، دسمبر ، ۱۹۶۱ع
- ۶۸۔ نیاز فتح پوری ، غالب کی شاعرانہ خصوصیات ، نگار ، لکھنؤ ،
 جنوری فروری ، ۱۹۶۱ع
- ۶۹۔ ڈاکٹر سید معین الدین ، غالب کا نظریہٴ حیات ، تحریک ، دہلی ،
 اپریل مئی ، ۱۹۶۱ع
- ۷۰۔ حمیدہ سلطان ، غالب کا تصور عشق ، ماہ نو ، کراچی ، فروری ،
 ۱۹۶۲ع

- ۷۱۔ ڈاکٹر عبداللطیف شادانی ، غالب کا اسلوب نگارش (پنج آہنگ)
صحیفہ ، لاہور ، جنوری ، ۱۹۶۳ء
- ۷۲۔ مالک رام ، غالب کے فارسی قصیدے ، نقوش ، لاہور ، مارچ ،
۱۹۶۳ء
- ۷۳۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی ، ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اور خطوط غالب ،
آئینہ ادب ، دہلی ، ۱۹۶۳ء
- ۷۴۔ عبدالمعنی ، موازنہ اقبال و غالب ، نقطہ نظر ، پٹنہ ،
۱۹۶۵ء
- ۷۵۔ آغا افتخار حسین ، یورپ میں غالب کا مطالعہ ، افکار ، غالب ممبر
کراچی ، ۱۹۶۶ء
- ۷۶۔ پروفیسر احمد علی ، غالب ایک مابعد الطبیعیاتی شاعر ، افکار ،
غالب ممبر کراچی ، ۱۹۶۶ء
- ملک اسماعیل حسن خاں ، غالب کے اردو قصائد ، نقوش ، اکتوبر ،
۱۹۶۶ء
- ۷۸۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام ، غالب کا محبوب ابتدائی دور میں مشمولہ
تقدیدیں ، انجمن ، پٹنہ ، ۱۹۶۶ء
- ۷۹۔ پروفیسر محمد محبوب ، مرزا غالب ، علی گڑھ میگزین ، ۶۷-۱۹۶۶ء
- ۸۰۔ سجاد ہاشم رضوی ، غالب اور جدید ذہن ، مشمولہ تہذیب و تخلیق
لاہور ، ۱۹۶۶ء
- ۸۱۔ ڈاکٹر ظہیر انصاری ، مرزا غالب کی مثنویاں ، گفتگو ، بمبئی ،
جنوری ، ۱۹۶۷ء
- ۸۲۔ ڈاکٹر احسن فاروقی ، حیوان ظریف غالب ، تخلیق تنقید ، کراچی ،
۱۹۶۸ء
- ۸۳۔ ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی ، یک عمر ناز شوخی عنوان الہائے
علی گڑھ میگزین غالب ممبر ، ۱۹۶۹ء
- ۸۴۔ آل احمد سرور ، غالب اور جدید ذہن ، علی گڑھ میگزین غالب ممبر
۱۹۶۹ء

- ۸۵۔ ڈاکٹر سید محمود ، مقدمہ دیوان غالب ، نظامی ایڈیشن بدایوں
- ۸۶۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی ، غالب کا اسلوب نگارش (پنج آہنگ) صحیفہ
لاہور ، جنوری ۱۹۶۹ء
- ۸۷۔ خواجہ فاروق ، غالب کی عظمت ، مشمولہ کلاسیکی ادب ، دہلی ،
- ۸۸۔ سید معین الرحمان ، غالب کے بعد ان پر پہلا مضمون ، نقوش ،
لاہور ، فروری ۱۹۶۹ء
- ۸۹۔ سید معین الرحمان ، غالب کی معدوم تصنیفات ، العلم ، کراچی ،
غالب کبیر ، ۱۹۶۹ء
- ۹۰۔ پروفیسر سید وقار عظیم ، غالب کا تنقیدی مزاج ، نقوش ، لاہور،
فروری ، ۱۹۶۹ء
- ۹۱۔ ڈاکٹر محمد عقیل ، غالب اور مثنوی، نقوش لاہور، فروری، ۱۹۶۹ء
- ۹۲۔ ڈاکٹر سید ناظر حسن زہدی، غالب کا تہذیبی اور معاشرتی پس منظر۔
پنجاب یونیورسٹی ریسرچ جرنل ، غالب کبیر ، فروری ، ۱۹۶۹ء
- ۹۳۔ سید محمد حسین رضوی، غالب کی صحیح تاریخ پیدائش، اردو، کراچی،
جنوری مارچ ، ۱۹۶۹ء
- ۹۴۔ ڈاکٹر ناظر حسن ۔ غالب اپنے اشعار کے آئینے میں، راوی، لاہور
فروری ۱۹۶۹ء
- ۹۵۔ اختر انبال کمال ، غالب
- ۹۶۔ محمد حسن ، غالب ۔ نئی داخلیت کی آواز

اشاریہ

الف

- آب حیات ، ۳۶۰ -
آثار الصنائید ، ۳۵۷ -
آثار غالب ، ۱۱ -
آزاد محمد حسین ، ۱۳۶ ، ۳۶۰ -
آزودہ مفتی صدر الدین ، ۱۱۳ ،
۱۳۳ ، ۳۷۷ -
آفاق حسین ، ۱۸۰ ، ۳۸۳ -
آل احمد سرور ، ۳۳۵ ، ۳۷۷ -
آفند رام خلاصی ، ۸۱ -
ابر گوہر یار ، ۱۸۶ -
ابوالقاسم خان ، ۱۹۵ -
ابواللہ صیدی ، ۳۸۳ -
ابوسعید سرزا ، ۱۳۳ -
احتشام حسین ، پروفیسر ، ۳۳۷ ،
۳۷۹ -
احسن اللہ خان حکیم ، ۹ ، ۳۶ ،
۱۳۶ ، ۳۱۳ -
احمد بخش خان ثواب ، ۵۳ ،
۲۷۳ -
احمد علی پروفیسر ، ۳۸۳ -
احمد علی مولوی ، ۱۰ ، ۳۱۳ -
احمد شاہ ابدالی ، ۸۱ -
احمد فاروق خواجہ ، ۳۸۲ -
احوال غالب ، ۳۲ -
اختر اورینوی ، ۳۸۳ -
اوجین سنگھ گرو ، ۸۲ -
اردو مے معلی ، ۱۶۹ ، ۱۷۱ ،
۳۸۶ -
اسپرنگر ، ڈاکٹر ، ۱۳۵ -
اسٹرننگ ، مسٹر ، ۲۷۵ -
اسیر ، جلال ، ۶ -
اعظم خان ، ۱۰۳ -
اعظم الدولہ سرور ، ۳۵۳ -
اقبالؔ عشق ، ۱۳۱ -
الہی بخش مفتی ، ۱۱۳ -
الہی بخش خان معروف ، ۱۶ ، ۱۱۳ ،
۳۲ -
القاب و آداب غطوط ، ۳۸۹ -
امام بخش صبیانی ، ۱۳۶ -
امان ، خواجہ ، ۵۳ -
امتیاز علی خان عرشی ، ۶ ، ۱۳۰ ،
۳۱ ، ۹۹۲ -
امداد امام اثر ، ۳۶۷ -
امراق بیگم ، ۳۷۹ -
امیر النساء ، ۲۲ -
امیر خان ، ثواب ، ۱۱۸ -
امیر مہتانی ، ۳۶۰ -
امین الدین خان ، ۵۳ -
انتخاب غالب ، ۱۹۲ -
انتخاب یادگار ، ۳۶۰ -
انوری ، ۳۲۰ -

جام جہاں نما ، ۱۹۵ -

جلوۂ خضر ، ۳۶۲ -

جہاندار شاہ ، ۹۲ -

جہانگیر مرزا ، ۱۰۱ -

جیون بیگ ، ۲۲ -

ج

جراخ دیر ، ۳۰۲ -

چورامن جاٹ ، ۸۳ -

چوک سعد اللہ خان ، ۱۰۳ -

چھچھ مل ، ۱۸۵ -

چھوٹی خانم ، ۵ -

چین سنگھ ، ۲۷۳ -

ح

حاجی خان ، ۲۱ -

حالی مولانا ، ۳۳ ، ۵۱ ، ۵۲ -

۳۶۵ -

حسیب اللہ خان ، ۱۱۲ -

حسن علی خان ، ۳۳ -

حکیم فرزانہ ، ۳۳۱ -

حمید احمد خان پرویسر ، ۳۲ -

۱۶۳ ، ۳۳۸ ، ۳۳۹ ، ۳۷۳ -

خ

خاٹانی ، ۳۲۰ -

خطوط غالب ، ۱۷۷ ، ۳۷۷ -

خطوط غالب سہر ، ۱۸۲ -

خلیق احمد نظامی ، ۸۵ -

خلیق احمد نظامی ، ۸۵ -

خواجہ حاجی خان ، ۲۱ -

خوب چند ، ۲۷۲ -

پ

بابر مرزا ، ۱۰۱ -

باغ دودر ، ۱۹۶ ، ۱۹۸ -

باتر علی خان ، ۳۳ -

بتروس ، مسٹر ، ۱۳۵ -

عبدالرحمن بجنوری ، ۳۷۱ ، ۳۷۳ -

بختاور سنگھ ، ۲۸ -

برہان قاطع ، ۵۱ ، ۵۳ ، ۱۰۱ -

۳۱۱ -

بزم آخر ، ۱۰۲ -

بشیر حسین زیدی ، ۱۷۶ -

بلوان سنگھ ، ۲۹ -

بنارس ، ۳۰۲ ، ۳۰۳ -

بہادر شاہ ، ۵۰ ، ۱۰۱ ، ۱۳۶ -

۱۳۱ -

بیداد ، میر محمدی ، ۱۳۵ -

بیدل ، ۶ -

ت

تارا چند ، ڈاکٹر ، ۸۲ -

ترسم خان ، ۳ -

تفتہ ، ہر گوبال ، ۳۸۵ -

تیغ بہادر گرو ، ۸۲ -

تیغ تیز ، ۳۱۱ -

پ

پنج آہنگ ، ۱۸۷ -

پیارے لال آشوب ، ۱۸۳ -

ج

جاٹ قوم کا مرقع ، ۸۳ -

جارج گسنگھام ، ۱۰۰ -

سعادت علی ، ۱۰۳۰ -

سنگھ قوم ، ۹۲ -

سلاطین قلعہ ، ۱۰۰ -

سمرقند ، ۳۰ -

سوالات عبدالکرم ، ۱۱۱ -

سورج مل جاٹ ، ۸۳ -

سید احمد ، ۱۵ ، ۱۱۳ ، ۱۱۸ -

۱۲۷ ، ۳۷۷ -

شی

شاہ اسماعیل ، ۱۱۷ -

شاہ عبدالغنی ، ۱۱۷ ، ۱۳۳ -

شاہ عبدالعزیز ، ۱۱۳ -

شاہ عبدالقادر ، ۱۱۳ ، ۱۱۶ -

۱۲۶ ، ۱۳۱ -

شاہ غلام علی ، ۱۱۳ -

شاہ رفیع الدین ، ۱۱۳ ، ۱۱۶ -

۱۲۶ -

شاہ محمد اسحاق ، ۱۱۳ -

شاہ ولی اللہ ، ۸۱ ، ۱۰۹ -

شمشیر تیز تر ، ۱۳۱ -

شوکت بخاری ، ۶ -

شیفتہ ، ۳۶ ، ۱۳۹ ، ۱۴۰ ، ۳۵۵ -

شیو دھیان سنگھ ، ۲۵ ، ۳۷۷ -

شیو نراین ، ۹ ، ۱۶۵ -

ھی

صدر الدین آزرده ، ۱۱۳ ، ۱۳۲ -

۳۷۷ -

صفدر جنگ ، ۸۵ -

صفیر بلگرامی ، ۳۶۲ -

ڈ

دافع ہذیان ، ۱۱۱ -

درفش کلویانی ، ۵۲ ، ۱۹۰ -

درگاہ قلی خان ، ۱۰۳ -

دستنبو ، ۶۱ ، ۱۸۸ -

دعائے صباح ، ۱۹۳ -

دکنی محمد حسین ، ۲۲۲ -

دیوان غالب ، ۱۵۵ تا ۱۵۸ -

ڈ

ڈکا اللہ مولوی ، ۱۳۶ -

ذکر غالب ، ۱۱ -

ذوق ، ۳۶ ، ۱۱۳ -

ڈ

رامس ڈاکٹر ، ۹ -

رام چندر ، ماسٹر ، ۱۳۶ -

رحیم بیگ ، ۹۰ ، ۳۱۳ -

رشید احمد ، ۳۳ ، ۳۷۶ -

رنجیت سنگھ ، ۸۲ -

روس ، ڈاکٹر ، ۹ -

روٹیکن ، ۲۰ -

ڑ

ڑبن العابدین عارف ، ۳۳ ، ۳۶ -

۱۴۱ -

ھی

ساطع برہان ، ۱۰۳ -

سیدچیں ، ۱۸۶ -

سراج الدین احمد ، ۱۹۵ -

سر سید احمد خان ، ۱۲۰ ، ۱۴۷ -

عرفی شیرازی ، ۳۲۰ -

عقلمت آدم ، ۲۰۷ -

علاءالدین ، ۳۱ ، ۲۷۹ -

عود بندی ، ۱۶۳ ، ۳۸۳ -

عیش آغا جان ، ۱۳۱ -

غ

غالب اور :-

آفاق شاعری ، ۲۱۵ ، ۲۱۷ ، ۲۱۸ -

آگ اور اس کے متعلقات ، ۳۵۷ ،

۳۵۳ -

اجتماعی شعور ، ۲۵۵ -

اجتہاد شعری ، ۴۴۹ ، ۴۷۳ -

ازدواجی زندگی ، ۲۸ ، ۳۳ ، ۲۸۱ ،

۲۸۲ -

اسیری ، ۸ ، ۳۸۰ -

الہامی انداز ، ۳۳۹ ، ۳۷۱ -

انگریزی حکومت ، ۸۷ -

اولاد ، ۴۴ -

بچن ، ۱۳ ، ۲۹ -

بڑھاپا ، ۶۶ ، ۶۷ -

پنشن ، ۶۹ ، ۵۳ ، ۳۸۱ -

چلو داری ، ۴ ، ۲۹۳ -

تراکیب فارسی ، ۳۳۶ -

تعلیم و تربیت ، ۵ ، ۳۷ ، ۳۸ -

تصوف ، ۲۲۷ -

تصویر کاری ، ۳۴۵ ، ۳۴۶ ، ۳۵۷ ،

۳۶۲ -

تنقید ، ۴۲۲ ، ۴۲۸ ، ۴۵۳ -

صلاح الدین خدا بخش ، ۳۶۸ -

صہبانی ، اسام بخش ، ۱۴۶ ، ۳۷۷ -

ضی

ضیاء الدین احمد خان ، ۱۰ ، ۴۹ ،

۱۳۰ -

ضیاءالدین برنی ، ۳۶۸ -

ط

طور کلم ، ۳۵۹ -

ظ

ظہیر دہلوی ، ۴۶ ، ۱۳۱ -

غ

عارف ، ۴۴ ، ۴۶ ، ۱۳۱ -

عبدالحق چودھری ، ۶ ، ۴۴ ،

۴۴ -

عبدالحمیم خلیفہ ، ۳۸۰ -

عبدالحی ، ۱۱۳ ، ۱۶۵ -

عبدالصمد ، ۶ ، ۳۳ ، ۳۴ ، ۳۷۹ -

عبدالرحمن بھٹوری ، ۴۴۴ ، ۴۴۶ -

عبدالکریم ، ۳۱۱ -

عبدالله خان ، ۴ ، ۲۳ ، ۲۶ -

عبداللطیف ڈاکٹر ، ۴۳۸ -

عبدالواجد دریا آبادی ، ۴۶۹ -

عبدالودود قاضی ، ۳۵ -

عبدالله سید ، ۳۸۰ -

عجالتہ "ناقصہ" ، ۱۳۱ -

عرشی ، استیاز علی خان ، ۶ ، ۴۰ ،

۱۳۱ ، ۱۹۲ -

عقدہ منتخبہ ، ۴۵۴ -

عشق و عاشقی، ۲۸۳، ۲۹۱، ۲۹۵، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۳ -
 علامات و اشارت، ۳۳۲، ۳۵۰ -
 عمرانی نظریہ، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱ -
 عیش کوشی، ۲۵۰ -
 فنون لطیفہ، ۹۶، ۱۳۲ -
 فارسی کا اثر، ۳۵، ۳۶۵ -
 فلسفیانہ رجحان، ۲۰۳، ۲۸۶، ۳۶۸ -
 لہجہ اجنبیہ، ۳۶۵، ۳۶۷، ۳۶۸ -
 قلعہ کی ملازمت، ۳۹، ۶۰ -
 قنوطیت، ۲۷۳، ۲۷۵ -
 کالج کی ملازمت، ۳۸۰ -
 کلکتہ میں، ۲، ۵۳، ۳۸۰ -
 مزاجی خصوصیات، ۳۸۳ -
 معاشرت کے تقویر، ۹۷، ۹۸، ۲۱۴، ۲۶۲، ۳۸۷، ۳۹۸ -
 ۴۰۳، ۴۴۹ -
 معاشی حالات، ۲۷۶، ۳۸۷ -
 معشوق، ۳۱۱ -
 نثر نگاری، ۳۹۳، ۳۹۶، ۴۰۰ -
 نسب نامہ، ۲۲ -
 نشاطیہ انداز، ۳۶۵، ۳۶۶ -
 نکات و رقعات، ۱۸۳ -
 نقاد، ۳۲۵، ۳۳۲ -
 غالب نامہ، ۴۳۸ -
 غزوہ ۱۸۵۷ء، ۶۱، ۶۲ -
 غلام حیدر، حکیم، ۱۳۷ -
 غلام علی، ۱۳۳ -
 غلام نجف خان، ۳۶، ۱۳۶ -
 کلیات فارسی، ۱۸۵، ۱۸۹ -
 لکھنؤ، میں ۵۵ -

نہیں، و عمرانی اثرات، ۲۸۹، ۳۳۶ -
 جاگیر دارانہ ماحول، ۳۰۱، ۳۸۲ -
 جدت پسندی، ۳۹۰ -
 جہالیاتی چٹا، ۳۳۳، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۷۳، ۴۰۳ -
 حالات زندگی، ۲۰، ۲۸ -
 حسن پرستی، ۲۲۱، ۳۰۱، ۳۰۶، ۳۰۷ -
 خاندان، ۱۳، ۳۷۳، ۳۷۸ -
 خانہ داری، ۲۸، ۳۲، ۳۸۱، ۳۸۲ -
 خطوط، ۳۷۵، ۳۷۷، ۳۸۰، ۳۸۳، ۳۹۴، ۴۰۱ -
 خوش باشی، ۲۷۰ -
 خون کا تصور، ۳۵۷، ۳۵۹، ۳۷۰ -
 دیوان اردو، ۱۵۵ تا ۱۵۸ -
 رشک کا جذبہ، ۳۲۶ -
 روایت پرستی، ۳۶۲، ۳۶۶ -
 رومانیت، ۳۵۵ -
 سوانح زندگی، ۲۰، ۲۸ -
 سیاسی حالات، ۷۰، ۷۱، ۷۳، ۸۷ -
 شادی، ۳۰، ۳۷۹، ۳۹۳ -
 شکست خوردگی، ۲۶۲ -
 شخصیت چلو داری، ۳، ۳۹۳، ۴۰۱ -
 شاعرانہ عظمت، ۱۳۹، ۱۹۹، ۲۰۱ -
 شوخی و شگفتگی، ۲۳۳، ۳۶۷، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳ -

- گدستہ، قازنین، ۴۵۵ -
 گی رعنا، ۱۹۱ -
 گلستان سخن، ۴۵۸ -
 گلشن بے خار، ۴۵۵ -

ل

- لال کنور، ۹۲ -
 لطائف غیبی، ۴۱۱، ۴۱۶ -
 لکھنؤ، ۱۳، ۵۵ -
 لیک جنرل، ۲۰، ۲۵، ۸۷ -

م

- مالک رام، ۱۱ -
 مجنوں گورکھپوری، ۴۷۹ -
 محرق قاطع، ۴۱۰ -
 محمد اسبن مولوی، ۴۱۰ -
 محمد اکرام، ۴۴۱، ۴۷۳ -
 محمد محسن، ۴۸۵ -
 مشرقیات غالب، ۱۹۴ -
 ستھرا داس، ۲۷۹ -
 محاسن کلام غالب، ۴۳۳ -
 محبوب علی میر، ۱۱۴ -
 محمد نصیر ریخ، ۱۳۳، ۱۳۴ -
 محمد شاہ، ۹۲ -
 محمود خان، ۴۸ -
 مظهر العجائب، ۲۰ -
 معظم، مولوی، ۳۱، ۳۳، ۳۵ -
 مرزا خان کوتوال، ۴۹ -
 معین الملک میر منو، ۴ -
 مکاتیب غالب، ۱۷۴ -
 ممتاز حسین، ۴۷۸ -
 ممتاز علی خان، ۱۵۶، ۱۶۵ -
 مملوک العلّی، ۱۴۵ -
 مومن، ۴۶، ۵۱، ۱۱۳، ۱۴۰ -

ن

- نہض الدین، ۱۳۳ -
 فضل، ۶، ۴۶، ۴۸، ۱۱۳، ۱۲۹،
 ۱۳۲، ۳۷۷ -
 نباض الدین، ۱۰۳ -
 فیض الحسن کوتوال، ۹ -

ق

- قادر بخش صابر، ۴۵۸ -
 قادر نامہ، ۱۸۴ -
 قاطع القاطع، ۴۱۰ -
 قاطع بریان، ۱۸۹، ۴۱۱ -
 قطب الدین، ۲۱، ۱۳۲ -
 قطب الدین، یاطن، ۳۶ -
 قمر الدین راقم، ۲۰ -
 قورقان بیگ، ۱۳ -

ک

- کاشف الحقائق، ۴۶۷ -
 کالجی میان، ۴۹ -
 کانپور، ۱۳، ۷ -
 کرامت علی، ۱۳۲ -
 کریم الدین، ۱۳۶، ۴۵۵ -
 کلیم الدین احمد، ۴۸۲ -
 کلب علی خان، ۳۹ -
 کلکتہ، ۷، ۵۴، ۵۳، ۳۰۲، ۳۸۰ -
 کلیات نثر، ۱۸۹ -
 کو بروک، ۲۶۵ -

گی

- گرو ارجن سنگھ، ۸۲ -
 گرو تیغ بہادر، ۸۲ -
 گرو گویند سنگھ، ۸۲ -
 گرو لانگ، ۸۲ -

- مویده برهان، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳ -
 مہر خلام رسول، ۳۷ -
 مہر نیم روز، ۹، ۱۸ -
 مسیح پرشاد، ۱۷۸، ۳۸۳ -
 میان داد خان، سیاح، ۳، ۱۳، ۱۵ -
 میر جلدی، ۱۳۵ -
 میر سہدئی، ۱۰ -

ن

- نادرات غالب، ۱۸، ۳۸۳ -
 ناسخ، ۱۹۵ -
 ناصر نامہ قراق، ۱۱۳ -
 ناظر حسین مرزا، ۵۰ -
 نامہ غالب، ۳۱ -
 نانک، ۸۲ -
 نبی بخش حقیر، ۳۸۳ -
 نجف علی، ۳۱۱ -
 نذیر احمد مولوی، ۱۳۶ -
 نسخہ حمیدہ، ۱۰۸ -
 نصر اللہ بیگ، ۵، ۳۱، ۳۰ -
 ۳۸، ۲۶ -

و

- واجد علی، شاہ، ۲۷۵ -
 ویلزلی، ۸۸ -

ز

- برمزد (عبدالصمد)، ۶، ۳۳، ۳۴ -
 ۳۷، ۳۷ -
 برگوہال، نقشہ، ۳۸۵ -
 ہنگامہ دل آشوب، ۱۱، ۳۱ -

ی

- یادگار غالب، ۱، ۳۲۸، ۳۳۰، ۳۳۱ -
 ۳۶ -
 یوسف بیگ خان، ۲۳، ۳۸۱ -
 یوسف علی خان، ناظم، ۱ -



To
DEAR FRIENDS AND COLLEAGUES

★ Professor Philips

★ Professor Brough	★ Professor Clarke
★ Professor Wright	★ Professor Lewis
★ Colonel Dr. Moyses-Bartlett	★ Mr. Brackee
★ Mr. Pearsoo	★ Mr. Gatehouse
★ Miss Smith	★ Mrs. Garland

And

★ Ralph Russell

of

The School of Oriental and African Studies

Who

With their affection and love made my stay at the
School of Oriental and African Studies, University of
London, the best and happiest period of my life.

EBADAT BRELVI